نومبر 2013

خواتین ڈائجسٹ



زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا ------ 6000 روپے

نومبر 2013
جلد 41 شمارہ 7
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مدیرہ

کہی اَن کہی

خواتین ڈائجسٹ کا نومبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

نئے اسلامی سال کا آغاز اسی ماہ میں ہو رہا ہے۔ اسلامی سال کا پہلا مہینہ محرم الحرام ہے۔ محرم الحرام کی ایک تاریخی حیثیت ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں جب عرب قبائل آپس میں لڑتے رہتے تھے۔ تب بھی چار مہینوں کو انہوں نے حرمت والے مہینے قرار دیا تھا۔ ان مہینوں میں جنگ وجدل اور لڑائی سے گریز کیا جاتا تھا۔ ان چار حرمت والے مہینوں میں ایک ماہ محرم الحرام ہے۔

محرم الحرام میں دو انتہائی عظیم المرتبت شخصیات کی شہادت کا سانحہ رونما ہوا۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ کی شہادت اور نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، خاتون جنت حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے جگر گوشہ شہید کربلا امام عالی مقام حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا واقعہ دس محرم الحرام کو رونما ہوا۔ واقعۂ کربلا اسلامی تاریخ کا ایک المناک باب اور تاریخ انسانیت کا عظیم سانحہ ہے۔

جب سے دُنیا بنی ہے، حق و باطل کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ بہت بار ایسا ہوا ہے کہ باطل غالب آ گیا لیکن وقت کی عدالت میں فاتح وہی ٹھہرے جو حق کے علم بردار تھے۔ جنہوں نے اعلا مقاصد کے لیے جدوجہد کی اور اپنی جانیں راہِ حق میں قربان کر دیں۔ اور یقیناً آخری فیصلہ وقت کا ہی ہوتا ہے۔

امام عالی مقام حسین ابن علی رضی اللہ عنہ کربلا میں شہید کر دیے گئے لیکن تاریخ میں کامیابی ان ہی کو حاصل ہوئی اور جن لوگوں نے انہیں شہید کیا، درحقیقت یہ ان کی شکست تھی۔

امام حسینؓ نے عدل و انصاف اور قرآن و سنّت کے مطابق نظام قائم کرنے کے لیے جہاد کیا اور اپنی اور اپنے رفقاء کی جان کی قربانی دے کر ثابت کر دیا کہ اسلام میں ملوکیت اور بادشاہت کا کوئی تصور نہیں۔ آپؓ نے دُنیا کو بتا دیا، کثرت حق کی دلیل نہیں۔ ساری دُنیا باطل کے ساتھ ہو جائے، تب بھی سچائی قائم رہتی ہے۔ آپؓ لاکھوں کے لشکر کے سامنے اپنی آخری سانس تک ثابت قدم رہے۔

شہادت کا یہ المناک واقعہ ہمارے دِلوں میں گہرا رنج و غم پیدا کرتا ہے۔ ہم آپؓ کے غم میں سوگوار ہوتے ہیں لیکن آپؓ کی سچی اور حقیقی محبت تب ہی ثابت ہو گی جب ہم واقعۂ کربلا کے پیغام کو سمجھیں اور اس پر عمل بھی کریں۔

اس شمارے میں،

- زندگی، روشنی، تیرگی ۔ بشریٰ احمد کا مکمل ناول،
- زمین کے آنسو ۔ نگہت سیما کے ناول کی آخری قسط،
- سعدیہ عزیز آفریدی، صدف آصف اور آمنہ ریاض کے ناولٹ،
- سلویٰ علی بٹ، ثریا انجم، سمیرا یونس اور نظیر فاطمہ کے افسانے،
- عنیزہ سید اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- ڈراموں کی شفیق ماں عصمت زیدی سے ملاقات،
- دل مضطر کی صدا صنم جنگ سے ملاقات،
- میری خاموشی کو بیان ملے ۔ قارئین سے سروے،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- آپ کا باورچی خانہ، نفسیاتی ازدواجی اُلجھنیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین کا نومبر کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا، اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابو داؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

گمان کے مطابق

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ سبحانہ و تعالیٰ فرماتا ہے۔ "میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق (اس سے معاملہ کرتا) ہوں اور جب وہ مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ کسی جماعت میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں ان سے بہتر (فرشتوں کی) جماعت میں اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کے قریب آتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑتا ہوا آتا ہوں۔"

فوائد و مسائل:

1۔ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن رکھنا چاہیے۔

2۔ حسن ظن کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ نیک اعمال کیے جائیں اور ان کی قبولیت کی امید رکھی جائے۔ گناہوں سے توبہ کی جائے اور بخشش کی امید رکھی جائے۔ گناہوں کے راستے پر بھاگتے چلے جانا اور اللہ کی رحمت کی امید رکھنا نادانی ہے۔

3۔ اس میں بالواسطہ عمل کی تلقین ہے۔ کیونکہ عمل کے بغیر ثواب کی امید نہیں رکھی جا سکتی' لہٰذا اچھے عمل کرنے والا ہی اللہ سے اچھی امید رکھ سکتا ہے۔ برے عمل کرنے والا بری امید ہی رکھ سکتا ہے۔

4۔ جماعت میں ذکر کرنے سے مراد خود ساختہ اجتماعی ذکر نہیں۔ بلکہ یا تو یہ مراد ہے کہ جیسے نماز کے بعد سب لوگ اپنے اپنے طور پر مسنون دعائیں اور اذکار پڑھتے ہیں یا اللہ کی رحمتوں، نعمتوں اور اس کے احکام وغیرہ کا ذکر ہے' یعنی ایک شخص بیان کرے اور دوسرے سنتے رہیں۔

نیکی کا بڑھنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدم کے بیٹے کا ہر عمل (ثواب میں) بڑھتا ہے۔ (یعنی) ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک بڑھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ۔"سوائے روزے کے ۔کیونکہ وہ (خالص) میرے لیے ہوتا ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔"

لاحول ولا قوۃ الاباللہ کی فضیلت

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'انہوں نے فرمایا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) پڑھتے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عبداللہ بن قیس (ابوموسیٰ) کیا میں تجھے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کا پتا نہ دوں؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"کہا کر (لاحول ولا قوۃ الاباللہ) "اللہ کی توفیق کے بغیر نہ گناہ سے بچاؤ ہو سکتا ہے اور نہ نیکی کی طاقت ہے"

فوائد و مسائل :

1۔ یہ جملہ اللہ کے ذکر میں اہم جملہ ہے۔ کیونکہ اس میں اس بات کا اقرار ہے کہ ہر قوت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔

2۔ اس میں اللہ تعالیٰ پر اعتماد و توکل کے ساتھ ساتھ اس کے سامنے عاجزی اور مسکینی کا اظہار ہے اور عبودیت کا یہ اظہار اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔

3۔ نیکی کا کام انجام دے کر یا گناہ سے اجتناب کر کے دل میں فخر کے جذبات پیدا ہو سکتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں "نیکی برباد گناہ لازم" کی کیفیت پیش آسکتی ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے اس بات کی یاددہانی کی ضرورت ہے کہ یہ سب میری کوشش اور بہادری سے نہیں ۔بلکہ محض اللہ کی توفیق اور اس کے احسان سے ہے۔

4۔ اس سوچ کے ساتھ یہ الفاظ پڑھنے سے یقیناً" جنت کی عظیم نعمتیں اور بلند درجات حاصل ہوں گے ' اس لیے اسے "جنت کا خزانہ" قرار دیا گیا ہے۔

5۔ اللہ کا ذکر سری طور پر کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں ریاکاری نہیں ہوتی 'البتہ جن مقامات پر ذکر بلند آواز سے کرنا مسنون ہے 'وہاں بلند آواز ہی سے کرنا چاہیے۔

جنت کا خزانہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ' انہوں نے کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"کیا میں تجھے جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانے کا پتا نہ دوں ؟" میں نے کہا "کیوں نہیں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے فرمایا۔ (لا حول ولا قوۃ الاباللہ)۔"

خالہ کا درجہ

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے 'نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"خالہ 'ماں کے مرتبے میں ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ خالہ بھانجے کی وارث ہے نہ بھانجا خالہ کا 'تاہم خالہ کے ساتھ ادب و احترام اور حسن سلوک کا معاملہ اسی طرح کرنے کا حکم ہے 'جس طرح ماں کے ساتھ صلہ رحمی کا حکم ہے۔

2 اس حدیث کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب صلح حدیبیہ کے اگلے سال عمرہ ادا کرنے کے لیے تشریف لائے تو واپسی پر سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی آگئیں۔ سیدنا علی رضی اللہ عنہ اسے گھر لے گئے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا سے

فرمایا "اسے اپنے ساتھ رکھو۔" اب زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہنے لگے ہمارا حق زیادہ ہے کہ اسے اپنے ساتھ رکھیں "یہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھتیجی تھی اور سیدنا علی اور سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی چچازاد تھی 'البتہ سیدنا جعفر رضی اللہ عنہ کی بیوی اس بچی کی خالہ تھیں۔ اس موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا تھا کیونکہ جس طرح خالہ تربیت کرسکتی ہے اس طرح کوئی اور نہیں کرسکتا۔

برکت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے (اپنی اہلیہ) حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔

"کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں کمزوری محسوس کی ہے۔ میرا خیال ہے وہ بھوک کی وجہ سے ہے 'کیا تیرے پاس (کھانے پینے کی) کوئی چیز ہے؟"

انہوں نے کہا۔ "ہاں۔" پھر انہوں نے جو کی چند روٹیاں نکالیں 'پھر اپنا دوپٹا پکڑا اور اس کے ایک کنارے میں روٹیاں لپیٹیں اور میرے (یعنی حضرت انس کے) کپڑے کے نیچے چھپادیں اور اس دوپٹے کا کچھ حصہ میرے جسم پر لپیٹ دیا 'پھر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا۔ میں نے نبی مسجد میں تشریف فرما پایا۔ آپ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں ان کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا تو مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔

"کیا تمہیں ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر پوچھا۔ "کیا کھانے کے لیے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔"

تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ساتھیوں سے) فرمایا۔ اٹھو۔"

چنانچہ وہ سب چلے اور میں ان کے آگے آگے چلتا رہا 'یہاں تک کہ میں حضرت ابوطلحہ کے پاس پہنچ گیا اور آپ کو اس بات کی خبر دی تو ابوطلحہ نے فرمایا۔

"اے ام سلیم! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں سمیت تشریف لے آئے ہیں اور ہمارے پاس تو اتنا کھانا نہیں ہے جو ان سب کو کھلا سکیں؟"

انہوں نے کہا۔ "اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتا ہے۔"

چنانچہ ابو طلحہ (باہر نکل کر) چلے یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جا ملے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ آگے بڑھے حتیٰ کہ یہ دونوں گھر میں داخل ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ام سلیم سے فرمایا۔

"تمہارے پاس جو کچھ ہے 'لے آؤ۔"

چنانچہ انہوں نے وہ روٹیاں پیش کردیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے ان روٹیوں کو توڑا گیا اور ام سلیم نے ان پر گھی کی کپی نچوڑ دی جس نے ان کو سالن والا بنا دیا۔ (یعنی چپڑی روٹی سالن کا کام بھی دے گئی)

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں 'جو اللہ نے چاہا 'کہا (یعنی خیر و برکت کی دعا فرمائی) اور فرمایا۔

"دس آدمیوں کو (کھانے کی) اجازت دو۔"

تو ابوطلحہ نے انہیں اجازت دی۔ انہوں نے کھانا کھایا یہاں تک کہ سیر ہو گئے 'پھر چلے گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔

"دس آدمیوں کو اجازت دو۔"

تو انہوں نے اجازت دی۔

انہوں نے بھی کھانا کھایا حتیٰ کہ سیر ہو گئے اور نکل گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔

"دس آدمیوں کو اجازت دو۔" ابو طلحہ نے اجازت دی 'یہاں تک کہ سب لوگوں نے (دس دس کر

کے سیر ہو کر کھانا کھالیا اور یہ ستر یا اسی آدمی تھے۔(بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ دس آدمی داخل ہوتے نکلتے رہے' یہاں تک کہ کوئی شخص ایسا باقی نہ رہا جو داخل ہوا ہو اور اس نے سیر ہو کر کھانا نہ کھایا ہو' پھر اس کھانے کو اکٹھا کیا' وہ اسی طرح تھا جیسے کھانے سے پہلے تھا۔

ایک اور روایت میں ہے۔ انہوں نے دس دس آدمیوں کی صورت میں کھانا کھایا یہاں تک کہ 80 آدمیوں نے ایسا کیا۔ اور اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اور گھر والوں نے کھانا کھایا اور (پھر بھی) بچا ہوا کھانا چھوڑا۔

ایک اور روایت میں ہے۔ پھر انہوں نے اتنا کھانا بچایا کہ وہ پڑوسیوں کو بھی پہنچایا۔

حضرت انس ہی سے ایک اور روایت میں ہے کہ میں ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ تشریف فرما پایا اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے پیٹ پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے بعض ساتھیوں سے پوچھا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے اپنے پیٹ پر پٹی کیوں باندھی ہوئی ہے؟"

تو انہوں نے بتلایا۔ "بھوک کی وجہ سے۔" چنانچہ میں حضرت ام سلیم بنت ملحان کے خاوند حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا اور کہا۔ "ابا جان! میں نے نبی صلی اللہ علیہ و سلم کو اپنے پیٹ پر پٹی باندھے ہوئے دیکھا تو میں نے آپ صلی اللہ علیہ و سلم کے بعض ساتھیوں سے (اس کی بابت) پوچھا تو انہوں نے بتلایا کہ بھوک کی شدت سے ایسا کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو طلحہ میری والدہ کے پاس آئے اور کہا۔ "کیا کچھ کھانے کو ہے؟" انہوں نے کہا۔

"ہاں میرے پاس روٹی کے کچھ ٹکڑے اور چند کھجوریں ہیں۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم ہمارے پاس اکیلے تشریف لائیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ و سلم کو سیر کردیں گے اور اگر دوسرے لوگ بھی آپ کے ساتھ آئے تو پھر ان کے لیے یہ کم ہو جائے گا۔" اور باقی حدیث بیان کی۔

فوائد و مسائل :

(1) اس میں بھی وہی چیزیں ہیں جو سابقہ حدیث میں گزریں' البتہ اس میں ایک صراحت مزید یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم اور گھر والوں نے کھانا سب کے بعد کھایا' جس سے یہ معلوم ہوا کہ میزبانوں کو مہمانوں کے بعد کھانا چاہیے اور اسی طرح پیر و مرشد کو بھی اپنے مریدوں کو کھلانے کے بعد کھانا چاہیے۔ لیکن اب ایسے پیر و مرشد کہاں۔

(2) اس میں حضرت انس نے حضرت ابو طلحہ کو ابا جان کہہ کر پکارا' ادب و احترام کے طور پر ایسا کیا۔ حضرت ابو طلحہ' حضرت انس کے سوتیلے باپ تھے۔ حضرت انس کے والد' مالک بن نضر تھے۔ ان کی والدہ حضرت ام سلیم مسلمان ہو گئیں لیکن مالک نے قبول اسلام کے بجائے شام جانا پسند کیا۔ چنانچہ وہ اپنی مسلمان بیوی کو چھوڑ کر شام چلے گئے اور وہیں فوت ہو گئے۔ اس کے بعد ام سلیم نے حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نکاح کرلیا۔

(3) اس باب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ و سلم کے زہد و قناعت بلکہ فقر و فاقہ پر مبنی زندگی کے جو واقعات گزرے ہیں وہ ایسے ہیں کہ آج کل اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ وہ حقائق و واقعات ہیں جو نہایت مستند طریقے سے نقل ہوئے ہیں جنہیں افسانے کہہ کو جھٹلایا نہیں جاسکتا۔

اس کی توجیہہ البتہ بعض حضرات نے یہ کی ہے کہ اس وقت کفر و اسلام کا جو معرکہ درپیش تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ لوگ دنیا اور اس کی نعمتوں سے کنارہ کش رہ کر کفر کے استیصال اور غلبہ اسلام کے لیے شب و روز مصروف رہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر اس گروہ قدسیہ کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال ڈالی اور آخرت کی محبت ڈال دی اور یوں انہوں نے دنیا کے سامنے دنیا سے بے رغبتی کا ایک بے مثال کردار پیش کیا اور اس کی ترویج و اشاعت کا عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا۔ اگر وہ بھی دنیا کی لذتوں میں منہمک ہو جاتے تو اسلام کا ابتدا ہی میں وہ حال ہو جاتا جو بعد میں مسلمانوں کی محبت دنیا کی وجہ سے اس کا ہوا۔

آج مسلمانوں کے پاس سب کچھ ہے' مال و دولت کی کثرت ہے۔ آسائشوں اور سہولتوں کی فراوانی ہے اور ہر طرح کے اسباب و وسائل مہیا ہیں لیکن دنیا بھر میں ذلیل و رسوا ہیں' ان کی پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ دلوں میں آخرت کی بجائے دنیا کی محبت رچ بس گئی ہے۔ جس نے انہیں بزدل بنادیا اور مجاہدانہ کردار ادا کرنے سے عاری کردیا ہے۔

قربانی کا گوشت رکھ چھوڑنا

حضرت نبیشہ (بن عبداللہ ہذلی) رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"میں نے تم کو قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ رکھنے سے منع کیا تھا۔ اب کھاؤ اور ذخیرہ کرو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ قربانی کا گوشت استعمال کرتے وقت دوسروں کے حالات کا لحاظ رکھا جائے۔ اگر زیادہ لوگ ضرورت مند ہوں تو ان میں تقسیم کردیا جائے۔ اپنے لیے معمولی مقدار میں رکھا جائے۔ اگر عام لوگ خوش حال ہوں تو حسب خواہش رکھ لیا جائے۔

2۔ شریعت میں مختلف حالات کے لیے رہنمائی موجود ہے۔ امام کو چاہیے کہ جیسے حالات ہوں' ان کے مطابق شرعی احکام بیان کرے۔

3۔ عوام میں مشہور ہے کہ قربانی کے گوشت کے تین حصے کرنے چاہئیں' ایک گھر والوں کے لیے' ایک رشتہ داروں کے لیے' ایک غریبوں اور مسکینوں کے لیے۔ بعض لوگ بالکل برابر تین حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ درست نہیں بلکہ گھر میں حسب ضرورت تھوڑا بہت رکھ کر باقی دوسروں میں تقسیم کردیا جائے۔ اس میں غریب رشتہ داروں کو یا اڑوس پڑوس کے غریب لوگوں کو زیادہ اہمیت دی جائے۔

عورتوں کو نصیحت

ابن عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت فرماتے ہیں کہ آپؐ نے (ایک بار) فرمایا۔

"اے عورتوں کی جماعت! تم (خاص طور پر) صدقہ دیا کرو اور زیادہ استغفار کیا کرو۔ کیونکہ دوزخیوں میں زیادہ تعداد میں نے عورتوں کی دیکھی ہے۔"

ان میں ایک ہوشیار عورت بولی: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے کیا قصور کیا ہے کہ ہم دوزخ میں زیادہ جائیں گے؟"

آپؐ نے فرمایا: "تمہیں (باہم گفتگو میں) لعنت کرنے کی زیادہ عادت ہوتی ہے۔ اور تم اپنے شوہر کی بھی بہت ناشکری کرتی ہو۔ میں نے تم جیسا دین و عقل میں ناقص ہو کر پھر ایک دانشمند شخص پر غالب آجانے والا کسی کو نہیں دیکھا۔"

(بخاری و مسلم۔ ترجمان السنۃ)

نذر

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ نذر دو قسم کی ہے۔ ایک تو وہ نذر جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور طاعت کے لیے مانی جائے اس کا پورا کرنا ضروری ہے' اس لیے یہ خاص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور دوسری نذر وہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کے لیے کی جائے' یہ نذر شیطان کے لیے ہے اور اس کا پورا کرنا جائز نہیں اور اس قسم کی نذر کا کفارہ دے جو قسم کا کفارہ دیا جاتا ہے۔



کوئی دن گر یہ گرانی اور ہے

انشا جی

آج کل گرانی کا مسئلہ گرم ہے۔ ہر کوئی چیخ رہا ہے اور وہ سرے کے گریبان میں منہ ڈال رہا ہے۔ اپنے میں اس لیے نہیں ڈال رہا کہ اس میں پہلے ہی کسی اور نے اپنا منہ ڈال رکھا ہوتا ہے۔ حکومت نے دکان داروں اور صنعت کاروں کو پچکار کے دیکھ لیا۔ آنکھیں دکھا کے بھی دیکھ لیا۔ مرض بڑھتا گیا' جوں جوں دوا کی۔

آج کل ریڈیو پر اعلان ہو رہا ہے کہ

"جس بھائی کو گرانی دور کرنے کا نسخہ معلوم ہو' وہ فلاں نمبر پر فون کر کے بتا دے۔"

وہ نمبر تو ہم کو یاد نہیں رہا۔ اپنے کالم ہی سے ٹیلی فون کا کام لیتے ہیں۔

"ہیلو' ہیلو کون بول رہا ہے؟ انسداد گرانی کمیٹی بول رہی ہے یا کوئی ایک آدمی بول رہا ہے؟"

"نہیں' ہم سیٹھ صاحب نہیں ہیں' خادم قوم ہیں۔ ملت کے درد مند ہیں۔ ہمارے پاس گرانی دور کرنے کا نسخہ ہے۔"

"ہاں' صدری ہے۔ ہاں' تیر بہدف بھی ہے۔ ہمارے خاندان میں سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔"

"بے شک! کھٹمنڈو کے پہاڑ پر ایک خضر صورت سنیاسی نے خودکشی سے پہلے ہمارے ایک مایوس العلاج بزرگ کو بتایا تھا۔"

"نہیں' سنیاسی نے خودکشی نہیں کی تھی۔ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ آپ خود سمجھ دار ہیں۔ اگر ہمارے بزرگ نے مایوس العلاجی کے عالم میں خودکشی کر لی ہوتی تو ہم کہاں ہوتے حکیم؟ ڈاکٹر؟"

"نہیں صاحب! ہم حکیم یا ڈاکٹر نہیں ہیں۔ معمولی ادیب ہیں' ہمارے پاس خدا کا دیا سب کچھ ہے۔ اس نسخے پر نفع لینا حرام ہے۔ تھوڑا سا خرچہ اشتہارات اور پیکنگ البتہ ہے۔ اچھا! آپ وہ بھی نہ دیجیے۔ نسخہ یہ ہے' غور سے سنیئے۔

"اگر دکان دار لوگ اپنے مال کی چیزیں کم کر دیں تو گرانی فی الفور دور ہو سکتی ہے۔ بس اتنا ہی نسخہ ہے' ہمارے نسخے منفرد ہی ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔ آپ سے گزارش ہے۔

ارے فون کیوں بند کر دیا۔ ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔"

ایک طریقہ گرانی سے محفوظ رہنے کا آپ اپنے پر بھی برت سکتے ہیں۔ گھریلو ٹوٹکا ہے۔ ہمیں بھی چند دن ہوئے معلوم ہوا ہے۔ ہوا یہ کہ ہم کراچی کا "صبح نو" پروگرام سن رہے تھے۔

"سامعین کرام' حمیدہ ستار آپ کی خدمت میں حاضر ہے' آج منگل ہے' یعنی بغیر گوشت کا دن' گوشت نایاب ہو رہا ہے' آج کل تو سبزی' دال کی قیمتیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ بعض بہنیں ابھی سے دوپہر کے کھانے کی فکر میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔ اجی چھوڑیے کھانے پکانے کی فکر کو' نغمہ سنیے"

"بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا۔"

ہم نے وہیں سے گھر والوں کو آواز دی۔

"بھئی ناشتا روک دو' ڈبل روٹی مہنگی ہے اور انڈا بھی مہنگا ہے جبکہ نغمہ مفت ہے۔ بھیگی بھیگی ٹھنڈی ہوا' آجاؤ' گرمی میں بھی افاقہ ہو گا۔"

کیا کہا؟ دوپہر کی روٹی؟ ارے دوپہر کو بھی تو نغمے ہوتے ہیں۔ شام کے کھانے کے وقت بھی ہوتے ہیں۔ رات کے بارہ بجے تک ہوتے ہیں' اس کے بعد کھانے کا ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ چھ بجے صبح پھر ریڈیو اپنے نغمات کا خوان لے کر حاضر ہو جاتا ہے۔ واہ بھئی واہ' کتنی آسانی سے گرانی کا مسئلہ حل ہوا ہے۔ گھر بیٹھے نغمے سنو' نہ گھر سے نکلو' نہ بازار جاؤ' نہ دکان دار ستائیں۔

گرانی کے مسئلے کی کیا مجال ہے کہ حل نہ ہو۔ ایک طرف ٹیلی ویژن پر تابڑ توڑ تقریریں ہوتی ہیں۔ دوسری طرف ریڈیو پیچھے لگا ہوا ہے۔ حکام عالی شان کے بیانات اس پر مستزاد ہیں کہ اے قیمتو! اگر تم نیچے نہ آئیں تو ہم سے برا کوئی نہ ہو گا۔ دیکھ لیجیے کوئی روز میں دکان دار ہاتھ باندھے ریڑھیوں پر مال لاد کر گھروں میں پہنچیں گے کہ

"صاحب! لے لو' ہاڑے ہاڑے لے لو۔ جو دام چاہے دے دو' اچھا مفت لے جاؤ۔"

اتفاق سے ہم نے آج یعنی بروز جمعہ بھی صبح نو سنا۔ آج "صبح نو" والوں نے ملاوٹ کا بھی قلع قمع کر دیا۔ آج کوئی ادیبہ بی بی تھیں۔ جو فرما رہی تھیں۔

"ملاوٹ بڑی بری چیز ہے' اس سے آدمی کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن تکلیف تو محبوب کی بے مہری سے بھی ہوتی ہے۔ میر تقی میر کا نغمہ سنیے' زمرد بانو کی آواز۔"

"پتا پتا بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے۔"

حضرات ہم پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ تھوڑی نفسیات بھی پڑھی ہے' لیکن ٹونے ٹوٹکے کے قائل نہیں۔ چھو منتر کے قائل نہیں' نفسیاتی علاج تک کے قائل نہیں۔

نفسیات کا عامل آپ سے کہے۔

"آنکھیں بند کر لو اور ایک سو ایک بار دہراؤ۔

"میں بھوکا نہیں ہوں' میں بھوکا نہیں ہوں' چیزیں مہنگی نہیں ہیں' چیزیں مہنگی نہیں ہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہے' تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا؟"

جس دن سے ریڈیو پاکستان نے مشرقی پاکستان کو پوربو پاکستان کہنا شروع کیا تھا اور ہمارے بعض دوستوں نے بھی دعوا کیا تھا کہ اب دیکھیے بنگالی بھائی کس طرح دوڑ کر ہمارے گلے سے آلگتے ہیں یا پاکستان کونسل برائے یکجہتی بنی تھی یا ادیبوں اور سازندوں کے وفد ادھر سے ادھر گئے تھے اور ادھر سے ادھر آئے تھے۔ تب بھی ہم نے عرض کیا تھا کہ۔

"صاحبو! معاملہ اس سے کچھ زیادہ گہرا ہے۔ اقتصادی ہے۔ اسلام کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے' لیکن مسلمان اور مسلمان کے درمیان اسلام کے علاوہ اور بھی رشتے ہوتے ہیں' ان کی فکر کرو۔"

اخبار والے لکھتے ہیں کہ پیٹرول اور مہنگا ہونے والا ہے۔

ایک صاحب نے ہمیں فکر میں مبتلا دیکھا تو کہا۔

"تم کو کیا فکر ہے اور اگر ہوا بھی تو روپیہ گیلن مہنگا ہو جائے گا۔"

ہم نے کہا۔ "اے رفیق! وہ کہانی سنی ہے کہ ایک صاحب لیٹے ہوئے تھے۔ ایک چوہا ان کے پیٹ پر سے گزر گیا' چلانے لگے' ہاہاکار مچانے لگے۔

لوگوں نے کہا۔

"کیا قیامت آگئی؟ ایک چوہا ہی تو تھا۔"

"بولے ابھی تو نہیں آئی' لیکن چوہا آیا ہے تو اس کے پیچھے پیچھے بلی آئے گی' اس کے پیچھے کتا' اس کے پیچھے آدمی ہاتھ میں ڈنڈے لیے ہوئے۔ میرا تو کچومر نکل جائے گا۔"

سرکار تو گیلن پر ایک روپیہ ہی زیادہ لے گی۔ ٹیکسی والے ڈھائی روپے' تین روپے ہماری جیب سے نکالیں گے۔ مشرقی پاکستان کا سیلاب گیا۔ خود مشرقی پاکستان گیا' لیکن اس سیلاب کی مد میں جو ایک روپیہ فی گیلن سرچارج لگا تھا' وہ تین گنا ہم دے رہے ہیں اور ہمارے آنے والی نسلیں دیں گی۔ کوئی تو سوچے کہ ان چھ ماہ میں مہنگائی کا یہ کیا ماجرا ہو گیا ہے کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا اور یہ بھی سوچیے کہ ریڈیو اور ٹرانزسٹر اور "صبح نو" اور ٹیلی ویژن کے مذاکرے اور میر تقی میر اور زمرد بانو اور بھیگی بھیگی ٹھنڈا ہوا۔ کیسے ان مسائل کو حل کر سکتی ہے؟

موسیقی غذا ہے' لیکن فقط روح کی غذا ہے' روح اور پیٹ الگ الگ چیزیں ہیں اور پیٹ بڑا بدکار ہے بابا۔۔۔!

(72 میں لکھا گیا)



ڈراموں کی شفیق ماں

عصمت زیدی سے ملاقات

شاہین رشید

پروقار شخصیت کی مالک عصمت زیدی کا نام کسی ڈرامے میں پڑھتے ہی احساس ہو جاتا ہے کہ یہ ایک شفیق ماں کا ہی رول کر رہی ہوں گی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے کردار ان پر سجتے بھی بہت ہیں اور میرا تو خیال یہ ہے کہ اگر یہ کبھی کسی تیز طرار یا کسی بہت ہی غریب ماں کا رول کریں گی تو نہ یہ خود اس کے ساتھ انصاف کر پائیں گی اور نہ ہی ناظرین انہیں ایسے کردار میں ہضم کر پائیں گے۔ عصمت زیدی کی اداکاری میں جتنا حقیقی پن ہے کسی اور فنکارہ میں نہیں ہے۔

"کیسی ہیں عصمت صاحبہ ــــــــ بہت زمانے سے خواہش تھی آپ سے بات کرنے کی۔ مگر آپ مصروف ہی اتنی رہتی ہیں کہ موقع ہی نہیں ملتا۔"

"اچھا...... چلیں! آج تو بات ہو جائے گی اور جہاں تک مصروفیت کی بات ہے تو سچ پوچھیے! آج کل بہت اچھے لکھنے والے رہے بھی نہیں ہیں۔ اور اب سارا کام کمرشل ہو رہا ہے۔ بھاگ دوڑ لگی ہوئی ہے۔ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ دو دن میں سیریل بنا کر پیسے کمالوں جس کی وجہ سے کوالٹی بہت کم ملتی ہے اور بہت عرصے کے بعد ایک اچھا اسکرپٹ ملا ہے۔ ورنہ سیریلز تو بہت کیے ہیں میں نے۔ لیکن وہ کوئی خاص نہیں تھے۔ اگر اپنے جاننے والوں میں بھی کوئی پوچھتا ہے سیریلز کے بارے میں تو میں کہتی ہوں کہ کیا بتاؤں، بے کار سی کہانی ہے۔"

"تو کیا مجبوری میں کام کرتی ہیں آپ؟"

"میرا مسئلہ کچھ یوں ہے کہ کچھ سچویشن ایسی ہے کہ کام کرنا پڑ رہا ہے اور اس عمر میں آکر آپ پروفیشن چینج بھی نہیں کر سکتے۔ کچھ تعلقات کا لحاظ تو کرنا پڑتا ہے۔ مگر کام سو فیصد اچھا نہیں ہو رہا۔ دل چاہتا ہے کہ اچھا اسکرپٹ ہو۔ اچھی کہانی ہو۔ تاکہ لوگ بیٹھ کر دیکھیں انجوائے کریں۔"

"آج کل جو آپ کا ڈراما چل رہا ہے اور اس میں لڑکی کا جو کردار دکھایا گیا ہے کیا وہ صحیح ہے؟"

"جی! بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ میری نند جو امریکا میں رہتی ہیں۔ انہوں نے بھی بتایا کہ یہاں لوگ بہت شوق سے دیکھتے ہیں اور جہاں تک لڑکی کی بات ہے تو میرے پوائنٹ آف ویو سے بھی "کرن" (کردار) غلط ہے اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنانے والی لڑکی دکھائی گئی ہے اور جس طرح وہ طلاق پر اڑ گئی تھی اور ساس سسر منانے بھی آتے ہیں اور بجائے یہ کہ لہجے میں نرمی دکھاتی۔ وہ سسر کے سامنے زبان چلاتی ہے تو یہ بہت غلط دکھایا گیا ہے۔"

"جھگڑے ہر گھر میں ہوتے ہیں۔ گھر میں باپ، بھائی بھی تو ڈانٹ لیتے ہیں، خود سری پہ تھپڑ بھی مار دیتے ہیں تو کیا لڑکیاں، بیٹیاں گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہیں؟"

"آپ کا پوائنٹ بالکل ٹھیک ہے اور اس پوائنٹ کو بھی اٹھانا چاہیے تھا اصل میں ہمارا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ پورا اسکرپٹ ہمارے پاس ہوتا نہیں ہے۔ اب نیا سسٹم یہ شروع کیا ہے کہ جو ہمارا کردار ہوتا ہے، وہ ہمیں بھیج دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ابھی تو سیریل لکھا جا رہا ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ ہمارے سامنے پوری کہانی نہیں آتی۔ اب دیکھ کر سمجھ میں آ رہا ہے کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ تو جب ہم کرن کی خود سری دیکھتے تھے تو ہم سب یہی کہتے تھے کہ دس از ٹو مچ۔ اتنا زیادہ نہیں دکھانا چاہیے۔ کیونکہ اس سے آج کل کی بچیاں جو زیادہ ہی اسٹرونگ بنتی ہیں۔ ان کو شہہ ملتی ہے۔"

"کمپرومائز کرنا پڑتا ہے۔ لڑکیوں کے گھر آسانی سے نہیں بنتے۔"

"دیکھیں جی! ہر رشتے میں کمپرومائز کرنا پڑتا ہے اور میاں بیوی کے رشتے میں تو بہت زیادہ۔ پھر جب وہ سسر سے کہتی ہے کہ میں آپ سے ناراض ہوں کہ آپ کی وجہ سے یہ ہوا تو وہ بھی تو سچ تھا۔ اس طرح سے تھوڑی بات کی جاتی ہے۔ وہ ان کی پرائیویٹ لائف تھی۔ انہوں نے جیسی بھی گزاری۔ اب آپ ان کی لائف کو لے کر ان کے بیٹے کو بلیم (Blame) کر رہی ہیں تو یہ بہت غلط تھا۔"

"خیر..... آپ اتنی نرم گو ہیں۔ اتنی شفیق ماں کا رول کرتی ہیں کہ رشک آتا ہے۔ آپ اصل زندگی میں بھی ایسی ہی ہیں کیا؟"

"اصل زندگی میں بھی ایسی ہی ہوں۔ جیسی آپ مجھے "کنکر" میں دیکھ رہی ہیں۔ غصہ بھی آتا ہے۔ بچوں کی غلطیوں پر اور ان پر پیار بھی آتا ہے۔ تو میرا بھی درمیان والا انداز ہے۔ طبیعت میں بہت زیادہ سختی ہے اور نہ ہی بہت زیادہ نرمی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میانہ روی بہت ضروری ہے اور میں آپ کو بتاؤں کہ میں اپنی سسرال میں تقریباً" چونتیس سال سے ایک ساتھ رہ رہی ہوں۔ درمیان میں ایسے وقت آتے ہیں۔ خصوصاً" ینگ ایج کہ جی! الگ گھر ہو اپنی ایک پرائیویٹ یا الگ زندگی ہو۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جب آپ تھوڑا سا کہیں کچھ دیتے ہیں تو اس کا آگے چل کر آپ کو ریوارڈ ملتا ہے اور میرا یہ بھی خیال ہے کہ بچوں کے لیے بہت ضروری ہے جوائنٹ فیملی۔ کیونکہ بچوں کو بزرگوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا ہے اور ایک اچھا سیکولر ماحول بھی ملتا ہے۔ تربیت بھی بہترین ہوتی ہے۔"

"آپ نے بھی تیز طراریاں اور ساس کا رول نہیں کیا یا شاید میری نظر سے نہیں گزرا؟"

"ایسا نہیں ہے۔ بلکہ جب میں نے کام شروع کیا تھا تو میرا پہلا کردار ہی ایسا تھا۔ اس میں، میں ایک بہت بڑے بزنس مین کی بیگم دکھائی گئی تھی اور "وینزہ احمد" نے میری بیٹی کا رول کیا تھا اور مجھے بہت ہی کینہ پرور اور سخت مزاج کی خاتون دکھایا گیا تھا۔ جو شوہر کے انتقال کے بعد دیور دیورانی کو گھر سے نکال کر پوری جائیداد پر قبضہ کر لیتی ہے تو پہلا رول ہی نگیٹو تھا میرا اور سخت مزاج ماں کے رول بھی کیے ہیں۔ مگر کم..... لیکن ہمارے ڈائریکٹر اور پروڈیوسرز کہتے ہیں کہ آپا! آپ پر سافٹ کردار زیادہ سوٹ کرتے ہیں۔"

"آپ کا اپنا دل کیا چاہتا ہے؟"

"میرا دل تو دونوں طرح کے رول کرنے کو چاہتا ہے آرٹسٹ کی تو یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ ہر طرح کے رول کرے۔ کیونکہ جو آپ ہیں اسی طرح کے رول کریں گے تو پھر وہ اداکاری تو نہ ہوئی۔ لیکن ایسے نگیٹو رول جس سے میری شخصیت damage (تباہ) ہو۔ میں نہیں کرتی۔ جیسے ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ایک بڑا اچھا سیریل ہے اور اس میں آپ کا نگیٹو کردار ہے۔ پھر پوچھنے لگے کہ آپ سلیولیس پہن لیں گی اور سگریٹ پیتے ہوئے دکھائیں تو آپ کر لیں گی؟ تو میں نے کہا کہ نہیں! ایس اس قسم کے نگیٹو رول نہیں کروں گی..... کیونکہ میں آپ کو بتاؤں کہ میری فیملی نے مجھے بڑی مشکل سے اس فیلڈ میں آنے کی اجازت دی ہے۔ خاص طور پر میرے والد مرحوم اور میرے بھائی ذرا پرانے خیالات کے تھے سسرال والے ان کے برعکس تھے۔ یہ روک ٹوک والے نہیں تھے۔ میرے والد اور بھائیوں کو میرا ٹی وی پہ آنا ہی پسند نہیں تھا تو بھلا اس قسم کے رولز کی اجازت کیسے مل سکتی تھی اور ویسے بھی میری شخصیت میں تھوڑی سی جھجک ہے۔ مثلاً" اکثر مجھے ایسے رولز بھی آفر ہوئے ہیں کہ "نائیکہ" کا کردار..... تو میں انکار کر دیتی ہوں۔ کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ میں اس طرح کے کردار نہیں کر سکتی۔"

"مگر آرٹسٹ تو وہی ہے، جو ہر طرح کے رول کرے؟"

"بے شک..... لیکن بعض چیزیں ہم کر سکتے ہیں لیکن ہم نہیں کرنا چاہتے کہ ہماری اپنی شخصیت بھی آڑے آتی ہے اور ہماری فیملی بھی آڑے آتی ہے۔"

"یہ بتائیں کہ آپ کب سے ہیں اس فیلڈ میں اور کیسے آئیں؟"

"میں ایک "این جی اوز" کے لیے کام کرتی تھی بحیثیت والنٹیر کے۔ ہمیں فنڈ ریزنگ کے لیے اسٹیج پلے کرنے تھے۔ چونکہ اسکول، کالج کے زمانے میں غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھی تو مجھے بھی شوق ہوا اور میں نے پرفارم کیا۔ تو وہاں پلے دیکھنے والوں میں ایور ریڈی سے بھی ایک خاتون آئی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اپنے ایک سیریل کے لیے۔ اسی میں ہم نے بحیثیت مہمان آرٹسٹ کے مرینہ خان کو بلایا تھا۔ چند دن گزرنے کے بعد مرینہ خان نے کہا کہ میں ایک سیریل بنا رہی ہوں اور میں چاہوں گی کہ آپ بھی اس میں کام کریں تو میرا پہلا سیریل "امید سحر" کے نام سے تھا اور اس میں بھی میں نے ماں کا رول کیا تھا۔ اگرچہ وہ سیریل زیادہ کامیاب نہیں ہوا تھا۔ لیکن میں اچھی خاصی متعارف ہو گئی تھی اور یہ بات ہے 1991ء کی تو بس پھر آہستہ آہستہ آفرز آتی گئیں..... لیکن چونکہ اس وقت بچے چھوٹے تھے اور گھر کی ذمہ داریاں بھی زیادہ تھیں تو میں کبھی کبھار کوئی سیریل کر لیا کرتی تھی۔ چونکہ اس زمانے میں ٹیلی فلم کا رواج زیادہ تھا، تو وہ کر لیا کرتی تھی۔ کیونکہ وہ دو یا تین دن میں کام مکمل ہو جایا کرتا تھا اور اب جبکہ بچے ماشاءاللہ بڑے ہو گئے ہیں تو بھرپور طریقے سے کرتی ہوں۔"

"کیا کشش ہے اس فیلڈ میں؟"

"اس فیلڈ میں سب سے بڑی کشش تو شہرت کی ہوتی ہے۔ جب لوگ آپ کو پہچان رہے ہوتے ہیں آپ کی تعریف کر رہے ہوتے ہیں تو آپ کو اندر سے خوشی مل رہی ہوتی ہے اور شوق تو مجھے بچپن سے ہی تھا پھر جب آفر آئی تو یہ شوق بھی ہوا کہ جن فنکاروں کو ہم اسکرین پہ دیکھتے ہیں ہمیں ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔"

"آپ نے 1995ء میں ٹی وی جوائن کیا۔ پرائیویٹ چینلز کی بھرمار 2000ء کے بعد زیادہ ہوئی۔ اس وقت اور اس وقت کے ماحول اور کام میں کیا فرق محسوس کرتی ہیں؟"

"بہت فرق ہو گیا ہے۔ ماحول بالکل بدل گیا ہے۔ کام کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔ اب معیار کے لیے کوئی رکتا ہی نہیں ہے۔ کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اب تو چاہتے ہیں کہ دو دن میں سیریل تیار ہو جائے۔ اب تو فنکاروں کے لیے بھی سوچ بچار نہیں کی جاتی کہ کس کو لینا ہے، کس کو نہیں لینا ہے..... اب تو سب کچھ چلتا ہے۔"

"ماحول آزاد ہو گیا ہے۔ موضوعات بولڈ ہو گئے ہیں۔ بحیثیت سینئر آرٹسٹ کے آپ ڈائریکٹرز اور رائٹرز سے بات کرتی ہیں کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے؟"

"بولڈ ٹاپک دکھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر کوئی مقصد نکل رہا ہے تو..... مجھے یاد ہے کہ جب "امراؤ جان ادا" ٹی وی کے لیے کیا تھا تو پروگرام "پچاس منٹ" میں یہ بحث چلی تھی کہ ایسے موضوعات ٹی وی پہ دکھانے چاہئیں یا نہیں تو اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ بات آئی تھی کہ ٹاپک بولڈ ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بشرطیکہ اسے صحیح انداز میں پیش کیا جائے۔ عصمت چغتائی اور منٹو صاحب کے ڈراموں پہ آج تک اعتراض ہوتا ہے تو بولڈ چیزیں تو انہوں نے بھی لکھیں۔ انداز ذرا مختلف تھا۔ مگر اب پیغام کم ہوتا ہے اور تفصیل زیادہ ہوتی ہے۔ جس کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے اور جب میں بات کرتی ہوں تو کہتے ہیں۔ ارے آپا! دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ اب عجیب سا ماحول ہو گیا ہے۔ کوئی کسی کی نہیں سنتا نہیں۔"

"سوپ کا بھی بہت رجحان ہے یہ ہونے چاہئیں کیا؟



اور ترکش ڈراموں کے بارے میں کیا رائے ہے؟"

"سوپ تو مجھے بہت ہی بے کار لگتے ہیں اور مجھے کوئی آفر آتی ہے تو میں منع کر دیتی ہوں۔ "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" بھی میں نے ہمایوں سعید کے کہنے پر کر لیا ورنہ میں کبھی نہ کرتی۔ کیونکہ کہانی کو خواہ مخواہ کھینچا جاتا ہے۔ ترکش ڈراموں میں ایک پوائنٹ ہے کہ اگر لڑکی سو کر اٹھی تو وہ بالکل میک اپ کے بغیر ہو گی۔ کالج جاتی ہے تو انتہائی سادگی میں جبکہ ہمارے یہاں ڈراموں میں لڑکیاں سر سے پیر تک بنی سنوری اور میک اپ میں لدی پھندی ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہم انڈین ڈراموں کو فالو کرتے ہیں۔ ہمارے یہاں سوپ اس لیے ناکام ہوتے ہیں کہ ایک تو آرٹسٹوں کی کمی ہے۔ پھر اچھا پے بھی نہیں کرتے۔"

"ترکش ڈراموں کی ضرورت ہے ہمیں کیا؟ جبکہ ہمارے یہاں خود اتنے اچھے ڈرامے بن رہے ہیں؟"

"ضرورت بالکل نہیں ہے مگر چینلز کو فائدہ ہے کہ انہیں یہ ڈرامے سستے مل جاتے ہیں۔ مثلاً"

اپنے سیریل کو بنانے میں آٹھ سے دس لاکھ لگ جاتے ہیں جبکہ ترکش ڈرامے دو تین لاکھ میں آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس پر پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز نے اعتراض بھی کیا تھا مگر آج کل پیسوں کی ہوس اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ کوئی کسی کی سنتا ہی نہیں ہے۔"

"آج کل ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا بھی بہت رجحان ہو گیا ہے۔ کام کے معاملے میں نہیں بلکہ شوبازی کے حوالے سے بات کر رہی ہوں؟"

"یہ صرف آپ کو ٹی وی پہ ہی نظر نہیں آئے گا بلکہ ہمارے پورے معاشرے میں شو آف کرنے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ مثلاً "خواتین میں یہ رجحان بہت ہے کہ جو آپ نے پہنا ہوا ہے، میرا ڈریس اس سے بہت مختلف ہونا چاہیے۔ ہم جب جوان تھے تو مجھے یاد ہے کہ زندگی بہت پرسکون تھی۔ کوئی مقابلے بازی نہیں تھی۔ ہمارے اسکول میں ہر طبقے کی لڑکیاں ہوتی تھیں اور ہم نے کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ میری دوست بڑی گاڑی میں آتی ہے تو میں بھی بڑی گاڑی میں آؤں۔ اب تو پورے ماحول میں مقابلے بازی شروع ہو گئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک خاتون نے مجھے کہا کہ یہ ڈریس جو تم نے پہنا ہے، میں تیسری بار دیکھ رہی ہوں۔۔۔ مجھے بڑی ہنسی آئی اور میں نے کہا کہ ابھی تو تم دس بار اور دیکھو گی کیونکہ میں نے یہ اپنے شوق سے بنوایا ہے اب میں اسے صرف اس لیے نہ پہنوں کہ تم دوبارہ دیکھ چکی ہو تو ایسا تو نہیں ہو گا۔"

"اس فیلڈ میں بہت لڑکیاں آنا چاہتی ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ فیلڈ لڑکیوں کے لیے اچھی ہے؟"

"میں جب اس فیلڈ میں آئی تھی تو میری عمر پینتیس سال تھی اور میری سچویشن بالکل مختلف تھی۔ بڑا بول نہیں بولتی اور اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ مجھے نہ تو کبھی سفارش کی ضرورت پڑی نہ کسی کو کہنا پڑا۔ پہلے پروجیکٹ سے لے کر آج تک مجھے خود ہی آفرز آتی گئیں لیکن اپنے اردگرد میں اب جو ماحول دیکھتی ہوں، اس میں نئی بچیوں کے لیے مشکلات ہیں۔ ان میں سفارشیں بھی چلتی ہیں اور ہم جو کبھی اس فیلڈ کے بارے میں باتیں سنتے تھے اور جن پر مجھے یقین بھی نہیں تھا کیونکہ اس وقت ایسا کچھ نہیں تھا، ہو گا بھی تو کم۔ مگر اب یہ چیزیں پہلے کی بہ نسبت زیادہ ہیں۔ سولہ سترہ سال کی لڑکیاں آجاتی ہیں اور پھر ظاہر ہے کہ لوگ انہیں مس یوز بھی کرتے ہیں۔ صرف آگے بڑھنے اور بڑے رولز لینے کے چکر میں بہت کچھ ہو رہا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اچھی فیملیز کی لڑکیاں بھی آرہی ہیں جو بڑے طریقے سلیقے سے اور اپنے آپ کو سنبھال کر چلتی ہیں۔"

"فیلڈ کے بارے میں تو کافی باتیں ہو گئیں۔ اب آپ اپنے فیملی بیک گراؤنڈ کے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"میں پنجاب کے ایک چھوٹے سے شہر شیخوپورہ میں 21 جنوری 1960ء کو پیدا ہوئی۔ میرے والد گورنمنٹ سروس میں تھے ریڈیو پاکستان لاہور میں اور میری پھپھو شیخوپورہ میں اور چونکہ میں اپنے خاندان کی پہلی خوشی تھی تو پھپھو نے شوق میں میری والدہ کو اپنے گھر بلا لیا تھا تو اس طرح میں وہاں پیدا ہوئی اور چونکہ والد گورنمنٹ سروس میں تھے تو ہر شہر میں کچھ کچھ عرصہ رہے تو میں نے ہر شہر کا مزہ چکھا ہے اس لیے میں اپنے آپ کو پاکستانی کہنے میں اور بھی زیادہ فخر محسوس کرتی ہوں۔ پھر 1969ء میں میرے والد بی بی سی لندن چلے گئے تو ہم تین سال لندن میں رہے۔ واپس پاکستان آئے تو پھر تین سال کے بعد ابا کا کنٹریکٹ ہو گیا بی بی سی لندن میں۔ پھر دوبارہ چلے گئے تو اس طرح میری زندگی کے تقریباً" سات آٹھ سال لندن میں گزرے۔ میرے والد کا نام حسن ذکی کاظمی اور امی اگرچہ ہاؤس وائف ہیں لیکن ساتھ ساتھ ٹیچنگ بھی کرتی رہیں۔ میری تعلیم ذرا ڈسٹرب رہی ابا کی پوسٹنگ کی وجہ سے۔ کراچی سے میں نے 1975ء میں میٹرک کیا اور پھر لندن سے اولیولز کیا اور لندن کے برکلیز بینک میں کچھ عرصہ جاب بھی کی۔ میں والدین کی اکلوتی بیٹی ہوں اور بھائی میرے ماشاء اللہ دو ہیں اور جب میں انیس سال کی تھی تو میری شادی ہو گئی تھی۔"

"شادی کب ہوئی؟ پسند اور بچے؟ اور میاں صاحب کیا کرتے ہیں؟"

"میری شادی 1979ء میں ہوئی۔ ارینج میرج تھی۔ ماشاء اللہ دو بچے ہیں۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔۔۔ بیٹا لندن میں ہوتا ہے وہاں جاب کر رہا ہے اور بیٹی یہاں۔۔۔ اس کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ میرے میاں پی آئی اے میں پائلٹ ہیں۔"

"پی آئی اے کا تو بڑا برا حال ہے؟"

"ہاں پی آئی اے کا برا حال ہے لیکن اس سے پہلے وہ ہمارا حال برا کر گئے۔ انہوں نے بیس سال پہلے دوسری شادی کر لی تھی اور ہمیں چھوڑ کر چلے گئے اور دوسری شادی کے دو تین سال بعد طلاق بھی دے دی لیکن میرے سسرال والوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا اور آج تک میں اپنے سسرال میں ہی رہ رہی ہوں۔ میرے ساس سسر کا تو انتقال ہو گیا تھا۔ میری خالہ ساس اور میرے جیٹھ جیٹھانی نے میرے میاں کو بہت سمجھایا لیکن جب وہ نہیں مانے تو ان تینوں نے کہا کہ ہم اسے بیاہ کر لائے تھے، یہ ہماری بہو ہے اور بچے ہیں یہ اسی گھر میں رہے گی۔ اب تمہارا جو دل چاہتا ہے تم کرو۔"

"بڑی حیرت کی بات ہے ورنہ میاں بدلا یا خدانخواستہ دنیا سے گیا تو سسرال والے فوراً" بدل جاتے ہیں؟"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور جب میں کسی کو بتاتی ہوں تو سب بہت حیران ہوتے ہیں۔ انہوں نے کبھی مجھے کچھ نہیں کہا۔ اکثر مجھے شوٹنگ سے واپس آتے ہوئے رات کے دو تین بج جاتے ہیں لیکن کبھی مجھ سے ان لوگوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم کدھر سے آرہی ہو، کہاں گئی تھیں۔ بہت اچھے ہیں سب میرے ساتھ اگرچہ ہم سب ساتھ ساتھ ہیں لیکن پورشن الگ ہیں۔ بیٹی کی شادی کر کے میں نے بیٹی داماد کو اپنے ساتھ ہی رکھ لیا ہے تاکہ مجھے اکیلا پن محسوس نہ ہو۔ گھر داماد والی کوئی بات نہیں ہے۔ اپنا کماتے ہیں۔ میری بیٹی کے بھی دو بچے ہیں ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔۔۔ میرا اپنا بیٹا جب اٹھارہ انیس سال کا تھا تو امریکہ پڑھنے چلا گیا اور اب ماشاء اللہ لندن میں جاب کر رہا ہے۔ مجھے بہت کہتا ہے آنے کے لیے مگر اب ٹریولنگ مجھے مشکل لگتی ہے۔ بھائی بھی وہاں ہیں تو ان کا آنا جانا لگا رہتا ہے تو ملاقات بھی ہو جاتی ہے۔"

"چھٹی کا دن کیسا گزرتا ہے؟"

"چھٹی کا دن چاہتا ہے کہ بہت آرام کروں مگر دو چھوٹے بچے نواسا اور نواسی مجھے سونے نہیں دیتے۔ صبح چھ سات بجے سے ان کا شور شرابا شروع ہو جاتا ہے۔ تو بس انہی میں مصروف رہتی ہوں پھر گھر کے کام کاج بھی بہت ہوتے ہیں چھٹی کے دن۔ اگرچہ ملازم ہیں۔"

"بیٹی بھی ہے اس فیلڈ میں؟"

"میری بیٹی نے "انڈس ویلی" سے گریجویشن کیا پھر ٹی وی ون جوائن کیا پروڈکشن اور ڈائریکشن کے شعبے میں کام کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد مصالحہ چینل جوائن کیا۔ پھر اسے آر وائی گئی۔ وہیں اسے اپنے میاں صاحب ملے یعنی دونوں کی ملاقات ہوئی۔ میری بیٹی رباب نے مجھ سے ذکر کیا اور پھر سسرال والوں سے مشورہ کر کے بیٹی کی شادی کر دی۔ بیٹی نے کیمرہ کے پیچھے رہ کر کام کیا میری نواسی جب پیدا ہوئی تو تین ماہ کے بعد رباب دوبارہ ٹی وی جوائن کرنا چاہ رہی تھی مگر میں نے منع کر دیا۔"

"کمرشلز بھی آپ کے دیکھے ہیں اور کمرشلز میں آپ کی آواز بھی سنی ہے۔ یہ بھی تو ایک اضافی کام ہے؟"

"جی بالکل کافی کمرشلز کیے ہیں اور اکثر کمرشلز میں میری آواز بھی ہے۔ تو جب آئے ہیں اس فیلڈ میں تو کام تو کرنا ہی ہے۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے عصمت زیدی صاحبہ سے اجازت چاہی اور حقیقت میں ہمیں ان کے ساتھ باتیں کر کے بہت اچھا لگا۔



نادیہ خاتون



خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

عابدہ غوری... کوٹ چٹھہ

مابدولت مس سے مسز کے عہدے پر فائز ہو چکے ہیں۔ (ڈھیروں دعائیں) خواتین کو بھول سکتے ہیں؟ نا جی... ایک ہی بار ہمارے شوہر نامدار نے دو تین ماہ کے رسالے لا دیے اور ہم نے شکریہ کے ساتھ قبول کیے۔ (اللہ نظر بد سے بچائے۔ آمین)

ج - پیاری عابدہ! نئی زندگی کے آغاز پر مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر نامدار کا یہ جوش و خروش ہمیشہ برقرار رکھے اور وہ آپ کو باقاعدگی سے اپنی محبت کے ساتھ ساتھ رسالے بھی پیش کرتے رہیں۔

غزالہ کنول... گوجرانوالہ

مجھے آج قلم اٹھانے پر آسیہ رزاقی جی نے مجبور کیا ہے۔ آسیہ جی بلاشبہ ڈائجسٹ کی دنیا کا ایک بڑا نام ہیں۔ ان کی روایتوں سے گندھی تحریریں ہمیشہ اٹریکٹ کرتی ہیں۔ مگر آج آسیہ جی سے ایک شکایت ہے۔ بڑے ادب سے شکوہ کرتی ہوں کہ آپ نے اپنے ناولٹ "کس کے گھر پر" میں لکھا گوجرانوالہ کے بارے میں "چھوٹے شہر کی رہائشی لڑکیاں بڑے شہر میں آکر دیدہ ہوائی ہو جاتی ہیں۔" اب یہ لائن تو ایک ہے۔ مگر اس کے حوالے سے شکوے بے شمار ہیں۔ سب سے پہلے تو گوجرانوالہ کے لیے لفظ چھوٹے شہر اور یہاں کی لڑکیوں کے لیے "لفظ دیدہ ہوائی" سب سے پہلی بات ہمارا پیارا شہر گوجرانوالہ چھوٹا شہر ہرگز نہیں اور اگر ہو بھی تو یہاں کی لڑکیاں بلکہ پاکستان کے کسی بھی چھوٹے شہر، قصبوں اور دیہاتوں کی لڑکیوں کے لیے لفظ دیدہ ہوائی بہرحال کسی صورت بہتر نہیں۔ یہ چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کی لڑکیاں نہ صرف قناعت پسند ہیں، بلکہ محنتی اور سادہ بھی ہیں۔ یہ ہماری روایتیں ہیں جو ہمیں کینیڈا جیسے ملک میں بھی ہمارے اصل سے جوڑے رکھتی ہیں۔ اب ذرا میں بتاؤں کہ گوجرانوالہ پنجاب کا پانچواں بڑا شہر اور پاکستان کا ساتواں بڑا صنعتی شہر ہے۔ یہاں کا گھنٹہ گھر بہت مشہور ہے اور یہاں چھ تاریخی دروازے بھی ہیں۔ گرجاکھی دروازہ، ایمن آبادی دروازہ، کھیالی دروازہ، سیالکوٹی دروازہ، ٹھاکر سنگھ گیٹ اور لاہوری دروازہ۔ ماشاء اللہ یہاں بہت سے سرکاری اور پرائیویٹ تعلیمی ادارے ہیں۔ یہاں لڑکیوں کے تین بڑے گورنمنٹ کالج ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں بہت بڑی گفٹ یونیورسٹی بھی ہے اور تو اور پنجاب یونیورسٹی کا ایک بہت بڑا پنجاب کیمپس بھی کافی سال ہوئے یہاں قائم ہو چکا ہے۔ یہاں کا پنجاب سائنس کالج بھی اپنی مثال آپ ہے۔ یہ شہر بے شک چڑوں اور کھانے پینے کے لیے مشہور ہے۔ مگر اب نوجوان نسل تیزی سے تعلیم یافتہ ہو رہی ہے اور گوجرانوالہ ایک بڑا صنعتی شہر تو ہے، ساتھ ساتھ پورا گوجرانوالہ ڈویژن بھی ہے۔ اس میں سیالکوٹ، وزیر آباد، حافظ آباد، لالہ موسیٰ، کاموکی، گجرات، سرائے عالمگیر سے لے کر منڈی بہاؤالدین تک شامل ہیں۔ رہی بات بڑے بڑے ملکوں اور بڑے بڑے شہروں کی تو...

تو قد و قامت سے شخصیت کا اندازہ نہ کر
جتنے اونچے پیڑ تھے، اتنا گھنا سایہ نہ تھا

ج - پیاری غزالہ! ہمیں حیرت ہے کہ آپ نے یہ مطلب کیسے لیا کہ یہ آسیہ جی نے لکھا ہے۔ ناول، افسانوں میں جو کردار تخلیق کیے جاتے ہیں۔ ان کی ذہنی سطح، ان کی سوچ اور نفسیات کو مدنظر رکھ کر ان کے جملے لکھے جاتے ہیں۔ یہ سوچ آسیہ رزاقی کی نہیں بلکہ اس ناولٹ کی "آپا" کی سوچ تھی جو کینیڈا میں رہائش کے باوجود اپنی روایتوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ آپ نے پورا جملہ نہیں پڑھا۔ "کیونکہ آپا کے خیال میں چھوٹے شہر کی رہائشی لڑکیاں بڑے شہر میں آکر دیدہ ہوائی ہو جاتی ہیں۔" ناول اور افسانوں میں ہر طرح کے اچھے برے کردار ہوتے ہیں اگر کوئی مصنف ان کرداروں کی تخلیق کرتا ہے تو وہ اپنے خیالات کی نہیں ان کے کردار کی ترجمانی کرتا ہے۔ بہرحال اچھی بات یہ ہے کہ آپ نے اپنے شہر کے بارے میں لکھا اور ہمیں اور ہمارے قارئین کو گوجرانوالہ کے بارے میں بہت سی باتوں کی آگاہی ہوئی۔

ثمینہ اکرم... لیاری کراچی

سرورق کلر فل اور عید نمبر سے ہم آہنگ تھا۔ "کرن کرن روشنی" میں عیدالاضحی کے مسائل کی معلومات ملی۔ "سعید کے رنگ" پیاری رائٹرز سے کیا گیا سروے بہت دلچسپ لگا۔ سب کے جوابات پسند آئے۔ مگر خاص طور پر سائرہ رضا اور سمیرا حمید کے جوابات اچھے لگے۔ کسی بناوٹ اور تصنع سے پاک... صاف اور سچے جوابات۔ اس ماہ نیا سلسلہ وار ناول شروع کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے تو اس ناول کا نام (بن مانگی دعا) مجھے متاثر کر گیا۔ پھر اس ناول کے ہیرو کا نام معیز... (11 نومبر کو معیز اکرم کا یوم شہادت ہے۔) ایسی پرفیکٹ اور مکمل فیملی کی کہانی جس میں زندگی سے بھرپور کردار سانس لے رہے ہیں۔ مجھے یہ ناول ابتدا میں ہی دلچسپ اور پاور فل لگا۔ قانتہ رابعہ کا افسانہ "چھوٹی سی خواہش" بہت اچھا لگا۔ ایسے بامقصد افسانے لکھنا قانتہ رابعہ کے قلم کا خاص جوہر و ہنر ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے جو اپنی پوری کمائی ڈیپ فریزر کی نذر کر دیتے ہیں۔ دوسرا افسانہ رضا کی گڑیا ریما سید کا بہترین لگا۔ انشاء جی کی گیت میری پسندیدہ ہے۔ نیو نور کی آواز میں اس کا حسن اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ "کوہ گراں تھے ہم" عنیزہ سید کی کہانی میں ابھی تک کسی بھی راز سے پردہ نہیں اٹھایا گیا۔ سعد کی بچھڑی ماں بھین جی ہیں اور رضوان الحق سارہ کی تلاش میں ہے۔ جبکہ کھاری اور سعدیہ کے مابین معاملے کی کچھ سمجھ نہیں آئی۔ یہ ایک مشکل ترین ناول ہے عنیزہ جی... شاہ زیب خان زادہ کا انٹرویو پڑھنے کی ایک عرصے سے دلی خواہش تھی جو شاہین رشید نے آج پوری کر دی۔ ناولٹ "ماہ تمام" مجھے پہلی ہی قسط سے کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ جبکہ فائزہ (میری اسٹوڈنٹ) ماہ تمام کی دیوانی ہے اور صرف اس ایک ناولٹ کے لیے خواتین ڈائجسٹ ہر ماہ خریدتی ہے۔ دراصل مجھے گھریلو سیاست کچھ خاص پسند نہیں آتی۔ عدنان بھائی کی "نفسیاتی الجھنیں" ہر ماہ شوق سے پڑھتی ہوں۔ اب بات کرتے ہیں ہاٹ فیورٹ ناول "زمین کے آنسو" کی۔ اس ناول میں قارئین بیک وقت دو ناولوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ایک تو ایک فلک شاہ کی کہانی، دوسرے تاریخی واقعات پر مبنی حورعین کی کہانی سے۔

ج - ثمینہ جی! ہمیں احساس ہے کہ قارئین کا سروے نہ دیکھ کر آپ کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ آپ نے محنت سے جواب لکھ کر بھجوائے اور وہ شامل نہ ہو سکے۔ اس کے لیے معذرت۔ دراصل مصنفین سے سروے بھی عیدالاضحی کے حوالے سے تھا۔ اس لیے ہم نے سوچا قارئین سے سروے آئندہ سال شائع کیا جائے۔ آپ کے جوابات محفوظ ہیں۔ ان شاء اللہ آئندہ سال شامل ہوں گے۔ غنوی کا انتخاب بھی شامل ہوگا۔ بشرطیکہ اچھی تحریریں انتخاب کر کے بھجوائیں۔

عائشہ خان... ٹنڈو محمد خان

ٹائٹل خوب صورت لگا۔ سب سے پہلے "زمین کے آنسو" پڑھا۔ ایبک کے ناول نے دل موہ لیا۔ حورعین کا سین اچھا لگتا ہے۔ مائرہ کی اصلیت احسان پر کھل گئی۔ شکر ہے مائرہ جیسے انتقام پسند لوگوں پر اللہ بازی الٹ دیتا ہے۔ عمر کے اس دور میں آکر اپنے شوہر کی نظروں سے گر جانا، مائرہ کے لیے یہ سزا ہی بہت ہے۔ "میری آنکھوں کے خواب" ویل ڈن نعیمہ۔ ناہید اور ثمینہ کی زبان درازی دیکھ کر پہلے ہی غصہ آرہا تھا کہ ظہیر کی شکی طبیعت نے تو میرے خون کو ابال دیا۔ شک بہت خراب چیز ہے۔ رشتوں کو دیمک کی طرح کھا جاتا ہے۔ ناہید اور ثمینہ کی امی اور ابو پر

حیرت ہوئی کہ اتنی سادہ طبیعت کے تھے کہ لڑکیاں جگہ جگہ معرکے سر کرکے آرہی ہیں اور وہ۔ ان کا سیدھا پن ختم نہیں ہو رہا ہے۔

"او سر۔" سچی بات ہے او سر مجھے کچھ خاص سمجھ نہیں آئی۔ سمیرا حمید میری فیورٹ بن چکی ہیں۔ مگر او سر سمجھ نہیں آئی۔

ماہ تمام ایک ماہ کی غیر حاضری کے بعد اچھی قسط تھی۔ تقی کی باتوں پر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ بے سروپا باتیں۔

عید نام ہے۔ نازیہ جمال واہ کیا پیاری تحریر ہے۔ ہوتی ہے کچھ لوگوں میں یہ عادت کہ کنجوسی کو سادگی سمجھتے ہیں۔ میں بہت ہنسی جب اماں کو بیٹی کے کپڑوں میں سے پسینے کی بدبو آئی اور (ہاہاہا) نمک پارے اور میٹھی بوندی تو منہ میں رکھنے کے قابل نہیں۔ البتہ ریوڑیاں اپنے اصل ذائقے میں موجود تھیں۔ (ہاہاہا) اور نند اختر باجی کا سرخ رنگ کے سستے نقلی زیور اور کس کے جوڑا' میرے ذہن میں آگیا اور میں بہت ہنسی۔ مہو بہت پسند آئی۔ بے چاری مہو سے انتقام کیوں لیا؟ کس کے گھر پر آسیہ رزاقی ویل ڈن۔ جنید بھائی کے بھول پن پر ہنسی آئی۔ غم میں بھی گھر والوں کو ڈٹ کے کھاتے پیتے دیکھ کر جنید بھائی حیرت زدہ رہ گئے۔ ہاہاہا۔ ویسے ٹینشن میں مجھے بھی بہت بھوک لگتی ہے۔ "عید کے رنگ سروے" بہت زبردست۔

نمرہ اقراء سے یہ کہنا ہے کہ

ساتھ ساتھ نام پڑھنے کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ اس مرتبہ نام الگ الگ پڑھا تو نوٹس کرلیا۔ شاہ زیب خان زادہ اور موحل شیخ کے انٹرویو پسند آئے۔ ہمارے نام میں نمرہ رحمٰن کا خط پسند آیا۔ ہاتھ پیروں کی رنگت صاف کرنے کا بتایئے گا۔ نفسیاتی الجھنیں' عدنان بھائی کے مشوروں سے مستفید ہوتی ہوں۔

ج - پیاری عائشہ! اتنی تفصیل سے ہر کہانی اور تمام سلسلوں پر تبصرے کا شکریہ۔ آپ بڑی باقاعدگی سے خواتین اور شعاع نہ صرف پڑھتی ہیں' بلکہ ہر ماہ تبصرہ بھی کرتی ہیں اور آپ کے تبصرے بڑے جامع ہوتے ہیں۔ پہلی بار آپ نے سمیرا حمید کی کہانی کے متعلق لکھا کہ آپ کی سمجھ میں نہیں آئی تو ہمیں بہت حیرت ہوئی ہے۔ سادہ سی کہانی تھی جو بہت خوب صورت اور اثر انگیز الفاظ میں لکھی گئی۔ اس میں نہ سمجھ میں آنے والی تو کوئی بات ہی نہیں تھی۔

سحر خان۔۔۔ کوئٹہ

عجب بدلتی خزاں رت ہے۔ اداسی میں لپٹی گویا ہر شے' ہر منظر اداس اداس۔۔۔ سردیاں ہمیشہ سے ہی اداس کردیتی ہیں مجھے نہ جانے کیوں؟ اس لیے ایسے میں خواتین کا نیا شمارہ' دل کو کچھ ڈھارس سی ملتی ہے۔ میں اپنی کچھ پرانی اور بہت اچھا لکھنے والی مصنفات سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔

پیاری مصنفات بار بار ایک ہی بات کہنے سے بات کا اثر ہی ختم نہیں ہوتا' بلکہ الفاظ اپنی حرمت بھی کھودیتے ہیں۔ ہم میں سے کسی قاری بہن کے الفاظ میں وہ تاثیر تو ہوگی جو آپ کو پھر سے لکھنے پہ' ہمارے پرچوں میں واپسی پہ مجبور کردے۔ محترمہ عنیزہ سید صاحبہ ہر دو راستوں پہ بے شمار گلیاں ہیں' کچھ روشن کھلی اور کچھ بند اندھیری اور دیکھیے ہمیں تو کوئی "بابا ہدایت اللہ" ملتا ہے نہ ہی آپ کا کوئی اور کردار۔ ہم کو تو صرف آپ مصنفات کے لکھے الفاظ ہاتھ پکڑے آگے لیے بڑھتے ہیں۔ روشن اور کبھی گلیوں والے راستے پر۔ نگہت عبداللہ صاحبہ آپ نے لکھا تو بہت خوب' مگر "کوئی لمحہ گلاب ہو" اور "دل پھولوں کی بستی" سا رنگ نہیں جما۔ منتظر رہیں گے آپ کے ان ہی کرداروں کے ساتھ ایک نئے ناول کے' نگہت سیما صاحبہ بلاشبہ آپ کی معلومات قابل رشک ہیں۔ صائمہ رضا صاحبہ سے میری درخواست ہے' لکھنے کا سلسلہ موقوف نہ کریں۔ وقفہ بہرحال ایک اچھی اور جامع تحریر کے لیے ضروری ٹھہرا۔ ذہن ایک وسیع جزیرہ اور اس جزیرے پہ چلتے' رقص کرتے' رنگ بھرتے بے شمار کردار اور بہت سی کہانیاں۔ کیا بات ہے۔ کوئی بھی کردار' کہانی نوک قلم پہ آتی ہی نہیں۔ حالانکہ لکھنا میرا بہت پرانا اور بڑا خواب ہے۔ "پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" (میرے اپنے لیے) شمارہ مجموعی طور پہ اچھا تھا اور بلاشبہ زرد اداس شاموں کو گلابی مائل کرنے میں معاون بھی' آخر میں اتنا ضرور کہوں گی کہ کوئٹہ میں رہیں یا ملک کے کسی اور گوشے میں' زمینی فاصلے کراچی والوں سے نہ تو ہمیں غافل کرسکتے ہیں اور نہ دل سے دور' ہر دکھ پر پریشانی اور ہر درد کا مداوا ہوگا اور ان شاء اللہ بہت جلدی ہوگا۔ ہر دعا اور دعا کی قبولیت کی ہر روشن ساعت وطن عزیز اور آپ سب ہی کے نام۔

ج - پیاری سحر! اتنے خوب صورت خط لکھتی ہیں۔ اتنی خوب صورت لکھائی ہے آپ کی۔ کہانیاں لکھنے کا شوق بھی ہے تو پھر انتظار کس بات کا ہے۔ نوک قلم پر کہانی نہیں کہانیاں آئیں گی۔ آپ قلم اٹھائیں تو سہی۔ ہمارے دل

بھی کوئٹہ والوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں۔ اتنا خوب صورت شہر اپنوں کی بے اعتنائی اور دشمنوں کی سازشوں کی نذر ہو رہا ہے۔ کراچی اور کوئٹہ کا کم و بیش ایک ہی حال ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان کے دشمنوں کو اس دھرتی پر نشان عبرت بنائے اور ہمارے ملک کی سالمیت کو برقرار رکھے۔ (آمین)

صدف افتخار۔۔۔ صدر کینٹ

مجھے تو ڈائجسٹ پڑھنے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔ گھر کے کاموں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ لیکن بڑی امی (دادی ساس) اور (امی ساس) دونوں باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ میرے میاں کہتے ہیں کہ آپ دونوں لڑکیوں کی طرح پڑھتی ہیں۔ اس مہینے بڑی امی نے مجھے اور میرے میاں کو باری باری بٹھا کر افسانہ "اوسر" پڑھوایا۔ میاں کو اس لیے کہ تم بھی پڑھو، ہم کیوں پڑھتے ہیں اور مجھے اس لیے کہ کاموں میں لگ کر بھول جاتی ہوں، ٹک کر پڑھ لوں۔

یہ ہفتہ ہمارے گھر "اوسر" ہفتہ رہا۔۔۔ پہلے دونوں امیوں نے خوب تبصرہ کیا۔

کام والی کو بھی امی نے پڑھ کر سنائی۔ بڑی بھابھی بھی پڑھتی ہیں ڈائجسٹ، وہ بھی تبصرے میں آشامل ہوئیں۔ آس پڑوس کی آنٹیاں آتی ہیں شام کو امی کے پاس۔ یقین کیجیے امی نے باقاعدہ انہیں پڑھ کر یہ کہانی سنائی۔ بڑی امی کہتی ہیں میری ایک جاننے والی کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ ہنستی کھیلتی تھی۔ پھر چپ لگ گئی۔ بڑی امی پوچھنا یہ چاہتی ہیں کہ یہ کہانی "اوسر" سچی ہے۔ وہ مجھے یہ کہہ رہی ہیں کہ پوچھوں کہ رائٹر نے ان کی جاننے والی کی کہانی تو نہیں لکھی؟

ج۔ پیاری صدف! "اوسر" کی کہانی تو ہر تیسرے چوتھے گھر کی کہانی ہے۔ ذات، برادری، مرتبہ، حسب نسب، اونچ نیچ، صدیوں سے ہمارے معاشرے میں انسان ان دیواروں کے پیچھے قید ہے۔ اسلام ان سب بتوں کو توڑنے کے لیے ہی آیا تھا۔ لیکن ہمارے معاشرے میں آج بھی ان بتوں کی پوجا کی جاتی ہے۔

کچھ لوگ اپنی افتاد طبع میں شدت رکھتے ہیں۔ وہ ناکامی برداشت نہیں کرپاتے۔ چپ چاپ اپنے اندر مرجاتے ہیں۔ وہ کوئی فرزانہ ہو یا جمیلہ نہ جانے کتنی لڑکیاں ان رسم و رواج کے ہاتھوں ماری جاتی ہیں، اپنی بڑی امی اور چھوٹی امی کو بتادیں کہ یہ کہانی ان کی رشتہ دار کی نہیں، لیکن سچی ضرور ہے۔

عالیہ بتول۔۔۔ حویلی بہادر شاہ

ٹائٹل گرلز اچھی لگ رہی ہیں خواتین ڈائجسٹ کی جتنی تعریف کریں کم ہے۔ اس کے سارے سلسلے ہی بہت پسند ہیں ہمیں۔ نگہت سیما کی کہانی نے بہت خوب صورت موڑ لیا۔ احسان شاہ نے مائرہ کی سچائی اس کی زبان سے سنی جھوٹ ہو یا سچ آخر ایک ہی دن سامنے آہی جاتا ہے۔ عنیزہ سید کے لکھنے کا انداز تو ہے ہی بہترین لیکن کہانی کا نام بھی کافی منفرد سا ہے۔ عفت سحر طاہر کی کہانی فہرست کے لیے دیے گئے پیج میں نہیں شائع ہوئی اور پورے رسالے میں کہیں نہیں تھی۔ سمیرا حمید کی کہانی تو سر سے گزر گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ آمنہ ریاض کی تحریر بھی ٹھیک جارہی ہے۔ قانتہ رابعہ جی۔ بہت خوب، دل خوش ہوگیا۔ نعیمہ ناز کی تحریر اچھی تھی، ناہید کا کردار اچھا لگا، لیکن ذہن میں یہ سوال بھی آیا کہ لکھاریوں کو ان چبھتے عجیب و غریب سوال کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔ ثمینہ نے اپنا گھر خراب کیا، بے جا شک کی بنیاد پر۔

ج۔ پیاری عالیہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شائع نہ ہوسکے۔ جو خط تاخیر سے موصول ہوتے ہیں۔ وہ ہم شامل نہیں کر پاتے۔ آپ جلدی خط بھجوائیں۔ ان شاء اللہ ضرور شامل ہوں گے۔ نعیمہ ناز کے ناول پر آپ کا اعتراض بجا ہے۔ لیکن والدین اپنی سادگی (بلکہ نااہلی کہیں تو زیادہ ٹھیک ہوگا) کی وجہ سے ہی تو بیٹیوں کی تربیت نہ کرسکے۔ ورنہ لڑکیوں کی اتنی زبان درازی پر والدین خصوصاً مائیں دماغ ٹھکانے لگادیتی ہیں۔ بہرحال انجام بخیر تو سب بخیر، دونوں کسی نہ کسی کنارے پر تو پہنچ ہی گئیں اور سمجھوتے کرنا بھی سیکھ لیے۔ جو کام ماں کی تربیت نہ کرسکی، وہ وقت نے سکھادیا۔

عفت سحر کی کہانی آپ کے رسالے میں نہیں تھی۔ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ ایسی صورت میں پرچا اپنے بک اسٹال پر دے کر تبدیل کرالیا جائے۔ اب آپ اپنا ایڈریس بھجوادیں ہم آپ کو پرچا بھجوادیں گے۔

ارم کمال۔۔۔ فیصل آباد

دونوں ماڈلز کے ڈریس اور میچنگ جیولری چار چاند لگا رہی تھی۔ "بن مانگی دعا" عفت سحر طاہر کا نیا ناول پہلی قسط پڑھی۔ رائے محفوظ ہے۔ ماہ تمام اپنی تمام تر خوب صورتیوں اور شوخیوں کے ساتھ بہت زبردست جارہا ہے۔ عنیزہ سید کا "جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم" میں زندگی کے وہ رنگ دکھائی دیتے ہیں جو عام طور پر آنکھ سے اوجھل رہتے ہیں۔ کھاری کی اداسی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ مجھے تو کھاری کر فیوژن کے بغیر اچھا لگتا ہے۔ "زمین کے آنسو" میں شکر ہے احسان شاہ کی آنکھوں پر سے بدگمانی کی موٹی عینک اتر گئی۔ خدارا اریب فاطمہ کے ساتھ کچھ غلط نہ ہونے دیں۔ ورنہ "زمین کے آنسو" کبھی خشک نہیں ہوں گے اور احمد رضا کو بھی ہدایت اور توبہ کا در کھٹکھٹانے دیں۔ "عید کے رنگ سروے" بہت ہی دلچسپ اور کار آمد رہا۔ سب سے زبردست جوابات سائرہ رضا کے تھے۔ ان کے جوابات میں بھی کہانی کا طرز نمایاں تھا۔ سائرہ جی آپ کی تحریر کے تو سب رنگ ہی اچھوتے ہوتے ہیں۔ "ہماری آنکھوں کے خواب" بہت ہی عمدہ اور اے ون تحریر تھی۔ لیکن اینڈ سے اختلاف ہے۔ عموماً "ایسا ہوتا نہیں"، اتنی شدت سے ناہید نے انکار کیا تھا، نہ اب نہ کبھی اور پھر آخر میں مان جانا جب کہ بہن کا رشتہ بھی چھوٹ رہا ہو۔ خود غرضی سی لگتی ہے، "شادی کا کیا تھا" کہیں بھی ہوسکتی تھی۔ دیگر تمام مستقل سلسلے عید کے رنگوں کے سنگ مسکرا رہے تھے۔

ج۔ پیاری ارم! ناہید نے بھی انکار کیا تھا اور ثمینہ نے بھی بٹی ہوئی محبت قبول نہیں کی تھی۔ لیکن وقت سارے کس بل نکال دیتا ہے۔ انسان کو زندگی میں سمجھوتے کرنا ہی پڑتے ہیں۔ ثمینہ بٹا ہوا شوہر قبول کیا اور ناہید نے اپنی نہ کو ہاں میں بدل دیا دراصل ناہید نے شکی شوہر کے ہاتھوں جو اذیت برداشت کی تھی۔ اس کے بعد اس میں کوئی نیا تجربہ کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ دیکھا بھالا طارق ہی بہتر لگا۔ بہن کا رشتہ چھوٹنے والا نہیں۔ وقت بڑے سے بڑے حادثے پر راکھ ڈال دیتا ہے۔ ثمینہ بھی بھول جائے گی۔

مسز یمین اجمل۔ روہڑی ضلع سکھر

آپی میں نے "خاموشی کو بیاں ملے" سروے کے جوابات بھیجے تھے ان کا کیا بنا؟

ستمبر 13ء کے شمارے میں صفحہ نمبر 19 پر "اللہ کی رحمت" کے نام سے جو حدیث شائع کی ہے اس کے فوائد و مسائل نمبر 2 میں لکھا ہے کہ "ایسی دعاؤں کو اہمیت دینا جو نبی صلی اللہ وعلیہ وسلم سے منقول نہیں۔ ایسی چیزوں سے ثواب کے بجائے گناہ کا اندیشہ ہے" اس کا ذرا تفصیل سے بتائیں۔ پلیز قرآن و حدیث کے حوالے سے اسے واضح کریں تاکہ ہمارا ذہن کلیئر ہوسکے۔

سب سے پہلے "زمین کے آنسو" پڑھا۔ حورعین کی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں اور اس کے دکھوں پر ہمیں بھی رونا آتا ہے۔ "میری آنکھوں کے خواب" اچھی تحریر تھی۔ میرے خیال میں تو شکی انسان خود کردار کا ہلکا ہوتا ہے اسی لیے تو دوسروں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟ "کوہ گراں تھے ہم" میں نے اس ناول کو دوسروں کی تعریفیں سن کر پڑھنا شروع کیا۔ اس لیے ابھی آہستہ آہستہ سمجھ رہی ہوں لیکن اتنا جانتی ہوں کہ عنیزہ سید لکھتی سب سے ہٹ کر ہیں۔ عفت سحر طاہر کی یہ تحریر تو بڑی سنجیدہ لگ رہی ہے۔ "کس کے گھر پر" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ افسانوں میں "اوسر" اور "چھوٹی سی خواہش" پڑھ کر کافی دکھ ہوا۔ پتا نہیں کب ہم اپنے رویے بدلیں گے۔ "عید کے رنگ" سروے میں مصنفین کے جوابات پڑھ کر مزہ آیا۔

احادیث میں آپ نے "قربانی کے گوشت کی تقسیم" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

ج۔ پیاری بہن! قربانی کے گوشت کی تقسیم کے بارے میں کوئی پابندی نہیں ہے۔ بہتر تو یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ گوشت غریبوں میں تقسیم کیا جائے تاکہ وہ سال میں ایک بار تو جی بھر کر گوشت کھاسکیں۔ جو درود اور دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود پڑھیں اور صحابہ کرام کو سکھائیں۔ انہیں پڑھنا افضل ہے کیونکہ اس سے سنت پر عمل کرنے کا ثواب بھی ملتا ہے۔ جبکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو نظر انداز کرکے یا اسے چھوڑ کے کوئی بھی کام کیا جائے یا نئی راہ نکالی جائے تو گناہ کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ انسان سے خطا ممکن ہے۔

زہرہ۔ ضلع خوشاب

خواتین کا اور میرا بہت پرانا ساتھ ہے۔ آج میں بائیس سال کی ہوں اور شاید پچھلے پندرہ سالوں سے خواتین کی خاموش قاری ہوں۔

ج۔ خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ نے خط لکھا' خوشی ہوئی لیکن اتنا مختصر خط اچھا نہیں لگا۔ کسی بھی تحریر پر کوئی تبصرہ نہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

زاہدہ ملک۔۔ لاہور

میری تربیت میں اس رسالہ کا بڑا حصہ ہے۔ اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا' بتایا سمجھایا۔ میری تمام بہنوں سے درخواست ہے کہ اپنی بچیوں کو اسے پڑھنے کی اجازت دیں۔

رسالہ کھولتے ہی حدیث نبوی سے روح منور ہوجاتی ہے۔ انٹرویو کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ مگر آپ کی بیاض سے اور میری ڈائری بالکل ایک جیسے سلسلے لگتے ہیں۔ آپ کا باورچی خانہ اور موسم کے پکوان تو لاجواب سلسلے ہیں۔ افسانوں کا معیار پہلے گرتا جارہا تھا مگر اب بہتری نظر آرہی ہے۔ اور آپی پلیز مکمل ناول کو اقساط میں مت دیا کریں۔ عدنان جی کے تو کیا کہنے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذہنوں کی تاریکی کو روشنی کی راہ میں گامزن کرتے نظر آتے ہیں۔ اکثر رائٹر بہنیں اپنی کہانیوں میں قرآن کے لیے لفظ "ختم" استعمال کرتی ہیں اور آپ کو پتا ہے کہ ختم کے معنی کیا ہیں۔ مٹ جانا نہ رہنا یعنی ختم ہوجانا پلیز میری ان سے درخواست ہے کہ قرآن کے لیے مکمل کا لفظ استعمال کریں۔ قرآن پر درس و تدریس کی آیت کا ترجمہ مکمل شروع کے ساتھ بیان کریں۔

ج۔ پیاری زاہدہ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید اور دعائیں مکمل ناول اقساط میں دینا ہمیں بھی اچھا نہیں لگتا لیکن ہماری مجبوری یہ ہے کہ مصنفین طویل تحریریں لکھتی ہیں جو ایک قسط میں شائع نہیں کی جاسکتیں۔ اس لیے انہیں کئی اقساط میں دینا پڑتا ہے۔ آپ کی تجاویز نوٹ کرلی ہیں۔ افسانوں کے لیے معذرت' فی الحال آپ کو بہت محنت کی ضرورت ہے۔

شمسہ کوثر عطاری۔۔۔ نوشاہی ڈوگہ گجرات

دلہنوں سے سجا خوب صورت سرورق والا خواتین ڈائجسٹ دس تاریخ کو ملا حسب معمول پہلے حمد و نعت سے دل کو منور کیا اور پھر روح کو سیراب کرنے پہنچے "کرن کرن روشنی" میں قربانی کے متعلق اور دیگر احادیث' بہت خوب صورت انداز میں پیش کی گئیں بلاشبہ یہ زبردست سلسلہ ہے۔ اشعار سارے ہی بہت اچھے تھے' عید کے حوالے سے مصنفین کا سروے بھی زبردست تھا اور انٹرویوز بھی اچھے لگے۔ "زمین کے آنسو" بہت دلچسپ موڑ پر ہے اب تو یقین ہے اگلی قسط آخری ہی ہوگی کیونکہ چند معاملات ہی سیٹ ہونے والے رہ گئے ہیں۔ ابراہیم کا اچانک ملنا کافی امید دے گیا احمد رضا کو بھی اور ہمیں بھی نگہت صاحبہ کی تاریخ اکثر حیران کرجاتی ہے کہ وہ تاریخ کا کتنا گہرا مطالعہ رکھتی ہیں۔ نگہت صاحبہ آپ کو سلیوٹ کرنے کو دل چاہتا ہے۔ عفت سحر کی نئی تحریر کا آغاز اچھا لگا ویسے ہم تو تایا جیلانی کو سوچ بیٹھے تھے۔ ناولٹ میں اس دفعہ آسیہ رزاقی بازی جیت گئیں' بہت خوب صورت اور دلچسپ انداز تحریر ہے ان کا "ماہ تمام" بھی بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ افسانے تو بہت مزے کے تھے نازیہ جمال تو مجھے بہت پسند ہیں۔ قانتہ رابعہ کی واپسی بہت خوش کن تاثر دے گئی۔ نعیمہ ناز صاحبہ تو بہت منفرد لکھتی ہیں۔ بس خط اچھے نہیں لگے۔ کچھ خاص تبصرہ نہیں کیا گیا تھا۔

ج۔ پیاری ثمینہ! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ کسی بھی سلسلے میں آپ کا نام نہ تھا۔ دراصل بیس تاریخ تک سلسلے تیار ہوجاتے ہیں۔ اس لیے تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط شامل اشاعت نہیں کیے جاسکتے اس ماہ آپ کا خط تاخیر سے موصول ہوا ہے لیکن ہم شامل کررہے ہیں آئندہ آپ بیس تاریخ تک انتخاب بھجوادیں۔

آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- نساء

میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

عِفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

اقتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھیں مگران سے شادی نہ ہو سکی تھی اور سفینہ کو یقین ہے کہ وہ آج بھی ان کے دل میں بستی ہیں۔ صالحہ مرچکی ہیں۔ ابیہا ان کی بیٹی ہے۔ جواری باپ سے بچانے کے لیے صالحہ' ابیہا کو امتیاز احمد کے سپرد کرجاتی ہیں۔ تین برس قبل کے اس واقعے میں ان کا بیٹا معیز ان کا رازدار ہے۔

ابیہا ہاسٹل میں رہتی ہے۔ حنا اس کی روم میٹ ہے اور اچھی لڑکی نہیں ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد' ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب' معیز میں دلچسپی لینے لگتی ہے۔

۲
دوسری قسط

یہ اس کا خدا جانتا تھا یا پھر خود ابیہا کہ وہ کس ذلت کو برداشت کرتی ہاسٹل پہنچی۔ ڈرائیور کی وجہ سے وہ رو بھی نہ سکتی۔

وارڈن سے سامنا نہ ہوا تھا۔ ورنہ وہ ضرور مشکوک ہوجاتی۔



اول تو ابیہا کبھی کہیں گئی ہی نہ تھی۔ ماسوائے کبھی کبھار امتیاز احمد کے ساتھ جانے کے اور آج اگر کسی تقریب میں شرکت کی اجازت لے کر گئی بھی تو آدھے گھنٹے کے اندر اس قدر نڈھال سی واپسی۔۔۔ ابیہا تقریباً" بھاگتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ لاک کرلیا۔ صد شکر کہ حنا گھر گئی ہوئی تھی۔ ورنہ آج ابیہا کی زندگی ان کے سامنے بے نقاب ہو چکی ہوتی۔

اسے رونا آیا۔ اپنی بے بسی "اپنی بے کسی پر۔

اسے امتیاز احمد جیسے کمزور سہارے پر رونا آیا۔۔۔ اور معیز احمد کے سلوک کا دکھ تو حد سے سوا تھا۔

وہ اپنے بستر پر سکڑ سمٹ کر بیٹھی تھی۔ گھٹنوں کے گرد بازو لپیٹے بے حد خوف زدہ انداز میں۔

اسے احساس ہوا کہ وہ بالکل تنہا تھی۔ ایک شرعی رشتے اور مضبوط سہارے کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس دنیا کے ہجوم میں اکائی تھی۔

اس کی ماں نے ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچانے کے لیے اسے ایک شرعی رشتے کے تحت امتیاز احمد کے حوالے کیا تھا۔ مگر جو سلوک اسے یہاں سہنا پڑ رہا تھا' وہ کسی دلدل میں دھنسنے کے مترادف تھا۔

اس کی سیاہ آنکھوں میں چھپی حقارت یاد آئی۔

"وہ کبھی مجھے اس گھر میں قدم نہیں رکھنے دے گا۔ جہاں اس کی ماں رہتی ہے۔" اسے معیز کے لب و لہجے کی نفرت بھری سرد مہری یاد آئی۔ وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

"اور امتیاز احمد کب تک اس رشتے کو ٹوٹنے سے بچاتے رہیں گے اور اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو۔۔۔ میں بے نام و نشان۔۔۔"

اس کے دل کو کسی نے مضبوط شکنجے میں کس لیا۔ تو وہ بے اختیار امتیاز احمد کی صحت اور لمبی عمر کے لیے دعا مانگنے لگی۔



یونیورسٹی کے ہنگاموں میں بھی وہ بے زار سا رہا۔ طبیعت پہ ایک عجیب سی بے کیفی چھائی ہوئی تھی۔

"کیا یار۔۔۔ اتنا بورنگ کیوں ہو رہا ہے؟" عون اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی طبیعت کے رنگ کیوں نہ پہچانتا۔

"ایسے ہی بس۔۔۔ فنکشن کی تیاری میں نیند پوری نہیں ہوئی۔ تھکاوٹ ہے ذرا سی۔"

معیز اس کے ہمراہ پارکنگ میں کھڑی اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"چل اوئے۔۔۔ جھوٹ تو اس سے بول جو تجھے جانتا نہ ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا کس خفیہ حسینہ کا سایہ ہو گیا ہے تیرے دل پر۔۔۔ ایسا لگا ہے کہیں کم بخت کہ اب کہیں اور لگتا ہی نہیں۔" عون نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

معیز کی یک لخت بدلتی شخصیت کا وہ گواہ تھا۔ مگر جو راز معیز احمد اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ اس کی اس نے اپنے عزیز دوست کو بھی ہوا نہ لگنے دی تھی۔

"شٹ اپ۔۔۔" ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس نے عون کو گھورا۔

"بھئی۔۔۔ ہم تو خدا لگتی کہیں گے۔ ڈرتے تھوڑی ہیں تم سے۔" وہ بے نیازی سے بولا اور میوزک آن کر دیا۔

یار سانوں "او دوست سانوں" لگ گئی بے اختیاری۔

سینے دے وچ نہ سمائی ہے۔

یار ڈاہڈی عشق آتش۔

"واہ۔۔۔" عون نے سر دھنا۔ "بلکہ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا سچویشن ہے اور کیا کلام سیٹ ہوا ہے اس پہ۔" معیز نے ہاتھ بڑھا کے میوزک بند کر دیا۔

"اب اگر تم نے سر ہلایا تو پکڑ کے ڈیش بورڈ میں دے ماروں گا۔" معیز نے اسے دھمکایا۔

"تو بتاتا کیوں نہیں۔۔۔ اندر کی بات کیوں نہیں بتاتا؟ جو اندر ہی اندر تجھے کاٹ رہی ہے۔ جلا رہی ہے۔"

عون ایسا ہی تھا۔ سر پھرا لاابالی "مگر معیز کے اندر تک اترا ہوا۔

اب بھی اپنی بات پہ زور دے کر بولا تو معیز نے لمحہ بھر کو جبڑے بھینچے۔ پھر دانت پیس کر بولا۔

"میں تو تجھے گھر تک ڈراپ کرنا چاہتا تھا۔ مگر اب جی چاہ رہا ہے' تجھے گاڑی میں سے ڈراپ کر دوں۔"

"ویل سیڈ۔۔۔" عون نے ڈھٹائی سے قہقہہ لگا کر داد دی۔

"شٹ اپ یار۔۔۔ ہر چکر کے پیچھے لڑکی کا چکر نہیں ہوتا۔" معیز کو اس کے انداز نے چڑایا۔

"تو پھر بتا دو اس چکر کے بارے میں۔ جس نے تمہیں چکرا کے رکھ دیا ہے؟"

عون کا اعتماد قابل دید تھا۔ معیز نے زوردار بریک لگائے تو وہ واقعی ڈیش بورڈ سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

"آؤچ۔۔۔"

"یار۔۔۔ یہاں سے پیدل آدھے گھنٹے کا راستہ ہے۔" عون گھگھیایا۔

"گیٹ آؤٹ۔۔۔" معیز کے انداز میں بے اعتنائی تھی۔

"والٹ گھر ہی بھول آیا تھا میں۔" عون نے جی بھر کے مسکینی طاری کی۔

"اترتا ہے یا پھر میں اتار دوں؟" معیز نے تیوری چڑھائی۔

عون منہ پھلائے گاڑی سے اترا۔ زوردار انداز میں دروازہ بند کرکے اپنے غصے کا اظہار کیا۔ پھر کھڑکی میں جھکا۔

"ٹھیک ہے۔ چھپائے رکھ راز بند گو بھی کی طرح۔ مگر میں بھی اس شعبے میں ماسٹرز کر چکا ہوں بیٹا جی! اتنا ذلیل ہو کے بندہ تب ہی پھرتا ہے' جب کسی لڑکی کا سایہ اس پر پڑ جائے۔" عون کے چہرے پر بڑی تپانے والی مسکراہٹ تھی۔

دانت پیستے ہوئے معیز نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ پھرتی سے پیچھے ہٹا۔ ورنہ منہ تو اڑ ہی گیا تھا۔

"چھوڑوں گا تو میں بھی نہیں معیز بیٹا! بھاگ لے جتنا بھاگنا ہے۔ مگر دنیا گول ہے پیارے۔ آخر میں پھر مجھ ہی تک آؤ گے۔"

عون نے چہرے پر ہاتھ پھیر کر دھول اڑاتے ہوئے جاتی گاڑی کو دیکھا اور بڑبڑایا۔

پھر گہری سانس بھر تا پوائنٹ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا۔



"اچھا ہوا تم ٹائم پہ پہنچ گئے معیز۔ ذرا یہ کیانی اینڈ سنز والوں کے ایگری منٹ کی شرائط دیکھ لو۔ میں تو کنفیوزڈ ہوں اس بارے میں۔"

امتیاز احمد نے اسے آفس میں داخل ہوتے دیکھ کر طمانیت بھری سانس لی۔

جوان اولاد بھی کیسی نعمت ہوا کرتی ہے۔ جب جب وہ معیز اور ایزد کو دیکھتے انہیں اپنے بازوؤں کی مضبوطی کا

احساس ہوتا تھا۔

"جی..." اس نے فائل لے کر سائیڈ پر رکھ دی۔

امتیاز احمد نے اس کی بے توجہی کو محسوس کیا۔ متفکر ہوئے۔ "کیا بات ہے معیز۔ طبیعت تو ٹھیک ہے بیٹا؟"

اس نے ہلکا سا اثبات میں سر ہلایا۔ مگر وہ تھا کسی اور ہی دھیان میں۔ جیسے کچھ کہنے کو الفاظ جمع کر رہا ہو... یا شاید ہمت۔

"معیز..." انہوں نے اسے پکارا۔

"آپ نے "اسے" بھی زارا کے نکاح میں انوائیٹ کیا تھا...؟" لمحہ بھر اسے دیکھتے رہنے کے بعد امتیاز احمد نے گہری سانس بھری اور اپنی کرسی سے ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔

"تو یہ بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔"

"یہ معمولی بات نہیں ہے ابو۔ وہاں ہماری فیملی موجود تھی۔ اس کی موجودگی پر تو بعد میں سوال اٹھتے۔ پہلا سوال تو اس کا تعارف ہوتا۔ اگر وہ وہاں آجاتی تو قیامت آجاتی۔"

وہ تلخی سے گویا ہوا۔ بہت عرصے سے یہ تلخی اس موضوع پر گفتگو کرتے خود بخود معیز کے لب و لہجے میں گھل جاتی تھی۔

مگر وہ مطمئن انداز میں بولے۔

"سوواٹ... کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لینے سے بلی غائب نہیں ہو جائے گی معیز! حقیقت کو فیس کرنا سیکھو۔"

"مگر میں بلی کو غائب ہی کرنا چاہتا ہوں ابو۔ اس کی موجودگی کا کسی کو بھی علم ہونے سے پہلے۔" معیز کا انداز ہٹیلا تھا۔

"وہاں ماما اسے دیکھتیں، ملتیں۔ کیا کہہ کے تعارف کراتے آپ اس کا؟"

"اس انداز میں بات مت کرو معیز! اس کی ماں نے شرعی رشتے میں باندھ کے اسے میرے حوالے کیا تھا۔ بھاگ کے نہیں آئی وہ... اور جہاں تک تمہاری ماں کا سوال ہے تو میرے خیال میں اب وقت آچکا ہے کہ اسے حقیقت سے آگاہ کر دیا جائے۔" ان کے ٹھہرے ہوئے تادیبی انداز نے معیز کے خون میں انگارے سلگا دیے۔

"واٹ...؟" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"آپ شاید بھول رہے ہیں کہ نکاح کے وقت ہمارے مابین کیا طے پایا تھا۔" اس کا لہجہ ذرا سا تیز تھا۔

"میں بالکل بھی نہیں بھولا۔" انہوں نے کہنا چاہا۔ مگر معیز نے اپنی بات جاری رکھی۔

"آپ نے کہا تھا کہ یہ نکاح آپ کی مجبوری ہے اور یہ بھی کہ اس پر آئی مصیبت ٹلنے کے بعد اس نکاح کو ختم کر کے آپ کسی اچھی جگہ پر اس کا رشتہ کرا دیں گے۔ اینڈ ڈیٹس آل۔"

وہ بالکل صحیح کہہ رہا تھا۔ لیکن یہ بھی سو فیصد درست تھا کہ اگر وہ اس وقت یہ سب نہ کہتے تو معیز انہیں یہ انتہائی قدم اٹھانے کی نہ تو اجازت دیتا اور نہ ہی ان کا ساتھ دیتا۔

انہوں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"میری ہمت کو مت توڑو معیز...! مجھے صرف اتنا بتاؤ کیا تم میری خاطر اپنی ماں کے سامنے اسٹینڈ لو گے؟"

"ہرگز نہیں۔" وہ بھڑکا۔ "بیک گراؤنڈ دیکھیں ذرا آپ اس کا۔ میں ایک جواری کی بیٹی کی خاطر اپنی ماں کو لیٹ ڈاون نہیں کر سکتا ابو..."

اس کی نفرت بے کراں تھی۔ بالکل اپنی ماں جیسی۔ امتیاز احمد کو اچھی طرح اندازہ ہوا تھا۔

"پہلے تم خود کو سمجھالو معیز! اگر میں نے یہ قدم اٹھا ہی لیا ہے تو تم اپنے دل میں اس کے لیے جگہ بناؤ۔ پھر دیکھنا تمہاری ماں احتجاج کرنا بھول جائے گی۔ اگر میرے ساتھ تم کھڑے ہوئے تو۔"

وہ معیز کو بہت ظالم لگے تھے۔ بہت زیادہ ظالم۔

"میری ماں نے تمام عمر اس عورت سے نفرت کرتے گزاری ہے ابو۔ اور آپ اسی کی بیٹی کو باقی زندگی کے لیے ہمارے سروں پر مسلط کرنا چاہتے ہیں... نو وے۔"

وہ کرسی دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر سرخی چھلک آئی۔

"کیا معیز یار۔" امتیاز احمد یک لخت تھکے تھکے اور بوڑھے سے نظر آنے لگے۔ وہ مایوسی سے بولے۔

"میں تو ترس گیا ہوں تمہارا پرانا روپ دیکھنے کو۔ یاروں کے یار ہوا کرتے تھے تم۔ جذبات و احساسات سے لبریز۔"

"ان ہی جذبات و احساسات کے زیر اثر مات کھا گیا تھا میں۔ لیکن اب میں وہ معیز نہیں ہوں ابو۔" وہ تلخی سے گویا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خفیف سی سرخی اتر آئی۔

"اس گھر میں نہ تو صالحہ بیگم کی گنجائش تھی اور نہ اب اس کی بیٹی کی ہے۔"

وہ قطعیت بھرے انداز میں کہتا فائل اٹھا کر تیزی سے ان کے آفس سے نکل گیا۔

امتیاز احمد کے دل کا درد بڑھنے لگا۔ انہوں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موندیں اور گہری سانس لے کر اندر کی کثافت کو کم کرنا چاہا۔

"مجھے معاف کر دینا صالحہ! شاید میں اپنے قول میں پورا نہ اتر سکوں۔" انہوں نے صالحہ کی روح سے دل ہی دل میں معافی مانگی۔



"بیا! تمہارا فون آیا ہے۔"

حنا نے اسے ہلایا تو کسل مندی کا مظاہرہ کرتی بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹتی وہ اٹھ بیٹھی۔

"کیسی طبیعت ہے اب؟"

"ہوں! ٹھیک ہوں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر بستر سے نیچے اتری اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی۔

درحقیقت اس کا یہ فون اٹینڈ کرنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا موبائل دو دن سے مسلسل بند تھا۔ اسی لیے یہ کال لینڈ لائن پہ آئی تھی۔

وہ فون اٹھا کر باہر کاریڈور میں لے آئی اور وہاں رکھے بینچ پر بیٹھ کر ریسیور کان سے لگا لیا۔

"ہیلو..." اس کا انداز بے زار سا تھا۔ مگر دوسری طرف موجود امتیاز احمد نے طمانیت بھری سانس لے کر کہا۔

"شکر ہے اللہ کا۔ تمہارا موبائل تو مسلسل آف آرہا ہے۔ میں تو بس ہاسٹل آنے کا سوچ رہا تھا۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو یہاں آنے کی۔" تلخی ابیہا کی آواز میں رچی ہوئی تھی۔

امتیاز احمد ٹھٹکے۔ پھر تفکر سے پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے ابیہا... اور تم فنکشن میں کیوں نہیں آئیں؟ میں نے ڈرائیور کو بھیجا بھی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا تم نے آنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔"

ابیہا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ یقینا "معیز احمد ہی کی مہربانی تھی۔ اسی نے ڈرائیور کو پٹی پڑھائی ہوگی۔

"تو کیا فرق پڑا میرے نہ آنے سے؟ آپ کی بیٹی کا نکاح رک گیا کیا؟" وہ بدلحاظ ہو رہی تھی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں اس کا گلا دکھنے لگا۔

"مجھے فرق پڑتا ہے ایبہا! میں نے اپنے دل و دماغ کی رضامندی سے یہ رشتہ جوڑا ہے۔ اور تمہیں اپنے گھر میں تمہاری حیثیت میں دلوا کر ہی رہوں گا۔ مگر تمہیں بھی ہمت کرنی ہوگی۔" وہ سچے دل سے بولے۔

"اچھا ہوتا اگر آپ اپنے بیٹے پر بھی میرا رشتہ اور حیثیت واضح کر دیتے۔ پھر کم از کم وہ مجھے یوں دروازے سے واپس تو نہ لوٹاتا۔" باوجود خود پر ضبط کرنے کے وہ پھپھک کر رو دی۔

امتیاز احمد سن رہ گئے۔ خاموشی کو صرف ایبہا کی سسکیاں توڑ رہی تھیں۔ بہت دیر کے بعد وہ بولنے کے قابل ہوئے۔

"تم آئی تھیں نکاح میں...؟"

"جی... اور آپ کے بیٹے معیز احمد نے اسی وقت مجھے واپس بھجوا دیا۔ بس دھکے دینے کی کسر رہ گئی تھی۔"

"آئم سوری ایبہا! وہ ایسا نہیں ہے... اور پھر ڈرائیور نے بھی کہا تھا کہ تم..."

وہ بہ وقت تمام صفائی میں کچھ کہنے لگے تھے کہ وہ خود کو سنبھالتے ہوئے تلخی سے بولی۔

"ڈرائیور کا کیا قصور اس قصے میں؟ وہ تو مالکوں کے حکم کا غلام ہے۔ ایک نے کہا 'لے آؤ۔ وہ لے آیا۔ دوسرے نے کہا 'وہیں پھینک آؤ... تو اس نے تعمیل کر دی۔"

"میں بات کروں گا معیز سے۔"

انہیں معیز کی پریشانی یاد آئی۔ تو کیا وہ اسی وجہ سے ان سے الجھ رہا تھا؟

"اللہ حافظ۔"

ایبہا کا دل برا ہونے لگا۔ اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور فون سیٹ اٹھا کر وارڈن کے روم میں رکھ آئی۔

وہ کمرے میں آئی تو حنا چائے تیار کر چکی تھی۔

"تھینک یو۔" ایبہا متشکر ہوئی اور مگ تھام کر بستر پر بیٹھ گئی۔

"یو ویلکم۔" حنا اسٹول گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اپنی چائے کا مگ تھامے وہ ایبہا کی بھیگی پلکوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"بس کرو۔ نظر لگاؤ گی کیا؟" ایبہا نے نظر چراتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ برجستہ بولی۔

"ایسی رونی صورت کو کیا نظر لگے گی۔"

ایبہا نے بے ساختہ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"شاباش! اب جلدی سے بتا دو۔ میرے پیچھے کیا ہوا تھا؟" حنا نے اسے پچکارا۔

وہ واپس آئی تو ایبہا بخار میں پھنک رہی تھی۔ وارڈن سے اسے علم ہوا کہ ایبہا کسی فنکشن میں شرکت کے لیے گئی تھی۔ واپسی کے بعد ہی طبیعت خراب ہوئی۔

"بخار ہوا تھا... اور کیا۔" ایبہا نے گول مول جواب دیا۔

"ساری رات پتا نہیں کیا اول فول بولتی رہی ہو۔ معاملے کا پتا ہوتا تو میں خود ہی ساری کڑیاں جوڑ لیتی۔ چلو شاباش۔ اب خود ہی بتا دو۔ کس نے ہرٹ کیا تمہیں اور یہ نکاح کس کا تھا؟ مجھے تو بتایا ہی نہیں تم نے۔ صبح ہی تو میں گھر گئی تھی۔"

حنا کسی طور پیچھا چھوڑنے پر راضی نہ تھی۔ سوال در سوال۔ ایبہا پھیکے انداز میں مسکرائی۔

"ایسے ہی یار! گھر سے فون آ گیا تھا۔ کزن کا نکاح ہو رہا تھا۔ بس وہاں کچھ بدمزگی ہو گئی۔"

"یقیناً تمہاری اسٹیپ مدر نے کچھ غلط سلط کہا ہوگا۔" حنا نے اس کی سنائی ہوئی کہانی کے بموجب اندازہ لگایا۔

ایبہا نے یونہی سر ہلا دیا۔

"کم آن یار! بی اسٹرانگ یار۔ اب تو تمہیں عادی ہو جانا چاہیے ان کے رویے کا۔ بلکہ تم وہاں سے واپس کیوں آئیں؟ ایک کے جواب میں دس سناتیں۔"

حنا ایسی ہی تھی۔ بے باک اور منہ پھٹ۔ فوری ردعمل ظاہر کرنے والی۔

"کیا فائدہ... جب دل چھوٹے پڑ جائیں تو بڑے بڑے گھروں میں جگہ تنگ پڑ جایا کرتی ہے۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی اور چائے پینے لگی۔

"کم آن یار۔ قسم سے، نہ تو تمہارے گھر والوں کو تمہاری قدر ہے اور نہ کبھی خود تم نے آئینے میں ڈھنگ سے اپنی شکل دیکھی ہے۔ ایک دو وزٹ پارلر کے کرو۔ پھر دیکھو' آفت سے قیامت نہ بن جاؤ تو کہنا۔" حنا نے مایوسی سے کہتے ہوئے آخر میں مشورہ دیا تو ایبہا نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہ تو میں خود آئینہ دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ ہی دنیا کو "چونکانے" کی خواہش ہے میری۔"

"بے وقوف ہو تم۔" حنا نے فتویٰ دیا۔

"میری بات لکھ کے رکھ لو حنا! گمنامی لڑکیوں کو بہت سے فتنوں سے بچاتی ہے۔ قیامت بن کے نکلیں گی تو پھر قیامت تو آئے گی نا۔"

اس نے کسی گم گشتہ تکلیف کو محسوس کرتے ہوئے پژمردگی سے کہا۔ حنا اس کے ہاتھ سے خالی مگ لے کر اٹھ گئی۔

"میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میرا بھائی تو ایک ہی ملاقات میں تمہارا دیوانہ ہو گیا ہے۔"

"ہائیں!" وہ ہونق ہوئی۔ یہ بات سننے کی اسے بالکل بھی توقع نہ تھی۔ حنا اس کی صورت دیکھ کے خوب ہنسی۔

"تم تو لگتا ہے' چاہے جانے کی امید ہی چھوڑ بیٹھی ہو۔"

"پلیز حنا۔" اس کی رنگت زرد پڑ گئی۔ "فضول باتیں مت کرو۔"

"قسم سے... سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہارا اسیل نمبر مانگ رہا تھا۔ میں نے کہا پوچھ کے بتاؤں گی۔"

حنا کھلے ماحول کی پروردہ تھی۔ یہ سب تو ماڈرن ازم کے زمرے میں آتا تھا۔ مگر ایبہا لرز کر رہ گئی۔

"پلیز۔ ایسا کچھ مت کرنا حنا! میں یہ سب پسند نہیں کرتی۔" وہ رونے والی ہو گئی۔

"اچھا! اچھا... اب پلیز! رونا نہ شروع کر دینا۔" حنا نے اس کے تاثرات بھانپ کر تیزی سے کہا۔ تو اس نے بروقت ہونٹ پھیلاتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔



"خدا کے لیے بھائی! مان جائیں شادی کے لیے۔ لائن کلیئر کریں یار۔ آپ کی شادی تک تو میری تمام ایج فیلوز شادی کر چکی ہوں گی۔" ایزد سخت مایوس تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی معیز کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ جب جی چاہے کر لو۔"

"یہ بات ذرا زور سے ماما کے کانوں میں کہیں۔ تب ہی شاید ان کے دل پہ اثر کرے گی۔" اس نے زارا کے ساتھ مل کر کھانے کی ٹیبل سیٹ کرتی سفینہ کو دیکھ کر اونچی آواز میں کہا تو وہ مسکرانے لگیں۔

اسی وقت امتیاز احمد نے آکر معیز کو مخاطب کیا۔

"معیز! ذرا میرے کمرے میں آؤ۔"

ان کا لہجہ بے حد سنجیدہ۔ بلکہ قدرے کھردرا سا تھا۔ سفینہ تو چونکی ہی تھیں۔ معیز بھی بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔

"خیریت ہے ابو؟"

"جب جوان اولاد اپنی من مرضی پر اتر آئے تو بہت کم خیریت بچا کرتی ہے۔" وہ شکوہ کناں انداز میں بولے تو سفینہ حیرت زدہ سی ان کی طرف آگئیں۔

"کیا ہو گیا ہے امتیاز۔ کیا کر دیا معیز نے؟"

"تم میرے کمرے میں آؤ معیز! تم سے بات کرنی ہے مجھے۔" وہ تحکمانہ انداز میں معیز سے کہتے واپس پلٹ گئے۔

"کیا ہوا ہے معیز۔ کون سی من مانی کی ہے تم نے جو اتنی ٹھنڈی طبیعت کے مالک کو غصہ آگیا؟" سفینہ پریشان تھیں۔

معیز نے تیزی سے خود کو سنبھالا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ امتیاز احمد کس وجہ سے اتنے غصہ ہو رہے ہیں۔

"ہاں! وہ... ایک کانٹریکٹ میں نے اپنی مرضی سے سائن کروایا تھا۔ اسی کا غصہ ہے شاید۔"

سفینہ نے گہری سانس لی۔ "توبہ ہے۔ میں نے سوچا' پتا نہیں کیا ہو گیا۔"

"میں آتا ہوں۔" وہ امتیاز احمد کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"جلدی آنا دونوں۔ کھانا لگانے لگی ہوں میں۔" سفینہ نے پیچھے سے اسے آواز دی تو وہ سر ہلا کے چلا گیا۔

امتیاز احمد کے سامنے جا کے اسے پتا چلا کہ وہ کس درجہ بے چینی اور اضطراب کا شکار تھے۔ مسلسل کمرے کے چکر کاٹتے وہ معیز کو دیکھ کر رکے۔

"جی ابو۔" اس کا اعتماد قابل دید تھا۔

"بہت شرم کی بات ہے معیز!" میں تمہیں اخلاق کے بہت اونچے درجے پر رکھتا تھا۔ مگر تم نے تو..." سلگتے لہجے میں وہ لحہ بھر کو رک گئے اور پھر وہ تاسف سے سر ہلاتے جیسے خود پر قابو پانے لگے۔

انہوں نے یہی سمجھا تھا کہ ایمہا کی آمد کا پتا معیز کو ڈرائیور سے چلا ہے۔ یہ بات تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ وہ اسے پارکنگ ہی سے واپس لوٹا چکا ہے۔

"میں نے اخلاقیات ہی کا مظاہرہ کیا ہے ابو! ورنہ جو کچھ ماما کرتیں' وہ میرے کیے سے بہت زیادہ ہوتا۔" وہ جتاتے ہوئے اسی اطمینان سے گویا ہوا۔ مگر جیسے جلتی پر تیل ڈال بیٹھا۔

"شٹ اپ معیز۔ ہر وقت اپنی ماما کا ڈراوا مت دیا کرو مجھے۔ اپنے عمل پر تم اپنی ماں کے "متوقع" رد عمل کا پردہ ڈال رہے ہو۔"

یہ شاید زندگی میں پہلی بار تھا کہ وہ معیز سے اس قدرے تند و تیز لہجے میں بات کر رہے تھے۔

معیز نے لب کچلے۔

"اسے میں نے انوائیٹ کیا تھا۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم اسے پارکنگ ہی سے لوٹا دو۔" وہ دھیمے مگر غصیلے انداز میں پوچھ رہے تھے۔

"میں نے جو مناسب سمجھا وہی کیا ابو۔"

"مناسب... ہونہہ۔" انہوں نے تلخی سے ہنکارہ بھرا۔

"بہت جانتے ہو تم مناسب اور نامناسب کے؟"

"وہ میری بہن کے نکاح کا فنکشن تھا ابو! وہاں وہ لڑکی آ کر اپنا تعارف کراتی تو کیا عزت بچتی ہماری؟ کیا ہیں ہم؟

چوری چھپے نکاح کرنے والے؟" اس کا لہجہ بھنچا ہوا تھا۔

وہ بھڑکے۔

"چوری چھپے؟" انہیں اس کے الفاظ نے جیسے شدید اذیت دی تھی۔

"باپ ہوں میں تمہارا۔ تم اس وقت میرے ساتھ تھے۔ پھر بھی یہ چوری چھپے کا نکاح ہے؟"

"فار گاڈ سیک ابو! اس سارے چکر کو اب ختم کریں۔ اسے برے حالات سے بچانا مقصود تھا۔ ہم نے بچا لیا۔ اب اسے چلتا کریں۔" وہ سخت بے زار اور بدلحاظ ہو کر بولا۔

امتیاز احمد کے اندر بہت گہرا تاسف اترا۔ یکلخت ہی جیسے ان کا تمام غم و غصہ ختم ہو گیا اور اس کی جگہ یاسیت نے لے لی۔

"کیا کروں... کہاں بھیج دوں اسے... اس کے نکاح کے تین ماہ بعد ہی اس کی ماں مر گئی تھی۔ باپ وہ ہے' جو جوئے میں لگا رہا تھا اسے۔ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کے پاس بھیجوں اسے؟"

معیز چپ سا ہو گیا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے ایمہا نامی اس لڑکی سے ذرہ برابر بھی ہمدردی نہ تھی۔ جوان کے گھر کے لیے ایک قیامت کی مانند تھی۔ وہ جلد از جلد اپنی زندگیوں سے اس کی نکاسی چاہتا تھا۔

"آپ اسے کسی دارالامان میں بھیج سکتے ہیں... طلاق کے بعد... اب تو وہ لوگ اچھی جگہوں پر شادیاں کر دیتے ہیں لڑکیوں کی۔" وہ شاید کچھ زیادہ ہی سخت دل ہو گیا تھا۔ امتیاز احمد کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

"معیز!" انتہائی سخت اور غصیلے انداز میں اسے پکارا اور ساتھ ہی اپنا سینہ مسلنے لگے۔

معیز گھبرا کر ان کی طرف لپکا۔ انہیں سہارا دے کر بستر پر بٹھایا اور جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر پڑی شیشی اٹھا کر اس میں سے ایک گولی نکال کر ان کی زبان کے نیچے رکھی۔

"ابو پلیز... ریلیکس۔" اسے اپنی بے وقوفی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے۔ کوئی بھی ذہنی و جذباتی دباؤ ان کی طبیعت بگاڑ سکتا تھا۔

"آئی ایم سوری۔" ان کے شانے دباتا وہ نادم سا تھا۔ "پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ شاید یہ سب میرے لیے ناقابل قبول ہے اس لیے۔"

ان کی طبیعت سنبھل گئی تھی۔

"تم کیا جانو معیز۔ میرا کیا حال ہے۔ کیسا بوجھ اٹھا لیا ہے میں نے اپنے کاندھوں پر۔ راتوں کی نیند اڑ گئی ہے میری۔ زندگی کا کیا بھروسا۔ کچھ گھنٹے ہیں یا پل... اور صالحہ سے اتنی بڑی ذمہ داری لے لی میں نے۔"

وہ دکھی تھے اور پشیمان بھی۔

معیز تڑپ اٹھا۔

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ ابو۔ آئم رئیلی سوری۔ اگر آپ کو میرے عمل سے تکلیف پہنچی ہے تو۔"

"معیز! میں اسے اس گھر میں لانا چاہتا ہوں یار۔ سوچو کوئی تو طریقہ ہو گا؟" وہ بچوں کی سی معصومیت سے بڑی امید بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

معیز کو کرنٹ سا لگا۔ "ابو۔"

"میں اسے اپنی زندگی میں ہی اس گھر میں لے آنا چاہتا ہوں معیز۔ میرے بعد وہ دارالامان کے دھکے کھائے۔ میری روح بھی تڑپے گی معیز۔" وہ تھک سے گئے۔

"بس کریں ابو پلیز۔" معیز کی آنکھوں میں سرخی اتر آئی۔

"ٹھیک ہے نا یار۔ اگر وہ اس رشتے سے یہاں نہیں آسکتی تو کسی اور بہانے سے۔ مگر یہاں اس کے لیے تحفظ تو

ہے۔" ان کا لہجہ بھیگنے لگا۔
معیز کے دل کو کچھ ہونے لگا تو وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"یہ سب خالی پیٹ کی دہائیاں ہیں۔ اٹھیں! ماما نے کھانا لگا دیا ہے۔" اس نے زبردستی انہیں بھی تھام کر اٹھایا۔
وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتے اپنا بازو چھڑا کر اس سے آگے نکل گئے۔
معیز نے ایک نظر اپنا خالی ہاتھ دیکھا۔ امتیاز احمد کی نگاہوں نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار ہونے لگا۔

☼ ☼ ☼

معروف ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک کر وہ استفہامیہ نظروں سے زارا کو دیکھنے لگا۔
"نہیں پلیز۔ کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔" زارا نے اس کا مقصد جان کر فوراً کہا۔
"کم آن یار۔ لنچ ٹائم ہو رہا ہے۔" سفیر نے نگاہ بھر کے اپنی منکوحہ کو دیکھا۔ نکاح کے بعد آج پہلی بار وہ اس کے ہمراہ لانگ ڈرائیو کے لیے نکلی تھی۔
جدید طرز کا سلا لیمن کلر کا لباس پہنے' وہ سیدھی دل میں اتر رہی تھی۔
اس کی نگاہ کے جمود کو محسوس کر کے زارا اپنی تمام تر بولڈنیس کے باوجود اپنی ہتھیلیاں پسیجتی محسوس کر رہی تھی۔
خفیف سے پلکیں اٹھا کر سفیر کو دیکھا۔ پھر سٹپٹا کر بولی۔
"او کے! پھر آئس کریم ٹھیک ہے۔"
وہ پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے ہنسا۔
"یار! تمہاری خاطر گھر کا کھانا چھوڑ کے آیا ہوں اور تم یہاں آئس کریم پہ ٹرخا رہی ہو۔"
"آپ لنچ کر سکتے ہیں جناب۔ آپ پر پابندی تھوڑی ہے۔" زارا کھل کے مسکرائی۔
سفیر نے گاڑی لاک کی اور زارا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ نچلا لب دانتوں تلے دبا کر مسکراہٹ روکتے ہوئے زارا نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔
وہ دونوں ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو بہت سی ستائشی نگاہوں نے اس جوڑی کو دیکھا۔
وہ قدرے کارنر کی ٹیبل پر آبیٹھے۔
"حالانکہ اب ہمیں فیملی کیبن لینا چاہیے تھا۔" اس کے لیے کرسی نکالتے ہوئے سفیر شرارت سے بولا۔
زارا ہنس دی۔
وہ اس کے مقابل آبیٹھا اور پرشوق نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ پہلے تو وہ جزبز ہوئی۔ پھر جھنجلا گئی۔
"سفیر۔" اس کے تنبیہی انداز پر وہ محظوظ ہوا۔ پھر مصنوعی ناراضی سے بولا۔
"کیا یار! اب بندہ اپنی بیوی کو بھی نہیں دیکھ سکتا۔"
"دیکھ سکتا ہے۔ مگر یوں پبلک پلیس پر نہیں۔" زارا نے برجستہ کہا۔
"آہا۔" وہ کھل اٹھا۔ آگے کی طرف جھک کر اشتیاق سے پوچھنے لگا۔
"یعنی تنہائی میں بھی ملاقات کا ارادہ ہے تمہارا؟"
"میرے خیال میں آپ کو بہت بھوک لگی ہے۔ بہتر ہو گا کہ لنچ آرڈر کر لیں۔" زارا نے اس کے رومانٹک موڈ کو بدلنے کی سعی کی۔ وہ گہری سانس بھرتا ویٹر کو بلانے لگا۔

کھانا آرڈر کرنے کے بعد وہ زارا کی طرف متوجہ ہوا وہ اسی کو دیکھ رہی تھی۔ اونچا لمبا' خوش شکل اور خوش گفتار سفیر احسن اسے اچھا لگا تھا۔
سفیر کے ایک دم سے دیکھنے پر وہ خجل سی ہو گئی۔
"کیسا لگا پھر؟"
سفیر کے پوچھنے پر وہ بے ساختہ بولی۔ "کیا؟"
"سفیر احسن۔"
وہ اطمینان سے بولا تو وہ جھینپتی ہوئی ہنس دی۔ سفیر کے مجبور کرنے پر اسے بھی تھوڑا بہت کھانا ہی پڑا۔ ویٹر ابھی ان کے سامنے آئس کریم کے بلوریں گلاس رکھ کے گیا تھا۔
"یو نو زارا! میں ہمیشہ سے سوچتا تھا کہ میری بیوی وہ لڑکی ہو جس سے میری بہت دوستی ہو۔ جو بہت کیئرنگ اور شیئرنگ ہو۔" وہ اسے بتا رہا تھا۔
"شیئرنگ؟" زارا نے ٹھٹک کر پوچھا۔
"بے شک بیلنس نہیں... اپنے جذبات و احساسات' اپنی ہر خوشی' ہر غم مجھ سے شیئر کرے... اور ایک دوسرے کے ہوتے ہمیں کسی تیسرے کی ضرورت ہی نہ پڑے" وہ مسکرایا۔
زارا کو اس کے خیالات جان کر دلی خوشی ہوئی۔ جیسی بیوی کی وہ ڈیمانڈ کر رہا تھا۔ بحیثیت شوہر وہ خود بھی ویسا ہی لگ رہا تھا۔ فرینڈلی' کیئرنگ اینڈ شیئرنگ۔
اس ایک لنچ نے ان کے مابین دوستی کے رشتے کو پروان چڑھا دیا تھا۔ زارا خوش تھی۔ بے حد خوش۔

☼ ☼ ☼

"بیا یار... ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔"
حنا متفکر سی اس کے پاس آئی۔ ابھی اس کے موبائل پہ کوئی کال آئی تھی تو وہ اٹھ کر بات کرنے کاریڈور تک گئی تھی۔
ایبھا نے نوٹس ترتیب سے پن اپ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔
"ساری پاکٹ منی تم آج کی شاپنگ میں لگا چکیں۔ خالی پرس تمہارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ پھر اور کیا مسئلہ ہو گیا ہے؟" اس کا انداز چھیڑنے والا تھا۔ مگر وہ یونہی سنجیدہ رہی۔
"یار! میرے انکل کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔"
"کون سے انکل؟"
"ہیں ناں ایک۔ چچا ہی سمجھ لو۔ مجھ سے بڑا پیار ہے ان کو۔ اپنی اولاد جو نہیں ہے بے چاروں کی۔"
حنا نے تفصیل بتائی۔ ایبھا نے محض سر ہلا دیا۔
"کمال ہے یار! حد ہوتی ہے بے مروتی کی بھی۔ مسئلہ تو تم نے پوچھا ہی نہیں۔"
اسے لاپروائی سے نوٹس کے ساتھ منہمک دیکھ کر حنا نے ناراضی کا اظہار کیا تو وہ سٹپٹائی۔
"ہیں! مسئلہ ابھی باقی ہے کیا؟ تم نے بتا تو دیا کہ تمہارے انکل کی طبیعت ناساز ہے۔"
"یار! اس ہاسٹل میں سب سے بڑا مسئلہ یہاں سے باہر نکلنے کے لیے اس کھڑوس وارڈن سے پرمیشن لینا ہے۔"
اس نے منہ بسورا۔
"لیکن تمہیں باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ سارا ٹائم تو آج شاپنگ میں لگا آئی ہو۔" ایبھا معترض ہوئی۔

"اوفوہ۔ ایک تو بندہ دنیا میں اتنا اکیلا بھی نہ ہو کہ اسے پتا نہ چلے کہ دنیاداری پلس رشتہ داری کیسے نبھائی جاتی ہے۔" حنا نے منہ پھلایا۔

اس کی بات کا تیر ٹھک سے ایبہا کے دل میں کھب گیا۔ اور جو اتنے مضبوط رشتے کے ہوتے بھی دنیا میں تن تنہا ہو اس کا کیا کہنا؟ وہ تیزی سے پلکیں جھپک کر نمی روکنے لگی۔

"یار! ان کی عیادت بنتی ہے نا۔ ابھی فون پہ بات ہوئی ہے میری ان سے۔ خفا ہو رہے تھے کہ کیسی بھتیجی ہو۔ پوچھنے بھی نہیں آئیں۔"

حنا اپنے ہی مسئلے میں الجھی تھی۔ ایبہا نے اپنا دھیان ہٹانے کے لیے نوٹس سائیڈ پر رکھ دیے اور اسے مشورہ دیا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ گھر چلی جاؤ۔ اس شہر میں گھر ہے تمہارا۔ پھر بے گھری کا دکھ کیوں کاٹ رہی ہو۔"

"تم نہیں سمجھ سکتیں۔" حنا نے سرہلایا۔ "وہاں کی خالی دیواریں مجھے کاٹتی ہیں۔ مما کی اپنی سوشل لائف ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم جیسی معصوم چڑیا مجھے ہاسٹل میں ہی مل سکتی ہے باہر والیوں کے تو پر نکلے ہوتے ہیں۔"

حنا کی بات پر وہ ٹھٹکی۔ حیرت سے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اتنی معصوم ' اتنی اچھی دوست۔ میں تو کہتی ہوں کہ تم بھی میرے گھر چلو یار! دونوں وہاں ہوں گی تب شاید میں بھی رہ پاؤں۔"

جوش سے کہتے حنا نے ہزاروں بار کی جانے والی آفر دہرائی۔ جو ہر بار ہی ایبہا کو بدکا دیتی۔

"اچھا۔ اب تم دوبارہ اپنے مسئلے کی طرف آؤ۔ اصل میں مسئلہ کیا ہے؟" ایبہا نے جلدی سے بات گھمائی۔ تو اسے چند لمحے گھورنے کے بعد حنا نے مجبوری سے کہا۔

"وارڈن اجازت نہیں دے گی یار۔"

"تو؟"

"تو یہ کہ تم ہو نا۔ ہم تمہارے انکل کی عیادت کا بہانا کر کے جا سکتی ہیں۔"

حنا نے جوش سے کہا۔ ایبہا نے بے اختیار ہاتھ جوڑے۔

"خدا کے لیے۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔"

"کیسی دوست ہو تم۔" حنا نے اسے تاسف سے دیکھ کر کہا۔ تو اس نے صفائی پیش کی۔

"تمہارا کیا خیال ہے' وارڈن بے وقوف ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میرا رابطہ بہت کم لوگوں سے ہے۔ پھر یہ انکل کہاں سے آگئے؟"

"کم آن بیا! بس میں نے کہہ دیا تو طے ہو گیا۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اسی بہانے تم بھی باہر نکلو گی تو اس سڑی جیسی شکل پہ شاید رونق ہی آجائے۔" اس نے قطعی انداز میں فیصلہ سناتے ہوئے طنز بھی کیا تو ایبہا سے مسکراہٹ روکنا مشکل ہو گیا۔

"چلو اٹھو۔ ابھی جاؤ اور اس چنگیز خان کے زنانہ ایڈیشن سے اجازت لے کر آؤ۔ آدھے گھنٹے تک ہمیں نکلنا ہے۔ اور شام سے پہلے واپس پہنچنا ہے۔"

حنا نے اسے پچکارا تو نہ چاہتے ہوئے بھی ایبہا کو اٹھنا ہی پڑا۔

حنا کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے پھیلنے والی مسکراہٹ بہت معنی خیز تھی۔ وہ گنگناتے ہوئے اٹھ کر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنی بھنوؤں کی شیپ چیک کرنے لگی۔



اجنبی نمبر سے آنے والی کال کو معیز نے دوبار نظرانداز کیا مگر دوسری طرف بھی کوئی انتہائی "مستقل مزاج" بندہ تھا۔ کمپیوٹر شٹ ڈاؤن کرتے ہوئے معیز نے موبائل اٹھایا اور کال ریسیو کرتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگالی۔

"ہیلو۔"

"ہیلو معیز۔" بے حد بے تکلفانہ انداز۔ وہ بری طرح چونکا۔ آواز سراسر زنانہ تھی۔

"جی۔ معیز بات کر رہا ہوں۔" اس نے محتاط انداز میں کہا۔

"اچھا۔" وہ ہلکا سا ہنسی۔ "کیا ہر ایک کے ساتھ اسی احتیاط کے ساتھ بات کرتے ہیں؟"

"ایکچوئلی میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" اسی سنجیدگی کے ساتھ وہ صاف گوئی سے بولا۔

"چلیں۔ پہچان جائیں گے جناب۔ ایک آدھ ملاقات اور ہو جانے دیں۔" وہ معنی خیزی سے کہتی معیز کو دانت جمانے پر مجبور کر گئی۔

"دیکھیں۔ یہ پزل وغیرہ مجھے بالکل بھی پسند نہیں۔ ناؤ کم ٹو دی پوائنٹ۔ فون کس لیے کیا ہے آپ نے؟"

اس نے ابھی بھی تحمل کا مظاہرہ کیا تھا۔ لڑکی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اس سے واقف ہے۔ اسی لیے وہ بدمزاجی کا مظاہرہ کرنے سے اجتناب کر رہا تھا۔

"بھئی' ظاہر ہے آپ سے باتیں کرنے کے لیے۔ موبائل فون کا مصرف تو یہی ہے نا۔" لڑکی کی معصومیت قابل دید تھی۔

"محترمہ! نہ تو میں اتنا فارغ ہوں اور نہ ہی میری نظر میں موبائل فون کا یہ مصرف ہے۔" اس نے رکھائی سے کہتے ہوئے موبائل آف کر دیا۔

اسے درحقیقت ایسے لڑکے لڑکیوں پر افسوس ہوتا تھا جو سائنس کی بہترین ایجاد کو انتہائی غلط انداز میں استعمال کرتے تھے۔ سستے ترین پیکجز کالجز کے اسٹوڈنٹس تو ایک طرف رہے اسکول جانے والے لڑکے لڑکیوں کو بھی برباد کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ فقیروں کو حقارت سے دیکھنے والے خود بیس تیس روپے کے بیلنس کی بھیک مانگ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر۔

اس کی سوچ کہاں کی کہاں بھٹکنے لگی۔ آفس سے اٹھنے تک وہ اس کال کو بھول چکا تھا۔



امتیاز احمد اس سے اب برائے نام ہی بات کرتے تھے۔ جب سے ایبہا والا واقعہ ہوا تھا۔ تب سے انہوں نے معیز سے انتہائی ضرورت کے علاوہ بات چیت بند کر رکھی تھی۔ اور یہ صورت حال معیز کے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ ماں باپ کا پہلا بچہ تھا۔ اس لیے دونوں ہی کے نزدیک تھا۔ ایسے میں امتیاز احمد کا رویہ اسے بہت تکلیف پہنچا رہا تھا۔ پہلے وہ آفس سے اس کے ساتھ ہی لوٹتے تھے مگر آج کل وہ اس سے پہلے ہی ڈرائیور کے ساتھ نکل جاتے۔

معیز ذہنی پریشانی کا شکار ہونے لگا تھا۔ ایک ایسا مسئلہ جس میں اسے زبردستی شریک کیا گیا تھا۔ اب اس کے گلے کی ہڈی بنایا جا رہا تھا جسے نہ وہ اگل سکتا تھا اور نہ ہی نگل سکتا تھا۔

آج وہ امتیاز احمد سے ان کے سرد رویے کی بابت بات کرنے کا ارادہ لے کر گھر آیا مگر لاؤنج میں مچی خوشگوار سی ہلچل اسے ٹھٹکا گئی۔ ایزد اور زارا کے ساتھ زارا کی نند رباب بھی موجود تھی اور تینوں کسی بات پر بحث کرتے

ہوئے ہنسی مذاق میں بھی مصروف تھے۔
"آؤ معیز۔ بڑے موقع پر آئے۔ چائے تیار ہے۔"
سفینہ نے اسے پکار لیا تو اسے ان کے انداز ہی سے اندازہ ہو گیا کہ اسے لاؤنج میں آنا چاہیے۔ اور رباب سے سلام دعا کرنی چاہیے کیونکہ یہ زارا کی سسرال کا معاملہ تھا۔ حالانکہ وہ اس وقت سیدھا جا کر ابو سے ملنا چاہتا تھا۔ لیکن اسے مجبوراً "رکنا ہی پڑا۔
رباب نے بڑی خوش دلی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔ معیز وہیں زارا کے ساتھ صوفے میں دھنس گیا۔
"آپ کے یہ بھائی بڑے مصروف رہتے ہیں۔" وہ ایزد اور زارا سے کہہ رہی تھی۔ ایزد کو صدمہ ہوا۔
"یعنی دوسرے لفظوں میں میں ویلا نکما ہوں آپ کی نظر میں؟"
وہ مدھم سا ہنسی تو معیز چونک سا گیا۔ بلا ارادہ ہی نگاہ اس کے پرکشش چہرے کی طرف اٹھ گئی۔ یہ ہنسی بڑی شناسا سی لگی تھی۔
"بڑی جلدی نتیجے پر پہنچے ہو۔" وہ ایزد کو چھیڑنے لگی۔
"یہ بھی کہاں فارغ رہتا ہے۔ بے چارہ اتنی کڑی ڈیوٹی دیتا ہے۔ گرلز کالج کے باہر۔" زارا نے چائے ڈالتے ہوئے رباب کا ساتھ دیا تو وہ برجستہ بولا۔
"وہ تو صرف اس لیے کہ تمام بہنیں اپنے بھائیوں کے ساتھ بخیریت رخصت ہو جائیں تو میں تمہیں لے کر آؤں۔ یہ تو میری فرض شناسی ہوئی نا۔"
"یعنی کہ حد ہے فرض شناسی کی۔" زارا نے طنز کیا۔ تو وہ پھر سے ہنسی۔ وہی مخصوص انداز میں ہلکا سا قہقہہ۔ معیز کا ذہن الجھا اسی بے خیالی میں وہ رباب ہی کو دیکھتا سوچ رہا تھا کہ یہ ہنسی اسے یوں ڈسٹرب کیوں کر رہی ہے؟ جب ہی رباب نے ایک دم سے اس کی طرف دیکھا۔ معیز کو اپنی طرف یوں "محویت" سے متوجہ پا کر بڑے انداز سے مسکرا دی۔
یک دم ہی معیز کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ وہ بدتہذیبی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ یوں بلاوجہ کسی لڑکی کو سامنے بیٹھ کے گھورنا مینرز کے خلاف تھا۔ وہ خفیف سا ہو گیا۔ اور فوراً" وہاں سے اٹھ گیا۔
"میں فریش ہو کے آتا ہوں۔"
"میں ذرا تمہارے ابو کو دیکھوں۔ سر میں درد کا کہہ رہے تھے۔" سفینہ معذرت خواہانہ انداز میں زارا سے کہتی اٹھ گئیں۔
"جی۔ میں چائے دے آئی ہوں ابو کو۔ ساتھ میں ٹیبلیٹ بھی۔" زارا نے بتایا تو وہ سرہلاتی چلی گئیں۔
معیز اس کے بعد فریش ہو کر چائے پینے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کا رباب کی کمپنی میں بیٹھ کر مزید مروت نبھانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ وہ اطمینان سے بیڈ پر تکیے سے ٹیک لگائے ٹانگیں پھیلا کر اوپر لیپ ٹاپ کھولے بیٹھا تھا۔ عون سے چیٹنگ جاری تھی۔
زارا اسے مصروف دیکھ کر اس کی چائے پاس رکھ گئی۔ اس کے بعد وہ کھانا لگنے کی اطلاع پر ہی اٹھ کر کمرے سے باہر آیا۔
رباب ابھی بھی وہیں موجود تھی۔ وہ یقیناً" ڈنر کے بعد جانے والی تھی۔
معیز کو حیرت نے گھیرا۔ وہ سب کے ساتھ اتنی گھل مل گئی تھی۔ اتنی بے تکلفی سے لاؤنج، کچن اور ڈائننگ کے چکر لگا رہی تھی جیسے کہ جانے کب سے اس گھر میں آنا جانا ہو۔ اس نے سفینہ اور زارا کے منع کرنے کے باوجود ان کے ساتھ ٹیبل پر کھانا بھی لگایا تھا۔

"کوئی بات نہیں آنٹی۔ پکا نہیں سکتی لگا تو سکتی ہوں۔"

"یعنی آپ اس محاورے کو غلط ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ جس میں اچھا پکا ہوا کھانا کھلا کر شوہر کے دل پر راج کرنے کی پلاننگ کی گئی ہے۔ آپ یہ مہم صرف کھانا "لگا" کر ہی سرانجام دیں گی۔ ویری ویل۔"

کرسی گھسیٹتے ہوئے ایزد نے سر دھنا۔ معیز نے اسے تنبیہی نظروں سے دیکھا۔ زارا کے ساتھ رباب کا رشتہ ایسا تھا کہ اسے گفتگو میں احتیاط برتنی چاہیے تھی مگر وہ لاابالی کہاں ایسی محتاط روی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔

امتیاز احمد بھی کھانے کی میز پر آئے تو کھانا شروع ہوا۔ کھانے کے دوران بھی زارا، رباب اور بالخصوص ایزد کی شگفتہ بیانی نے ماحول بنائے رکھا۔ معیز کو ابو کا موڈ بھی اچھا لگا۔ وہ ایزد کی باتوں پر مسکرا رہے تھے۔ معیز کو لگا اب ان سے سوری کرنا آسان ہو گا کیونکہ وہ پچھلے دنوں والے موڈ میں نہیں تھے۔ مگر کوفت کا شکار تو وہ تب ہوا جب کھانے کے تھوڑی دیر بعد سفینہ نے آکر اسے رباب کو گھر ڈراپ کر آنے کو کہا۔

"میں ؟" وہ حیران ہوا تو سفینہ نے اسے گھورا۔

"ہاں، تم۔ سفیر گھر پہ نہیں ہے۔"

"تو اسے ایزد کے ساتھ بھیج دیں۔ مجھے ابو سے کچھ ضروری ڈسکشن کرنی ہے۔" اس نے صاف جواب دیا۔

"اسی کو کہتی اگر وہ کھانے کے فوراً بعد دوستوں کے ساتھ نہ نکل گیا ہوتا۔" سفینہ نے تحمل کا مظاہرہ کیا۔

وہ جھنجلا سا گیا۔ "مام پلیز۔ یہ جبری مشقت اور زبردستی کی ڈیوٹیز مجھ سے نہیں نبھائی جاتیں۔"

جب وہ تنک کر کہہ رہا تھا اسی وقت کسی نے ہلکی سی دستک دے کر دروازہ اندر کی طرف کھولا۔ رباب کو دیکھ کر سفینہ تو گڑبڑائیں ہی معیز بھی خجل سا ہو گیا۔ اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ اس کے کمرے تک آجائے گی۔

"ایکسکیوز می آنٹی! اگر معیز بزی ہے تو کوئی بات نہیں۔ میں ٹیکسی میں چلی جاتی ہوں۔ کون سا آدھی رات ہو رہی ہے۔" نارمل سا انداز۔

"ارے نہیں رباب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ بس آ رہا تھا معیز۔" معیز پر ایک جتاتی نظر ڈال کر وہ رباب کو لیے کمرے سے نکل گئیں وہ بے زاری کے حصار میں گھرنے لگا۔ مگر مجبوری گلے آن پڑی تھی سو نبھانا ہی تھا۔ بالوں میں ہاتھ پھیر کر یونہی سنوارا اور گاڑی کی چابی اٹھا کر چل پڑا۔

سفر بے حد خاموشی سے جاری تھا۔ رباب کا گھر تقریباً دس منٹ کے فاصلے پر تھا۔

"انسان اگر کسی کام پر راضی نہ ہو تو اسے کھل کر اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔" اس کی سی ڈیز چیک کرتی رباب نے اونچی آواز میں یقیناً اسی کو سنایا تھا۔

معیز کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ گہری سانس بھرتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"تھینک گاڈ۔ تم مسکرا بھی سکتے ہو۔"

اب کی بار وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"ناٹ بیڈ۔ زارا بہت تعریف کر رہی تھی تمہاری مسکراہٹ کی۔" رباب کا انداز بے حد بے تکلفانہ تھا۔ جو سچ تو یہ تھا کہ معیز کو پسند نہیں آیا۔ اس کی دوبارہ سے خاموشی اور سنجیدگی کو رباب نے سرعت سے محسوس کیا۔

"آئم سوری۔ تم نے شاید میری بے تکلفی کو مائنڈ کیا ہے؟" وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔ پھر صاف گوئی سے بولی۔

"ایکچوئلی۔ میں جو اندر سے ہوں وہی باہر سے بھی ہوں۔ جو دل میں ہو کہہ دیتی ہوں۔"

"میں نے مائنڈ نہیں کیا۔ جو تم ہو اس پر یقیناً مجھے اعتراض کا کوئی حق نہیں۔" وہ دل توڑنے کی حد تک سنگ دل تھا۔ بے اعتنائی سے بولا۔ رباب نے لحہ بھر اسے دیکھا۔

"مگر جب ہم اچھے دوست بن جائیں گے تو تمہیں یقیناً یہ حق بھی حاصل ہو گا۔" دھونس بھرا انداز۔ زور

آور۔ اپنا آپ منواتا ہوا۔

"میں بہت کم اور بہت دیر میں دوست بناتا ہوں۔"

معیز کے لب و لہجے میں سرد مہری سی اتر آئی۔ وہ کسی کے لیے بھی خود تک پہنچنے والے راستوں کو آسان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ معیز نے اس کے عالیشان بنگلے کے باہر گاڑی روکی۔ وہ خاموشی سے گاڑی سے اتری اور آگے سے گھوم کر اس کی کھڑکی کی طرف آئی۔

"مگر مجھے تو عادت ہے نا دوست بنانے کی، اچھے اور مخلص۔" وہ نرمی سے مسکرا رہی تھی۔ معیز نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہ رباب کی خود میں دلچسپی کو اچھی طرح محسوس کر چکا تھا۔ مگر اسے اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"تھینکس فار دی لفٹ۔"

وہ پلٹ کر بیل بجانے لگی۔ معیز نے چوکیدار کے گیٹ کھولنے تک ہی انتظار کیا اور گیٹ کھلتے ہی گاڑی آگے بڑھا دی۔



وہ گھر آیا تو سفینہ اس کی منتظر تھیں۔

"ابو کہاں ہیں؟"

"چھوڑ آئے رباب کو؟" انہوں نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے جواباً سوال کیا تو وہ جھنجلاہٹ کا شکار ہوا۔

"ظاہر ہے۔ اب جیب میں ڈال لینے سے تو رہا۔" ٹی وی کے سامنے براجمان ایزد کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔

"پرائی بچی ہے۔ اس لیے فکر ہو رہی تھی۔" سفینہ نے خفگی سے کہا۔

"تو پرائی بچی کو کس نے کہا تھا، آدھی رات تک پرائے گھر میں رکے۔" معیز اکتاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

"بھائی! ایک تو آپ بھی نا۔ وہ تو اتنی تعریفیں کرتی رہی ہے آپ کی اور آپ ایسے چڑ رہے ہیں اس سے۔" زارا اپنے امیر سسرالیوں سے کافی متاثر تھی۔ معیز اپنا مسئلہ بھول سامنے آبیٹھا۔

"مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے ڈسکس کرنے کا مطلب کیا ہے تم لوگوں کا؟" اس کے انداز کی سختی کو محسوس کرتے ہوئے زارا گڑبڑائی۔

"کم آن معیز! کسی کی پسند و ناپسند پہ آپ بین تو نہیں لگا سکتے نا۔" سفینہ فوراً زارا کی حمایت کو آئیں۔ معیز نے مزید کچھ کہنے کو وا ہوتے لبوں کو باہم بھینچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"ابو کا پوچھا تھا میں نے؟" وہ سفینہ کی طرف متوجہ تھا۔

"وہ تو میڈیسن لے کر لیٹ گئے ہیں۔ اب تک تو شاید سو بھی چکے ہوں۔" ان کے بتانے پر وہ گہری سانس بھرتا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"بھائی کتنے بدل گئے ہیں ماما! ذرا جو کوئی بات برداشت کرتے ہوں۔" زارا نے منہ بسورا۔

"اتنی تعریفیں رباب کے سامنے میری کی ہوتیں تو وہ آٹوگراف بک لیے میرے آگے پیچھے پھر رہی ہوتی۔" ایزد نے اس کی شکل دیکھ کر فقرہ کسا۔

"ہنہ۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔"

زارا تلملائی۔ ایک تو پہلے ہی دل جل رہا تھا۔ اوپر سے وہ مزید تیل چھڑک رہا تھا۔

"نہیں۔ چنے کی بھی ہو سکتی ہے بلکہ ماش کی شاہی دال مجھے پسند بھی بہت ہے۔" حسب عادت وہ بات کو کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔

جبکہ ان کی نوک جھونک سے بے خبر سفینہ اپنی سوچ میں گم تھیں اور ان کی سوچ کا محور معیز میں دو ایک سال سے در آنے والی تبدیلی تھی۔ وہ حقیقتاً" معیز کی شادی کرنے کا سوچنے لگیں۔



اس شان دار سی کوٹھی میں داخل ہوتی ایبہا بڑے اشتیاق سے ہر شے کا جائزہ لے رہی تھی۔ ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔

"صاحب فون پر بزی ہیں ابھی۔" انہیں کولڈ ڈرنک سرو کرتے ہوئے ملازم نے بتایا۔ عجیب سا آدمی تھا یا شاید ایبہا کو عجیب لگا۔ خوامخواہ دانت نکالتا۔ بے تکلفی سے باری باری حنا اور ایبہا کو دیکھتا۔

"کس قدر فضول آدمی ہے۔" ملازم کے جاتے ہی ایبہا نے اطمینان کی سانس لی تھی۔

"کون؟" حنا چونکی۔

"تمہارے انکل کا ملازم اور کون۔" ایبہا نے ناگواری سے کہا۔

وہ حیران ہوئی۔ "کیا کیا اس نے؟"

ایبہا نے بے یقینی سے حنا کو دیکھا۔

"تم نے دیکھا نہیں، کیسے دانت نکال رہا تھا اور فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"اچھا۔ میں نے تو ایسا کچھ محسوس نہیں کیا۔ وہ بے چارہ تو شاید خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔" سرسری انداز میں کہہ کر وہ جوس پینے لگی جس کلاس سے حنا کا تعلق تھا وہاں بھلا ان چھوٹی موٹی باتوں کی کیا اہمیت؟ ایبہا سوچ کے ٹھنڈی پڑ گئی۔

تھوڑی دیر کے بعد حنا کے انکل آئے۔ حنا کھڑی ہوئی تو مجبوراً" ایبہا کو بھی اس کی تقلید کرنا پڑی۔

"او جان۔۔۔ کیسی ہو؟"

انکل نے لپٹا کر حنا کو پیار کیا تھا۔ ایبہا بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی۔ حنا اپنے انکل کی بانہوں میں تھی، وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ انچ بھر کے فاصلے پر چہرے۔

"آپ کیسے ہیں انکل جی؟" حنا کے انداز میں شوخی تھی۔ جواباً" انہوں نے ایک ہاتھ سے حنا کے ماتھے پر آئی لٹ سنوارتے ہوئے پیار سے کہا۔

"میں تو اپنی جانو کے بغیر بالکل ادھورا تھا۔ آج آئی ہو تو کچھ چین آئے گا۔"

ایبہا کے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑنے لگی۔ حلق خشک ہو گیا۔ پھر اچانک جیسے حنا کو یاد آیا تو وہ ان سے الگ ہو کر ایبہا کی طرف پلٹی۔

"انکل کو مجھ سے بہت پیار ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نا ان کی اپنی اولاد نہیں ہے۔" حنا اسے یاد دلا رہی تھی۔

ایبہا نے انکل کو سلام کرتے ہوئے اندر ہی اندر اپنی تنگ نظری پر خود کو ملامت کی۔

شاید وہ جن حالات سے گزر کے آئی تھی، وہ اسے شکی بنا گئے تھے۔ اونچے لمبے شان دار سے انکل ایبہا کا خوش دلی سے حال چال پوچھ رہے تھے۔

"حنا نے بتایا تھا مجھے فون پر تمہارے بارے میں۔ بہت دوستی ہے تم دونوں کی۔" وہ بڑے پیار سے ایبہا کو دیکھ

رہے تھے۔

"جی۔" وہ اپنی جگہ پر کسمسائی۔ "اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بس۔ اپنی بچی کو دیکھ لیا۔ سمجھو جان میں جان آگئی۔" وہ اب معنی خیز نظروں سے حنا کو دیکھ رہے تھے۔

"اور آپ کی مسز کہاں ہیں؟" ایبہا نے یونہی پوچھ لیا۔

"وہ۔ بیڈ روم میں آرام کر رہی ہیں۔ جوڑوں کا مسئلہ ہے نا۔ اسی لیے نیچے نہیں آئی ہوں گی۔" حنا نے جلدی سے بیان داغا تھا۔ پھر فوراً" ہی صفائی بھی پیش کر دی۔

"دراصل ۔۔۔۔ وہ اس وقت آرام ہی کر رہی ہوتی ہیں۔"

"ہاں بالکل۔ چلو نا بیڈ روم میں۔" انکل نے دو انگلیوں کی پشت سے حنا کے گال کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ان کی نگاہ حنا کی نگاہوں میں پیوست تھی، وہ کھل کے مسکرا دی۔

"کیوں نہیں۔ ضرور۔" پھر وہ ایبہا کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ببیا! تم ذرا دیر بیٹھو۔ میں آنٹی سے مل آؤں۔" وہی دانت نکوستا ملازم ان کے سامنے ٹیبل پر چائے اور ناشتا رکھنے لگا۔ وہی عجیب سی نگاہیں۔ ایبہا گھبرا گئی۔

"نن۔۔۔ نہیں۔ میں بھی چلتی ہوں۔ آنٹی سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔"

"سوری یار! مگر وہ اجنبیوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔" حنا کے صفاچٹ مگر معذرت خواہانہ انداز پر وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اسے حنا سے اس قدر بداخلاقی کی توقع نہ تھی۔ انکل اس کے شانے پہ ہاتھ پھیلائے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

"اور کچھ چاہیے تو بتا دیں۔" ملازم اس سے پوچھ رہا تھا۔

"نہیں۔" ایبہا نے قدرے رکھائی کا مظاہرہ کیا تو وہ منہ بناتا باہر چلا گیا۔ وقت گزاری کے لیے ایبہا نے ایک آدھ بسکٹ کترا۔ چائے کا کپ پی کر خالی کر دیا۔ مگر حنا کی واپسی نہ ہوئی۔ اس دوران وہی مشکوک سا ملازم کسی نہ کسی کام کے بہانے ادھر ادھر چکر لگاتا رہا۔ ایبہا کا دل گھبرانے لگا۔

"سنو۔۔۔" اس نے ملازم کو پکارا۔ وہ جیسے اسی انتظار میں تھا۔ لپک کر آیا۔

"حنا کو بلا دو ذرا۔۔۔" ایبہا نے تحکمانہ انداز اپنانے کی کوشش کی۔ (آخر کو حنا کے چچا کا گھر تھا۔)

"وہ۔۔۔ آپ کی دوست؟ جو اوپر صاحب کے بیڈ روم میں گئی ہیں؟" وہ اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وضاحت طلب کر رہا تھا۔ جیسے حنا کی حقیقت سے واقف ہی نہ ہو۔

"ہاں۔۔۔ بھتیجی ہے وہ تمہارے صاحب کی۔" ایبہا نے جتایا تو ملازم کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ پھر وہ بڑے استہزاء سے ہنسا۔

"جانتا ہوں میں۔ کون سا پہلی بار آئی ہیں۔۔۔ بھتیجی صاحبہ۔۔۔" طنز و استہزاء سے ہنستا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتا وہ چلا گیا۔ ایبہا خوف کا شکار ان وجود چھیدتی نگاہوں سے سمٹی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"یا اللہ۔۔۔ پاگل ہے یہ شخص شاید؟" اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑا ٹھی۔ اسے حنا پر سخت غصہ آیا اور اپنی کمزوری پر بھی۔ وہ کیوں منہ اٹھائے ہر جگہ حنا کے ساتھ چل پڑتی تھی۔

اسی غصے میں وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ وہ اس عجیب سے ماحول والے گھر میں مزید ایک لمحہ بھی نہیں رکنا چاہتی تھی۔

"جا رہی ہیں آپ؟" وہی ملازم باہر برآمدے میں ٹکرا گیا۔ ایبہا نے مضبوطی سے اپنے شانے پر لٹکے بیگ کی اسٹرپ کو پکڑا۔

"کیوں... تم سے مطلب...؟"
"اپنی سہیلی کو تو فارغ ہو لینے دیتیں۔" وہی معنی خیز سا لہجہ۔
"اُسے میرے جانے کا بتا دینا۔" وہ کہہ کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ گیٹ سے باہر نکلنے تک اس کی ٹانگیں لرزتی ہی رہیں۔ باہر روڈ پر آ کر اس نے سکون کی سانس لی۔

وہ دل ہی دل میں حنا سے برگشتہ تھی۔ جو اسے ساتھ لا کے یوں بھولی تھی جیسے وہ ساتھ موجود ہی نہ ہو اور ایسے ہی مواقع ہوتے تھے جب وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی تھی۔ سڑک کے کنارے چلتی وہ خود ترسی کا شکار تھی۔

وہ اپنی ماں کی بہت لاڈلی ہوا کرتی تھی۔ مگر اکثر یہ زمانہ لاڈلوں کے ساتھ بہت برا سلوک کرتا ہے۔ آنسو پیتی وہ غائب دماغی کی کیفیت میں رکشہ روکنے لگی۔



امتیاز احمد آفس میں میٹنگ کے بعد اس کے ہاتھ لگے۔
"مجھے آپ سے بات کرنی ہے ابو..." وہ احتجاجاً بولا۔
"بات تو مجھے بھی تم سے کرنی ہے۔" وہ آگے بڑھ کے اپنی ریوالونگ چیئر میں دھنس گئے۔
معیز ان کے مقابل بیٹھ گیا۔
"بات کرنے سے بات بنتی ہے۔ آگے بھاگنے سے نہیں۔" اس کے طنز کو پا کر امتیاز احمد نے سنجیدگی سے کہا۔
"بعض اوقات بات سے بھاگنے والے کچھ سوچ رہے ہوتے ہیں۔ شاید کسی نتیجے پر پہنچنے کی خاطر وقت لے رہے ہوتے ہیں یوں بھاگ کر۔"
"یہ قدم میری مرضی سے اٹھایا گیا تھا ابو! اور اب اگر اس رشتے کے بارے میں کوئی فیصلہ ہونا ہے تو اس میں بھی آپ کو میری مرضی کو اولیت دینی چاہیے۔ نہ کہ تین سال پہلے کی طرح خود فیصلہ کر کے بات میری فرماں برداری پر چھوڑ دی جائے۔" وہ سلگا تھا۔
چند ثانیوں تک وہ یوں ہی اسے دیکھتے رہے۔ پھر گویا تھک کر بولے۔ "تو پھر تم وہی کر لو جو تمہاری ماں کہتی ہے۔"
"کیا...؟" وہ نا سمجھنے والے انداز میں پوچھنے لگا۔
"شادی کر لو۔" معیز نے ان کی بات پر لب بھینچے، جیسے غصہ ضبط کیا ہو۔ پھر وہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے ترش لہجے میں بولا۔
"ایک بات تو طے ہے ابو! جب تک آپ اس لڑکی کو ہماری زندگی سے نہیں نکالیں گے میں ماما کی یہ خواہش کبھی بھی پوری نہیں کروں گا۔"
"معیز..." انہوں نے بے بس نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ نرم لہجوں کا عادی... اس موضوع پر آتے ہی پتھر برسانے لگتا تھا۔
کوئی اجنبی سا معیز۔
"سچی بات کہوں تو یہ دل اب ختم ہو رہا ہے معیز۔" وہ اداس سے ہونے لگے۔ تو معیز کے دل کو دھچکا لگا۔
"اور اس سے بھی زیادہ سچی بات یہ ہے کہ... اس دل کی خوشی کا نام ایبہا ہے۔"
انہوں نے تھک کر سیٹ سے ٹیک لگالی۔ معیز نے اس قدر نڈھال انہیں کبھی نہ دیکھا تھا۔ زرد رنگت، بجھا بجھا سا انداز۔

"ہاں... میں نے صالحہ سے محبت کی تھی اور کیوں نہ کرتا۔ منگیتر تھی وہ میری۔ میرے بچپن کی منگ۔ بڑا قدرتی لگاؤ تھا مجھے اس سے... اب اس پر بھی تمہاری ماں مجھے طعنے دے تو پھر... شاید وہی حق پر ہو۔"

انہوں نے کبھی... آج تک اپنے بچوں کے سامنے اس موضوع پر نہ تو بات کی تھی اور نہ ہی یوں صفائی پیش کی تھی۔ معیز کا دل گھبراہٹ کا شکار ہونے لگا۔

"تم نے دیکھا' وہ بے نام و نشان ہے۔ طوفان کی زد میں آئے معصوم سے پرندے کی مانند ہراساں و خائف۔ باپ اسے رقم کے عوض دینے کو راضی تھا' اس کی ماں اسے ہمارے حوالے کر کے رب سے جا ملی۔ اب بتاؤ' اگر ہم بھی اسے آسرا نہ دے سکے تو وہ کیا کرے گی؟"

ان کی کیفیت دیکھتے ہوئے معیز کا پارہ تیزی سے نیچے آیا۔ وہ اس موضوع پر اسی لہجے میں ان سے مزید بات نہیں کر سکتا تھا۔

"او کے... لیو دس ٹاپک۔" اس نے پہلو تہی کرنے کی کوشش کی۔

مگر وہ کسی اور ہی رو میں تھے۔ "یار... میں چاہتا ہوں' میں رہوں یا نہ رہوں' تم اس کا ساتھ دو یا نہ دو لیکن میرے گھر سے اس کا رشتہ کبھی ختم نہ ہو۔ وہ میرے نام سے جڑی رہے۔ میرے حوالے سے اس گھر میں رہے۔ وہ صالحہ کی بیٹی ہے معیز... میرے دل کے بہت قریب..."

ان کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھا' سینے کو مسلتا ان کا ہاتھ۔

معیز نے تیزی سے اٹھ کر ان کے میڈیکل باکس میں سے گولی نکال کر ان کی زبان کے نیچے رکھی۔

وہ غنودہ سی کیفیت میں یوں ہی ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ جب تک ان کی طبیعت سنبھل نہیں گئی' وہ یوں ہی ان کا ہاتھ تھامے ان کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی حالت نے اسے اندر تک ہلا دیا تھا۔ واپسی پر وہ زبردستی انہیں چیک اپ کے لیے لے گیا۔

"کچھ دنوں کے لیے ریلیف دیں انہیں۔ کام سے چھٹی کروائیں۔ اسٹریس فری رہیں گے تو طبیعت جلد سنبھلے گی۔ یہ ہارٹ پیشنٹ ہیں۔ انہیں زیادہ مسئلوں میں انوالو مت کریں۔" ڈاکٹر نے معیز کو سمجھایا۔

اور جو خود ہی مسئلے میں گھرا ہو' اس کا کیا؟

وہ سوچ کر رہ گیا۔



وہ کیا حنا سے ناراض ہوتی۔ حنا آکر اس پر خوب بگڑی۔ ایبہا نے صفائی پیش کرنا چاہی۔ مگر وہ تو اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔

"غضب خدا کا... چند لمحوں کی دیر کیا ہو گئی' تم یوں بھاگ لیں وہاں سے جیسے میں خدا جانے کہاں غائب ہو گئی ہوں۔" وہ غصے میں مسلسل پنڈولم بنی کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔

"اتنی دیر انتظار کیا میں نے۔" ایبہا کو اپنی حماقت کا احساس ہونے لگا۔

"تو... کیا مر گئی تھی میں؟ آواز دے لیتیں... بلوا لیتیں مجھے۔ انکل کے سامنے اتنی شرمندگی ہوئی مجھے۔" حنا اس پر حاوی تھی۔

"اچھا سوری۔ میں گھبرا گئی تھی۔"

"اسی لیے کہتی ہوں انسانوں میں اٹھا بیٹھا کرو۔ عادت پڑے تمہیں بھی۔" وہ اپنے کپڑے لیے گرمی گرمی کا شور کرتی نہانے چلی گئی۔

ایبہا نے گہری سانس کھینچی۔ اس کے تمام دلائل اندر ہی دم توڑ گئے تھے۔ وہ حنا سے شکایت کرنا چاہتی تھی۔ مگر حنا کی چرب زبانی کے آگے اس کی چلتی ہی کہاں تھی۔
ایبہا نے بستر کی چادر جھٹک کر ٹھیک کی تو حنا کا پرس نیچے جا گرا اور کھل گیا۔
ایبہا ٹھٹکی۔ پھر حیرت و بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ پرس جو دوپہر تک خالی ہو چکا تھا۔ اس وقت بڑے بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔
ایبہا نے گھبرا کر پرس بند کر کے تکیے کے پاس ڈال دیا تو کیا حنا اپنے انکل سے پیسے مانگ کے لائی ہے؟ اسے عجیب سا لگا۔ حنا گنگناتی ہوئی لوٹی تو ایبہا نے دل میں چبھتی یہ بات پوچھ ہی ڈالی۔
وہ گڑبڑائی۔ پھر بالوں کو تولیے سے آزاد کرتی اعتماد سے بولی۔
"چچی جان نے دیے ہیں۔ بڑی مہربان ہیں مجھ پر۔ تمہیں بتایا تو تھا ان کی اولاد نہیں ہے۔"
ایبہا مطمئن ہو گئی۔ حنا اب آئینے کے سامنے کھڑی بلند اور خوش گوار آواز میں گنگنا رہی تھی۔



"بیا۔ یار رباب کے بھائی کے نکاح کی تصویریں تو دیکھو چل کے۔" حنا نے آکر اسے آفر دی۔ وہ نوٹس بنانے میں محو تھی۔
"ہمارا کیا تعلق اس نک چڑھی سے... رہنے دو۔" ایبہا نے صاف انکار کیا۔
"میں تو دیکھ بھی آئی۔ اتنا زبردست کپل ہے اور کافی امیر فیملی ہے رباب کی۔"
وہی... خود اچھی خاصی فیملی سے تعلق ہونے کے باوجود امیر لوگوں سے امپریس ہونے کی بیماری۔ ایبہا نے اسے گھورا۔ پھر نصیحت کی۔
"بیٹھ جاؤ، بلکہ اپنے نوٹس کمپلیٹ کرو۔ فائنل ایگزیمز ہیں، پاس نہیں ہونا۔"
"کون کمبخت پاس ہونے کے لیے پڑھتا ہے۔ ہم تو بس ٹائم پاس کرنے کے لیے پڑھتے ہیں چندر مکھی۔" وہ دیوداس اسٹائل میں بولی تو ایبہا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جگمگا اٹھی۔
"چلو بھی... ساری لڑکیاں جمع ہیں وہاں۔" حنا نے بضد ہو کر اسے اٹھانا چاہا۔ تو وہ سنجیدہ ہو گئی۔
"تم بھول رہی ہو۔ پچھلے تین سالوں سے وہ ہر ٹیسٹ اور ہر ایگزیم میں مجھ سے مقابلہ کر رہی ہے... پکی دشمن ہے وہ میری۔"
"تو تم ہی کبھی دو چار نمبر پیچھے رہ جایا کرو اس سے۔ ہر بار پوزیشن لے کر کیوں اس کا دل خراب کرتی ہو۔" حنا نے مزاحیہ انداز میں کہا۔
"یہ پوزیشن لینا میری مجبوری ہے حنا! اپنی آئندہ پوزیشن بہتر بنانے کے لیے۔" وہ بس پژمردگی سے سوچ ہی سکی۔
"چلو نا یار! دیکھو تو کیا ہینڈسم لڑکے ہیں ان کی فیملی کے۔ بلکہ ڈیشنگ۔" وہ یقیناً "تصویریں" دیکھ کر بلکہ اچھی طرح دیکھ کر آئی تھی۔ حنا کی اپنی ہی فطرت تھی۔ مگر ایبہا کا نہ تو رباب کے بھائی کے نکاح کی تصویریں دیکھنے کا موڈ تھا اور نہ ہی ہینڈسم اور ڈیشنگ لڑکے۔
حنا اس کے پاس سے بڑبڑاتی ہوئی گئی تھی۔ ایبہا اطمینان سے اپنے نوٹس مکمل کرنے لگی۔



وہ بہت کوفت زدہ سا عون کے ساتھ پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

"تمہاری جگہ اگر میں اپنی بہن کی نند کو کالج سے پک کرنے جا رہا ہوتا تو اڑتا ہوا جاتا۔" عون نے جیسے اسے اس کی بدذوقی کا احساس دلایا۔
"تم صرف اپنی نہیں بلکہ کسی کی بھی بہن کی نند کو اڑتے ہوئے لینے جا سکتے ہو۔" معیز نے دانت پیسے۔
"ٹھنڈے دل سے سوچو گے تو کافی رومانس محسوس ہو گا اس سارے سلسلے میں۔" عون کے مشورے پر وہ رک کر تیکھی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔
"یہ رومانس کہاں سے آگیا بیچ میں؟"
"بہن کی نند اور بھائی کی سالی سے بڑھ کے اور کون سا رشتہ رومانٹک ہو سکتا ہے بھلا۔" وہ آنکھ دبا کر ہنسا تو معیز کا دل چاہا ایک گھونسا تو اسے رسید کر ہی دے۔
سفیر آؤٹ آف سٹی تھا۔ رباب نے ہی زارا سے کہا ہو گا۔ تب ہی زارا نے جھٹ رباب کو کالج سے پک کرنے کی ذمہ داری معیز پر ڈال دی۔
"ایزدمل رہا ہے نہ اس کے موبائل کی لائن... ورنہ اسی سے کہتی۔" زارا نے ریکویسٹ کی تھی۔ سو اسے ہاں کرتے ہی بنی اور اب اسی بات کو لے کر عون اسے چھیڑ رہا تھا۔ عون اپنی بائیک نکالنے لگا' معیز نے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔
وہ آج تک زارا کو اس کے کالج سے لینے نہیں گیا تھا۔ کجا اس کی نند کی ذمہ داری... وہ حد درجہ کوفت کا شکار تھا۔ رباب مسکراتی ہوئی بے زار کھڑے معیز کی طرف بڑھی۔ "ہیلو..."
معیز نے بدقت تمام ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلائی۔
اپنی دھن میں چلتی ایبھا کو حنا نے کہنی سے ٹھوکا دے کر متوجہ کیا۔
"وہ دیکھو... رباب جا رہی ہے ہینڈسم ہیرو کے ساتھ۔" ایبھا کو اس کی ایسی حرکتوں سے چڑ تھی۔ مگر پھر بھی بے اختیار ہی اس نے مڑ کر دیکھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے معیز احمد کو دیکھ کر وہ جہاں کی تہاں رہ گئی۔ انجان سی دہشت پل بھر میں اس کا گھیراؤ کر گئی تھی۔
"تیزی دیکھو اس لڑکی کی۔ بھابھی رخصت ہو کر آئی نہیں اور اس نے بھابھی کے بھائی کو اپنے چکر میں پھنسا بھی لیا۔" حنا کہہ رہی تھی۔ (تو یہ سمدھیانہ تھا امتیاز احمد کا... رباب کی فیملی؟)
ایبھا کو احساس ہوا کہ اس پر زندگی کے دروازے بند کرنے والے خود زندگی سے ہر طرح کا لطف کشید کرنے میں مصروف تھے۔ اس کا دل عجیب سے جذبات کا شکار ہونے لگا۔
اور اسی شام... اس نے اسی بگڑتی کیفیت میں امتیاز احمد کو فون کیا تو ان کا آفس ٹائم ختم ہونے ہی والا تھا۔ لائن ملتے ہی وہ بنا سلام دعا کے سپاٹ لہجے میں بولی۔
"مجھے آزاد کر دیں امتیاز احمد صاحب..."
"جی..." وہ شاید حیران ہوئے۔ ایبھا کو ان کی اداکاری پر غصہ آیا۔ اس کا نام تو اسکرین پر دیکھ ہی چکے ہوں گے۔
"سمجھ میں نہیں آیا آپ کے... طلاق چاہیے۔ آزادی چاہیے مجھے اس بندھن سے۔"
"جی ضرور... کیوں نہیں۔ معیز احمد بات کر رہا ہوں میں۔" دوسری طرف سے انتہائی کاٹ دار لہجے میں کہا گیا تو ایبھا کو خون اپنی رگوں میں منجمد ہوتا محسوس ہوا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ امتیاز احمد کی کال معیز بھی اٹینڈ کر سکتا ہے۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

تنظیر فاطمہ



جیسے ہی بائیس دسمبر کے بعد دن بڑھنا شروع ہوتے ہیں، میرا دل گھٹنا شروع ہو جاتا ہے کہ گرمیوں کی طرف سفر شروع ہو گیا۔ پچھلے تین سالوں سے میں گرمیوں سے سخت تنگ آئی ہوئی ہوں۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ ایک میری اسکن الرجی اور دوسری بھنڈی۔

پچھلے تین سال سے میرے چہرے اور ہاتھوں کی جلد گرمیوں کی دھوپ اور تپش سے اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ کیا بتاؤں۔ دھوپ میں باہر نکلتے وقت یا چولہے کے پاس جاتے ہوئے چہرے پر ڈھیروں ڈھارسن بلاک (اسکن اسپیشلسٹ کے مشورے سے) ملنے کے باوجود گرمیوں میں کم از کم دو دو بار میری جلد اتنی شدید متاثر ہوتی ہے کہ میں منہ اور ہاتھ چھپائے پھرتی ہوں اور میری ساری گرمیاں اسکن اسپیشلسٹ کے چکر لگاتے ہوئے گزر جاتی ہیں۔ باہر نکلنے سے پرہیز، چولہے کے پاس جانے سے پرہیز، اینٹی الرجی لینا، چہرے اور ہاتھوں پر مختلف اوقات میں ڈاکٹر صاحب کی تجویز کردہ کریمیں ملنا، اف خدایا... اس چکر میں تو میں بالکل پاگل ہو کر رہ جاتی ہوں۔

گرمیوں سے عاجز آنے کی دوسری وجہ ہے بھنڈی... جی ہاں بھنڈی جو کہ ایک مزے دار سبزی ہے، جو تقریباً" سب ہی کو پسند ہوتی ہے۔ جی بالکل آپ سب کی طرح مجھے بھی بہت پسند ہے۔ مگر پچھلے تین سالوں میں اس بھنڈی نے ہمیں جتنا ستایا ہے شاید ہی کسی چیز نے اتنا تنگ کیا ہو۔

میری امی کے ہاتھ کی بنی ہوئی بھنڈیاں خاندان بھر میں مشہور ہیں مگر اب وہ بھی یہ سمجھتی ہیں کہ شاید انہیں بھنڈیاں پکانا بھول گئی ہیں۔ اس کی وجہ جانتے ہیں آپ لوگ؟ چلیے میں بتاتی ہوں غور سے سنیے۔

اس کی وجہ ہے میرا بھائی سلمان۔ تقریباً" تین سال پہلے وہ اپنے دوست مدثر سے ملنے حافظ آباد گیا۔ وہاں اس کی بھابھی کے ہاتھ کی بنی ہوئی بھنڈیاں کھانے کے بعد اس کی ایسی مت ماری گئی کہ گھر آتے ہی شروع ہو گیا۔

"اف کیا بھنڈیاں بنائی تھیں مدثر کی بھابھی نے۔"

ہم سب نے اس کی اس تعریف کو ذرا بھی سیریس نہیں لیا۔ بھئی بہت سی خواتین بڑا اچھا کھانا پکاتی ہیں جیسا کہ میری امی... تو ایسی خواتین کی تعریف کرنی بھی چاہیے مگر ہمیں کیا معلوم تھا کہ آگے چل کر ان بھنڈیوں کے حوالے سے ہمارا کیا حشر ہونے والا ہے۔

☼ ☼ ☼

اس واقعے کے تھوڑے دنوں بعد ہم نے بھنڈیاں بنائیں تو سالن کی پلیٹ دیکھتے ہی سلمان بولا۔

"امی! آپ نے یہ کیسی بھنڈیاں بنائی ہیں۔ آپ بھی مدثر کی بھابھی کی طرح بھنڈیاں بنائیں۔" اس کی بات پر امی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

"چلو چپ کر کے کھانا کھاؤ۔ آج تک تو میں ایسے ہی بھنڈیاں پکاتی آئی ہوں۔ اب کیا برائی نظر آگئی تمہیں اس میں۔" امی کو اس کی بات ناگوار گزری تھی۔

"امی! میں نے یہ تو نہیں کہا کہ آپ کی بھنڈیاں اچھی نہیں ہیں بلکہ میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ بھنڈیاں بناتے وقت مدثر کی بھابھی کی طرح پیاز اور ٹماٹر زیادہ ڈال لیا کریں بس۔" اس نے امی کے ہاتھ تھام لیے۔

امی نے جب دوبارہ بھنڈیاں بنائیں تو اس میں پیاز اور ٹماٹر زیادہ ڈال دیے مگر سلمان صاحب پھر بھی مدثر کی بھابی کی بھنڈیاں کی تعریف میں لگے رہے۔

اس کے بعد امی نے کئی بار بھنڈیوں کی ریسپی بدل بدل کر دیکھا مگر ہمارے بھائی صاحب ان بھنڈیوں کا ذائقہ نہ بھلا سکے جو مدثر کی بھابھی نے بنائی تھیں۔

اس کے بعد سے اب یہ ہوتا ہے کہ گرمیوں میں جب بھی ہمارے ہاں بھنڈیاں پکتی ہیں، مدثر کی بھابھی کی تعریفیں شروع ہو جاتی ہیں۔ جس پر کبھی تو امی خاموش ہو جاتی ہیں اور کبھی اسے بے بھاؤ کی سناتی ہیں مگر نتیجہ صفر تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اسی بات پر دونوں ماں بیٹے میں تکرار ہوئی تھی۔ امی نے بھنڈی گوشت بنایا تھا اور سلمان صاحب کی وہی تان۔ بس کیا تھا، امی نے اس کے سامنے سے بھنڈی گوشت کی پلیٹ اٹھا کر رات کی بنی ہوئی دال اس کے سامنے رکھ دی تو وہ منہ بسور کر رہ گیا۔

پچھلے تین سالوں سے یہ سب سن سن کر ہم سب گھر والے تنگ آچکے ہیں۔ دو تین دفعہ میں نے بھی زیادہ پیاز ڈال کر بھنڈیاں بنانے کی کوشش کی کہ چلو میرا بھائی خوش ہو جائے مگر بے سود۔

"بیا! یہ لڑکا تو مجھے پاگل کر دے گا۔ پتا نہیں کیا کھا لیا ہے اس نے حافظ آباد میں کہ اب اسے کسی کی پکائی ہوئی بھنڈیاں پسند ہی نہیں آتیں۔" امی اس کی آئے



روز کی تکرار سے بے زار ہو گئی تھیں۔ تھوڑی دیر پہلے سلمان امی کے ہاتھ کی بنی بھنڈیاں کھا کر "مدثر کی بھابھی" کی بھنڈیوں کی تعریف کر کے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! مدثر کی امی اور بھابھی آج دوپہر کو ہمارے گھر آئیں گی۔ آپ ان کے کھانے کا بندوبست کر لیجیے گا۔ وہ دونوں مدثر کے بھتیجے کو چیک اپ کے لیے لاہور لے کر آئی ہیں۔ میں انہیں دوپہر میں اپنے ساتھ لے آؤں گا۔" سلمان نے فون پر امی کو اطلاع دی۔

"بیا! آج میں مدثر کی بھابھی سے بھنڈیاں بنانے کی ترکیب ضرور پوچھوں گی۔" امی کو ان کے آنے سے

زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ وہ بھی ان جیسی بھنڈیاں بنا سکیں گی۔

خیر امی اور میں نے مل کر ان لوگوں کے لیے چکن بریانی، قورمہ، سلاد اور رائتہ بنالیا۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ہم سارا کام کر کے فارغ ہو گئی تھیں۔



"آنٹی! آپ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے۔" مدثر کی بھابھی نے کھانا کھاتے ہوئے امی کی تعریف کی۔ مدثر کی امی نے اپنی بہو کی تائید کی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس وقت سلمان بھی موجود تھا۔

"بس بیٹا! تمہاری محبت ہے۔ میں نے تو تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے کھانے کی بھی بہت تعریف سنی ہے۔ خاص طور پر بھنڈیوں کی۔" امی فوراً اصل موضوع کی طرف آگئیں۔

"کہاں آنٹی! تین سال پہلے جب میں بیاہ کر آئی تھی تو کچھ بھی پکانا نہیں آتا تھا۔ اب امی سے سیکھ کر گزارے لائق بنالیتی ہوں۔" اس نے اپنی ساس کی طرف بہت محبت سے دیکھا۔ انہیں دیکھ کر لگ رہا تھا کہ دونوں کے تعلقات کافی اچھے ہیں۔

"مگر یہ سلمان تو تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی بھنڈیوں کی بہت تعریف کرتا ہے۔" امی نے اس کی توجہ سلمان کی طرف دلائی جو کھانا کھانے کے دوران ان کی باتیں بھی سن رہا تھا۔

"سلمان؟" اس نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے کب میرے ہاتھ کی بنی ہوئی بھنڈیاں کھائی ہیں؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بھابھی! تین سال پہلے جب میں مدثر سے ملنے گیا تھا۔ تب آپ کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔" اس نے یاد دلایا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"ارے! تمہیں وہ بھنڈیاں ابھی تک یاد ہیں؟" اس نے ہنسی کے درمیان پوچھا۔

"ایسی ویسی یاد ہیں بیٹا! اس کے بعد تو اسے کسی کے ہاتھ کی پکی ہوئی بھنڈیاں پسند ہی نہیں آئیں۔" امی بے چارگی سے بولیں۔

"ہائے آنٹی نہ کریں پلیز۔" اس نے اپنی ہنسی پر قابو پا کر بات جاری رکھی۔

"جب سلمان ہمارے گھر آیا تھا اس وقت میری نئی نئی شادی ہوئی تھی اور کوکنگ تو مجھے بالکل نہیں آتی تھی۔ جس وقت یہ ہمارے ہاں پہنچا اس وقت امی گھر پر موجود نہیں تھیں۔ ہم لوگ دوپہر کا کھانا کھا چکے تھے۔ مدثر نے مجھے کھانے کا انتظام کرنے کا کہا تو میں پریشان ہو گئی۔ اب میں اسے کیسے بتاتی کہ مجھے کھانا بنانا نہیں آتا۔ خیر میں نے فریج کا جائزہ لیا تو صرف دو شامی کباب اور رات کی بنی ہوئی تھوڑی سی بھنڈیاں موجود تھیں، جو ایک آدمی کے لئے ناکافی تھیں۔ میں نے سوچ بچار کے بعد ایک بڑے سائز کی پیاز کاٹی، اس میں دو ٹماٹر اور نمک مرچ ڈال کر اسے اچھی طرح بھونا اور وہ بچی ہوئی بھنڈیاں اس میں ڈال دیں یوں سالن تیار ہو گیا۔ روٹیاں میں نے بازار سے منگوالیں۔ جتنی دیر میں روٹیاں آئیں۔ میں نے ایک پیالی رائتہ بھی بنالیا۔ اس طرح سالن، شامی کباب، رائتہ اور روٹیاں ٹرے میں سجا کر میں نے ڈرائنگ روم میں بھجوادیں۔ فریج میں آئس کریم بھی موجود تھی، وہ میں نے میٹھے کے طور پر بھجوادی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میری عزت رہ گئی۔"

وہ اس واقعے کو یاد کر کے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کی ساس کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔

"میں اکثر اپنا مذاق اڑاتے ہوئے امی سے کہتی تھی کہ سلمان بھی کیا یاد کرے گا کہ کیسی مزے دار بھنڈیاں تھیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ واقعی اسے یاد رہیں گی۔" وہ پھر ہنسی۔

امی اور میں نے بیک وقت سلمان کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خجالت تھی۔ وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر چلا گیا اور میں نے سکھ کا سانس لیا کہ اب "مدثر کی بھابھی کی بھنڈیاں" ان کی نیندیں حرام نہیں کریں گی۔

سمیرا یونس ہارون



"یہ کراچی کے لاڈلے اور چہیتے بادل۔" سمن نے ایک ناراض سی نگاہ اوپر آسمان پر ڈالی۔

"نہیں یہاں وی آئی پی پروٹوکول ملتا ہے۔ سو نخرے بھی خوب دکھاتے ہیں۔ دم بھر کو گرجے، چمکے اور اپنا بھیگا دامن نچوڑ کے چل دیے آگے کو۔" اس نے چھتری بند کی۔ اس کی نوک کو زمین پر مار کر پانی جھاڑا اور چھتری بغل میں دبالی۔

بارش مکمل طور پر تھمی نہیں تھی۔ ہلکی پھوار اب بھی جاری تھی۔ سو چھتری بند کر دینے کے باعث سمن کے ساتھ وہ بھی بھیگنے لگی۔

زارا نے نگاہ اٹھا کر پانی سے لبالب بھرے بادلوں کو دیکھا اور پھر دور تک سنسان پڑی سڑک کو۔

"یار!" اس نے گہرا سانس لے کر پلٹ کر اپنے پیچھے کچھ رونق تلاش کرنا چاہی تو اسے کافی دور رولی اور عباس بھیگے موسم کا لطف لیتے، چہل قدمی کرتے نظر آئے۔

"یہ زندگی قصے کہانیوں سے اتنی مختلف کیوں ہوتی ہے۔ اگر ہوتا کوئی افسانہ یا فلم تو اس خوب صورت موسم میں چہل قدمی کرتی مجھ جیسی حسین لڑکی کے لیے کوئی ہیرو کہیں نہ کہیں سے ضرور نمودار ہو ہی جاتا۔" اس نے مایوسی سے اردگرد ہیرو تلاش کرتے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے، کوئی ہیرو خاص تمہارے لیے ہی اس بھیگے موسم میں گھر سے نکلا ہو۔" سمن نے اردگرد کا نظارہ کرتے ہوئے دانستہ سرسری لہجے میں کہا۔

زارا جانتی تھی، سمن کا اشارہ کس سمت ہے۔ مگر اسے سمن کی اس بات سے کبھی اتفاق نہیں رہا تھا۔ سو

اس وقت بھی نظر انداز کرنا از بس ضروری ٹھہرا۔

"ایک وہ ہیں مسٹر ہینڈسم!" اس نے دور انکل زید کے بنگلے کے ٹیرس پہ چائے کا مگ ہاتھ میں لیے کھڑے ان کے بیٹے ارسلان زید کو دیکھا۔ جو ڈیڑھ ماہ قبل انگلینڈ سے آیا تھا اور پچھلے ڈیڑھ ماہ سے ہی وہ شام کا وقت ٹیرس پہ اسی باقاعدگی سے گزارتا تھا۔ جس باقاعدگی سے زارا شام کی واک کسی فرض کی طرح نبھاتی تھی۔

"دور سے کھڑے بس گھورتے رہیں گے۔ ان سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ آکے کہیں۔ "ایکسکیوز می میم! ایسا لگتا ہے۔ میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" یا پھر۔" جملہ لبوں میں رہ گیا۔ نگاہیں اس ہینڈسم پر جمی تھیں اور دھیان بھی۔ سو پیر پھسلا اور ایک بے ہنگم شور کے ساتھ وہ تین، چار فٹ تک پھسلتی چلی گئی۔ لبوں سے نکلنے والی چیخ اس شور میں کہیں دب سی گئی۔

سمن نے اس صورت حال کو دیکھا تو بوکھلا گئی۔ چونکہ پھسلنے کی رفتار، چلنے کی رفتار سے زیادہ ہوتی ہے۔ سو اس کے اور زارا کے مابین کافی فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ جسے اس نے بعجلت پاٹا اور زارا کے بالمقابل آئی۔ قدموں کا رخ بدلا تھا۔ سو نگاہوں کا رخ بدلنا لازم ٹھہرا۔ نتیجتاً" ولی اور عباس، سمن کی نگاہوں کی زد میں بھی آئے۔

عباس نے قریب سے گزرتے بلال کی سائیکل لی اور اس پر سوار ہو گیا۔ سمن نے دیکھا۔ وہ دو پیڈل میں ہی یہاں پہنچنے والا ہے۔ سو اس کی ڈھارس بندھی۔ وہ مسکرا کر گیلے فرش پر دو زانو بیٹھی اور انکل زید کے ٹیرس کی جانب نگاہ کی۔

وہ ہینڈسم تمہیں تکلیف میں نہ دیکھ سکا۔ سو چلا گیا۔ کیا خیال ہے، کچھ انتظار نہ کرلیں؟ شاید کوئی ہیرو آہی جائے، تمہاری مدد اور محبت کے جذبے سے سرشار دل لیے۔"

لبوں پہ مچلتی شرارتی مسکراہٹ کو زارا نے روٹھی نگاہوں سے دیکھا اور خاموش رہی۔ بائیں پیر میں موچ آگئی تھی۔ اس نے لب بھینچ کر سامنے پھیلی ٹانگ موڑی۔

"کیا ہوا؟ زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟" اسی پل عباس نے سائیکل کھڑی کی اور اس کے مقابل دو زانو بیٹھ کر استفسار کیا۔

اس نے ایک نظر عباس کو دیکھا۔

"نہیں! چوٹ کیسی؟ چوٹ تو گرنے کی صورت میں آتی ہے۔ میں تو جھولے لے رہی تھی۔" اس نے جل کر سوچا ضرور۔ مگر کہا کچھ نہیں اور اٹھنے کی سعی کرنے لگی۔ نتیجتاً" کراہ کر دوبارہ بیٹھ رہی۔

عباس فوراً" اٹھ کھڑا ہوا اور سائیکل تک پہنچا۔

"سمن! یہ چل نہیں پائے گی۔ اسے سہارا دے کر سائیکل تک لے آؤ۔"

اس نے بوکھلا کے گردن موڑی۔ وہ سائیکل کا ہینڈل پکڑے منتظر کھڑا تھا۔

"میں اس کے ساتھ سائیکل پہ بیٹھوں گی کیا؟" بوکھلاہٹ میں سمن سے کیا گیا استفسار سرگوشیانہ لہجے میں ضرور تھا۔ مگر فاصلہ زیادہ نہ ہونے کے باعث عباس کی سماعت تک بخوبی پہنچا۔

"کیا مضائقہ ہے؟ چندراوتی تو شباب کے ساتھ سائیکل پہ سارا شہر گھوما کرتی تھی۔ بیسویں صدی میں جب اسے معیوب نہیں سمجھا گیا تو اب تو زمانہ کافی ماڈرن ہو گیا ہے۔" سمن کی غیر سنجیدگی پر وہ چڑ گئی۔

"جب تمہیں لگے کہ تمہارے لبوں سے کوئی معقول بات برآمد نہیں ہوگی۔۔۔ تو خاموش ہی رہا کرو۔" وہ سمن کی مدد سے کھڑی ہو گئی۔

"ولی!" عباس نے بلال کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ولی کو آواز دی۔ جو خراماں خراماں چلنے کے باعث ان سے اب بھی قدرے دور تھا۔

"جلدی آیار!" ولی نے قدموں کی رفتار بڑھائی اور دوسرے پل ان کے مقابل تھا۔

"زارا کو سائیکل پر گھر لے جاؤ۔ اس کے پیر میں موچ آگئی ہے۔" اس نے سائیکل ولی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"کمال ہے۔ بلال سے تو سائیکل لے کر یوں بھاگے تھے۔ جیسے اگر ذرا بھی تاخیر ہو گئی تو نمبر کٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ اس وقت ہی مجھ سے کہہ دیتے۔" وہ اچک کر سائیکل پر سوار ہوا اور سائیکل بالکل زارا کے قریب لے آیا۔

"اصولاً" تو یہ شتابی تمہیں دکھانی چاہیے تھی۔ آخر کو میرے سگے اور اکلوتے بھائی ہو۔" سمن اور ولی کی مدد سے سائیکل پر بیٹھنے کے بعد اس نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

"یقیناً" میں ہی دکھاتا۔ اگر عباس صاحب صورت حال بھانپتے ہی سوچنے کا موقع فراہم کیے بنا بے قابو ہو کر دوڑ نہ پڑتے۔" ولی نے حقیقت واضح کی۔

عباس جھینپ کر سر کھجانے لگا۔ "تم بخوبی جانتے ہو کہ میں کسی بھی شخص کو تکلیف میں دیکھوں تو فوراً" مدد کو پہنچتا ہوں۔"

"خوامخواہ کی صفائی۔" سمن نے زارا کی، خفگی کے خیال سے لبوں تک آتی معنی خیز مسکراہٹ کو بدقت روکا۔ ولی نے البتہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔

"ہاں! یہ کسی بھی شخص کی مدد کے لیے یوں ہی بے چین ہو کے دوڑتے ہیں۔ سارے جہان کا درد ان ہی کے جگر میں تو ہے۔" وہ بے سبب ہی کڑھنے لگی۔

"ہاں بالکل۔۔۔ یہ بات تو میں اس روز سے جانتا ہوں۔ جب مومنہ کا ہاتھ جلنے پر اشفاق چچا سے پہلے تم اسے لے کر ڈاکٹر کے پاس بھاگے تھے۔"

اس بار عباس بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ ابو کے خالہ زاد بھائی اشفاق احمد اپنی اکلوتی بیٹی مومنہ کے ہمراہ قریب ہی رہائش تھے۔ بیوی کو جدا ہوئے برسوں بیت چکے تھے۔ بڑھاپے، دمہ اور جوڑوں کے درد نے انہیں کسی بھی قسم کی مشقت کے قابل نہیں رکھا تھا۔ سو گزر بسر گاؤں میں موجود زمینوں کی آمدن سے ہوتی تھی۔ بھائیوں کے تصرف میں رہنے والی زمینوں سے ان کا حصہ ہر ماہ باقاعدگی سے مل جاتا تھا۔ جس کے سبب فکر معاش کی آزادی تھی۔

"اوئے! میں تجھے سائیکل دینے نہیں آؤں گا۔ خود ہی آکر لے جانا۔" ولی نے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوئے بلال سے کہا، جو کب سے خاموشی سے کھڑا ان کی بے تکی گفتگو سے بور ہو رہا تھا۔ صرف اپنی سائیکل کی خاطر۔

"یا اللہ مدد! یار زارا! کتنی وزنی ہو تم۔ مجھ سے تو سائیکل چلانا دشوار ہوا جا رہا ہے۔" اس نے اللہ سے مدد مانگتے ہوئے زارا کو چڑایا۔ مگر وہ خاموش رہی۔ دل پر اداسی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کیوں؟ سبب وہ خود بھی جاننے سے قاصر تھی۔

"پیڈل پر ٹانگیں مارتے کہیں میرے پاؤں میں بھی موچ نہ آجائے۔" اس نے سابقہ لہجے میں کہا۔

"یار! پیر کے ساتھ کہیں تمہاری زبان میں بھی تو موچ نہیں آگئی؟" زارا کی مسلسل خاموشی پر اس نے مصنوعی پر تشویش لہجے میں کہا۔ مگر وہ ہنوز "صم" بکم کی تفسیر بنی رہی۔

"تمہاری خاموشی بتا رہی ہے، ایسا ہی ہے، خدانخواستہ۔" وہ گویا اسے بولنے پر اکسا رہا تھا۔

دل بوجھل تو پہلے ہی تھا۔ سو بہانہ ہاتھ آیا اور وہ زارو زار رونے لگی۔ ولی غیر متوقع صورت حال پہ ایک دم بوکھلایا۔

"یار زارا! مذاق کر رہا تھا، قسم سے۔" وہ منتیں کرنے لگا۔ مگر وہ اس کے سینے سے ماتھا ٹکائے روئے چلی گئی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس طرح ولی کو سائیکل کا توازن قائم رکھنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"قبل اس کے کہ وہ لہرا کے زمین بوس ہوتی۔ کوئی مہربان ہاتھ غیبی مدد کی طرح آگے بڑھا اور اسے تھام لیا۔ "سنبھل کے محترمہ۔"

اس نے اکتا کر ڈائجسٹ کو اپنے برابر الٹا دھر دیا۔

"یہ رائٹرز بھی نا! نہ جانے کس دیس کی کہانیاں لکھتی ہیں۔" وہ لاؤنج کے تھری سیٹر صوفے پر بائیں ٹانگ سامنے سینٹرل ٹیبل پر پھیلائے بیٹھی تھی۔ سمن نے اپنی نصاب کی کتاب سے نظریں اٹھا کر

اپنے اور اس کے درمیان موجود ڈائجسٹ پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس پر۔

"یہاں تو ہم لہرا کے بل کھا کے زمین بوس بھی ہو گئے۔ مگر کوئی مہربان ہاتھ کہیں سے نمودار نہ ہوا' جو کسی کہانی کے ہیرو کی طرح عین وقت پہ آ کے ہمیں بچا لیتا۔" اسے خدا جانے کس بات کا قلق تھا۔ زمین بوس ہو جانے کا یا عین وقت پر کسی مہربان کے نہ آنے کا۔

"عین وقت پر نہ سہی' مگر کوئی مہربان آیا ضرور تھا۔ اگر تم ذہن پر زور ڈالو تو یاد آ جائے گا۔ زیادہ پرانی بات نہیں۔"

"تم جس شخص کی بات کر رہی ہو۔ وہ سب پر ہی ایسی عنایات کرتا رہتا ہے۔ تم خوامخواہ ہی اسے میرا ہیرو بنانے پر تلی ہوئی ہو۔" سمن کی اس ایک بات کو اس نے نہ پہلے کبھی مانا تھا اور نہ ہی اب ماننے کو تیار تھی۔

"سمن یار! آج چائے نہیں ملے گی کیا؟" عقب سے نمودار ہو کر عباس سامنے آیا تو وہ دونوں ہی چونک اٹھیں۔ ابو ابھی آفس سے لوٹے نہیں تھے اور امی' ولی کے ساتھ اشفاق چچا کی طرف گئی تھیں۔ سو اپنی ازلی سستی کے باعث تاخیر تو ہونا ہی تھی۔

"اوہ سوری!" سمن نے گھڑی کی جانب نگاہ کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ "بس ابھی لائی۔"

"کہیں اس نے میری گوہر افشانی سن تو نہیں لی۔" اس نے بغور عباس کی صورت دیکھی۔

عباس نے اس کی نگاہیں اپنے چہرے پہ محسوس کیں اور آستین موڑتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"جاسوس کہیں کا! اب کن سوئیاں بھی لینے لگا۔" منہ پہ کہہ دینے کی شدید خواہش کو دل میں دباتے ہوئے اس نے نگاہیں پھیریں۔

"تمہارے پاؤں کی تکلیف میں کمی ہوئی؟" وہ صوفے پہ سمن کی خالی کی ہوئی جگہ پہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ موچ تین دن پرانی تھی۔ سو اب تکلیف اسی وقت محسوس ہوتی تھی۔ جب پیر پر دباؤ پڑتا تھا۔ مگر وہ ہلکی تکلیف قابل برداشت ہوتی تھی۔ سو وہ سہار لیتی۔

"سنو زارا!" سیڑھیوں تک پہنچنے سے قبل اس نے اپنے عقب میں اس کی آواز سنی تو پلٹی۔

"زندگی قصے' کہانیوں سے مختلف ہوتی ہے۔ کہانیوں جیسی صورت حال' حقیقی زندگی میں ذرا کم ہی پیدا ہوتی ہے۔ سو اگر اس کی خواہش بھی کرو گی تو مایوسی ہو گی۔"

اسے شک تھا کہ اس کے شاندار خیالات عباس کی سماعت تک پہنچ چکے ہیں۔ مگر عباس کی سنجیدگی سے کی گئی نصیحت سے اس کا شک فوراً" یقین میں بدلا۔

"اوہ خدا! شاید اس نے سب کچھ ہی سن لیا ہے۔" اس اندیشے کو تقویت ملی تو وہ خفیف ہوئی۔ "یہ آخر دوران گفتگو ارد گرد کا ہوش کیوں نہیں رہتا مجھے؟"

خفت کا احساس بڑھا تو اس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے قدم اوپر کی جانب بڑھا دیے۔ آخری زینے پر قدم رکھ کر اس نے یوں ہی پلٹ کر دیکھا۔

وہ صوفے پہ ڈائجسٹ الٹا دھر آئی تھی۔ سو اب وہی صفحہ عباس کے زیر نظر تھا۔ جسے پڑھنے کے بعد اس نے اپنے "اعلا وارفع" خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس نے دیکھا عباس کے ہونٹوں پہ مسکان' جبکہ نگاہیں ڈائجسٹ پر تھیں۔

☼ ☼ ☼

شام سے کلفٹن کے اس پوش علاقے کی گلیوں کا طول ناپنا اس کے معمول کا حصہ بھی تھا اور مشغلہ بھی۔ مگر پیر میں آ جانے والی موچ کے سبب معمول میں تبدیلی آئی تھی اور مشغلہ کچھ روز کے لیے چھوٹا تھا۔ سو آج کافی دنوں بعد وہ چہل قدمی کے لیے نکلی تھی۔ انکل زید کے بنگلے کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا نگاہ اٹھائی۔ وہ ٹیرس پہ کھڑا اسی کی طرف متوجہ تھا۔ سو جوں ہی آنکھیں چار ہوئیں' وہ یوں مسکرایا جیسے کوئی پرانی شناسائی ہو۔ زارا نے سٹپٹا کے نگاہوں کا رخ بدلا اور تیز قدموں سے آگے ہو لی۔

موسم آج بھی قدرے خوش گوار تھا۔ آسمان پر آوارہ اڑتی پھرتی بادلوں کی ٹکڑیاں جب سورج کو ڈھانپتیں تو دم بھر کے لیے چھانے والا نیم اندھیرا ماحول کو پر کیف بنا دیتا۔ کافی آگے جا کر اس نے واپسی کی راہ پہ قدم موڑے۔ انکل زید کا ٹیرس اب سونا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

"اف۔۔۔ میں بھلا کیوں اس کی موجودگی اور عدم موجودگی کا نوٹس لینے لگی ہوں؟" اس نے سر جھٹک کر خود کو جھڑکا۔ دفعتاً" اس نے اپنے پیچھے چاپ سنی۔

"ہیلو!" کوئی اس کے ہم قدم ہوا۔

اس نے آواز کے تعاقب میں گردن موڑ کے اپنی دائیں جانب دیکھا تو جانا۔ موسم' بادل' پھول سب کا حسن سمٹ کر اس ایک وجود میں سما گیا ہو۔ اس نے زارا کو پھر اپنی اسی مسکراہٹ سے نوازا' جسے دیکھ کر وہ سٹپٹا گئی تھی' تو بدتہذیبی۔ مگر اس نے نہ اس کے ہیلو کا جواب دیا' نہ مسکراہٹ کا۔ مگر وہ قطعی مایوس نہیں ہوا۔

"آج موسم بڑا خوش گوار ہے۔۔۔ ہے نا؟" وہ یوں مخاطب تھا۔ جیسے ان کے درمیان نہایت گہری دوستی ہو۔

"معاف کیجئے گا۔ مجھے لگ رہا ہے شاید آپ کو مجھ پہ کسی اور کا گمان گزرا ہے۔" اس کے بے تکلف انداز سے زارا کو واقعی یہی لگا تھا۔ جواباً" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا اور بولا۔

"چند روز پیشتر بارش کے پانی سے آپ کا پیر پھسل گیا تھا۔ شاید موچ بھی آئی تھی۔" وہ گویا اس کی بات کا جواب دے رہا تھا۔

"اب ٹھیک ہے پاؤں؟" وہی دوستانہ لب و لہجہ۔

"جی!" اب کی بار جواب دینا لازمی ٹھہرا۔ سو اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"ویسے میں آپ کو پہچان نہیں پائی۔" وہ بلاوجہ ہی بے تکلف ہو رہا تھا۔ سو اس نے جتلایا۔

"بھلا کیسے پہچانیں گی۔۔۔ پہلی بار جو مل رہے ہیں۔" وہ مسکرایا۔

"ویسے میرا نام ارسلان زید ہے۔ تین سال قبل چند کورسز کے لیے لندن گیا تھا۔ دو ماہ پہلے ہی آیا ہوں۔ آج کل اپنے والد کا بزنس ہینڈل کر رہا ہوں۔" وہ زارا کی بے زاری کو اہمیت دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ سو کہتا چلا گیا۔

"اچھا!" اب کی بار زارا اخلاقاً" مسکرائی۔

"آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"زارا۔۔۔" وہ محض اتنا ہی کہنا چاہتی تھی۔ مگر اچانک عباس کو دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدلا۔ جو اس کے عقب سے نمودار ہو کر آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ بالکل کسی اجنبی کی طرح' کسی انجان کی طرح۔

"زارا مسعود نام ہے میرا۔ بی بی ایس کے فائنل ائیر میں ہوں۔ والد صاحب گاڑیوں کے شوروم کے مالک ہیں۔ اس کے علاوہ فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ بھی چلاتے ہیں۔" اس نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ بات کے اختتام پہ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے۔

"اوکے۔۔۔" ارسلان قہقہہ لگا کر ہنسا۔ عباس نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ پلٹ کے ڈالی اور موڑ مڑ کے نظروں سے اوجھل ہوا۔

"ثابت ہوا کہ اونچی آواز میں بات کرنے سے آپ کی آواز مزید دلکش لگتی ہے۔" ارسلان کے محظوظ انداز پہ وہ ایک دم خجل ہوئی۔

"یہ میں کیسی جاہلوں جیسی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرنے لگی ہوں۔" اسے فوراً" ہی احساس ہوا۔ سو اس نے بے پناہ شرمندہ ہوتے ہوئے خود کو سرزنش کی۔

"سوری! میری آواز شاید کچھ زیادہ ہی بلند ہو گئی تھی۔"

"نہیں۔۔۔ اتنی زیادہ تو نہیں۔۔۔ بس ساحل تک پہنچی ہو گی۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے قدرے شرارت سے کہا۔ وہ مزید شرمندہ

ہوگئی۔

ساحل یہاں سے کم از کم دس منٹ کی پیدل مسافت پہ تھا۔ قدرے شرمندگی سے اس نے لب بھینچے اور نگاہیں جھکائیں۔

موڑ مڑ کے جب وہ اپنی رہائش گاہ والی گلی میں پہنچی تو اس نے دیکھا۔ عباس پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے گیٹ کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ یوں جیسے کسی کی راہ تک رہا ہو۔

"میرا انتظار تو کم از کم نہیں کر رہا ہوگا۔" وہ بے سبب کڑھی۔

"وہ جو سرخ اینٹوں والی کوٹھی ہے۔ وہی میری رہائش گاہ ہے۔" اس نے ارسلان کو آگاہ کیا۔

"اور یہ صاحب کون ہیں؟" اس نے عباس کو نگاہ کے حصار میں لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"پھپھو کے صاحبزادے ہیں۔ گاؤں سے آئے ہیں پڑھنے کے لیے۔" گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے لہجہ بدلا۔

"آیئے ارسلان صاحب! میں آپ کو اچھی سی چائے پلاؤں۔" اس نے کن اکھیوں سے عباس کی سمت دیکھا۔ وہ اب مکمل طور پر ہمیں متوجہ تھا۔

"آج نہیں، پھر کبھی سہی۔" وہ مسکرا کے عباس کی جانب متوجہ ہوا۔

"السلام علیکم!" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے عباس نے بڑی گرم جوشی سے تھاما۔

"یہ ارسلان زید ہیں عباس! یہاں قریب ہی رہتے ہیں۔" اس نے دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "اور یہ میرے۔۔۔"

"آپ کے بھائی ہیں عباس۔" ارسلان نے اس کی بات قطع کی۔ زارا نے چونک کر ارسلان کی سمت دیکھا۔

"بھائی نہیں۔۔۔ کزن۔" عباس نے فوراً "سنجیدگی سے تصحیح کی۔

"کزن بھی بھائی ہی ہوتا ہے میرے دوست۔" ارسلان نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ گویا اس کی معلومات بڑھائیں۔ عباس بے ساختہ ہنس دیا۔

"یعنی یہ نرالی منطق خوب سمجھ میں آئی ہے موصوف کے۔" زارا نے عباس کی ہنسی سے اپنی سمجھ کے مطابق معنی اخذ کیے۔

"ایکسکیوز می۔" عباس نے کلائی موڑ کے گھڑی میں وقت دیکھا۔

"مجھے ذرا ضروری جانا ہے۔" اس نے ارسلان سے مصافحہ کیا اور چل دیا۔

اس کی چوڑی پشت نظروں سے اوجھل ہونے تک زارا کی نگاہوں کی زد میں رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"زارا! چکن جلفریزی بڑی مزے کی بنی تھی۔ مجھے اس کی ریسیپی بتانا۔" آج شام جب عباس گاؤں سے لوٹا تو ہمراہ پھپھو سمیت مہر اور فاطمہ بھی تھیں۔ سمندر کی دیوانی مہر کزنز اور ماموں کی محبت سے زیادہ سمندر کی محبت میں کھنچی چلی آتی تھی۔ سو آج بھی عشائیے سے فارغ ہو کر وہ سب پیدل ہی ساحل کی جانب بڑھ رہے تھے۔ جب مہر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا! وہ چکن جلفریزی تھی؟" ان سے چند قدم آگے، عباس اور فاطمہ کے ہم قدم چلتا ولی اچانک پیچھے مڑا اور اپنی رو چھوڑ کے ان تینوں کے برابر آگیا۔

"ویسے زارا! تم نے چکن کے ساتھ ایسا کیا کیا تھا کہ اس کی شکل و صورت پکوڑوں کے مشابہ ہوگئی تھی؟" آنکھوں میں شرارت اور زارا کو تپانے کا مشن لیے اس نے استفسار کیا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس مرغی کو ذبح کرنے سے قبل تمہاری تصویر دکھادی تھی۔" دل میں جلنے بھننے، مگر بظاہر ٹھنڈے لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

"نوٹ کر لو مہر! مخصوص ذائقے کے لیے ضروری ہے کہ مرغی کو میری تصویر دکھائی جائے۔" اس نے زارا کو چڑانے کے لیے مذاق اڑاتے لہجے میں کہا۔

"ولی! کیوں اوٹ پٹانگ ہانکتے رہتے ہو؟" سمن

نے کوفت سے کہا۔

"دیکھو مہر! یہ ہے کراچی کی وہ مشہور جگہ جہاں اپنی زارا قبلہ معلوم کیے بغیر ہی سجدہ ریز ہوگئی تھیں۔" وہ باز آنے والا نہیں تھا۔ سو اس نے فوراً "اس جگہ کی نشاندہی کی' جہاں چند روز قبل زارا کا پیر پھسلا تھا۔

"ولی! ایسا کرو' اس ایک بات کے پوسٹر تم پورے کراچی میں لگوادو۔" زارا نے ناراضی سے کہا۔

"بہت بہتر مادام! اور کچھ؟" اس نے فرماں برداری دکھائی اور سینے پہ ہاتھ رکھ کے ذرا سا جھکا۔

"یار ولی! کن فضول باتوں میں لگ گئے ہو۔" عباس نے زارا کی ناراض صورت کو دیکھا اور ولی سے کہا۔ "آؤ سیٹی پہ ازاٹ لو کی دھن سناؤں۔" اس نے ولی کا ہاتھ کھینچ کر دوبارہ اپنی رو میں شامل کیا۔

" is it love " کی خوب صورت دھن رات کی تاریکی میں دور تک پھیلتی چلی گئی۔

"ہیلو زارا!" اپنے دائیں جانب سے اچانک ابھرنے والی آواز پہ زارا بری طرح چونکی۔

عباس نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور لب بھینچ لیے۔ فضا میں ابھرتی سیٹی کی دھن ایک دم معدوم ہوئی۔

"بعض اوقات تو دل کی خواہش کچھ یوں پوری ہوتی ہے کہ چند لمحوں تک تو یقین ہی نہیں آتا۔" ارسلان نے متبسم لہجے میں معنی خیزی سے کہا۔

"اچھا! ایسی کون سی خواہش پوری ہوگئی بھلا؟" زارا نے اس کی معنی خیزی کو دانستہ نظرانداز کیا۔

"تھی کوئی۔" اس نے سمن اور مہر کو دیکھا اور بات بدلی۔

"کہاں جارہی ہیں؟" چند قدم آگے جاتے عباس' ولی اور فاطمہ پر اس کی توجہ نہیں گئی۔

"ساحل سمندر۔" اس نے مختصراً "کہا۔

"گڈ، میں بھی وہیں جارہا ہوں۔ اچھی کمپنی رہے گی۔" اس کی آنکھوں کی چمک بڑھی۔

"جی بالکل اچھی رہے گی۔" عباس ایک دم پیچھے مڑا اور مسکرا کر اس کی سمت مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

"مگر وہ کیا ہے کہ۔۔۔" وہ اب ارسلان کے ہم قدم چلنے لگا۔

"ہم سب اپنے ماموں کی طرف ڈنر پہ مدعو ہیں۔ سو پہلے وہیں جائیں گے۔" وہ ذہن میں اشفاق چچا کو رکھ کر جھوٹ گھڑنے لگا۔ زارا نے گھور کے اس کی سمت دیکھا۔ مگر اس نے زارا کے تاثرات دیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"ویسے ہمیں آپ کا ساتھ دینا اچھا لگے گا۔ سو اگر آپ مناسب جانیں تو ہمارے ساتھ' ہمارے ماموں کے گھر چل سکتے ہیں۔ وہ یقیناً "خوش ہوں گے آپ سے مل کر۔"

چلتے چلتے وہ سب گلی کے کونے تک آکر ٹھہر گئے۔ اب یہاں سے طے کرنا تھا کہ بائیں طرف مڑ کے ساحل کی جانب جانا ہے یا سڑک کے اس پار جاکر اشفاق چچا کے گھر کی طرف۔

"جی! ضرور چلتا۔ مگر دوست میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ سو اجازت دیجیے۔" وہ عباس اور ولی سے ہاتھ ملا کر بائیں جانب مڑ گیا۔

اور عباس اپنی غلط بیانی کو سچ ثابت کرنے کے لیے سڑک کے اس پار چل دیا۔ ایک بار پھر ان کا کارواں دو گروہوں میں بٹ گیا اور فضا میں "ازاٹ لو؟" کی دھن گونجنے لگی۔ کسی نے بھی عباس سے اس حرکت کی وجہ دریافت نہیں کی۔

"خود کا دل چاہ رہا ہوگا نا' مومنہ صاحبہ سے ملنے کو۔ سو موصوف نے کھڑے کھڑے تمام ارادے ہی بدل ڈالے۔" اس نے چڑ کے سوچا۔

"ولی! اشفاق چچا جلد سونے کے عادی ہیں۔ اس وقت جاکے ہم ان کے آرام میں خلل ڈالیں گے۔" اس نے دانستہ عباس کو نظرانداز کیا۔ مگر وہ ولی سے پہلے پلٹا۔

"ایسا نہیں ہوگا۔ ہم اشفاق ماموں کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔" اس نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا اور دوبارہ رخ سامنے کی جانب موڑ کر قدرے اونچی آواز میں بولا۔ "مومنہ سے مل کر

آجائیں گے۔ میں نے اسے میسج کردیا ہے' سو گیٹ بھی ہمیں کھلا ہی ملے گا۔"

زارا نے اپنی ساری ناگواری' بے زاری اور غصے سمیت اس کی پشت کو بری طرح گھورا۔

خوش اخلاق سی مومنہ ہمیشہ کی طرح ہی خوش خلقی سے ملی۔ مگر آج اسے یہ بات کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔

"شنید ہے مومنہ! تم کافی بڑی اچھی بناتی ہو۔" ولی نے نشست سنبھالتے ہی کافی پینے کی فرمائش کو خوشامد کے ریپر میں لپیٹ کر پیش کیا۔

"یہ محض شنید نہیں۔ تم بھی مومنہ کے ہاتھ کی بنی کافی کا ذائقہ چکھ چکے ہو۔ سو یہ بات بخوبی جانتے ہو۔" فاطمہ نے سینٹرل ٹیبل سے ڈرائی فروٹ کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کی ولی سے گاڑھی چھننے کی وجہ یہی تھی کہ وہ ہر بات میں ولی کا ساتھ فرض شناسی سے نبھاتی تھی۔

"صرف کافی ہی نہیں' میں کیک بھی بڑا اچھا بناتی ہوں۔ آج شام میں بنایا تھا۔ ابھی لاتی ہوں۔" مومنہ اٹھ کر کچن کی سمت بڑھ گئی۔

"تم لوگ کبھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آنا۔" عباس نے کسی قدر جھنجلا کے کہا اور اٹھ کر مومنہ کے پیچھے ہولیا۔

"ہم نے کیا کردیا؟" ولی نے قدرے حیرت سے پہلے زارا اور پھر مہر کو دیکھا۔

"خدا جانے۔" مہر نے کندھے اچکائے۔

"ان کی لاڈلی کو بے وقت کی فضول سی فرمائش سے ڈسٹرب جو کردیا ہے۔ سو موڈ تو بگڑے گا ہی نا۔" اس کی بڑبڑاہٹ صرف برابر میں بیٹھی سمن ہی سن پائی۔ اس نے لبوں تک آتی مسکراہٹ کو بڑی دقتوں سے روکا۔

"اب اسے کیا ہوا؟" ولی کے کانوں تک صرف اس کی بڑبڑاہٹ پہنچی تھی۔ الفاظ نہیں۔ سو وہ اس کے بڑبڑانے کا مقصد بھی نہ جان پایا۔ وہ اکتا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ذرا پانی پی لوں۔" اب اس کا رخ بھی کچن کی جانب ہوگیا۔ اب کی بار سمن کے ساتھ ولی بھی مسکرا اٹھا۔

"مومنہ! گھر کے بندوں کے لیے مہمانوں جیسا اہتمام نہ کرنا۔" وہ مومنہ کے عقب میں ہاتھ باندھے سلیب سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"اوہو! اتنی اپنائیت۔" اس نے طنز سے سوچا۔

"ہاں مومنہ! ویسے بھی ہم مہمان کی حیثیت سے آئے بھی نہیں۔" اس نے فریج سے بوتل نکالتے ہوئے کہا تو مومنہ چونک کے پیچھے مڑی۔ وہ اس کی موجودگی سے لاعلم تھی۔

"ہم تو بلا ارادہ ہی مجبوری کے تحت ہی آگئے ہیں۔" اس نے گلاس میں پانی نکالتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا اور ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"مجبوری کے تحت؟" مومنہ کو اس کی بات بہت محسوس ہوئی۔

"ہاں! دراصل ہم تو سمندر کی سیر کے ارادے سے گھر سے نکلے تھے۔ مگر ہمیں راستے میں ہی خبر ہوگئی کہ وہاں ہمیں ایک ایسے شخص کا ساتھ نصیب ہوگا' جو عباس کی ناپسندیدہ ہستیوں میں شمار ہوتا ہے۔ سو ہمیں اپنا ارادہ بدلنا پڑا۔" اس نے گلاس لبوں سے لگاتے ہوئے کن اکھیوں سے عباس کی سمت دیکھا اور جتاتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔" عباس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کسی حد تک یہ بھی ٹھیک ہی کہہ رہی ہے مومنہ۔" اس نے لب بھینچ کر بات بنائی۔ "گھر سے نکلے ہم ضرور اسی ارادے سے تھے۔ مگر تمہیں بھی اس سیر میں شامل کرنے کا پروگرام میں نے اور ولی نے مل کر ترتیب دیا تھا۔ سو یہ اس بات سے لاعلم ہے۔"

"یہ علیحدہ بات کہ ولی بھی لاعلم ہی ہے۔ اسے تو بیچ میں خوامخواہ ہی گھسیٹا جارہا ہے۔" تیز لہجے میں کہتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی۔

"ماموں نے تاکید کی تھی کہ دس بجے سے پہلے لوٹ آنا۔ پونے دس بج رہے ہیں۔ ہم ساحل سمندر جائیں گے یا نہیں؟" وہ لاؤنج میں پہنچی تو مہر ولی سے استفسار کررہی تھی۔

"ان محترمہ کو تو بس یہی اک قلق ہے۔" صوفے پہ بیٹھتے ہوئے اس نے چڑ کے سوچا۔

"یہ تو آپ اپنے بھائی محترم سے ہی دریافت کریں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم مومنہ کو بھی اپنی پکنک میں شامل کرلیں۔" ولی کے جواب نے اسے مزید سلگایا۔

"سنو! ابھی مومنہ آئے گی تو تم سب اسے اپنے ہمراہ چلنے کی دعوت دینا۔" اسی پل عباس نے آکر ہدایت دی اور فلور کشن پہ بیٹھ گیا۔

"اور یہ سمن اسے میرا ہیرو گردانتی ہے۔ جتنی پروا اور فکر اسے مومنہ کی ہے۔ اس سے تو کچھ اور ہی لگتا ہے۔"

"مومنہ! یہ کیا... تم نے تو ہماری دعوت ہی کر ڈالی۔" لوازمات سے بھری ٹرالی دیکھ کر سمن نے کہا۔

"اتنے تکلف میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی مومنہ۔" مہر نے کہا۔

"کیوں ضرورت نہیں تھی؟ مومنہ! تم ان عورتوں کی باتوں میں بالکل نہ آنا۔" ولی نے کیک کا پیس اپنی پلیٹ میں منتقل کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے اسے بری طرح گھورا۔

"ہم دراصل ساحل سمندر جارہے تھے تو سوچا تمہیں بھی ہمراہ لیتے چلیں۔" فاطمہ نے عباس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ پاگل تو نہیں ہوگئے۔" پیشتر اس کے کہ مومنہ کوئی جواب دیتی' زارا بول اٹھی۔

"بھلا اشفاق چچا کو تنہا چھوڑ کر مومنہ ہمارے ساتھ کیسے چل سکتی ہے؟" زارا مروتاً بھی ایسی کوئی پیش کش مومنہ سے کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ سو اس نے اپنی ناپسندیدگی واضح کی۔

"آخر یہ زارا کو ہو کیا گیا ہے؟ اس نے پہلے تو کبھی مجھ سے اس طرح کا رویہ روا نہیں رکھا۔" مومنہ نے کسی قدر حیرت سے زارا کی سمت دیکھا۔ جبکہ جملہ حاضرین نے اسے تنبیہی نگاہوں سے گھورا۔

"ہاں یار! زارا ٹھیک کہہ رہی ہے اور ویسے کل میرا زولوجی کا ٹیسٹ ہے۔ اس کی تیاری بھی کرنی ہے۔ سو اس وجہ سے بھی میں آپ لوگوں کی آفر قبول نہیں کرسکتی۔ مجھے افسوس ہے۔"

"ٹیسٹ سے یاد آیا۔" زارا ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرا بھی تو کل ٹیسٹ ہے اور میری تیاری بالکل نہیں۔ سو ہمیں اب چلنا چاہیے۔"

"ہاں چلو۔" عباس نے ایک سنجیدہ سی نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں پھر آؤں گا مومنہ! اشفاق ماموں کو ہمارا سلام کہنا۔" الوداعی کلمات کہنے کے ساتھ ہی وہ بیرونی راہ پر ہولیا۔

"یہ کیا حرکت تھی؟" سڑک تک پہنچتے ہی وہ اس کے ہم قدم چلتے ہوئے سخت لہجے میں گویا ہوا۔

"وہی جو تم نے آتے سمے اختیار کی تھی۔" اس نے بے رخی سے کہا۔

"کس کے ساتھ؟" وہ جان کے انجان بنا۔

اس نے ایک نظر اسے دیکھا اور گویا ہوئی۔

"ارسلان کے ساتھ۔"

"اگر یہ اس بات کا بدلہ تھا تو جب تمہیں فرصت اور تنہائی ملے تو میرے اور اپنے لہجے کا موازنہ ضرور کرنا۔" اس نے ہنوز سابقہ لہجہ برقرار رکھا۔

"ولی۔" اس نے جواب دینا غیر ضروری جانا اور پیچھے مڑ کے ولی کو آواز دی۔

"میں گھر جارہی ہوں۔ مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

"سارا وقت تو بلاوجہ ہی بے کار گیا۔ لوگوں کے درشن اور دل بہلانے میں ہی۔" گردن سیدھی کرتے ہوئے وہ اتنی آواز میں بڑبڑائی کہ ساتھ چلتا شخص بخوبی سن لے اور پھر تیز قدموں سے اس سے آگے نکلتے ہوئے گھر کی راہ پہ ہولی۔



کل رات میں تنہا تھا' میرے دھیان میں تم تھے
تحریر میں تم تھے' میرے وجدان میں تم تھے
آہٹ تھی کہ بے تاب کیے دیتی تھی مجھ کو
احساس یہ کہتا تھا کہ دالان میں تم تھے
گو اجنبی دستک تھی' مگر میں نے در جاں
یہ سوچ کے کھولا تھا کہ امکان میں تم تھے
میں کیا ستاروں نے بھی جھپکی نہ تھیں آنکھیں
کل شب' شب مہتاب تھی اور لان میں تم تھے
کیا دیکھتے اوروں کی طرف ہم سے گرفتار
ہر عہد میں تم' بیعت و پیمان میں تم تھے

ہر روز شام کی سیر پر ہونے والی ملاقات گہری شناسائی میں بدل کر اس نہج پر پہنچ گئی تھی کہ وہ اب دل کی بات غیر محسوس طریقے سے 'شاعری کی زبان میں اس کے گوش گزار کرنے لگا تھا۔ مگر وہ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی بڑی خوبی سے انجان بنی رہتی۔

"کچھ سمجھیں؟ کیسی لگی؟" اس نے معنی خیزی سے گمبھیر لہجے میں کہتے ہوئے اس کی سمت دیکھا۔

"زبردست! کیا آپ کی اپنی تھی؟" اس نے بھولپن سے یوں استفسار کیا' جیسے کوئی شاعروں ہی کسی کو اپنی شاعری سنادے۔

"یک بہا۔"

یارب! وہ نہ سمجھے ہیں' نہ سمجھیں گے میری بات
دے اور دل ان کو' جو نہ دے مجھ کو زبان اور

ارسلان نے گہری سانس لی اور کسی قدر مایوسی اور بے بسی سے اسے دیکھا۔

"نہیں... ہوگی کسی کی۔ مجھے شاعروں کے نام یاد نہیں رہتے۔" اس نے بدمزہ ہو کے نگاہوں کا رخ بدلا۔

"کمال ہے۔ آٹھ' دس شعروں کی غزل یاد ہو جاتی ہے اور دو حرفی نام یاد نہیں رہتا۔"

"وہ اس لیے کہ شاعری بڑے کام کی چیز ہے۔ جبکہ شاعر کے اسم گرامی فقط کسی کوئز پروگرام میں شرکت کے وقت ہی کام آسکتے ہیں۔" وہ چڑا ہوا تھا۔

"اچھا..." وہ اس کے چڑنے پر من ہی من میں محظوظ ہوئی۔

"اور شاعری کس وقت کام آتی ہے؟" معصومیت کے تاثرات چہرے پہ سجا کر استفسار کرتے ہوئے وہ اپنے تئیں اس کے چڑنے کے مزید اسباب پیدا کر رہی تھی۔ مگر اب کی بار وہ چڑنے کے بجائے تیز قدموں سے دو قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

"جذبات کے اظہار میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہے یہ شاعری۔ آپ کو سمجھنا چاہیے۔" وہی معنی خیز گمبھیر لہجہ۔

"تو آپ کا کیا خیال ہے۔ میں شاعری نہیں سمجھتی کیا؟" اس نے نروٹھے پن سے پوچھا۔

"ان تلوں میں تیل نہیں بیٹا ارسلان۔" اس نے گہری سانس لے کر مایوسی سے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے خود کلامی کی۔

"یقیناً" سمجھتی ہوں گی۔ چلیں! ساحل کی طرف چلتے ہیں۔" اس نے اچانک موضوع بدلا۔

"ساحل کی طرف؟" وہ اس وقت واپسی کے سفر پر تھے اور آدھے سے زیادہ راستہ طے کر آئے تھے۔ سو گھر قریب ہی تھا۔

"میرے خیال سے اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ کافی دیر ہوگئی ہے۔" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے کہا۔

"کوئی دیر نہیں ہوئی۔ ابھی مغرب کی اذان میں بھی پینتیس منٹ رہتے ہیں۔" ارسلان نے بھی اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور مزید کچھ سننے سے قبل ہی اپنے قدم ساحل کی جانب جاتی راہ پہ موڑے۔

وہ پلٹ کے اس کے ہم قدم ہوئی تو ارسلان نے مسکرا کے نگاہیں اس پر جمائیں اور گنگنانے لگا۔

تڑپ میرے بے قرار دل کی کبھی تو ان پہ اثر کرے گی
کبھی تو وہ بھی جلیں گے اس میں جو آگ دل میں دہک رہی ہے

اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا کر اس نے اپنا رخ دائیں جانب موڑ لیا۔ مگر نگاہوں کی تپش بدستور قائم رہی تو اس نے دوبارہ چہرے پر بھولپن طاری کرتے ہوئے رخ اس کی جانب موڑا۔

"آپ کو نور جہاں پسند ہے؟"

"یہ کون محترمہ ہیں؟" اس نے کسی قدر ناراضی سے دریافت کیا۔

"آخر یہ مجھے کس قماش کا بندہ سمجھتی ہے۔" اس نے جز بز ہو کر سوچا۔

"میڈم نور جہاں۔" اسے امید نہیں تھی کہ وہ میڈم نور جہاں سے ناواقف ہوگا۔

"مشہور گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں۔" اسے شاید شاعروں کی طرح گلوکاروں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اف میرے خدا! آخر یہ سمجھتی کیوں نہیں؟" اس نے بے بسی سے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"میں سب جانتی بھی ہوں اور سمجھتی بھی ہوں ارسلان۔" ارسلان کی خود کلامی اس کے کانوں تک بڑا دھیان لگانے کے بعد پہنچی اور سوچ کا رخ موڑ گئی۔

"مگر میں اس دل کا کیا کروں' جو ایسا سب کچھ کسی اور کے لبوں سے سننے کا متمنی ہے۔ جو نہ وجاہت میں تمہارا پاسنگ ہے' نہ دولت میں۔ مگر دل کی مسند پر پھر بھی وہی براجمان ہے۔ سو میری اس محبت کا تقاضا ہے کہ میں تمہیں نظر انداز ہی کروں۔"

"آپ انگیجڈ ہیں؟" اس نے شاید جان لیا تھا کہ صاف لفظوں میں بات کیے بغیر چارہ نہیں۔

"نہیں۔" اس نے چند لمحے سوچا اور نفی میں گردن ہلائی۔

"میرے بارے میں کیا خیال ہے آپ کا؟" زارا نے ذرا سی گردن موڑ کے اسے دیکھا۔

"یعنی اگر میں آپ کو پروپوز کروں تو آپ کا جواب کیا ہوگا؟" اس نے سابقہ تجربات کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی۔

اس نے لب بھینچے اور ایک دم خاموش ہو کر نگاہیں سیدھی جاتی سڑک پہ جمالیں۔ وہ چند لمحوں تک اس کے جواب کا منتظر رہا۔ پھر گویا ہوا۔

"بے شک آپ سوچ کے فیصلہ کیجئے گا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں انتظار کرلوں گا۔"

وہ سر ہلا کے رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ارسلان نے مجھے پروپوز کیا ہے۔" لاؤنج میں صوفے پہ بیٹھی ثمن کو اس نے کھڑے کھڑے آگاہ کیا۔

"اچھا..." ثمن نے ٹی وی کی آواز دھیمی کی اور اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

"تم نے یقیناً" انکار کر دیا ہوگا... ہے نا؟"

"نہیں! انکار کیوں کرنے لگی؟" اس نے کسی قدر اچنبھے سے دریافت کیا۔

"تو کیا ہامی بھر لوگی؟" ثمن نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے استفسار کیا۔

"ہاں! اتنے شاندار پروپوزل کو ریجیکٹ کر کے میں نہ خود کو ناشکری ثابت کرنا چاہتی ہوں اور نہ کم عقل۔"

"مگر تمہارا ہیرو تو کوئی اور ہے۔" اسے زارا سے یہ توقع نہیں تھی۔ سو اس نے بے یقینی سے اس کی سمت دیکھا۔ ثمن کے الفاظ پہ وہ ایک دم زچ ہوا اٹھی۔

"تم جس شخص کو میرا ہیرو ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ میں اس کے خیالوں میں بھولے سے کبھی نہیں آتی۔"

"ہم بھلا کسی کی سوچوں اور خیالوں تک کیسے رسائی حاصل کر سکتے ہیں؟"

"تم بتاؤ! کیسے کر سکتے ہیں... تم نے بھی تو اس کی سوچوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ تب ہی تو مجھے زبردستی اس کے ساتھ نتھی کر رہی ہو۔" اس نے طنزاً" کہا اور دروازے کی سمت قدم بڑھا دیے۔

ثمن نے تیزی سے عباس کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ لیپ ٹاپ گھٹنوں پہ دھرے کسی کام میں مصروف تھا۔

"ارسلان نے اسے پروپوز کیا ہے۔ مجھ سے کہہ کے گئی ہے کہ وہ قبول کرلے گی۔" اس نے ایک فقرے میں کہانی سموئی۔ مگر لہجہ ہموار ہی رکھا۔

عباس نے ٹھٹک کر اس کی سمت دیکھا اور لیپ ٹاپ ایک طرف رکھ کر بے قراری سے اٹھ کھڑا ہوا۔
"ارسلان تک پہنچنے سے قبل اگر تم اس تک پہنچ گئے تو فیصلہ تمہارے حق میں ہوگا۔ اتنا مجھے یقین ہے۔"
اس نے سمن کا یہ فقرہ جوتوں میں پیر اڑستے ہوئے بہ عجلت سنا اور تیز قدموں سے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"اور اگر جو کچھ سمن سمجھتی ہے۔ وہ حقیقت ہو تو وہ یقیناً" میرے پیچھے آئے گا۔" اتنا تو وہ جانتی تھی کہ سمن نے یہ خبر فوراً" اس تک پہنچائی ہوگی۔ سو خیالات کا رخ بھی اسی سمت تھا۔
"مگر وہ اب تک آیا کیوں نہیں؟" اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا اور مطلوبہ چہرہ نہ پا کے مایوس ہوئی۔
"مگر شاید جو کچھ سمن سمجھتی ہے۔ وہ محض اس کی خام خیالی ہی ہے۔" وہ دل کو اس حوالے سے فقط چند لمحے ہی پر امید رکھ پائی۔ سو اس نے سر جھٹک کے ہونٹ بھینچے۔
"اور اگر یہ واقعی سمن کی خام خیالی ہوئی تو وہ اب تک تو سمن کے غلط اندازوں کی تردید بھی کر چکا ہوگا۔" ناامیدی کے خیالات راسخ ہوئے تو اس نے پلٹ کے دیکھنا چھوڑا۔
"اور میں یہاں اس کے پیچھے آنے کی آس لگائے بیٹھی ہوں۔" ایک ستارہ پلک سے ٹوٹ کر قدموں میں آگرا۔
"جب یہ طے ہے کہ وہ پیچھے نہیں آئے گا تو پلٹ کر دیکھنے کا کیا جواز؟" اس نے خود کو پلٹ کر دیکھنے کی کوشش سے باز رکھا۔
اپنے خیالات کے تانے بانے میں الجھی وہ ساحل سمندر تک پہنچ گئی۔ جہاں ارسلان پچھلے دس منٹ سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ آج اسے ارسلان کو اپنا جواب بتانا تھا۔

☼ ☼ ☼

عباس نے دور سے ہی اسے ارسلان کی سمت بڑھتے دیکھا اور قدموں کی رفتار بڑھاتے ہوئے اپنے اور زارا کے درمیان حائل فاصلے کو ارسلان سے پہلے پاٹنے کا قصد کیا۔ وہ زارا کے عقب میں تھا۔ زارا کا ہر اٹھتا قدم اسے ارسلان سے قریب اور عباس سے مزید دور کر رہا تھا۔ سو اسے لگا' وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہیں ہو پائے گا۔ اپنے قدموں کی رفتار مزید بڑھاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ ارسلان زارا سے فقط چند قدموں کی دوری پر تھا۔ اس نے بے قراری سے آواز دینا چاہی' مگر ایک دم ٹھٹک کے رکا۔
ارسلان اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ دیوتاؤں جیسا وجیہہ اور بادشاہوں کی مانند امیر۔ خدا نے جو اسے حسن عطا کیا تھا' وہ دولت کی کثرت کے سبب دو آتشہ ہوا۔ اس کے زیر استعمال ہر چیز اس کے طبقے کا پتا دیتی تھی۔ مگر وہ خود۔۔۔؟ گویا اچانک ہی اپنے روبرو آیا تھا۔
قریب ہی پارک کی گئی کسی کار کے بیک ویو مرر پر ابھرتی اپنی شبیہہ پہ نگاہ اچانک بلا ارادہ ہی پڑی تھی۔ مگر پھر ارادتا" جمی رہی۔
"یہ تقدیر نے مجھے کس شخص کے مقابلے پہ لا کھڑا کیا ہے؟ اس سے تو میرا مقابلہ کسی صورت بنتا ہی نہیں۔" اس نے آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور پھر ارسلان کی سمت دیکھا۔
زارا کی بات مسکرا کر سنتا ہوا شخص اردگرد روشنیاں بکھیر رہا تھا۔
"میں صورت شکل میں بہتر ہوں اور ارسلان بہترین۔" اس نے نچلا لب دانتوں تلے دبا کر گہری سانس لی۔
"ارسلان ایک بزنس مین کا بیٹا اور میں ایک کسان کا۔ کئی برس کی جدوجہد کے بعد جب میں اس کے برابر پہنچوں گا تو پتا چلے گا' وہ مزید کامیابیوں کے کئی زینے پھلانگ چکا ہے۔ سو ثابت ہوا کہ ارسلان اس لحاظ سے بھی مجھ سے بہترین ہے۔" وہ گویا خود کو باور کروا رہا

تھا۔
"تو گویا زندگی کے بائیس برسوں میں اس تجربے سے بھی آشنائی ہوئی کہ جس سے محبت ہو۔ اس کے لیے ہم ہمیشہ بہترین کا انتخاب کرتے ہیں۔" اس نے انتہائی دل گرفتی سے اپنی شکست تسلیم کی اور قدم واپسی کی راہوں پہ موڑے۔
"اور آج سے یہ تجربہ بھی زندگی کا حصہ بننے والا ہے کہ بجھے دل اور تشنہ آرزوؤں کے سنگ زندگی بتانا کتنا کڑا اور کتنا دشوار ہے۔" وہ سر جھکائے چلتا چلا گیا۔
زارا نے موہوم سی امید کے زیر اثر آخری بار مڑ کے دیکھا۔ دور تک لوگوں کا ہجوم تھا۔ مگر نگاہیں جسے دیکھنا چاہ رہی تھیں' وہ نہیں تھا۔ سو دور تک ویرانی ہی ویرانی تھی۔
"یعنی ثابت ہوا کہ سمن کے خیالات' محض خیالات ہی تھے۔ حقیقت ایک فیصد بھی نہیں۔" موہوم سی امید لمحوں میں بجھی۔
"مگر اس کے دل میں میرے لیے ذرا سی محبت ہوتی تو وہ ایک بار میرے پیچھے ضرور آتا۔۔۔ اور چاہے وہ اپنے لفظوں سے کچھ نہ کہتا۔ مگر میں اس کی "ذرا سی محبت" پر اپنا بہت کچھ قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ سو باقی فاصلہ میں ہی طے کر لیتی۔ مگر کاش وہ ایک قدم بڑھاتا تو سہی۔" اس ایک "کاش" نے نارسائی کا کرب مزید بڑھایا۔
"مگر اس ایک قدم کے لیے بھی ذرا سی محبت از بس ضروری تھی' جو شاید اس کے دل میں میرے لیے موجود رہی نہیں۔" ایک ایسی حقیقت' جسے حقیقت ماننے پر دل کسی طور آمادہ ہی نہیں تھا۔
"سو مجھے جان لینا چاہیے کہ نارسائی کا عذاب اب عمر بھر ساتھ نبھائے گا۔" اداسی اس کے اندر پیر پسارے اطمینان سے بیٹھ گئی۔
اچانک وہ اسے دور کھڑی ایک گاڑی کے عقب سے نکلتا دکھائی دیا۔ زارا کا دل ایک دم سے خوشی کی تال پر تھرک اٹھا۔
مگر اگلے ہی لمحے اس کے دل نے اداسی کی چادر دوبارہ اوڑھی تھی۔ کیونکہ عباس کے قدموں کا رخ ساحل کی مخالف سمت میں تھا۔ زارا اسے پیاسی نگاہوں سے دیکھے گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ عباس ایک لمحے کو رکا ہے۔ اس ایک لمحے میں اس کے دل نے عباس کے پلٹنے کی بے شمار دعائیں کر ڈالیں۔
مگر اس کی دعائیں اوپر جانے کے بجائے یہیں کہیں ساحل پر بھٹک گئیں۔
ارسلان اس کے لیے آئس کریم خرید رہا تھا۔ لیکن زارا کی ساری توجہ عباس کی طرف تھی۔ وہ ابھی تک سر جھکائے وہیں ساکت کھڑا تھا۔ زارا کو اس پر کسی بے جان مجسمے کا گمان ہوا۔
اچانک اس مجسمے میں حرکت ہوئی۔ وہ ہلا اور زارا سے ایک قدم دور ہو گیا۔ اس کے قدم اٹھنے کے ساتھ ہی زارا نے چند سرخ گلاب زمین پر بکھرتے دیکھے۔ وہ چونک اٹھی۔۔۔ اور بس اسے ایک لمحہ ہی لگا تھا سب کچھ سمجھنے میں۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا۔
"تو یہ پھول لینے چلا گیا تھا۔۔۔ اسی لیے دیر سے پہنچا۔"
زارا نے پلٹ کر ارسلان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی وجیہہ شخصیت پر دلکش مسکراہٹ سجائے' ہاتھوں میں آئس کریم تھامے ہوئے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اپنے اور زارا کے درمیان فاصلے کو سمیٹتا۔ زارا بھاگتی ہوئی اس سے دور ہوئی تھی۔ اسے اپنے اور عباس کے درمیان فاصلے کو پاٹنا تھا۔ وہ ارسلان سے مردانہ وجاہت اور سماجی حیثیت میں لاکھ کم سہی' اس کے دل کا شہنشاہ تو وہی تھا نا!
کیونکہ محبت کا تاج تو اس کے دل نے اسی کے سر پر سجایا تھا۔

☼

مکمل ناول

"توبہ! کتنی پیٹو عورتیں تھیں۔ پورے پندرہ شامی کباب سامنے رکھے تھے۔ تین عدد عورتیں گیارہ شامی کباب ہڑپ کر گئیں۔" مہمانوں کے جانے کے بعد پہلا تبصرہ اجیہ نے کیا تھا اور اس کے تبصرے اور تجزیے ایسے ہی بے لاگ ہوتے تھے۔

"شکر کریں اجیہ آپی! چار کباب چھوڑ دیے انہوں نے ورنہ وہ جس اسپیڈ سے کھا رہی تھیں، مجھے تو خدشہ تھا کہ باقی کے چار بھی ان ہی کے پیٹ کی زینت بنیں گے۔" سب سے چھوٹی ہنیہ نے ہنس کر بہن کی بات آگے بڑھائی۔

"ویسے امی! کچھ قصور ہمارا اپنا بھی ہے۔ آپ جو کچھ آپی سے بنواتی ہیں، سارا کا سارا مہمانوں کے سامنے پیش کر دیتی ہیں۔ غنیہ آپی کے ہاتھ میں ذائقہ ہی اتنا ہے کہ لوگ چیز چکھنے کے بہانے اٹھاتے ہیں اور پھر کھاتے ہی چلے جاتے ہیں۔ چنا چاٹ اور دہی بڑوں کے ڈونگے تو منٹوں میں خالی ہو گئے تھے۔ شکر ہے یہ چار کباب بچ گئے۔" ہنیہ نے ماں کی گھوری کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بات جاری رکھی اور خدیجہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"تم دونوں اتنی دیر سے مہمانوں کے چٹورپن پر باتیں بنائے جا رہی ہو۔ خود کسی سے کم ہو کیا۔ مہمان اپنا رزق ساتھ لاتے ہیں۔ تمہاری باتوں سے یوں لگ رہا ہے جیسے زندگی میں کبھی شامی کباب اور دہی بڑے چکھے تک نہیں۔ اول تو تم لوگوں کو بہن کے ساتھ چیزیں سرو کروانے کے بعد کمرے میں بیٹھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ لیکن تم دونوں نہ صرف جم کر بیٹھ گئیں بلکہ بے چاروں کے نوالے بھی گننے لگ گئیں۔ حد ہوتی ہے بدتہذیبی کی۔" خدیجہ نے دونوں کو درشتی سے ٹوکا۔

اتنے میں غنیہ اندر آئی۔ لیمن کلر کا سوبر مگر اسٹائلش سا سوٹ پہنے۔ یہ سوٹ گزری عید پر اجیہ نے اسے زبردستی دلوایا تھا۔ دکان پر قیمت سن کر وہ سوٹ لینے کا ارادہ بدل رہی تھی، لیکن اجیہ کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ اجیہ نے دکان دار کو سوٹ پیک

بشریٰ احمد

زندگی تیرے گاؤں کی روشنی





کرنے کا کہہ دیا تھا۔ سوٹ بے شک خاصا مہنگا تھا لیکن غنچہ اسے اتنی بار پہن چکی تھی کہ بقول ہنیہ سوٹ کی قیمت وصول ہو چکی۔ مہینے میں دو بار تو لازما" خاص مہمانوں کی آمد ہوتی تھی۔ ان کے سامنے غنچہ یہ ہی سوٹ پہنتی تھی۔ یہ اس کی الماری میں موجود سب سے پیارا سوٹ تھا اور بلاشبہ غنچہ یہ سوٹ پہن کر لگتی بھی بہت پیاری تھی۔ لیکن لوگوں نے جانے خوب صورتی کا کیا معیار قائم کر رکھا تھا کہ غنچہ اس معیار پر پوری نہ اترتی یا پھر ان کے گھرانے کی سفید پوشی لوگوں کی نگاہوں میں کھٹکتی تھی۔ رگڑ رگڑ کر چمکایا صاف ستھرا گھر لوگوں کی توجہ اپنی جانب کھینچتا، نہ کھینچتا گھر کا سازو سامان مکینوں کی حیثیت کا پتا بتا دیتا تھا۔

شائستہ بیگم جو خدیجہ کی خالہ زاد کزن تھیں اور رشتے کروانے کا کام کرتی تھیں۔ لڑکے والوں کا انکار ان تک پہنچا دیتیں مگر خدیجہ بلا کی صابر عورت تھیں۔

"چلو جو ہوا اللہ نے اسی میں بہتری رکھی ہوگی۔" کہہ کر بات ختم کر دیتیں۔ ان کا اللہ پر توکل بے حد مضبوط تھا۔ شوہر بھی ہم مزاج تھے۔ سرکاری محکمے میں ایک ایسی پوسٹ پر تھے کہ چاہتے تو زندگی کی ہر آسائش بیوی، بچوں کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے۔ مگر اکل حلال کا تصور ان کی زندگی کی بنیاد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں انتہائی مطمئن اور خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کر رہے تھے۔ تین پیاری پیاری بیٹیوں نے ان کی زندگی کو مکمل کر رکھا تھا۔ غنچہ، اجیہ اور ہنیہ۔ غنچہ سب سے بڑی تھی۔ صورت اور سیرت میں ماں کا پرتو۔ دھیمے مزاج کی بہت سلجھی ہوئی لڑکی۔ کھلتی ہوئی گندمی رنگت، بڑی بڑی روشن آنکھیں اور ستواں ناک۔ وہ دیکھنے میں بہت پرکشش لگتی تھی۔ پھر جانے کیوں اب تک کسی کے من میں کیوں نہ اتری۔

دوسرے نمبر والی اجیہ کا رنگ روپ ددھیال پر گیا تھا۔ سرخ و اسپید رنگت اور لمبا قد۔ کالج میں وہ دس لڑکیوں کے درمیان کھڑی ہوتی تو سب میں نمایاں لگتی۔ خدیجہ کے اکلوتے بھائی نے اپنے لاڈلے بیٹے کے لیے لاڈلی بھانجی کا ہاتھ جب ہی مانگ لیا تھا۔ جب عون تھرڈ ایر میں اور اجیہ فقط میٹرک کی اسٹوڈنٹ تھی۔ غفار احمد دل کے مریض تھے۔ انہیں اپنی زندگی سے متعلق عجیب سی بے اعتباری تھی۔ دو بڑی بیٹیوں کی مناسب عمروں میں شادی کر دی تھی۔ اب انہیں عون کی خوشیاں جلد از جلد دیکھنے کی تمنا تھی۔ ابھی بچوں کی شادی کی تو عمر نہ تھی لیکن غفار احمد کے اصرار پر دونوں کو نکاح کے بندھن میں باندھ دیا گیا۔ وقت نے ثابت کیا کہ غفار احمد کے خدشے بے بنیاد نہیں تھے۔ عون اور راجیہ کے نکاح کے بعد وہ محض چار ماہ ہی جی پائے تھے۔

عون نے ماسٹرز مکمل کر کے نوکری کی تلاش میں وقت ضائع کرنے کے بجائے باپ کے چھوڑے ہوئے کاروبار کو سنبھالنے کو ترجیح دی۔ نوکر بے شک قابل اعتبار تھے۔ لیکن سدا نوکروں پر تو کام نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ واشنگ مشین تیار کرنے کا چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ لیکن گزر بسر بہت اچھے طریقے سے ہو جاتی تھی۔ عون کا گھرانہ اپر مڈل کلاس گھرانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا اور خدیجہ تو ہر پل اللہ کا شکر ادا کرتی تھیں کہ تین بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کی طرف سے تو بالکل بے فکری تھی۔ ورنہ اجیہ کا مزاج ایسا تھا کہ اگر اسے کسی انجان سسرال میں بیاہنا پڑتا تو خدیجہ ہر گھڑی خدشوں میں گھری رہتیں۔

اجیہ کسی مصلحت کو خاطر میں نہ لانے والی لڑکی تھی۔ اپنے گھر والوں کے لیے بہت حساس تھی۔ ان کے متعلق کچھ غلط سن بھی نہ سکتی تھی۔ اس میں جذباتیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ غنچہ والی بردباری اور سمجھ داری اس میں نام کو نہ تھی۔

"لڑکیوں کو سوچ سمجھ کر بولنا چاہیے اجیہ۔ فضول بولنے سے بہتر ہے بندہ خاموشی اختیار کرے۔" خدیجہ اسے رسانیت سے سمجھاتیں۔

"میری چہکتی مینا کو کیوں خاموشی اختیار کرنے کا کہہ رہی ہیں آپ۔" ظہیر صاحب بیٹی کو پیار سے دیکھتے ہوئے پوچھتے۔

"آپ کے لاڈ پیار نے ہی اسے بگاڑ دیا ہے۔" خدیجہ ماؤں والا روایتی شکوہ دہراتیں۔

"میں کہاں سے بگڑی ہوئی ہوں بابا!" اجیہ منہ بسورتے ہوئے باپ سے دریافت کرتی۔

"اللہ کا شکر ہے میری تینوں بیٹیاں بہت سلجھی ہوئی اور سمجھ دار ہیں۔ اس بات میں تو کوئی شبہ ہی نہیں۔" ظہیر صاحب مسکرا کر اس کی تائید کرتے۔

"آپ کی اور امی کی ایک عادت بالکل مشترک ہے بابا! ہر بات میں آپ لوگ شکر کا پہلو ڈھونڈ لیتے ہیں۔"

"شکر تو اچھی عادت ہے بیٹا۔" ظہیر صاحب مسکراتے۔

"ہاں بابا! لیکن کوئی اور ہوتا تو ہو سکتا ہے وہ اس بات پر کبھی کبھی اللہ سے شکوہ بھی کرتا کہ اللہ نے اسے بیٹیاں ہی بیٹیاں دیں۔ ایک بھی بیٹے سے نہیں نوازا۔"

"تمہاری بات کسی حد تک درست ہے بیٹا۔ لیکن جب ہم ایسے لوگوں پر نگاہ ڈالتے ہیں جنہیں اللہ نے اولاد کی نعمت سے ہی محروم رکھا۔ تو پھر ہم پر شکر واجب ہو جاتا ہے نا کہ اس نے ہمیں صاحب اولاد تو کیا۔" ظہیر صاحب اسے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں سمجھا رہے تھے۔

"اچھا تو پھر وہ شخص جو صاحب اولاد نہیں ہے۔ اس کا شکوہ کرنا تو بنتا ہے۔" اجیہ نے نیا نکتہ اٹھایا۔

"وہ شخص اپنی زندگی پر غور کرے تو اس کی زندگی میں بھی شکر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور چھپا ہوگا۔" ظہیر صاحب مسکرائے۔

"مجھے کسی کی زندگی کا تو پتا نہیں۔ لیکن میں اپنی زندگی پر غور کروں تو بے ساختہ شکر ادا کرتی ہوں کہ اللہ نے مجھے آپ جیسے ماں، باپ دیے۔"

"مکھن ہے؟" ظہیر صاحب نے بیٹی کو پیار سے دیکھا۔

"نہیں بابا! بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ اس نے مجھے آپ کے گھر پیدا کیا۔ ورنہ اگر تایا جان کے گھر پیدا ہو گئی ہوتی تو کیا بنتا میرا۔"

"ہائیں۔ یہ درمیان میں تایا جان کا ذکر کہاں سے آگیا۔" پاس بیٹھی خدیجہ نے اسے گھورا۔

"روز صبح کالج جاتے ہوئے تایا جان کا گھر درمیان میں ہی تو آتا ہے امی! ماہین جی کو ساتھ نہ لوں تو خفا ہو جاتی ہیں وہ۔"

"بڑی بہن ہے بیٹا! باجی کہا کرو۔" ظہیر صاحب نے ٹوکا۔

"نہیں باجی کہوں تو مزید خفا ہو جاتی ہیں بابا! حالانکہ انہیں بچپن سے باجی ہی کہتی آئی ہوں۔ اب صرف ماہین کہنا مجھے خود عجیب لگتا ہے۔ لیکن اب تو تائی جی تک ٹوک دیتی ہیں۔ اس لیے باجی کا "با" ہٹا کر صرف ماہین جی کہنا شروع کر دیا۔" اس نے عادت کے مطابق تفصیلی جواب دیا۔

"ہاں تو ٹھیک ہے نا۔ ایک ہی کلاس میں پڑھتی ہو دونوں۔ باجی کہنا ٹھیک نہیں لگتا۔" خدیجہ نے ان لوگوں کی حمایت کی۔

"پورے تین برس بڑی ہیں ماہین جی مجھ سے۔ تعلیمی مدارج ذرا سستی سے طے کیے ہیں۔ جب ہی میری کلاس فیلو بن گئیں۔"

"ہر کسی کی ذہنی قابلیت الگ ہوتی ہے اجیہ! اب اگر ماہین کا دماغ پڑھائی میں نہیں چلتا تو اس میں اس بے چاری کا کیا قصور۔" خدیجہ نے اسے رسانیت سے ٹوکا۔

"بس پڑھائی میں ہی دماغ نہیں چلتا امی! ورنہ تو۔۔۔"

"اچھا بس! کسی دوسرے کا یہاں کیا ذکر۔ تم جا کر اپنی پڑھائی کرو۔"



"پلیز ماہین جی! جلدی کیجیے۔ پہلا پیریڈ مس رابعہ ہاشمی کا ہے۔ آپ جانتی ہیں نا، دو منٹ لیٹ کلاس میں جانے پر کتنی عزت افزائی کرتی ہیں۔"

وہ حسب معمول کالج جاتے ہوئے تایا جان کے گھر رکی تھی۔ ماہین کا اصرار ہوتا تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر کالج جائے۔ لیکن ماہین کالج جانے سے پہلے اتنی

نک سک سے تیار ہوتی تھی کہ اکثر اجیہ کو اس کی وجہ سے دیر ہو جاتی۔

وہ بے زار شکل بنائے ماہین کے چلنے کا انتظار کر رہی تھی اور باہر حسب معمول تایا جان اور تائی جان با آواز بلند کسی بحث میں مشغول تھے۔ اسے جھگڑا کہنا زیادہ مناسب تھا۔

"ماہین جی پلیز، جلدی کریں نا ورنہ میں اکیلے ہی چلی جاتی ہوں۔" اجیہ کے صبر کا پیمانہ آخر لبریز ہو ہی گیا تھا۔

"اچھا بھئی چلو۔ اب اتنی بھی دیر نہیں ہوئی۔" ماہین نے دوپٹا بہت اسٹائل سے سیٹ کیا۔ پھر موبائل بیگ میں ڈال کر زپ بند کی۔

"آج پاپا سے کہتی ہوں ہمیں ڈراپ کر دیں۔" وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولی۔ اجیہ نے اسے منع کرنا چاہا مگر پھر چپ ہو گئی۔

"پاپا! آج ہم تھوڑا سا لیٹ ہو گئے۔ آپ چھوڑ دیں گے ہمیں۔" ماہین نے باہر آ کر تایا جان کو مخاطب کیا۔ کچھ لمحوں پہلے تایا جان اور تائی اماں میں جھڑپ رک گئی تھی۔ وہ اب اخبار پر نگاہ دوڑا رہے تھے۔ بیٹی کی بات سن کر اسے گھورا۔

"پانچ منٹ کے فاصلے پر کالج ہے۔ اتنی سی دور کے لیے گیراج میں سے گاڑی نکالوں۔ دماغ صحیح ہے تمہارا۔ دیر ہو رہی ہے تو صبح وقت پہ اٹھا کرو۔" تایا جان نے بغیر کسی مروت اور لحاظ کے بیٹی کو لتاڑا۔

"آپ سے تو چھوٹی سی فرمائش بھی کرنا فضول ہے۔" ماہین بدتہذیبی سے کہتی آگے بڑھ گئی۔

اجیہ نے بھی چپ چاپ اس کی پیروی کی۔ اسے اپنے نرم خو بابا یاد آئے۔ تایا جان کے سگے بھائی ہوتے ہوئے وہ ان سے کتنے مختلف تھے۔ اس نے بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کیا تھا۔ "واقعی بابا صحیح کہتے ہیں۔ اگر انسان غور و فکر شروع کرے تو شکر کرنے کو بہتیری باتیں مل جاتی ہیں۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

عون، صفیہ مامی کے ساتھ گھر آیا تھا۔ ہفتہ دس دن بعد وہ چکر لگا ہی لیتا تھا۔ اس نے کبھی ظہیر اور خدیجہ کو بیٹے کی کمی محسوس نہ ہونے دی تھی۔ وہ خود ہنستے ہوئے کہتا تھا کہ "مجھے دو گھروں کے اکلوتے بیٹے ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔"

گھر کے باہر کے بہت سے کام اس نے از خود اپنے ذمے لے رکھے تھے۔ خدیجہ کبھی کبھار اسے دامادوں والا پروٹوکول دینے کی کوشش کرتیں بھی تو وہ خفا ہو جاتا۔

"مجھے بیٹا سمجھیں یا بھتیجا۔ لیکن پلیز کبھی داماد مت سمجھیے گا پھپھو۔"

"کیوں تمہارے کہنے سے یہ حقیقت بدل جائے گی کیا۔ آفٹر آل تم اس گھر کے داماد ہی تو ہو۔" غنیہ اسے شرارت سے چھیڑتی۔

"اگر میں کبھی آفٹر آل ٹائپ والا داماد بنا تو سب سے پہلے آپ کی بہن ہی خونخوار بلی کی طرح پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گی۔" عون کا اشارہ اجیہ کی طرف تھا۔ غنیہ ہنس پڑتی۔ اجیہ اور عون میں بے تحاشا دوستی اور بے تکلفی تھی۔ یہ دوستی بچپن سے تھی۔ رشتہ بدلنے کے بعد بھی اس دوستی پر کوئی فرق نہ پڑا۔ عون کو یہ حسرت ہی رہی کہ کبھی وہ ان کے بیچ جڑے رشتے کی نزاکت اور خوب صورتی کو محسوس کرے۔ لیکن اجیہ اسے دوست سے زیادہ کچھ سمجھنے پر تیار نہ ہوتی۔ آج جب وہ ماں کے ساتھ یہاں پہنچا تو خلاف توقع اجیہ کچن میں مصروف تھی۔

"لگتا ہے ہم صحیح وقت پر پہنچے ہیں۔ بڑی خوشبوئیں آ رہی ہیں۔" عون اس کو تلاش کرتا کچن میں ہی پہنچ گیا۔

"تم جانتے ہو سنڈے کو ہمارے گھر لنچ پر خاص اہتمام ہوتا ہے۔ اس لیے بن بلائے مہمان بن کر نازل ہو جاتے ہو۔ اس میں نئی کیا بات ہے۔" اجیہ نے اسے چڑایا۔

"اس میں نئی بات یہ ہے کہ آج امی بھی میرے ساتھ آئی ہیں۔ میں انہیں جا کر بتاتا ہوں تم انہیں بن بلایا مہمان قرار دے رہی ہو۔"

"سچ مامی بھی آئی ہیں۔" اجیہ خوش ہو گئی۔

"ہاں آج امی کا پروگرام بن گیا۔ سو مجھے انہیں لے کر آنا پڑا۔ ورنہ تو میں نے کل آنا تھا۔"

"کیوں کل کیا خاص بات ہے؟" اجیہ نے تعجب کا اظہار کیا۔

"بھول گئیں۔ کل کیا خاص بات ہے؟" عون نے افسوس کا اظہار کیا۔

"مجھے واقعی یاد نہیں آ رہا۔ کل کیا خاص بات ہے عون؟"

"کل ہمارے نکاح کی اینورسری ہے اجیہ! یہ کوئی بھولنے والا دن تو نہیں۔" عون کو اس کی بے خبری پر شدید افسوس ہوا۔

"افوہ عون! کتنی چھوٹی تھی میں اس وقت۔ مجھے کیسے یاد رہ سکتا ہے وہ دن۔" اجیہ نے مسکراہٹ دباتے ہوئے اسے چڑانا چاہا اور حسب توقع وہ بری طرح چڑ گیا۔

"ہاں جی بہت چھوٹی تھیں آپ اس وقت۔ فیڈر ہاتھ میں لے کر تو نکاح نامے پر سائن کیے تھے۔" وہ چڑ کر بولا اور اجیہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔ عون اس کی خوب صورت ہنسی کے سحر میں کھو سا گیا۔

"کیا ہوا اب، ایسے کیوں گھور رہے ہو۔" اجیہ نے اسے ٹوکا۔

"جو لڑکی پیار سے دیکھنے کو گھورنے کا نام دے اس کی عقل پر افسوس کا اظہار ہی کیا جا سکتا ہے۔" عون نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"عون! تم آج کل بار بار پٹری سے کیوں اترنے لگتے ہو۔" اجیہ خفا ہوئی۔

"پتا نہیں یہ بات مجھے خود بھی سمجھ نہیں آتی۔ ویسے یار! ہمارے نکاح کا پیریڈ کچھ زیادہ ہی طویل نہیں ہو گیا۔ کیا خیال ہے امی سے کہوں کہ وہ پھپھو، پھپھا سے بات کریں؟"

"میں ماسٹرز سے پہلے شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ بات پتا ہے نا تمہیں۔" اجیہ نے اسے سنجیدگی سے باور کروایا۔

"ماسٹرز رخصتی کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ پر امس

تم جتنا مرضی پڑھنا چاہو، پڑھ لینا۔ میں تمہیں ہرگز نہیں روکوں گا۔" عون نے یقین دلایا۔ اجیہ اسے افسوس کے عالم میں دیکھتی رہ گئی۔

"تمہاری خاموشی سے میں یہ ہی نتیجہ نکالوں ناکہ تمہیں اس بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ پھر امی کو کہہ دوں کہ وہ پھپھو سے بات کریں؟" عون پوچھ رہا تھا۔ اجیہ کی آنکھیں ایک دم ڈبڈبا گئیں۔

"ارے کیا ہوا۔ آئی واز جوکنگ یار!" عون سٹپٹا گیا۔

"قسم سے میں تو اس انتظار میں تھا کہ تم اپنے سامنے پڑا کفگیر مجھے اٹھا کر مارو گی۔ تمہیں ملکہ جذبات بننے کیا سوجھی؟" عون اس کے آنسو دیکھ کر بے چین ہو گیا تھا۔

"مجھے لگا تم سیریس ہو۔" وہ ہولے سے بولی۔

"میں تمہارے ساتھ واقعی بہت سیریس ہوں۔ بلیو می۔" عون کی آنکھوں میں پھر شرارت چمکی۔

"تم جانتے ہو نا عون! میں غنچہ آپی سے پہلے رخصتی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہ میری تم سے زندگی کی پہلی اور آخری فرمائش ہے کہ غنچہ آپی کی شادی سے پہلے تم نے مامی کو اس بات سے روکے رکھنا ہے۔ ورنہ پتا ہے امی اور بابا کا یہ خیال ہے کہ ندا آپی اور ثنا آپی کی شادیوں کے بعد مامی بالکل تنہا ہو گئی ہیں۔ اگر وہ میری رخصتی کروانے کی خواہش کا اظہار کریں تو امی، بابا کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ لیکن عون! میں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہتی۔ پتا نہیں ماموں کو تمہارے لیے میرا ہی خیال کیوں آیا۔ سال، چھ مہینے کی چھوٹائی بڑائی کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اگر تم اور غنچہ آپی..."

"اسٹاپ اٹ اجیہ!" عون نے اپنے اندر اٹھتی غصے کی لہر بمشکل ضبط کی تھی۔ جانتا تھا کہ اس کی بیوی کو بنا سوچے سمجھے بولنے کی عادت ہے۔

"غنچہ آپی مجھے بہت پیاری ہیں۔ اتنی ہی پیاری جتنی مجھے ندا آپا اور ثنا آپا ہیں۔ مگر مجھے تمہاری اس بے تکی بات کو سن کر اتنا شدید غصہ آیا ہے ناکہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"سوری عون!" اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کتنی غلط بات کر چکی ہے۔ سو فوراً معذرت کرلی۔

"اٹس او کے... اور تم غنچہ آپی کی وجہ سے اتنی ٹینشن کیوں لیتی ہو۔ مجھے تو اللہ پر پورا بھروسا ہے کہ اس نے ان کے نصیب میں ضرور کسی بہت اچھے شخص کا ساتھ لکھ رکھا ہے۔ جب وہ وقت آئے گا تو وہ شخص ضرور ان کی زندگی میں شامل ہو جائے گا۔" عون نے دل کی گہرائیوں سے یقین دلایا تھا۔

"تم سے بات کر کے میں واقعی بہت ریلیکس ہو جاتی ہوں عون!" اجیہ نے سادگی سے تسلیم کیا۔ عون مسکرا کر رہ گیا۔

"تم اندازہ نہیں کر سکتے آج کل ہمارے ہاں کیسے بھانت بھانت کے لوگ آتے ہیں۔ غنچہ آپی کی ہمت ہے کہ وہ ہر دس دن بعد ایک نئی رشتہ پریڈ کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ اگر ان کی جگہ میں ہوتی تو ناتو..."

"تم ان کی جگہ کیسے ہو تیں ڈارلنگ! برسوں پہلے تمہیں تو میری زندگی پر مسلط..."

"یہ تم نے ڈارلنگ کسے کہا۔" اجیہ نے اس کی بات پوری ہونے کا انتظار کیے بنا کفگیر اٹھالیا۔

"اجیہ آپی! اتنی دیر ہو گئی۔ مامی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔ انہیں سلام کرنے نہیں جانا کیا؟" ہنیہ کی آواز سن کر اجیہ نے جھٹ ہاتھ نیچے کیا۔

"بڑے وقت پر آئی ہو بہنا۔" عون ہنسا تھا۔

"میں مامی سے مل لوں۔ پھر پوچھتی ہوں تم سے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے کچن سے نکلی۔ عون بھی ہنستے ہوئے اس کے پیچھے نکل گیا۔



"لگتا ہے آپ لوگوں کے ہاں مرچیں زیادہ کھائی جاتی ہیں۔" مہمان خاتون نے ایک شامی کباب سوں سوں کرتے ہوئے بمشکل ختم کیا۔ پھر پلیٹ میز پر رکھ کر اظہار خیال کیا۔

"اگر مرچیں زیادہ نہ ڈالیں تو کباب زیادہ کھائے جاتے ہیں آنٹی!" اجیہ بڑبڑائی تھی۔

آج پھر شائستہ خالہ نے چند خواتین کو بھیجا تھا۔ اجیہ کی چھٹی حس نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ خواتین پہلے آنے والی خواتین جیسی ہی ثابت ہوں گی۔ اس نے آج مہمانوں کی خاطر تواضع کا چارج خود سنبھالا تھا۔ شامی کباب اور چنا چاٹ میں مرچوں کی مقدار شاید ضرورت سے زیادہ پڑ گئی تھی۔ جب ہی ایک بار لینے کے بعد کسی نے دوبارہ ان چیزوں کی جانب ہاتھ نہ بڑھایا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر اب لڑکے کی ماں اور دونوں بہنیں غنچہ کے انٹرویو میں مگن ہو گئیں لیکن جلد ہی ان کے چہروں سے عدم دلچسپی کا اظہار ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اجیہ بغور ان کے چہرے کے تاثرات جانچ رہی تھی۔ اسی لمحے لڑکے کی ایک بہن اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"شائستہ باجی بتا رہی تھیں کہ آپ کی منجھلی بیٹی کی بات تو پہلے سے طے ہے۔ صحیح کہہ رہی تھیں کیا وہ؟" لڑکے کی بہن نے خدیجہ کو مخاطب کیا۔

"جی... اجیہ کا نکاح میرے بھائی کے بیٹے سے ہو چکا ہے۔" خدیجہ نے بتایا۔

"اچھی چیزیں پہلے ہی خاندان والے چھانٹ لیتے ہیں۔" لڑکے کی ایک بہن نے دوسری بہن کے کان میں استہزائیہ انداز میں سرگوشی کی تھی۔ اجیہ ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ یہ بے رحم سرگوشی اس کے کانوں تک بھی با آسانی پہنچ گئی تھی۔

"آپ کی شادی فیملی میں ہوئی ہے یا آؤٹ آف فیملی۔" اس نے اچانک لڑکے کی بہن سے پوچھ ڈالا۔

"یہ تو سگے چچا کے گھر گئی ہے۔" لڑکے کی ماں نے بیٹی کی بابت بتایا۔

"پھر تو آپ کا تبصرہ غلط ہوا نا باجی جان! ضروری تو نہیں خاندان والے ہی اچھی چیز منتخب کریں۔" وہ بظاہر ہنستے ہوئے مگر چبا چبا کر بولی تھی۔

"کیا مطلب؟" لڑکے کی بہن کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا۔

"کچھ نہیں۔ آپ یہ کباب لیں نا۔ کیچپ ڈال کر کھائیں گی تو مرچیں کم لگیں گی۔" اجیہ نے ان کے آگے کبابوں کی پلیٹ کی۔

"بس چلتے ہیں ہم۔ چلو اماں!" لڑکے کی بہن اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شکر ہے اماں جی کو یہ "کراس ٹاک" صحیح طور پر سمجھ میں نہ آئی تھی۔ ورنہ انہوں نے بھی اچھا خاصا فساد ڈال دینا تھا۔ رسمی سے الوداعی کلمات ادا کر کے وہ بیٹیوں کے ہمراہ واپس ہو لیں۔

اجیہ جانتی تھی اب ماں سے اسے سخت سست سننے کو ملے گی مگر خلاف توقع خدیجہ نے ہنیہ کو چیزیں سمیٹنے کا کہا اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ غنچہ بھی معمول کے مطابق اپنا قیمتی جوڑا اتارنے کمرے میں گھس گئی۔ اجیہ کے دل و دماغ پر عجیب سا بوجھ آن گرا تھا۔ اس نے چپکے سے جا کر ماں کے کمرے میں جھانکا۔ خدیجہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھیں۔

"کیا ہوا امی؟" اجیہ بے چین ہو کر ان کے پاس گئی۔

"کچھ نہیں، تھک گئی ہوں۔" خدیجہ نے اسی پوزیشن میں لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"سوری امی!" وہ روہانسی ہو کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"میں نے تمہیں کچھ کہا؟" خدیجہ نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا۔

"میں کیا کروں امی! کوئی غنچہ آپی کو ڈی گریڈ کرے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ وہ ہر بار کیسی اذیت سے گزرتی ہیں۔"

"ہاں صرف تمہیں ہی غنچہ سے پیار ہے۔ ہم تو اس کے کچھ نہیں لگتے۔" خدیجہ ٹھنڈے لہجے میں مخاطب ہوئیں اور اجیہ ان کی ہر قسم کی ڈانٹ ڈپٹ ہنستے ہنستے برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن ان کا یہ ناراضی بھرا انداز سہنا اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ جب ہی وہ روتے ہوئے ان سے لپٹ گئی تھی۔ خدیجہ سے بھی اس کا رونا کب برداشت ہوتا تھا۔ انہوں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کی پیشانی چومی تھی۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اب ان کی ناراضی ختم ہو گئی ہے۔

"امی! شائستہ خالہ کو کہیں کم از کم ہمارے کوائف لڑکے والوں کو صحیح صحیح بتادیں۔ ہمارے متعلق اچھی طرح جان لینے کے بعد کوئی آنا جانا چاہے تو شوق سے آئے۔ لیکن شائستہ خالہ تو ہر رشتے کو ہی یہاں ریفر کردیتی ہیں۔ یہ بار بار کی ریجیکشن غنچہ آپی کو کس طرح مینٹلی ٹارچر کرتی ہے امی! آپ کو اندازہ ہے نا اس بات کا۔" اس نے ماں کے ہاتھ تھام کر پوچھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو بیٹا! مجھے شائستہ کو کہنا پڑے گا کہ وہ ہمارے متعلق بتاتے ہوئے بالکل مبالغہ آمیزی سے کام نہ لے۔ غنچہ میری بچی ہے۔ ظاہر ہے وہ مجھے بہت خوب صورت اور پیاری لگتی ہے۔ لیکن شائستہ کو چاہیے کہ وہ غنچہ کے متعلق بھی لڑکے والوں کو زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان نہ کرے۔ جانے لوگوں کی خوب صورتی کے کیا پیمانے ہیں۔ میری غنچہ لوگوں کے معیار پر کیوں پورا نہیں اترتی۔" خدیجہ کی آواز بھرا گئی۔

"امی! آپ ہمیشہ ہمیں نصیحت کرتی ہیں کہ اللہ پر بھروسا رکھو۔ آپ بھی اللہ سے اچھی امید رکھیے۔ وہ ہماری غنچہ آپی کو بہت اچھے اور مخلص شخص کا ساتھ نصیب کرے گا۔" اس نے ماں کو مخاطب کیا۔

"یہ میری بیٹی نے اتنی سمجھ داری کی باتیں کہاں سے سیکھ لیں۔" خدیجہ نے اسے پیار سے دیکھا۔

"آپ کے سمجھ دار بھتیجے نے پرسوں مجھے ان ہی الفاظ میں تسلی دی تھی۔" اس نے مسکرا کر ماں کو بتایا۔ خدیجہ سے وہ کبھی کچھ نہ چھپاتی تھی۔ شاید دنیا میں وہ سب سے زیادہ اپنی ماں کے ہی قریب تھی۔ اس کی بات سن کر خدیجہ مسکرا دیں۔



"تمہاری ماں نے بہت دنوں سے چکر نہیں لگایا۔ زیادہ ہی مصروف نہیں رہنے لگ گئی۔" تائی اماں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ ماہین کے انتظار میں بیٹھی یوں ہی سامنے پڑے اخبار پر نگاہ دوڑا رہی تھی۔ تائی جان کی بات پر سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

"پرسوں امی آرہی تھیں تائی اماں! لیکن عین وقت پر کچھ مہمان آگئے۔ ویسے کہہ رہی تھیں ایک دو روز میں چکر لگائیں گی۔" اس نے جو سچ تھا بتا دیا۔

"کیسے مہمان، کیا پھر غنچہ کو دیکھنے لوگ آئے تھے؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں تائی اماں! بابا کے کچھ دوست آگئے تھے۔ بس امی ان ہی کی خاطر تواضع میں مصروف ہو گئیں۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہاری ماں کی بھی ہمت ہے۔ ہر وقت خاطر داریوں میں الجھی رہتی ہے لیکن مجبوری ہے۔ بچی کی عمر نکلتی جارہی ہے اور کوئی مناسب رشتہ مل کر نہیں دے رہا۔ ظہیر بے چارے کی آمدنی اتنی کہاں کہ گھر کے خرچے کے ساتھ ان روز کے مہمانوں کی خاطر کا خرچا اٹھاتا رہے۔"

تائی اماں کا لہجہ ترس کھاتا ہوا تھا۔

"غنچہ آپی کی کہاں سے عمر نکلتی جارہی ہے۔ ماہین جی سے بمشکل سال، سوا سال بڑی ہیں۔ غنچہ آپی بھی اگر ماہین جی کی طرح انٹر کرنے میں کئی سال لگا دیتیں تو شاید آج وہ بھی ہمارے ساتھ کالج جارہی ہوتیں۔"

"پورے دو سال کی بڑائی چھوٹائی ہے ماہین اور غنچہ میں۔ ماہین کے تو اتنے رشتے آرہے ہیں کہ ہم سوچ میں پڑے ہوئے ہیں۔ کس کو انکار کریں۔ کس کو اقرار۔ لاکھوں میں ایک ہے میری بچی۔ پھر دو بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ باپ کی آمدنی لاکھوں میں۔ ایسے ہی تو لوگ ہماری دہلیز کا پیچھا نہیں پکڑ رہے۔"

تائی جان کا لہجہ، ان کا طنطنہ، ان کا غرور۔ اچھی بہر حال ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ خدیجہ اسے ٹوکتی تھیں۔ اسے اپنی زبان قابو میں رکھنے کا ہنر آنا چاہیے۔ بلاوجہ جواب دے کر بات بڑھائی۔ تائی اماں کی باتیں اتنی بھی غلط نہ تھیں۔ واقعی ماہین کو رشتوں کی کیا کمی تھی۔ وہ خوب صورت تھی۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی تھا اور اپنی خوب صورت شخصیت کو مزید جاذب نظر بنانے کے لیے وافر پیسہ بھی تھا لیکن وہ کیوں ماہین کو سوچے جارہی تھی۔ کیا وہ دل ہی دل میں اس

سے حسد کا شکار ہو رہی تھی۔ اس نے خود کو ٹٹولا۔ اپنے آپ کو جھٹلانا چاہا مگر پھر تسلیم کرلیا۔ ہاں شاید وہ ماہین سے جل گئی تھی اور بابا اکثر ان بہنوں کو ایک حدیث سناتے تھے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑیوں کو اور بابا اکثر یہ بھی کہتے تھے کہ بعض اوقات کوئی گناہ بھی انسان کو اس کے خالق کا قرب دلا سکتا ہے۔ انہیں حیرت ہوئی تھی تو بابا نے بتایا تھا۔

"بیٹا جی اگر کسی انسان کو گناہ کا احساس ہو جائے اور پھر وہ اس گناہ پر نادم ہو کر رب کے سامنے توبہ کا اظہار کرے تو اللہ کو اپنے بندے کی یہ ادا بہت پسند آتی ہے اور یوں رب کی بارگاہ میں اس کا درجہ بڑھ جاتا ہے۔" بابا کی بات یاد آتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور لبوں پر استغفار آ گئی تھی۔

"چلیں اجیہ!" ماہین تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔

وہ دوپٹا اور فائل سنبھالتی تائی اماں کو اللہ حافظ کہتے ہوئے ماہین کی معیت میں آگے بڑھ گئی۔



"اجیہ یار! تمہاری کزن ماہین آج پھر نہیں آئی۔ میری ایک بک بہت دنوں سے اس کے پاس ہے۔ روز یاد دلاتی ہوں مگر بہانہ کردیتی ہے کہ گھر بھول آئی۔ میری توبہ جو آئندہ اسے کوئی کتاب دی۔" یہ ماہین کی کلاس فیلو نوشین تھی جس نے اجیہ کو آواز دے کر روکا تھا۔

"ماہین آج آئی ہے، ہو سکتا ہے پیریڈ نہ لیا ہو۔ تم اگلے پیریڈ میں مل لینا اس سے۔" اجیہ نے اسے رسانیت سے آگاہ کیا۔

"ارے نہیں یار! صبح سے میں نے ایک بار بھی ماہین کو نہیں دیکھا۔ میرا چکر لائبریری کا بھی لگا ہے اور کینٹین کا بھی، ماہین مجھے تو کہیں نظر نہیں آئی۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ آج کالج آئی ہی نہیں۔" نوشین نے کہا۔

"نہیں نوشین! صبح ماہین میرے ساتھ کالج آئی ہے۔ مجھے غلط فہمی کیوں ہونے لگی۔" وہ مسکرائی۔

آخری پیریڈ لے کر وہ گیٹ کی طرف جا رہی تھی کہ پھر نوشین سے ٹکراؤ ہوا۔

"اجیہ! ماہین مجھے تو ملی نہیں۔ تمہارا اس سے رابطہ ہو تو پلیز اسے میرا میسج دے دینا کہ مجھے اپنی گائیڈ بک کی فوری ضرورت ہے۔ وہ کل یاد سے لیتی آئے۔"

نوشین کہہ کر چلی گئی۔ اجیہ حیران پریشان کھڑی رہی۔ آخر آج ماہین نے کلاسز کیوں اٹینڈ نہیں کی تھیں۔ گیٹ کے پاس اسے ماہین کی دوستوں کا گروپ کھڑا نظر آ رہا تھا۔ لیکن ماہین ان میں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی، روز آخری پیریڈ لے کر اجیہ ہی ماہین کے پاس جاتی تھی۔ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گیٹ کے پاس ایک مخصوص جگہ کھڑی ہوتی تھی۔ لیکن آج وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اگر صبح وہ اس کے ساتھ کالج نہ آئی ہوتی تو وہ سمجھ لیتی کہ آج ماہین نے کالج سے چھٹی کرلی ہے۔ لیکن صبح وہ اس کے ساتھ آئی تھی۔ پھر آخر اس نے سارا دن کالج کے کس کونے کھدرے میں چھپ کر گزرا کہ وہ اپنی کلاس فیلو تک کو نظر نہ آئی۔

ماہین کی دوستوں سے اس کے متعلق استفسار کرنے وہ ان کی طرف چل پڑی۔ اتنے میں گیٹ سے ماہین اندر آتی دکھائی دی۔ اس نے دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ آسانی سے پہچان میں آ رہی تھی۔

"ہائیں! یہ ماہین باہر سے کیوں آ رہی ہے۔" اجیہ نے تعجب سے سوچا۔

چھٹی کے ٹائم گیٹ پر لڑکیوں کا جم غفیر تھا۔ کچھ جھانک کر باہر اپنے لینے کے لیے آنے والوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ کچھ دوستوں کے ساتھ گروپ بنائے کھڑی تھیں۔

اجیہ لڑکیوں کے رش میں جگہ بناتی ماہین کے گروپ کی طرف بڑھی۔ ماہین کی سب سہیلیاں یوں لپک کر ماہین کی طرف بڑھی تھیں جیسے ان کی بہت دیر بعد ملاقات ہو رہی ہو اور ماہین کے پاس انہیں سنانے کے لیے کوئی خاص خبر ہو۔ اجیہ ان لوگوں کے پاس پہنچی

تو وہ سب باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ کوئی اجیہ کی جانب متوجہ نہ ہوا۔ اجیہ بھی دانستہ طور پر ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ وہ سننا چاہتی تھی کہ آخر ماہین کے پاس اپنی دوستوں کو سنانے کے لیے کیا خاص خبر ہے۔

"اب کچھ منہ سے پھوٹ بھی دے ماہین کی بچی! ہم سب لوگوں کا ایکسائٹمنٹ کے مارے برا حال ہو رہا ہے۔" اس کی ایک سہیلی نے اس کے کندھے پر دھپ رسید کیا۔

"تم لوگ ایویں اتنے ایکسائٹڈ ہو رہے ہو۔ بندہ ایک دم ڈل اور ڈفر تھا۔ میرے تو سارے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔" ماہین ناک چڑھا کر بولی تھی۔ اجیہ کا ایک لمحے کو سانس رک گیا۔

"آواز سے تو ایک دم ڈیشنگ اور اسمارٹ لگتا تھا۔" ایک اور سہیلی نے اسے مخاطب کیا۔

"ہاں آڈیو زبردست تھی۔ ویڈیو ایک دم بکواس۔ چار بچوں کا ابا لگ رہا تھا۔"

"ہائے اللہ نہیں۔" سب کورس میں چیخی تھیں۔

"اتنا برا تھا تو پھر چار گھنٹے کیوں جھک مارے اس کے ساتھ؟" ایک سہیلی نے لتاڑا۔

"ٹائم پاس کرنا تھا نا۔ خیر لنچ بڑا مزے دار تھا۔" ماہین ہنسی تو سب سہیلیاں بھی ہنس پڑیں۔

"ویسے جس طرح وہ میری توقع کے خلاف نکلا۔ میں بھی اس کی توقع کے خلاف نکلی۔ وہ اتنی خوب صورت لڑکی کی توقع ہی نہیں کر رہا تھا۔ سچ مجھے دیکھ کر مبہوت ہی رہ گیا تھا۔" ماہین اترا کر بولی۔ اس کی سہیلیوں نے اسے رشک سے دیکھتے ہوئے اس کی بات کی تائید کی۔

"اب وہ تمہارا پیچھا اتنی آسانی سے تو نہیں چھوڑے گا یار! کوئی مسئلہ ہی کھڑا نہ کردے۔" ماہین کی سب سے چہیتی دوست نے تشویش کا اظہار کیا۔

"ارے نہیں یار! میرا اس سے فون پر رابطہ تھا تنگ کرے گا تو اپنی سم بدل لوں گی۔ وہ میرا صحیح نام تک تو جانتا نہیں۔ ایڈریس بھی غلط بتایا ہے۔ بس اسے یہ ہی پتا ہے نا کہ اس کالج میں پڑھتی ہوں تو اس

کالج میں تو ہزاروں لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ بے وقوف ہی ہوگا جو کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر مجھے کھوجتا پھرے گا۔ لڑکیوں کو زیادہ تاڑے گا تو کسی لڑکی کے باپ، بھائی کے ہاتھوں پٹ جائے گا۔" ماہین کھلکھلائی۔

اجیہ حیرت اور افسوس سے اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ ماہین سے اس کی نہ تو دوستی تھی۔ نہ ہی کوئی جذباتی یا قلبی لگاؤ۔ ہاں مگر خون کا رشتہ تو تھا نا۔ وہ اس کے سگے تایا کی بیٹی تھی۔ اسے اتنی اخلاقی پستی میں گرتا ہوا دیکھ کر اجیہ کا دکھ اور صدمے سے برا حال تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی پیچھے مڑ گئی تھی۔ اس کا ماہین کا سامنا کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ اس کا دماغ ابھی تک سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فزکس لیب کے سامنے والے برآمدے کی سیڑھیوں پر وہ دونوں ہاتھوں میں سر گرا کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ماہین اسے ڈھونڈتی وہیں پہنچ گئی۔

راستے میں ماہین نے ایک، دو بار اس سے اس کی طبیعت اور موڈ کے بارے میں استفسار کیا تھا مگر جب وہ کچھ نہ بولی تو وہ بھی نخوت سے ہونہہ کہہ کر چپ ہو گئی۔

سچی بات تو یہ تھی کہ وہ اب ماہین جیسی لڑکی کے ساتھ آنا جانا گوارا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر کوئی ماہین کو ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا تو وہ بھی اس کے ساتھ کسی کی نگاہ میں آسکتی ہے۔ اس سوچ نے اسے سب سے زیادہ خائف کردیا تھا۔

یہ طے تھا کہ وہ اب ماہین کے ساتھ کالج نہیں جاسکتی تھی۔ اگلے دن وہ صبح تائی جان کے گھر گئی۔ گیٹ ان کے چھوٹے بیٹے شرجیل نے کھولا تھا۔

"شرجیل! تم ماہین جی کو بتا دینا کہ آج سے مجھے جلدی جانا ہوگا۔ اب ہمارا پریکٹیکل صبح ہوا کرے گا۔ تم چھوڑو بتا نہیں کالج۔"

یہ کہہ کر اس نے شرجیل کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور آگے بڑھ گئی۔ ماہین کے ساتھ جانے سے بہتر تھا کہ وہ کالج ٹائمنگ سے پندرہ منٹ پہلے ہی کالج

پہنچ جایا کرے۔ واپسی کے ٹائم بھی ایسا ہی کوئی بہانہ بنایا جاسکتا تھا اور بہانہ بنانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ کالج میں جب اس کا ماہین سے آمنا سامنا ہوا تو ماہین نے اسے بہت نخوت سے مخاطب کیا۔

"آج میں صدیقی صاحب کی بیٹی کے ساتھ آئی ہوں۔ واپسی میں بھی اسی کے ساتھ جاؤں گی۔ تمہارے بہت نخرے ہونے لگے ہیں نا۔ واپسی پر بھی اکیلے ہی جانا۔" ماہین نے اپنے پڑوس میں رہنے والی لڑکی کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"ٹھیک ہے ماہین جی! جیسے آپ کی خوشی۔" اس کے سر سے جیسے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا تھا۔



موسم کے تیور آج بہت خطرناک تھے۔ صبح سے ہی گھٹائیں اُمڈ اُمڈ کر آرہی تھیں۔ خدیجہ نے اسے اور ہنیہ کو کالج' اسکول سے چھٹی کا مشورہ دیا تھا۔ ہنیہ نے خوشی خوشی ماں کی بات مان لی۔ جبکہ اس کا بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔ وہ ماں کو منا کر کالج آگئی تھی۔ جس ٹائم چھٹی ہوئی تو بادل بس برسنے کو تیار ہی تھے۔ دن میں ڈھلتی شام کا سماں تھا۔ تیز ہوا اور گرج چمک' اس کا اپنا دل ہول رہا تھا۔ "اے اللہ پلیز گھر پہنچ جاؤں۔ تب بادل برسیں۔" اس نے دل ہی دل میں رب کو پکارا تھا۔ گیٹ کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ ماہین کے گروپ پر نظر پڑی۔ وہ سب حسب معمول ہنسی مذاق میں مشغول تھے۔ اسی لمحے ماہین کی بھی اس پر نگاہ پڑی تھی۔

"اتنی دیر کیوں کردی اجیہ! بے چارہ تمہارا عون کب سے باہر تمہارے انتظار میں کھڑا سوکھ رہا ہے۔" ماہین نے استہزائیہ انداز میں اسے باآواز بلند پکارا تھا۔ اردگرد کی کئی لڑکیوں نے چونک کر اجیہ کو دیکھا۔ اجیہ نے غصے کی اٹھتی لہر کو بمشکل کنٹرول کیا۔ ماہین کو جواب دیے بنا وہ گیٹ پار کرگئی۔ باہر واقعی بائیک پر عون براجمان تھا۔

"اتنی دیر کردی' میں کب سے انتظار کررہا ہوں۔"

عون نے ماہین والے الفاظ ہی دہرائے تھے۔

"تم کیوں آئے ہو؟" اجیہ نے خفگی سے پوچھا۔ عون بائیک اسٹارٹ کررہا تھا۔ اس کی بات پر کچھ گھور کر اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے' تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"ذرا سے فاصلے پر تو گھر ہے۔ میں خود ہی آجاتی۔" اس نے عون کے پیچھے بیٹھتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ عون نے کوئی جواب نہ دیا۔

"کتنا حسین موسم ہورہا ہے نا اجیہ۔" بائیک مین روڈ پر فراٹے بھرنے لگی۔ تب عون نے اجیہ کو دوبارہ مخاطب کیا تھا۔

"کہاں سے حسین ہے' اچھا خاصا خطرناک ہے۔" اجیہ نے اس کی بات سے اتفاق کرنا ضروری نہ سمجھا تھا۔

"کیا خیال ہے' تمہیں آئس کریم کھلاؤں۔" موسم کی خوب صورتی عون پر اثرانداز ہورہی تھی۔

"پلیز عون! دماغ نہ خراب کرو۔ سیدھا گھر چلو۔" اجیہ نے بے زاری سے اسے مخاطب کیا۔

"دماغ تم میرا خراب کررہی ہو۔ اتنے دنوں بعد ملاقات ہورہی ہے۔ بجائے اس کے مسکرا کر ملو' تیوریاں ہی چڑھائی ہوئی ہیں۔" عون کو بھی غصہ آگیا تھا۔

"مسکرا کر ملنے کے لیے تمہیں گھر آنا چاہیے' کالج ملنے کے لیے ہرگز مناسب جگہ نہیں ہے۔" ماہین کی بات پر آیا غصہ بلاوجہ عون پر نکل رہا تھا۔

"بائی دا وے میں تم سے ملنے نہیں آیا تھا۔ تمہیں لینے آیا تھا۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے۔" عون چبا چبا کر بولا تھا۔ اجیہ چند لمحوں کے لیے کچھ نہ بول پائی' اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ عون کے ساتھ زیادہ ہی سخت لہجے میں بول گئی ہے۔

"تمہیں لڑکیوں کی عادت کا اندازہ نہیں عون! کسی لڑکے کے پیچھے لڑکی کو بیٹھتا دیکھ کر کیا کچھ نہیں سوچ لیتیں۔" کچھ دیر بعد اس نے دھیمے لہجے میں عون کو مخاطب کیا۔

"میں "کسی" کے زمرے میں نہیں آتا اجیہ! ہمارے درمیان ایک بہت معتبر رشتہ موجود ہے۔ میں کم از کم تمہیں اپنے پیچھے بائیک پر بٹھانے کا تو حق رکھتا ہی ہوں نا۔" اب خفا ہوکر اکڑنے کی باری عون کی تھی۔

"ہر کسی کو تو میرے تمہارے رشتے کا علم نہیں ہے نا عون! تمہیں میری نیچر کا اندازہ ہے۔ کوئی میرے کردار کے حوالے سے کوئی الٹی سیدھی بات کرے مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔" عون کچھ نہ بولا۔ بائیک کو ایف سکسٹین کی طرح اڑاتے ہوئے اس نے اسے گھر کے عین سامنے اتارا تھا۔

"آؤ گے نہیں؟" اجیہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ یک لفظی جواب دے کر بائیک پر سوار اور یہ جا وہ جا۔ اجیہ نے بہت بوجھل دل کے ساتھ گھنٹی پر انگلی رکھی۔

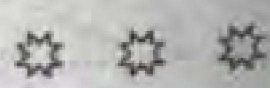
"عون چلا گیا؟" گیٹ خدیجہ نے کھولا تھا اور گیٹ کھولنے کے ساتھ ہی اسے اچنبھے سے مخاطب کیا۔

"آپ کو کیسے پتا' میں عون کے ساتھ آئی ہوں۔" اسے حیرت ہوئی۔

"میں نے ہی تو بھیجا تھا اسے۔ موسم اتنا خراب ہورہا تھا' پھر تم نے بتایا تھا کہ ماہین اپنی کسی اور سہیلی کے ساتھ گھر آتی ہے۔ میں نے سوچا اکیلے آتے ہوئے تم ڈرو گی۔" خدیجہ نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے بتایا۔ برآمدے میں پہنچ کر اجیہ تھکے ہوئے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"عون کو کوئی کام یاد آگیا۔ وہ چلا گیا امی۔" اس نے دھیرے سے بتایا۔

"عجیب لڑکا ہے' مجھ سے پکوڑوں کی فرمائش کرکے گیا۔ میں نے تو چولہے پر کڑاہی بھی رکھ دی۔ آئندہ آئے گا تو کان کھینچوں گی اس کے۔" خدیجہ عون پر خفا ہوتے ہوئے کچن میں گھس گئیں۔ اجیہ ٹھنڈا سانس لے کر رہ گئی تھی۔



"میری عزت" اپنی عزت کے لیے بہت حساس ہے۔ غصہ اترا تو مجھے اس کے غصے کی وجہ سمجھ میں آگئی۔ شاید وہ ہی صحیح تھی۔ میں بلاوجہ خفا ہوا' سوری فارویٹ۔"

میسج کی بپ پر ہنیہ نے پاس پڑا موبائل اٹھا کر دیکھا۔ میسج پڑھ کر اس کے ہونٹوں پر شرارتی سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ میسج میں کس واقعے کی جانب اشارہ تھا۔ وہ لاعلم تھی۔ لیکن یہ میسج کس کے لیے تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اجیہ اس وقت گہری نیند سو رہی تھی۔

"چلو' میں ہی عون بھائی کو جواب دے دوں۔ بے چارے جوابی میسج کے منتظر ہوں گے۔ ہنیہ نے سوچا اور فوراً" ہی سوچ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے عون کو ٹیکسٹ کردیا۔

"آپ کی عزت اس وقت خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی ہیں۔ عون بھائی اور اگر میں نے انہیں جگا کر آپ کا میسج پڑھوایا تو وہ میری کتنی عزت افزائی کرسکتی ہیں' یہ تو آپ کو اندازہ ہوگا ہی۔ بہرحال وہ جاگ جائیں گی تو آپ کے میسج کے بارے میں بتادوں گی۔" ہنیہ نے مسکراتا میسج سینڈ کیا تھا۔

"شرارتی بلی۔" عون میسج پڑھ کر دیر تک ہنسا تھا۔



بہت دنوں بعد شائستہ خالہ کی آمد ہوئی تھی۔ وہ خدیجہ کی خالہ زاد بہن تھیں اور ایک چھوٹا سا میرج بیورو چلاتی تھیں۔ غنیہ کے لیے انہوں نے بہت سے رشتے بھیجے تھے' مگر کہیں بھی بات نہیں بنی تھی' مگر آج شائستہ خالہ پرجوش انداز میں ایک نئے رشتے کی بابت بتارہی تھیں۔

"بس یوں سمجھیں خدیجہ باجی اگر یہاں بات بن جاتی ہے پھر تو آپ کی ساری دعائیں قبولیت کا درجہ پا جائیں گی۔"

"کون لوگ ہیں؟" خدیجہ نے اپنے مخصوص دھیمے انداز میں استفسار کیا۔

"اپنی برادری کے ہی ہیں اگر ابا جان زندہ ہوتے تو ضرور ان لوگوں کا شجرۂ نسب کھنگال کر کوئی دور نزدیک کی رشتہ داری بھی ڈھونڈ نکالتے' بہر حال بہت پڑھا لکھا اور وضع دار گھرانہ ہے' لڑکا انجینئر ہے' دو بہنوں کا اکلوتا بھائی اور دونوں بہنیں شادی شدہ۔ ماں اور دادی کے ساتھ رہتا ہے۔ خوب صورت' لائق فائق پڑھا لکھا اور بر سر روزگار بہت خاندانی لوگ ہیں پھر شجاع آباد کی طرف بہت سی زرعی اراضی بھی ہے' یوں سمجھو کہ دولت کی ریل پیل ہے۔"

"جو کوائف تم بتا رہی ہو شائستہ ایسے لوگوں کا ہم سے کیا جوڑ' تم انہیں لانے کا تکلف نہ ہی کرو' کوئی ہمارے جیسا متوسط گھرانہ نظر میں ہے تو بتاؤ۔" خدیجہ نے انہیں رسانیت سے مخاطب کیا۔

"آپ ایک دفعہ میری بات مان کر ان لوگوں کو اپنے ہاں آنے دیں خدیجہ باجی! ان شاء اللہ ہماری غنچہ ان لوگوں کو پسند آجائے گی۔" شائستہ کا لہجہ پر یقین تھا۔

"لیکن شائستہ۔" خدیجہ نے متذبذب انداز میں بات ادھوری چھوڑی۔

"لڑکا اپنی دادی کا بہت لاڈلا ہے اور دادی کی خواہش ہے کہ شادی اپنی برادری میں ہی ہو' ورنہ ظاہر ہے لڑکے کو رشتوں کی کوئی کمی تھوڑی ہے۔ لڑکے کی ماں بھی بھلی عورت ہے لوگ دیکھنے سے ہی ان کے مزاج کا اندازہ ہو جاتا ہے' وہ لوگ ایسے نہیں لگتے جو بلا وجہ کسی لڑکی میں مین میخ نکال کر رشتہ مسترد کر دیں۔ وہ اپنے بیٹے کی جلد شادی کے خواہش مند ہیں۔ اس لیے لڑکی ڈھونڈنے میں بے حد سنجیدہ ہیں' پھر میں نے آپ لوگوں کے بارے میں سب کچھ صحیح صحیح بتا دیا' اس کے باوجود وہ لوگ آنے کی خواہش کا اظہار کر رہے ہیں تو اس کا یہ ہی مطلب ہے نا کہ انہیں ایک سفید پوش گھرانے سے بہو لانے میں کوئی اعتراض نہیں۔"

اور شائستہ کا کہنا صحیح تھا۔ وہ لوگ اب تک آنے والے لوگوں سے بہت مختلف تھے۔ لڑکے کی ماں' دادی اور ایک شادی شدہ بہن غنچہ کو دیکھنے آئے تھے۔ اجیہ اور غنچہ نے ریفرشمنٹ کا سامان مہمانوں کے سامنے لا کر رکھا تب دادی جان کچھ خفا ہو گئی تھیں۔

"بیٹی! اس قدر تکلف کی کیا ضرورت تھی' ہم نے آتے کے ساتھ ہی تمہیں بتا دیا تھا کہ کسی تکلف میں مت پڑنا۔ ہم تو چائے کے شوقین ہیں بس ایک پیالی چائے پئیں گے۔" دادی نے کہنے کے ساتھ ہی چائے کا کپ اٹھا لیا تھا۔

"یہ سموسے بھی لیجیے نا۔ گھر کے بنے ہوئے ہیں۔ غنچہ کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے' آپ چکھ کر تو دیکھیں۔" خدیجہ نے سموسوں کی پلیٹ ان کے آگے کی۔

"سموسے بھی کھالیں گے بٹی! پہلے اصل بات تو کر لیں۔ آخر ہم صرف سموسے کھانے تھوڑی آئے ہیں۔" پوپلے منہ والی دادی مسکرائی تھیں۔

"ارسلان میرا پوتا ہے۔ شائستہ نے آپ کو ہمارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہوگا' لیکن پھر بھی آپ لوگ ہمارے گھر آئیں۔ ارسلان کو دیکھیں چھان بین کروائیں' یہ آپ کا حق ہے۔ ہمیں بہر حال آپ کا گھرانہ اور آپ کی بچی بہت پسند آئے ہیں۔ آپ لوگ ہمارا بچہ اور گھر آکر دیکھ لیں۔" دادی کے منہ سے نکلنے والی یہ بات اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ خدیجہ ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ چند لمحوں کے لیے ان کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ ان ضعیف خاتون کی بات کا کیا جواب دیں۔

خدیجہ کو یقین ہی نہ آرہا تھا کہ اتنی امیر کبیر' پڑھی لکھی فیملی اتنی مختصر سی ملاقات میں ان کی غنچہ کو سند قبولیت بخش دے گی۔ بوڑھی دادی کی جانے گھر میں کیا حیثیت تھی' لڑکے کی ماں' بہنوں کو بھی ان کی رائے سے اختلاف تو نہ تھا چند لمحوں میں ہی خدیجہ نے کیا کچھ نہیں سوچ لیا تھا۔

"خدیجہ بہن! ہمارے گھر میں ہر فیصلہ اماں کرتی ہیں اور ہمارے گھر میں خیر و برکت کی وجہ بھی یہی ہے۔ اماں میری ساس ہی نہیں' بلکہ میری ماں بھی ہیں۔ یہ بات میں محاورتاً نہیں کہہ رہی' بلکہ حقیقتاً' آپ کو بتا رہی ہوں۔ اماں' اصل میں میری خالہ ہیں۔ میرے اپنے والدین کا بہت بچپن میں انتقال ہو گیا تھا مجھے اماں نے ہی پالا' پھر اپنے اکلوتے بیٹے سے میری شادی کروا دی۔ آپ انہیں میری ساس سمجھ لیں' خالہ کہہ لیں یا ماں سمجھ لیں۔ اور پھر ماشاء اللہ آپ کی بچی ہے ہی اتنی پیاری کہ ہم اماں کی رائے سے کیوں اختلاف کرنے لگے۔ آپ یہ بتائیں ہمارے گھر کب تشریف لا رہی ہیں۔"

لڑکے کی گریس فل سی والدہ نے لمبی سی تمہید باندھنے کے بعد خدیجہ سے پوچھا تھا۔ خدیجہ کو اپنی آنکھوں میں بے ساختہ امڈ آنے والی نمی چھپانے میں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

"میں غنچہ کے بابا سے مشورہ کر کے آپ کو آگاہ کر دوں گی۔" چند لمحوں کے توقف کے بعد خدیجہ نے رسانیت سے جواب دیا تھا۔

ذرا دیر بعد مہمان رخصت ہو گئے تھے۔ خدیجہ نے فوراً "دو نفل شکرانے کی نیت باندھ لی تھی۔ غنچہ کے چہرے پر بھی آج دھنک کے سارے رنگ اترے ہوئے تھے۔ اجیہ اور رضیہ نے اسے چھیڑ چھیڑ کر ناک میں دم کر دیا تھا۔ آج کی شام اس گھر میں اترنے والی حسین ترین شام تھی۔ سب خوش تھے اور بے تحاشا مطمئن۔



اگلے روز صبح صبح صفیہ مامی اور ثنا آپا آگئے تھے۔ خدیجہ انہیں رات کو ہی فون پر خوش خبری سنا چکی تھیں ان لوگوں کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ صفیہ مامی نے غنچہ کو خود سے لپٹا کر ڈھیروں دعائیں دیں۔ اجیہ کی آج کالج سے چھٹی تھی کچن کی ذمہ داری آج اس نے بخوشی سنبھال لی تھی۔

"سسرال والوں پر امپریشن جما رہی ہو کہ تم نے بھی اچھی کوکنگ سیکھ لی ہے۔" عون کی مسکراتی آواز پر اجیہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

"ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ عون جو کسی جلے بھنے جواب کا منتظر تھا حیران رہ گیا۔

"میں نے مامی کی پسند کی کھڑے ماش کی دال بنائی ہے۔ ثناء آپی نے بریانی کی فرمائش کی تھی۔ وہ بنا رہی ہوں۔ میٹھے میں کیا بناؤں کچھ فیصلہ نہیں کر پائی۔ تم آگئے ہو تو اپنی پسند بتا دو۔ سوئٹ ڈش تمہاری پسند کی بنا لوں گی۔"

"اگر یہ خواب ہے تو میں اللہ سے دعا کروں گا کہ یہ خواب طویل سے طویل ہوتا جائے۔" عون نے حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔ اسے اپنی کٹ کھنی سی بیوی کا یہ انداز اور روپ ہضم نہ ہو کر دے رہا تھا۔

"ابھی پتا چل جائے گا کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔" اجیہ نے مسکراتے ہوئے ہاتھ میں پکڑی چھری کی نوک ہلکے سے اس کے بازو پر چبھوئی تھی۔

"ظالم لڑکی۔ کبھی تو لحاظ کر لیا کرو کہ میں تمہارا۔۔۔"

"لحاظ ہی کیا ہے ورنہ یہ گرم کفگیر تمہارے ہاتھ پر رکھ کر خواب یا حقیقت میں فرق بتانے کا ارادہ تھا میرا۔" اس نے عون پر احسان دھرا۔

عون ہنس پڑا تھا۔ اس نے عون کی جانب دیکھا پھر خود بھی ہنس پڑی۔

"میں تم سے کہتا تھا نا فکر مت کرو۔ اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ دیکھ لو غنچہ آپی کے لیے کیسا اچھا خاندان مل گیا۔ پھوپھو نے جو تفصیلات بتائی ہیں میں نے تو لڑکے کو بغیر دیکھے ہی اوکے کر دیا ہے۔" عون نے اسے مخاطب کیا۔

"ظاہر ہے عون لڑکا دیکھنا تو محض تکلف ہی ہے ہمارے لیے تو یہ ہی بہت ہے کہ وہ غنچہ آپی کو پسند کر گئے ہیں۔ لڑکے اور اس کے خاندان کے متعلق شائستہ خالہ ہر قسم کی گارنٹی دینے کو تیار ہیں اور ویسے شائستہ خالہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ ارسلان بھائی بھی دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے ہم لڑکی والے کم از کم لڑکے کی شکل و صورت کو بنیاد بنا کر تو انکار نہیں کر سکتے۔ لڑکا شریف ہو' پڑھا لکھا ہو اور کھاتا کماتا ہو' ہم جیسے لوگ تو بس یہ ہی دو' تین چیزیں دیکھتے

ہیں۔" وہ سادگی اور صاف گوئی سے بول رہی تھی۔

"ان ساری خصوصیات کے ساتھ مابدولت ہینڈسم اور ڈیشنگ بھی ہیں۔ کتنی خوش قسمت ہو تم لڑکی۔ خدا کا شکر ادا کیا کرو۔" عون نے اسے ہنستے ہوئے چھیڑا تھا۔

"ہینڈسم اور ڈیشنگ۔" اس نے آنکھیں سکیڑ کر عون کو دیکھا عون کو پتا تھا کہ وہ "منہ دھو رکھو" یا "آئینہ دیکھ کر آؤ" جیسا اگلا جملہ بولے گی، مگر وہ بولی تو یہ۔۔۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تم واقعی بہت ہینڈسم ہو، لیکن اگر تم اتنے ہینڈسم نہ ہوتے تب بھی تمہارا ساتھ میری زندگی کے لیے سب سے بڑی خوش بختی کا باعث ہوتا میں واقعی اللہ کا جتنا شکر ادا کروں کم ہے۔"

"میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔" عون حیرت کے سمندر میں ڈبکیاں کھانے لگا تھا۔ اجیہ نے ہنستے ہوئے پھر چھری اٹھائی تھی۔ اگلے ہی پل دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

☼ ☼ ☼

"یہ تائی اماں کو ساتھ لے جانے کی کیا تک ہے بھلا۔" اجیہ ماں پر خفا ہو رہی تھی۔ آج انہوں نے ارسلان کو دیکھنے جانا تھا۔ وہ اور ہنیہ بہت خوشی خوشی اپنی تیاریوں میں مگن تھیں، لیکن جب خدیجہ نے انہیں بتایا کہ عشرت بیگم بھی ان کے ساتھ جائیں گی تب اجیہ کا موڈ آف ہو گیا تھا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ تائی جان ان کے ساتھ جائیں۔ تائی جان مقررہ وقت پر تیار ہو کر ان کے گھر پہنچ گئی تھیں۔

"جوڑوں میں اتنا شدید درد ہے کہ کہیں آنے جانے کی ہمت ہی نہیں۔ وہ تو بس ظہیر نے کہہ دیا کہ بھابھی آپ نے بھی ساتھ چلنا ہے تو میں نے کہا چلو اب ظہیر کو کیا انکار کروں۔ چل پڑتی ہوں ساتھ۔"

آتے کے ساتھ ہی عشرت بیگم نے اپنے مخصوص انداز میں احسان جتانا ضروری سمجھا تھا۔

"کیا تھا جو تایا جان بھی ساتھ چل پڑتے۔ ٹیکسی پر جاتے کوئی اچھے لگیں گے۔ تایا جان کی گاڑی میں چلے جاتے۔" ہنیہ کو ٹیکسی پر جانا کچھ آکورڈ لگ رہا تھا۔ اس بار اجیہ نے اسے گھورنے کا فریضہ سرانجام دیا تھا لیکن جب ٹیکسی "ارسلان ہاؤس" کے سامنے رکی تب اجیہ نے بھی سوچا کہ واقعی تایا جان کی گاڑی میں آجاتے تو اچھا تھا، مگر اگلے ہی پل اس نے خود کو ڈپٹا تھا۔ بابا نے ہمیشہ خودی، خودداری اور خود اعتمادی کا ہی تو درس دیا تھا۔ سو اجیہ بغیر مرعوب ہوئے پوری خود اعتمادی سے اس بڑے سے شاندار گھر میں داخل ہوئی تھی۔ وہ لوگ بھی شدت سے ان کے منتظر تھے۔ ارسلان کی دادی، اس کی والدہ، دونوں بہنیں ان سے بہت تپاک سے ملے، تھوڑی دیر میں ارسلان بھی ڈرائنگ روم میں آن موجود ہوا۔ اجیہ اور ہنیہ نے ارسلان کو دیکھنے کے ساتھ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ بے تحاشا خوشی ان کی آنکھوں سے چھلکنے لگی تھی۔

"یہ اجیہ اور یہ ہنیہ، تمہاری چھوٹی سالیاں۔" ارسلان کی والدہ فوزیہ بیگم نے ان دونوں کا تعارف ارسلان سے کروایا تھا اور ان الفاظ میں کروایا تھا جس سے ثابت ہوتا تھا کہ نہ صرف ان لوگوں کی طرف سے یہ رشتہ پکا ہے بلکہ انہیں بھرپور یقین ہے کہ وہ لوگ بھی ارسلان کو سند قبولیت بخش دیں گے اور ان کا یقین بے جا نہ تھا۔ ظہیر صاحب اور خدیجہ تو دل ہی دل میں اپنے رب کا شکر بجا لا رہے تھے اجیہ نے ماں باپ پر اک نگاہ ڈالی اور مسکرا دی۔ وہ جانتی تھی اس کے پیارے امی، بابا اس وقت "حالت شکر" میں ہیں پھر اس کی نگاہ عشرت بیگم پر پڑی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ عشرت بیگم کی آنکھوں سے چھلکنے والی کیفیت کو کیا نام دے۔ یہ حسرت بھری نگاہیں تھیں۔ بے تحاشا رشک یا پھر حسد۔

غنیہ میں تھا ہی کیا۔ بی اے پاس تھی۔ معمولی شکل و صورت کی مالک تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی متوسط گھرانے کی لڑکی تھی، پھر اتنے امیر کبیر اور پڑھے لکھے خاندان میں اس کا رشتہ کیسے طے ہو جا رہا تھا۔ ارسلان آیا تو وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی تھیں۔ وہ اچھا خاصا، خوش شکل لڑکا تھا۔ ڈریسنگ بھی لاجواب تھی۔ یہ سب کچھ تو انہوں نے اپنی ماہین کے حوالے سے سوچ رکھا تھا۔ یہ بات نہیں تھی کہ ماہین کے رشتے نہیں آرہے تھے اس کے لیے رشتے بہتیرے آتے تھے، لیکن ابھی تک کوئی رشتہ ایسا نہ آیا تھا جس میں یہ تمام خصوصیات اکٹھی موجود ہوں اور لمبے چوڑے سسرال میں تو انہوں نے اپنی نازوں پلی بیٹی کو بیاہنا ہی نہ تھا۔ انہیں تو اس کے لیے ایسا ہی رشتہ درکار تھا جو ان کے دیور، دیورانی نے اپنی بیٹی کے لیے ڈھونڈ نکالا تھا۔

ذرا دیر بعد ارسلان کی بہن انہیں ڈائننگ روم میں لے گئی بہت خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا تھا۔ کھانے کے بعد اجیہ اور ہنیہ نے ارسلان کو گھیر لیا تھا۔ اس کی پسند ناپسند، عادتیں، مزاج، ہنسی مذاق کرتے ہوئے وہ اس سے سب کچھ اگلوا رہی تھیں۔ ارسلان بہت خوش اخلاقی سے ان کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ظہیر صاحب نے ان لوگوں کو اپنے گھر پر مدعو کرتے ہوئے واپسی کی اجازت چاہی تھی۔

"آنٹی! آپ لوگ اجازت دیں تو اس بار ہم ارسلان بھائی کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں۔" ارسلان کی بہن نے خدیجہ سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" فوری طور پر تو خدیجہ کو یہی جواب سوجھا تھا، لیکن گھر آکر وہ ظہیر صاحب کے سامنے اپنی تشویش کا اظہار کیے بنا نہ رہ پائیں۔

"جب لڑکا ماں، بہنوں کے ساتھ آئے گا تو لازما" اس کا غنیہ سے بھی آمنا سامنا ہو گا چاہے کھانے پر غنیہ ساتھ نہ بیٹھے، لیکن ساس، نندوں سے سلام دعا کرنے تو آئے گی نا۔ ہمارے خاندان میں یہ پہلے کب ہوا ہے کہ شادی سے پہلے لڑکا، لڑکی ایک دوسرے کو دیکھیں۔"

"ہمارا مذہب اس بات کی اجازت دیتا ہے امی۔ اچھی بات ہے ارسلان بھائی اور غنیہ آپی شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔" چائے کی ٹرے لیے آتی اجیہ کی یہ بے وقت مداخلت خدیجہ کو بہت کھلی تھی، مگر انہوں نے اسے کچھ کہنے کے بجائے فقط گھورنے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"اجیہ صحیح کہہ رہی ہے بیگم صاحبہ! اگر ارسلان اور غنیہ ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں تو اس میں کچھ ایسا مضائقہ تو نہیں۔" ظہیر صاحب نے انہیں رسانیت سے مخاطب کیا۔

☼ ☼ ☼

رات بارہ، سوا بارہ کا وقت تھا جب اجیہ کے پاس دھرے موبائل پر میسج ٹیپ بجی تھی۔ وہ اپنی کتابیں پھیلائے پڑھنے میں مصروف تھی پاس پڑا موبائل اٹھا کر چیک کیا۔

"ہیلو اجیہ۔ آئی ایم ارسلان۔ کیسی ہو۔ سو تو نہیں گئیں۔"

"نہیں بالکل ٹھیک ٹھاک ارسلان بھائی اور جاگ رہی ہوں تو آپ کا میسج پڑھ کر جواب دے رہی ہوں۔ آپ سنائیں کیسے ہیں۔" اس نے فورا" جوابی میسج ٹائپ کیا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ رات کے اس پہر ارسلان کے میسج کی توقع نہیں کر رہی تھی، مگر پھر بھی اسے جواب دے ڈالا۔

"آئی ایم فائن۔ اور اجیہ اگر مائنڈ نہ کریں تو مجھے آپ سے ایک فیور چاہیے۔" ارسلان کی جانب سے برق رفتاری سے پیغام موصول ہوا تھا۔

"کیا مطلب ارسلان بھائی۔" اجیہ واقعی اس کی بات سمجھ نہ پائی۔

"مجھے غنیہ کا نمبر چاہیے اجیہ! میں ان سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" ارسلان بنا کسی لاگ لپٹ کے مطلب کی بات پر آگیا۔ اجیہ کو چند لمحوں کے لیے سمجھ نہ آیا کہ وہ اس کی بات کا کیا جواب دے۔ اس نے ایک نظر بیڈ کے دوسرے سرے پر سوئی اپنی بہن پر ڈالی۔ یہ قیامت تک ممکن نہ تھا کہ غنیہ، ارسلان سے بات کرنے پر راضی ہو جائے۔ وہ اپنی بہن کے مزاج سے

آگاہ تھی۔ بہن کا مزاج ایک طرف رکھ بھی دیتی تو خدیجہ کبھی اس بات کی اجازت نہ دیتیں کہ غنیہ اور ارسلان کا ٹیلی فونک رابطہ قائم ہو اور وہ تینوں بہنیں ماں کی اجازت کے بغیر کوئی کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ اجیہ نے چند لمحوں تک تمام ممکنات پر غور کیا پھر ارسلان کو جوابی میسج بھیج دیا۔

"غنیہ آپی اس وقت سو رہی ہیں ارسلان بھائی اور اگر جاگ رہی ہوتیں تب بھی وہ آپ سے بات کرنے پر راضی نہ ہوتیں۔"

"وائے۔" ارسلان کے یک لفظی میسج سے اس کی حیرت کا اظہار ہوا تھا۔

"غنیہ آپی سو فیصد ایک مشرقی دوشیزہ ہیں ارسلان بھائی! وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں جانتیں۔"

"ایسی بھی کیا مشرقیت یار۔ ہم دونوں کا رشتہ تقریباً طے ہو چکا ہے اور میں نے تمہاری آپی کی اب تک فقط ایک تصویر دیکھی ہے۔ وہ بھی تمہاری شائستہ آنٹی کی مہربانی۔ میرا خیال تھا کہ ہم لوگ ایک دوسرے سے کچھ بات چیت کر لیں تو ایک دوسرے کے مزاج کا کچھ اندازہ ہو جائے گا۔ میرے خیال میں اس میں کوئی حرج تو نہیں۔" ارسلان کا میسج پڑھ کر اجیہ گومگوں کا شکار ہو گئی تھی۔

"تم مجھے غنیہ کا نمبر سینڈ کرو، میں اسے خود راضی کر لوں گا۔" اس کی خاموشی سے تنگ آ کر ارسلان نے دوسرا میسج بھیجا۔

"غنیہ آپی کا کوئی پرسنل نمبر نہیں ہے ارسلان بھائی! ہم بہنوں کے استعمال میں ایک ہی نمبر ہے بلکہ میں اور ہنیہ اپنی فرینڈز سے پڑھائی کے متعلق بات چیت کرنے کی وجہ سے موبائل کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ غنیہ آپی تو سیل فون برائے نام استعمال کرتی ہیں۔" اس نے سادگی سے سچائی بتائی تھی۔

"حیرت ہے یار! آج کل کے دور میں کوئی ایسا بندہ بھی ہے، جس کے پاس اپنا پرسنل سیل فون ہی نہیں۔" ارسلان صاف گو شخص تھا۔ میسج بھیج کر اپنی حیرت کا برملا اظہار کر دیا۔ اجیہ کی سمجھ میں نہ آیا جواب میں کیا لکھ بھیجے وہ عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئی تھی۔

"او کے اجیہ! تم اپنی بہن سے بات کرنا بلکہ اسے مجھ سے بات کرنے پر راضی کرنا۔ باقی موبائل کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ میں غنیہ کو گفٹ کر دوں گا۔"

"میں کوشش کروں گی ارسلان بھائی۔" اجیہ نے حقیقتاً "جان چھڑائی تھی ادھر سے بھی او کے گڈ بائے کا میسج آیا تو اس نے گہرا سانس اندر کھینچتے ہوئے موبائل ایک جانب رکھا اس روز جب وہ ارسلان کے گھر گئے تھے تو باتوں باتوں میں ارسلان نے اس سے اس کا سیل نمبر مانگا تھا۔ لیکن ان لوگوں کی تربیت خدیجہ نے جس نہج پر کی تھی۔ اس میں ایسی باتوں کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ قانونی اور شرعی رشتہ جڑنے سے پہلے غنیہ کے لیے ارسلان ایک نامحرم شخص تھا۔ سو غنیہ کبھی بھی اس سے بات کرنے پر راضی نہ ہوتی، لیکن پھر بھی اگلی صبح اجیہ نے غنیہ کو رات کا سارا ماجرا کہہ سنایا تھا۔

"تمہیں ضرورت ہی کیا تھی اس کے میسج کا جواب دینے کی۔ جواب نہ ملتا تو ظاہر ہے، سمجھ لیتا کہ تم سو رہی ہو گی۔" غنیہ نے اسے خفگی سے مخاطب کیا۔

"میں چوبیس گھنٹے تو نہیں سوئی رہ سکتی نا۔ وہ مجھے دن میں بھی کسی ٹائم میسج کر سکتے تھے۔"

"اپنا موبائل آف رکھا کرو بلکہ سم ہی نکال دو۔ عقل مند ہوں گے تو خود سمجھ جائیں گے کہ ہم ان باتوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔" غنیہ قطعیت سے بولی تھی۔

"غنیہ آپی! آپ کہیں تو میں امی سے بات کروں۔ ہو سکتا ہے وہ اجازت دے دیں اور سوچا جائے تو اس میں کوئی ایسا حرج تو نہیں آج کل تو سب ہی۔"

"بے شک امی کے علم میں یہ معاملہ لے آؤ، لیکن ان سے اجازت دلوانے کی نہ تو ضرورت ہے نہ مجھے ایسی اجازت درکار ہے جب میں خود ہی ایک بات کو درست نہیں سمجھتی تو کیوں اس راہ پر چلوں اور جہاں تک مزاج سمجھنے کی بات ہے تو تم جانتی ہو کہ ارسلان کی دادی بھی جلد شادی کی خواہش مند ہیں اور امی بابا کی بھی یہ ہی خواہش ہے تو جب شادی میں اتنا کم عرصہ بچا ہو تو لڑکی، لڑکا ایک دوسرے کا مزاج سمجھ کر کیا کریں گے۔ یہ کام شادی کے بعد بھی ہو سکتا ہے اور اگر ہم دونوں نے ایک دوسرے سے بات شروع کر دی اور ہمارے مزاج آپس میں نہ ملتے ہوئے محسوس ہوئے تو یہ بات ذہنی خلفشار کا سبب ہی بنے گی نا۔ ٹیلی فون پر ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھنا مشکل ہے تو اسے بدلنا ناممکن۔ شادی کے بعد ایک دوسرے کے مزاج کو بہتر طور پر جانا جا سکتا ہے اور محبت اور اپنائیت کے ذریعے ایک دوسرے کے مزاج کے مطابق خود کو ڈھالا بھی جا سکتا ہے۔" غنیہ کا لہجہ دھیما، مگر انداز دو ٹوک تھا۔ اجیہ محبت سے بہن کو دیکھتی رہ گئی۔

"غنیہ آپی! آپ یقیناً "امی، بابا کی تربیت کا شاہکار ہیں۔ اس دور میں ایسی انمول اور خالص سوچیں کسی کی نہیں ہوتیں۔ شاید میں آپ کی جگہ ہوتی تو امی سے اجازت لے کر ارسلان بھائی سے بات کر لیتی۔"

"تم میری جگہ ہوتیں تو وہی کرتیں جو میں نے کیا۔" غنیہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اجیہ چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئی تھی۔

"شاید آپ صحیح کہہ رہی ہیں۔" وہ مسکرا دی تھی۔



صبح سے گھر میں ایمرجنسی کا نفاذ تھا۔ آج شام کو ارسلان اور اس کی فیملی ڈنر پر آ رہے تھے۔ انہوں نے کل شام فون کر کے اپنی آمد کنفرم کی تھی۔ اجیہ، ہنیہ نے کالج اسکول سے چھٹی کر لی تھی۔ چاروں ماں بیٹیاں مل کر گھر کے کام پھرتی سے نمٹانے میں مشغول تھیں اور جب ہی نصیبن کی آمد ہوئی۔ وہ تائی جان کے گھر کی ملازمہ تھی ہفتے میں ایک دو بار یہاں کا چکر بھی لگا لیتی تھی۔ خدیجہ اس کی حتی المقدور مالی مدد بھی کر دیا کرتی تھیں اور فریج میں پڑا ہوا زائد کھانا بھی دے دیتی تھیں۔

"آج تو سب بچیاں گھر پر نظر آ رہی ہیں۔ خیر تو ہے۔" نصیبن نے چھوٹتے ہی دریافت کیا۔

"ہاں نصیبن! بس شام کو کچھ مہمان آنے ہیں۔ اسی کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔" خدیجہ نے جواب دیا۔

"ہنیہ بیٹے! فریج میں کل کی بچی ہوئی ترکاری رکھی ہے۔ وہ ایک ڈونگے میں ڈال کر نصیبن کو دے دو اور میرے پرس میں سے پچاس روپے بھی لیتی آنا۔"

خدیجہ آج مصروف تھیں سو انہوں نے نصیبن کو بٹھانے کے بجائے رخصت کرنا مناسب جانا تھا۔ وہ بہت باتونی عورت تھی۔ ادھر ادھر کے قصے سنا کر گھنٹہ، آدھا گھنٹا تو آسانی سے ضائع کر دیتی تھی۔

"کہیں غنیہ باجی کے سسرال والے تو نہیں آ رہے باجی جی! آپ نے غنیہ باجی کی بات پکی کر دی اور نصیبن کو مٹھائی تک نہ کھلائی۔"

"ادھر بڑی باجی کے گھر تو سیاپا ہی پڑ گیا تھا جی۔ روز صاحب سے لڑتی ہیں کہ ماہین باجی کے لیے انہوں نے اب تک ڈھنگ کا رشتہ نہیں ڈھونڈا۔ برا مت ماننا خدیجہ باجی۔ آپ کی جیٹھانی کی بہت حاسد فطرت ہے۔"

نصیبن نے خدیجہ کو مخاطب کیا۔ وہ چند لمحوں کے لیے سن ہو کر رہ گئی تھیں، مگر اگلے ہی پل انہوں نے خود کو سنبھالا پھر ہنیہ کو پکارا تھا۔

"ہنیہ! کہاں رہ گئی ہو۔ فٹافٹ سالن ڈال کر نصیبن کو دو اور ہاں نصیبن! پچھلی بار تم جس ڈونگے میں سالن لے کر گئی تھیں، وہ بھی واپس نہیں لائیں۔ اب یہ دونوں ڈونگے کل یاد سے دے جانا۔" نصیبن کو یقین تھا کہ کم از کم آج تو وہ اس کی بات میں دلچسپی لے کر کچھ اور کریدیں گی مگر خدیجہ نے سپاٹ سے انداز میں اس کے ہاتھ میں ڈونگا اور پیسے تھمائے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اب وہ جا سکتی ہے۔

"اچھا باجی چلتی ہوں اللہ آپ کو خوش رکھے۔" وہ دعائیں دیتی رخصت ہوئی تھی۔

"دیکھا امی! آپ میری بات مان کر نہیں دے رہی تھیں نا۔ یقین آ گیا نا کہ تائی جان ہماری خوشی میں خوش نہیں۔ ان سے یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی کہ غنیہ

آپی کا رشتہ اتنی اچھی جگہ کیسے طے ہونے جارہا ہے۔" نصیبن کے جاتے ہی اجیہ نے چیختے ہوئے انداز میں ماں کو مخاطب کیا۔

"اچھا اجیہ اب تم فضول باتیں بند کرو۔ تمہارے ذمے جو کام لگایا ہے وہ کرو اور پھر جا کر کچن کی خبر لو۔ آج غنیہ کو زیادہ دیر کچن میں کھڑے مت رہنے دینا۔" خدیجہ نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"اور شکر ہے آج ڈنر پر تائی جان کو مدعو نہیں کیا ہوا۔ ویسے سچ بتائیں امی! اس روز آپ نے بھی ان کا سرد' سپاٹ رویہ محسوس کیا تھا نا۔" خدیجہ کچھ نہ بولیں۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے ڈرائنگ روم میں گھس گئی۔ اس کے جانے کے بعد خدیجہ تھکے تھکے انداز میں برآمدے میں بچھے تخت پر نیم دراز ہو گئیں۔ سچ تو یہ تھا کہ انہیں اجیہ کی کسی بات سے اختلاف نہ تھا۔ جیٹھانی کا انداز انہوں نے اس روز بھی نوٹ کیا تھا جب وہ انہیں ارسلان کے گھر لے گئی تھیں۔ وہ انہیں اپنا بڑا جان کر وہاں لے کر گئی تھیں' لیکن جس سپاٹ انداز میں وہاں بیٹھی رہیں' خدیجہ کو دل ہی دل میں کئی بار شرمندگی کا احساس ہوا۔ واپسی کے سفر میں بھی ان کا موڈ شدید آف ہو چکا تھا۔ وہ بار بار اپنے گھٹنوں اور جوڑوں کے درد کا ذکر کرتی رہی۔

خدیجہ نے اس روز کے تجربے سے سبق سیکھتے ہوئے آج انہیں بلانے سے احتراز کیا تھا اور اب۔

"خیر جوان ہوتی ہوئی بچیوں کی مائیں عجیب سے عدم تحفظ میں مبتلا ہو ہی جاتی ہیں۔ اللہ ماہین کا بھی نصیب کھولے تاکہ بھابھی بیگم کی پریشانی ختم ہو۔" اپنی عادت کے مطابق انہوں نے بھابھی جان کو "مارجن" دیتے ہوئے ماہین کے لیے بہت دل سے دعا کی تھی۔

شام کو مہمان مقررہ وقت پر آ گئے تھے۔ ارسلان' اس کی والدہ' دادی اور دونوں بہنیں (اس کے والد کا کچھ سال قبل انتقال ہو گیا تھا) خدیجہ اور ظہیر صاحب نے مہمانوں کا پرتپاک استقبال کیا تھا۔ اجیہ کو خدشہ تھا کہ کہیں ارسلان کا موڈ آف نہ ہو۔ اس نے دو تین بار غنیہ سے بات کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن اجیہ نے ہر بار اس سے بہت شائستگی سے معذرت کر ڈالی تھی۔ تھک ہار کر ارسلان نے میسج کرنا ہی چھوڑ دیے تھے اور آج جب ارسلان آیا تو اجیہ نے اس کے چہرے کے تاثرات بغور جانچے تھے۔ وہ بہت نکھرا نکھرا اور فریش لگ رہا تھا۔ موڈ بھی خاصا خوش گوار تھا اجیہ نے شکر ادا کیا کہ ارسلان نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

مہمانوں نے نشستیں سنبھال لیں تو کچھ دیر کی رسمی بات چیت کے بعد دادی کو غنیہ کا خیال آیا تھا۔

"ارے میری بیٹی کو تو بلاؤ۔ آج وہ اپنی دادی سے اب تک ملنے کیوں نہیں آئی۔" خدیجہ نے اجیہ کو اشارہ کیا تھا کہ وہ غنیہ کو بلا لائے۔ اجیہ غنیہ کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں تو وہ خاصی کنفیوز لگ رہی تھی یقیناً" ارسلان کا سامنا اس کے لیے آسان نہ تھا۔

ارسلان کی ماں' بہنوں سے ملنے کے بعد غنیہ دادی کے نرغے میں آ گئی تھی۔ دادی نے اس کی پیشانی پر محبت بھرا بوسہ دیا پھر اسے اپنے اور ارسلان کی امی کے درمیان میں گھسا کر بٹھا لیا۔

کھانا تقریباً" تیار تھا صرف شامی کباب تلنے باقی تھے۔ ہنیہ پہلے ہی کچن میں برتن نکالنے میں مصروف تھی۔ اجیہ بھی فٹافٹ شامی کباب تلنے لگی اتنے میں ہی دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی تھی۔

"ہنیہ دیکھنا یار! اس وقت کون آ گیا۔" اجیہ نے ہنیہ کو مخاطب کیا' وہ سر ہلاتے ہوئے گیٹ کی طرف چل دی چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی تو چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔

"کون تھا؟" اجیہ نے استفسار کیا۔

"تائی جان اور ماہین آپی آئے ہیں۔" ہنیہ نے جلے کٹے انداز میں جواب دیا۔

"وہ کس خوشی میں آ گئیں۔" اجیہ نے ناگواری کا اظہار کیا۔

"خوشی کا تو پتا نہیں البتہ دونوں بہت خوش لگ رہی تھیں۔ ماہین آپی کو دیکھ کر تو لگتا ہے کہ بیوٹی پارلر کا چکر لگا کر آ رہی ہیں۔ اپنا بلیک والا سوٹ پہن رکھا ہے اور سچ اتنے لشکارے مار رہی ہیں کہ حد نہیں۔" ہنیہ نے اسے مفصل رپورٹ دی۔

"وہ ڈرائنگ روم میں گئی ہوں گی؟" اجیہ کا دل کسی انہونی کے خدشے سے کانپا تھا۔

"ظاہر ہے۔" ہنیہ نے منہ بنا کر کہا۔

"ہنیہ! یہ دو چار شامی کباب رہ گئے ہیں' تم انہیں فرائی کرو۔ میں ابھی آتی ہوں۔" اجیہ نے بے چین ہو کر ڈرائنگ روم کا رخ کیا تھا۔

"ماہین نے بڑا بیک کیا تھا۔ کہنے لگی۔ چلیں امی! چچا کے گھر اکٹھے بڑا کھائیں گے اور بہنوں سے گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ ہمیں کیا پتا تھا کہ آپ لوگ بھی آئے ہوئے ہیں' چلو اچھا اتفاق رہا۔ اس بہانے آپ لوگوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔" یہ تائی جان تھیں جو کچھ دن پہلے ارسلان وغیرہ کے گھر بالکل سرد مہر اور سپاٹ سے انداز میں خاموش بیٹھی رہی تھیں' مگر آج ان کی خوش اخلاقی عروج پر تھی۔

اجیہ کا جی چاہا کہ ماہین سے پوچھے کہ اسے اتنے مہینوں بعد چچا کے گھر آنے' انہیں بڑا کھلانے اور بہنوں سے گپ شپ لگانے کا خیال کیونکر آ گیا وہ تو کسی تہوار پر بھی یہاں کا رخ نہیں کرتی تھی۔

"بچیوں کی آپس میں بہت دوستی ہے۔ گھر پاس پاس ہیں بس جب جس کا جی چاہا' ملنے پہنچ جاتا ہے بلکہ ماہین اور اجیہ تو روز اکٹھی کالج جاتی ہیں۔ غنیہ' ہنیہ سے ملے بہت دن ہو گئے تھے تو اس نے ضد پکڑ لی کہ امی ظہیر چچا کی طرف لے چلیں۔ میرے تو جوڑوں میں اتنا درد رہتا ہے کہ دو قدم چلنا محال ہے' لیکن میری ماہین میرے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتی۔ چھوٹے بھائی ٹیوشن گئے ہوئے تھے ورنہ ان ہی کے ساتھ اسے بھیج دیتی' لیکن اچھا ہوا نا! میں خود آ گئی۔ اس بہانے آپ لوگوں سے بھی ملاقات ہو گئی۔"

تائی جان نے جیسے ٹیپ کا مصرعہ دہرایا تھا۔ ماہین بھی چہرے پر مسکراہٹ سجائے ارسلان کی بہن کے ساتھ بیٹھی تھی' وہ اس سے کوئی بات کر رہی تھی اور ماہین مسکراتے ہوئے اس کا جواب دے رہی تھی۔

ہنیہ صحیح کہہ رہی تھی۔ وہ آج خطرناک حد تک حسین لگ رہی تھی۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تو خیر اسے ہمیشہ سے ہی تھا۔ اس کی گوری رنگت میں چھلکتی گلابیاں بتا رہی تھیں کہ اس نے کتنی مہارت سے "نہ نظر آنے والا" میک اپ کیا ہے اس کی تیاریاں بتا رہی تھیں کہ تائی جان اور وہ مہمانوں کی آمد سے لاعلم نہیں تھیں' لیکن آخر تائی جان ایسے موقع پر اپنی حسین و جمیل طرح دار بیٹی کو لے کر کیوں آ گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد تائی جان جانے کے لیے اٹھی تھیں۔

"پھر ہم چلیں خدیجہ! آپ لوگ ہماری طرف بھی چکر لگائیے گا۔ زیادہ دور نہیں ہے ہمارا گھر۔" پہلی بات خدیجہ کو دیکھ کر تو دوسری ارسلان کی والدہ کو دیکھ کر کہی گئی۔

"بچیاں کھانا لگا رہی ہیں بھابھی! کھانا کھا کر جائیے گا۔" خدیجہ نے انہیں مخاطب کیا۔

"اچھا۔!" وہ جیسے چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گئیں۔ اجیہ کو تو لگا کہ سوچنے کی محض ایکٹنگ ہی کی ہے' ان کا ارادہ کھانا کھا کر جانے کا ہی تھا۔

"چلو ماہین! اٹھو' کھانا لگوانے میں بہنوں کی مدد کرو۔" انہوں نے بیٹی کو مخاطب کیا۔ ماہین فوراً" فرماں برداری سے گردن ہلاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"رہنے دیں ماہین باجی! میں اور ہنیہ ہیں نا!" اجیہ خود کو کہنے سے نہ روک پائی تھی۔ اس نے دانستہ "باجی" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ ماہین اور تائی جان دونوں ہی جز بز ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد ارسلان کی دادی نے غنیہ کو ایک بار پھر اپنے قریب بلایا تھا۔

"ظہیر میاں! تمہاری اجازت ہو تو اپنی بچی کو انگوٹھی پہنا دوں۔" انہوں نے بابا کو مخاطب کیا اور بابا کے جواب کا انتظار کیے بغیر انہوں نے غنیہ کی انگلی میں انگوٹھی پہنا دی تھی۔

"اب بتاؤ میاں! شادی کی تاریخ کب دے رہے ہو۔ میں تو چاہتی ہوں کہ کوئی قریب کی تاریخ رکھ لیتے ہیں میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ اکلوتے بیٹے کی جدائی کا صدمہ سہا ہے اس دل نے۔ یہ دل اب بہت

کمزور ہوگیا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ جلد از جلد اپنے پوتے کی شادی کی خوشی دیکھ لوں بس پھر زندگی میں کوئی ارمان نہیں بچے گا۔" دادی کچھ جذباتی ہو گئی تھیں۔

"غنچہ اب آپ کی امانت ہے جب چاہیں لے جائیں۔" ظہیر صاحب مسکرائے تھے جبکہ ان کی آنکھوں میں نمی چمکی تھی۔ کتنی دعاؤں اور مناجاتوں کے بعد ان کی غنچہ کا نصیب کھلا تھا۔ انہوں نے اپنی شریک سفر کی جانب دیکھا۔ وہ بھی بالکل ان ہی جیسے جذبات میں گھری ہوئی تھیں۔ اجیہ اور ہنیہ کے چہرے بھی خوشی سے تمتما رہے تھے۔ صرف دو چہرے اترے ہوئے تھے۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد وہ دونوں چہرے بھی مزید کچھ کہے سنے بنا رخصت ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"اس کا مطلب ہے ہماری سونی زندگی میں بھی بہار آنے والی ہے۔" یہ عون تھا جو محبت اور شوق سے اجیہ کو چھیڑ رہا تھا۔

"کون بہار؟ تمہاری سونی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور آیا تو میں اس کا خون پی جاؤں گی۔" اجیہ نے اسے خوفناک تیوروں سے گھورا۔

"شکل تو پہلے ہی کسی ویمپائر سے ملتی جلتی ہے' کام بھی ویسے ہی شروع کر دیے۔" عون مسکرایا تھا۔

"تم خود کسی ڈریکولا سے کم ہو کیا؟" اجیہ بھی باز نہ آئی۔

"پچھلی ملاقات میں تم نے مجھے دنیا کا ہینڈسم ترین شخص قرار دیا تھا۔" عون نے اسے یاد دلایا۔

"میں نے ایسا کہا' حیرت ہے مجھے تو یاد نہیں۔" اجیہ نے ہنسی روکتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

"تمہاری یادداشت پاکستانی سیاست دانوں والی ہوتی جا رہی ہے۔" عون نے اسے گھورا۔ اجیہ اس بار اپنی کھلکھلاہٹ نہ روک پائی تھی۔ عون اسے محبت سے دیکھتا رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ آنے والی زندگی اپنے دامن میں بہت سی خوشیاں سمیٹے ان کی منتظر ہے۔

لیکن زندگی کے اگلے ورق پر کچھ اور ہی تحریر درج تھی۔

☼ ☼ ☼

اس شام وہ تینوں بہنیں ماں کے ساتھ بازار جانے کو تیار تھیں۔ غنچہ کی شادی کی شاپنگ کا آغاز ہونے جا رہا تھا اور وہ سب بہت خوش اور پرجوش تھے جب ہی ارسلان کی والدہ اور ایک بہن کی آمد ہوئی ان کی آمد کوئی اتنی بھی حیران کن بات نہیں تھی۔ جب نئی رشتہ داری جڑتی ہے تو ایک دوسرے کے گھروں کے چکر لگتے ہی ہیں' لیکن ان کے چہروں کے تاثرات کچھ عجیب سے تھے۔

خدیجہ کا دل کسی انہونی کے خیال سے لرزا بہرحال انہوں نے عزت و احترام سے مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ وہ ماں بیٹیاں ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں' کچھ کہنے کو لب کھولنا چاہتیں' مگر کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ خدیجہ حیران پریشان ہو کر ان کی شکلیں تک رہی تھیں حد تو یہ تھی کہ رسمی بات چیت کا آغاز بھی نہ ہو پا رہا تھا آخر ارسلان کی بہن نے ہی بات کا آغاز کیا۔

"ہم بہت شرمندہ ہیں آنٹی۔ آپ لوگوں کو ساری بات سن کر بہت دکھ پہنچے گا' مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم بھی ارسلان کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے ہیں۔" انیلا نے بات میں وقفہ دیا۔

"آپ بتائیں تو سہی' بات کیا ہے۔" خدیجہ نے متوحش ہو کر پوچھا۔

"آنٹی! بات دراصل یہ ہے کہ ارسلان...." انیلا پھر کچھ کہتے کہتے ہچکچائی۔

"خدیجہ بہن! ارسلان کو آپ کے جیٹھ کی بیٹی پسند آ گئی ہے۔ اس روز آپ کے ہاں آپ کی جیٹھانی اور ان کی بیٹی بھی آئی ہوئی تھیں۔ ارسلان نے ماہین کو دیکھا تو وہ اسے بہت پسند آ گئی۔ آپ یقین کریں ہم نے اسے بہتیرا سمجھایا بجھایا مگر اس کی یہ ہی رٹ ہے کہ وہ غنچہ کے بجائے ماہین سے شادی کرے گا۔"

بیگم عتیق نے جیسے خدیجہ کے حواسوں پر بم گرایا تھا

وہ خالی خالی نگاہوں سے بیگم عتیق اور انیلا کو دیکھے گئیں۔ بیگم عتیق ان کی حالت دیکھ کر شرمندگی کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہی تھیں۔

"میں آپ سے اور ظہیر بھائی دونوں سے معافی مانگتی ہوں' یقیناً" آپ لوگوں کے لیے یہ بات بہت دکھ اور تکلیف کا باعث بنے گی' لیکن ہم بہت شرمندہ ہیں۔" بیگم عتیق نے پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے پھر اپنی ندامت کا اظہار کیا۔ انیلا نے اپنی نشست پر پہلو بدلا۔ ماں کا اتنا معذرت خواہانہ رویہ اس سے برداشت نہ ہو رہا تھا یہ سچ تھا کہ وہ ماں' بیٹیاں معذرت کا اظہار کرنے ہی آئے تھے اور یہ بھی سچ تھا کہ گھر میں پہلی بار جب ارسلان نے غنچہ کے بجائے ماہین کا نام لیا تھا تو انیلا بھی بھائی پر بے تحاشا خفا ہوئی تھی' لیکن جب ماں اور دادی نے خفا ہو کر بھائی سے بات چیت ہی چھوڑ دی تو اسے اکلوتے بھائی پر ترس آنے لگا پھر آہستہ آہستہ اسے ارسلان سے ہمدردی ہونے لگی اور اس کا مطالبہ بھی جائز لگنے لگا۔

ارسلان خوب صورت' پڑھا لکھا' برسر روزگار اور صاحب جائیداد تھا۔ دادی کی محض یہ شرط کہ شادی کے لیے لڑکی اپنی ذات برادری کی ہونی چاہیے انہیں غنچہ کے گھر تک لے آئی تھی۔ شائستہ آنٹی کے توسط سے وہ ظہیر صاحب اور خدیجہ کے گھر پہنچے تھے۔ انیلا اور اس کی بڑی بہن سلمٰی کو بھی غنچہ معقول لگی اور ان لوگوں کی وضع داری بھائی تھی۔ غنچہ کے چہرے پر چھائی پاکیزگی' اس کی حیا' معصومیت اور بھولپن نے بھی دادی کو جیسے اس کا دیوانہ کر دیا تھا۔ سو دادی کی منتخب کردہ غنچہ کو سب نے خوشی خوشی سند قبولیت بخش دی' مگر اصل مسئلہ تب پیدا ہوا جب ارسلان پہلی بار غنچہ کے گھر گیا اور وہاں جا کر وہ غنچہ کے بجائے اس کی کزن پر دل ہار بیٹھا۔ ماہین واقعی بے تحاشا حسین لڑکی تھی۔ اس کے سامنے غنچہ تو کچھ بھی نہ تھی۔ شروع شروع میں انیلا نے بھائی کا فیصلہ بدلوانے کی کوشش کی' لیکن پھر وہ بھی ارسلان کے نقطہ نظر کی حامی ہو گئی۔

"تم امی اور دادی کو سمجھاؤ انیلا! میری تو سمجھ میں نہیں آتا انہوں نے غنچہ میں کیا دیکھ کر اسے پسند کر لیا۔ مجھے سولہویں صدی کے اس نمونے سے شادی نہیں کرنی۔"

"تم یہ مت بھولو ارسلان! کہ شائستہ آنٹی نے تمہیں غنچہ کی تصویر دکھائی تھی اور تم نے اسے اوکے کیا تھا۔" سب سے بڑی سلمٰی نے بھائی کو یاد دلایا۔

"ہاں ٹھیک ہے' میں مانتا ہوں کہ اس وقت میں نے ہاں کر دی تھی' لیکن دادی نے دباؤ ہی ایسا ڈال رکھا تھا کہ شادی صرف اپنی ذات برادری میں کرنی ہے' میں نے کبھی کسی لڑکی کو نظر اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔ سچ سلمٰی آپا! اسٹوڈنٹ لائف میں تمہارے اس ہینڈسم بھائی کے پیچھے لڑکیاں دیوانی ہو جاتی تھیں' لیکن میں شرافت کے ریکارڈ قائم کرتا رہا۔ تم سب لوگوں کو غنچہ پسند آئی تو میں نے سوچا چلو تم لوگوں نے اسے کچھ دیکھ کر ہی پسند کیا ہو گا۔ تم خود ہی بتاؤ کہ اگر تم غنچہ کے بجائے پہلے ماہین کو دیکھ لیتے تو کیا پھر بھی تمہارا فیصلہ یہ ہی ہوتا۔ ماہین بھی ہماری ذات برادری کی ہے' لیکن لڑکی تو ایسی ہے نا جس کو ایک بار دیکھو تو بار بار دیکھنے کو جی چاہے بلکہ جس پر سے نظر ہٹانے کو ہی جی نہ چاہے' میں مانتا ہوں کہ دادی نے غنچہ کے گھر والوں کو ہاں کہہ دی ہے' لیکن کوئی لمبے چوڑے پیمانے پر تقریب تھوڑی منعقد ہوئی ہے۔ محض چار بندوں کے سامنے غنچہ کو انگوٹھی ہی پہنائی ہے نا بس آپ لوگ جا کر ان سے معذرت کر آئیں اب میں بے دلی سے یہ رشتہ جوڑ بھی لوں گا تو کیا ضمانت ہے کہ میں شادی کے بعد اس لڑکی کو خوش رکھ پاؤں گا۔ آپ خود ہی سوچیں' یہ اس لڑکی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی۔"

ارسلان نے دونوں بہنوں کو دلیلیں دے دے کر قائل کر ہی ڈالا۔ ماں اور دادی کا ماننا مشکل تھا' مگر دو دن کی بھوک ہڑتال کے بعد ماں کا دل بھی پسیج گیا تھا۔ دادی کی خفگی ختم تو نہ ہوئی' مگر وہ سمجھ گئی تھیں کہ پوتے نے جو ٹھان لی ہے' وہ کر گزرے گا۔ انہوں نے بہو سے کہہ دیا کہ وہ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی پوری کر دیں۔

"میں تو ان شریف لوگوں کو مرتے دم تک منہ نہیں دکھا سکتی۔ بہو! تم ہی جاؤ اور معافی مانگو ان لوگوں سے۔ وہ وضع دار لوگ ہیں مجھے امید ہے کہ تم لوگوں سے شائستگی سے ہی پیش آئیں گے، لیکن وہ عورت خدیجہ کی جیٹھانی مجھے ایک' دو ملاقاتوں میں ہی اس کی فطرت کا پتا لگ گیا ہے۔ وہ خوشی خوشی ارسلان کا رشتہ قبول کرلے گی اور یہ ہی اس کے کمینے پن کی نشانی ہوگی۔" دادی نے پیش گوئی کردی تھی اور ان کی پیشن گوئی حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ خدیجہ نے بہت تحمل اور برداشت سے انیلا اور بیگم عتیق کی بات سنی تھی۔

"ماہین بھی ہماری ہی بچی ہے اگر ارسلان کے دل کی خوشی وہاں رشتہ کرنے کی ہے تو آپ اپنے بیٹے کے دل کی خوشی پوری کرو دیجیے۔" خدیجہ کی رنگت خطرناک حد تک زرد پڑچکی تھی، لیکن انہوں نے غنیہ کو پہنائی گئی انگوٹھی واپس انہیں تھماتے ہوئے مخاطب کیا تھا۔ بیگم عتیق معذرت کرتے کرتے رخصت ہوئی تھیں اور ان کے جانے کے بعد خدیجہ ہارے ہوئے جواری کی مانند' بے دم ہو کر اپنے بستر پر ڈھے سی گئیں۔

اجیہ کا غصے سے برا حال تھا۔ غنیہ نے گھبرا کر باپ کو فون ملادیا کچھ دیر بعد ظہیر صاحب آگئے تھے۔

"کوئی بات نہیں بیٹا! جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔ غنیہ کے نصیب میں ارسلان کا ساتھ لکھا ہی نہ ہوگا تو یہ رشتہ کیسے برقرار رہتا۔"

بہت متانت اور بردباری سے وہ دیر تک بچیوں کو سمجھاتے رہے، لیکن رات کی تنہائی میں انہوں نے اپنی شریک حیات کے آنسو کتنے جتن کرکے بہنے سے روکے تھے۔ اس کا علم کسی کو نہ تھا۔

اگلا دن طلوع ہوا تو دونوں میاں بیوی اپنے معمولات زندگی روٹین کے مطابق نمٹاتے رہے۔ شام کو تائی جان آئی تھیں۔ ان کے چہرے سے ہی ان کی بے پناہ مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"اے خدیجہ! جب تم نے ارسلان کے گھر والوں کو کہہ ہی دیا تھا کہ ماہین بھی اپنی ہی بچی ہے اور تمہیں ارسلان اور ماہین کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں تو میری بہن! ان لوگوں کو ہمارے گھر کا پتا ہی سمجھا دیتیں چلو ساتھ آنے کی تو تمہیں توفیق نہ ہوئی۔ وہ بے چارے آس پاس کی گلیوں میں گھنٹہ بھر ظہیر کے بھائی کا مکان ڈھونڈتے رہے' وہ تو اتفاق سے شرجیل ٹیوشن پڑھ کر آرہا تھا۔ اس کے کانوں میں آواز پہنچی کہ کوئی ہمارا گھر ہی ڈھونڈ رہا ہے تو وہ انہیں لے کر گھر پہنچا۔" تائی جان نے چھوٹتے ہی شکوہ کرکے خدیجہ کو ششدر ہی کر ڈالا تھا۔

"لڑکا اور اس کا گھر بار میرا تو دیکھا ہوا ہے' تمہارے بھائی کو پتا چلا تو کہنے لگے جب ظہیر نے رشتہ او کے کیا تھا تو ظاہر ہے' پوری طرح چھان بین کے بعد ہی کیا ہوگا۔ میں لڑکا دیکھ کر کیا کروں گا۔ تم اللہ کا نام لے کر ہاں کردو۔ بس مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو شادی کی جلدی ہے۔ میں اکیلی جان اتنی جلدی تیاری کیسے کر پاؤں گی۔"

"میرے اللہ اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ پائے جاتے ہیں۔" خدیجہ تاسف سے سوچ رہی تھیں۔ عشرت بیگم نے رسمی طور پر بھی افسوس کا اظہار نہ کیا تھا۔ ان کی طبیعت اتنی مکدر ہو رہی تھی کہ ان سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔ مگر اجیہ سے رہا نہ گیا تھا۔

"آپ کو اتنی جلدی ہاں نہیں کرنی چاہیے تھی تائی جان! وہ لوگ سمجھیں گے کہ آپ اس رشتے کے جی جان سے منتظر تھے۔ جیسے ہی رشتہ آیا فٹ سے ہاں کرلی۔ حالانکہ ماہین جی کو رشتوں کی کمی تھوڑی ہے۔" اس نے کٹیلے انداز میں عشرت بیگم کو مخاطب کیا۔ خدیجہ نے اسے گھورا۔ مگر اسے کب پروا تھی۔

"ہاں تو اور کیا میری ماہین کو رشتوں کی کب کمی ہے۔ لیکن وہ لوگ بھی منت پر اتر آئے تھے۔ لڑکا تو ماہین کی ایک جھلک دیکھ کر دیوانہ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں نہ کہیں تو ماہین کی شادی کرنی ہی ہے پھر کیوں نہ ان بے چاروں کو ہاں کرکے ان کے دل کی مراد پوری کردوں۔" تائی جان کے لہجے سے چھلکتا تفاخر کسی کے دل کو کتنی تکلیف پہنچا رہا تھا۔ اس کی انہیں پروا ہی کب تھی۔

"آپ صحیح کہہ رہی ہیں تائی جان۔ ارسلان بھائی ماہین جی کے حسن کا جادو چل گیا۔ لیکن آپ ایسے حسن پرست لڑکے کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ ذرا دھیان سے تھمائیے' یہ نہ ہو کہ اسے زندگی میں کبھی ماہین جی سے زیادہ حسین صورت نظر آگئی تو وہ اس پر دل ہار بیٹھے۔" اجیہ نے انہیں کاٹ دار لہجے میں مخاطب کیا۔

"اے لو' یہ بھی اچھی کہی تم نے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑیں۔ شاید اجیہ کی تلملاہٹ انہیں مزہ دے رہی تھی۔ اتنے دنوں تک یہ ہی تلملاہٹ ان کا مقدر بھی تو بنی رہی تھی۔ پہلے عون جیسا شان دار لڑکا اجیہ کا نصیب ٹھہرا۔ وہ تو چلو اس کا ماموں زاد تھا۔ یہ رشتہ کیسے ہوا۔ سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ لیکن پھر بھی عون کا مستحکم کاروبار' اس کی وجاہت اور سب سے بڑھ کر اس کی آنکھوں سے چھلکتی اجیہ کے لیے بے پناہ محبت انہیں ہمیشہ عجیب سی بے اطمینانی میں مبتلا کردیتی تھی اور جب بھی ماہین کے لیے کوئی اونگا بونگا رشتہ آتا تو یہ بے اطمینانی مزید بڑھ جاتی۔

ماہین کے لیے آنے والے رشتوں میں کوئی ایک بھی ان تمام خصوصیات کا بیک وقت حامل نہ ہوتا تھا۔

لیکن جب اس معمولی شکل و صورت والی غنیہ کا رشتہ بھی اتنی اچھی جگہ جڑنے لگا تو وہ انگاروں پر لوٹنے لگی تھیں۔

جب انہیں نصیبن کے توسط سے ارسلان اور اس کی فیملی کی ظہیر کے ہاں آمد کی اطلاع ملی تو۔ وہ ماہین کو نک سک سے تیار کروا کر اس کے چچا کے ہاں لے کر پہنچ گئیں تھیں۔ حسب توقع مہمان موجود تھے۔ ماہین کے چمکتے دمکتے حسن نے کسی اور کو متاثر کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ انہوں نے ارسلان کو کئی بار ماہین کو تکتا پایا۔ ایک' دو بار دادی کے پکارنے پر غنیہ کمرے میں آئی تو ارسلان اس کی جانب قطعی متوجہ نہ ہوا۔ اس کی نگاہیں بار بار ماہین کی طرف ہی اٹھ رہی تھیں۔ عشرت بیگم دل ہی دل میں پھولے نہ سما رہی تھیں۔ لیکن جب جاتے وقت دادی نے غنیہ کی انگلی میں انگوٹھی پہنادی تو عشرت بیگم کے خوش گمانی کے غبارے میں سے ساری ہوا نکل گئی۔ بہت بوجھل دل کے ساتھ وہ بیٹی کے ساتھ گھر واپس پہنچیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ محض چند روز گزرنے کے بعد ارسلان کی ماں اور بہن ان کے ہاں ان کی ماہین کا رشتہ لینے پہنچ جائیں گی۔

ارسلان کی والدہ کے انداز میں گرم جوشی مفقود تھی۔ انہوں نے جتا دیا تھا کہ بیٹے کی خواہش پر وہ یہ رشتہ مانگ رہی ہیں۔ لیکن اگر عشرت بیگم کو اس بات پر تحفظات ہیں کہ دیور کی بیٹی کی جگہ ان کی بیٹی کا رشتہ مانگا جارہا ہے اور وہ اس بات کو نامناسب خیال کرتے ہوئے انکار کرنا چاہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ وہ اپنے بیٹے کو ان کا انکار پہنچا دیں گی۔ شاید ارسلان کی ماں کی خواہش ہی یہ تھی کہ ارسلان تک ان کا صاف انکار پہنچا کر اس کی طبیعت صاف کردی جائے۔ وہ ظہیر اور خدیجہ کے حوالے سے بہت شرمندہ تو اپنے سگے اکلوتے بیٹے سے حد سے زیادہ شاکی معلوم ہو رہی تھیں۔ ہاں ارسلان کی بہن ماہین پر واری صدقے جارہی تھی اور عشرت بیگم کو کسی پاگل کتے نے تو نہیں کاٹا تھا کہ وہ ارسلان کی ماں کی سرد مہری کو دل پر لیتے ہوئے ارسلان جیسے ہیرا لڑکے کو چھوڑ دیتیں۔ انہوں نے ارسلان کی بہن کو کہہ دیا کہ وہ اپنے بھائی کو جا کر خوش خبری سنا دے کہ انہوں نے ماہین کے لیے اس کا رشتہ قبول کرلیا ہے۔

"اتنی جلدی' کچھ سوچنے کا تو ٹائم لیا ہوتا؟"

ارسلان کی ماں کا لہجہ اگر طنزیہ تھا بھی تو ان کی بلا سے۔

"دیکھ بھال تو ساری ظہیر' خدیجہ نے کر رکھی ہے۔ ظاہر ہے جو رشتہ انہیں غنیہ کے لیے مناسب لگا تھا تو میں اس میں مین میخ کیوں نکالوں اور آپ بتا ہی رہی ہیں کہ خدیجہ نے آپ کو کہہ دیا کہ آپ لوگ شوق سے ماہین کا رشتہ لے جائیں تو جب انہیں کوئی اعتراض

نہیں تو بہن! ہم آپ کون ہیں اعتراض کرنے والے اور پھر رشتے ناتے تو آسمان پر طے ہوتے ہیں۔ ماہین اور ارسلان کا نصیب جڑنا تھا تو دیکھیے جڑ کر رہا۔ یہ قدرت کے فیصلے ہیں بہن!" انہوں نے لہجے میں حد درجہ بردباری اور متانت سموئی تھی۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" ارسلان کی ماں نے تھکے تھکے انداز میں اقرار کیا۔ یہ مرحلہ تو بخیر و خوبی طے ہو گیا۔ وہ انگوٹھی جو چند دن پہلے غنچہ کو پہنائی گئی تھی ارسلان کی بہن کے پرس سے برآمد ہو کر ماہین کی انگلی میں سج گئی۔ مہمان رخصت ہوئے تو دونوں ماں بیٹیوں پر شادیٔ مرگ کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن جب نصیر الدین کو پتا چلا تو وہ بیوی پر چڑھ دوڑے۔

"رشتہ داری کا لحاظ نہیں کیا تو انسانیت کا لحاظ ہی کر لیا ہوتا۔ ظہیر میرا چھوٹا بھائی ہے۔ کتنا پریشان تھا وہ اپنی بچی کے لیے اگر قسمت سے اس کا رشتہ کسی اچھی جگہ طے ہونے جا رہا تھا تو تم وہ رشتہ لے اڑیں۔" وہ بیوی کی فطرت سے بخوبی آگاہ تھے۔ مسرت بیگم تو رشتہ لے اڑنے والی بات پر چراغ پا ہو گئی تھیں۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں لڑکے والوں کے گھر جا کر ماہین کا رشتہ پیش کر کے آئی ہوں۔ ارے وہ تو اتفاق سے میں اور ماہین ظہیر کے ہاں گئے تو وہاں لڑکا اور اس کی ماں، بہنیں آئی ہوئی تھیں اور اگر میں ماہین کا رشتہ وہاں نہ بھی کروں تو غنچہ کے لیے تو وہ لوگ صاف انکار کر آئے ہیں۔ وہ رشتہ تو دوبارہ جڑنے سے رہا۔" عشرت بیگم چمک کر بولی تھیں۔

"اگر تم اتفاق سے اس روز ظہیر کے ہاں نہ جاتیں تو ہو سکتا ہے غنچہ کا رشتہ برقرار رہتا۔ میں جانتا ہوں تمہارے اتفاقات۔" نصیر صاحب چبا چبا کر بولے تھے۔

عشرت بیگم کی برداشت بھی اب جواب دے گئی تھی۔ وہ جواباً میاں سے تیز آواز میں ان پر چڑھ دوڑی تھیں۔

"ارے میں کہتی ہوں بھتیجی کے لیے جو محبت اور ہمدردی کے مروڑ اٹھ رہے ہیں پیٹ میں تو سگی بیٹی کے متعلق کبھی سنجیدگی سے کیوں نہ سوچا۔ میں جوان بچی کو کب تک گھر بٹھاؤں۔ لڑکے والوں نے غنچہ کے لیے تو صاف انکار کر ہی دیا ہے اب ان کی بلا سے اس کا رشتہ کہیں بھی طے ہوا اور پھر کوئی شادی تھوڑی ہوئی تھی۔ زبانی کلامی بات چیت تھی۔ بات نہیں بنی تو کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ ظاہر ہے غنچہ بھی کنواری نہیں بیٹھی رہے گی۔ خدیجہ کی خالہ زاد بہن میرج بیورو چلاتی ہے۔ ایک سے ایک رشتہ بھیجتی ہے غنچہ کے لیے۔ وہ تو میں جوڑوں کی مریضہ، گھر سے نکلنا میرے لیے محال۔ میری تو سوچ سوچ کر راتوں کی نیندیں اڑ جاتی تھیں کہ آخر میں ماہین کا رشتہ کہاں سے ڈھونڈوں گی۔ ددھیال میں کوئی لڑکا نہیں تو ننھیال میں سب لڑکے اس سے چھوٹے۔ گھر بیٹھے بیٹھے تو صرف خاندان سے رشتے آ سکتے ہیں اور تمہیں کیا پتا ہے۔ لڑکی کی ذرا سی عمر بڑھ جائے تو کوئی رشتہ گھر کی دہلیز پار نہیں کرتا۔ تمہیں تو سگی اولاد کی کوئی فکر ہی نہیں۔ لیکن میں ماں ہوں۔ میں اپنی زندگی میں ہی اپنی بچی کو گھر بار کا کر دوں۔ کل کس نے دیکھی۔" بات کے آخر میں عشرت بیگم خواہ مخواہ جذباتی ہو گئی تھیں۔ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ رگڑ کر ناک پونچھنے لگیں۔

"اچھا پھر بھی تم ایک بار ظہیر اور خدیجہ سے پوچھ لو۔ اگر انہیں واقعی کوئی اعتراض نہ ہو تو کر دینا بیٹی کو ارسلان کے سنگ رخصت۔" عشرت بیگم کا جی چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ میاں کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی ان کی تسلی کو کہہ دیا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں، میں کل ہی جاؤں گی ظہیر کے ہاں۔"

"میں ظہیر کو بلوا کر خود بات کروں اس سے۔" نصیر صاحب کے دل کا ایک گوشہ ابھی بھی غیر مطمئن تھا۔

"نہ، نہ میں خود جا کر سلیقے سبھاؤ سے بات کر لوں گی۔ آپ تو لٹھ مار انداز میں بات کرتے ہیں۔"

انہوں نے شوہر کو منع کیا اور اگلے دن وہ واقعی ظہیر کے ہاں پہنچ گئی تھیں۔ لیکن مقصد صرف خدیجہ کے پھیکے پڑتے چہرے سے لطف اٹھانا تھا۔ باوجود خواہش

کے وہ خدیجہ کا اترا ہوا چہرہ نہ دیکھ پائی تھیں۔ ان کے چہرے پر وہ ہی مطمئن سی مسکراہٹ تھی جو ہمیشہ سے ہی اس کی شخصیت کا خاصہ رہی تھی۔ غنیہ بھی انہیں سلام کر کے معمول کے کام نپٹاتی رہی۔ بلکہ اسی نے انہیں چائے بنا کر لا دی تھی۔ ہاں اجیہ ضرور تلملا رہی تھی۔ وہ اس کی تلملاہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چائے پیتی رہیں۔ پھر گھر واپسی کی راہ لی تھی۔

ظہیر اور خدیجہ نے یہ حقیقت تسلیم کر لی تھی کہ غنیہ کے نصیب میں ارسلان کا ساتھ لکھا ہی نہ تھا۔ خود غنیہ بھی اپنے نصیب پر یقین رکھتی تھی۔ لیکن اجیہ کا غم و غصے سے برا حال تھا۔ اس کی بہن تھی بھی تو کتنی اچھی۔ ماں، باپ کی فرماں بردار بیٹی۔ چھوٹی عمر سے ہی غنیہ نے گھر کے کاموں میں ماں کی مدد کروانی شروع کر دی تھی۔ چھوٹی بہنوں کے کام بھی اس نے اپنی ذمہ داری سمجھ کر نپٹانے شروع کر دیے۔

ماں نماز کے لیے کھڑی ہوتی تو وہ جھٹ دوسرا مصلّٰی ساتھ بچھا لیتی۔ باپ گھر آتا تو سارے کام چھوڑ اسے پانی کا ٹھنڈا گلاس پیش کرتی۔ دونوں چھوٹی بہنیں بھی اس کی عادتیں اپنانے کی کوشش کرتیں۔ مگر ان میں غنیہ جیسا سلیقہ، اس جیسی برداشت اور اس جیسا صبر نہ تھا۔

بہت اچھے نمبروں سے گریجویشن پاس کرنے کے باوجود غنیہ نے آگے پڑھنے پر اصرار نہ کیا۔ وہ جانتی تھی باپ محدود آمدنی میں تین بچیوں کی تعلیم کا خرچا نہیں اٹھا سکتا۔ اس نے آج تک غنیہ کے لبوں پر کوئی شکوہ نہ دیکھا تھا۔ جب اونگے بونگے لوگ اس کا رشتہ دیکھنے آتے اور کھانے پینے کے بعد انکار کر کے چلتے بنتے تب بھی غنیہ کا چہرہ اتنا ہی پرسکون رہتا۔

پتا نہیں غنیہ میں اتنا ضبط، اتنا صبر اور اتنی برداشت کہاں سے آ گئی تھی۔ لیکن نہیں غنیہ کے پہلو میں بھی ایک دل تھا جو بہت حساس تھا۔ اس روز جب اجیہ پانی پینے کچن میں گئی تو غنیہ دوپہر کا کھانا بنانے کے لیے پہلے سے ہی کچن میں موجود تھی۔

"آپ صرف سالن بنا کر باہر نکل آئیں غنیہ آپی! روٹیاں میں ڈال لوں گی۔" اس نے غنیہ کو مخاطب کیا۔

"تم ابھی تو کالج سے آئی ہو۔ تھکی ہوئی ہو گی۔ میں روٹیاں خود بنا لوں گی۔" غنیہ نے دھیمے لہجے میں بغیر مڑے جواب دیا۔ لیکن اجیہ نے اس کی آواز سے جان لیا وہ رو رہی تھی۔ وہ تڑپ ہی تو گئی تھی۔

"آپ رو رہی ہیں غنیہ آپی؟"

"پاگل ہوئی ہو اجیہ۔ میں بھلا کیوں روؤں گی۔ فلو ہو رہا ہے مجھے۔ اس لیے آواز بھاری بھاری ہو رہی ہے۔" غنیہ نے اس سے نگاہیں ملائے بغیر مخاطب کیا تھا۔

"جن لوگوں نے آپ کے حصے کی خوشیاں چھینی ہیں نا غنیہ آپی۔ میں ان کی خوشیاں غارت کر دوں گی۔ میں نے ان کا وار ان پر نہ الٹ دیا تو میرا نام اجیہ ظہیر نہیں۔"

"کیا کر لو گی تم۔ ہاں بتاؤ، کیا کر لو گی تم؟" خدیجہ کی آمد اتنی اچانک تھی کہ غنیہ اور اجیہ دونوں بری طرح چونک گئیں۔ وہ شدید غصے کے عالم میں اجیہ کو تک رہی تھیں۔

"میرے پاس ارسلان کا نمبر ہے۔ میں نے صرف اسے ایک کال کر کے بتانا ہے کہ جس لڑکی کی ظاہری خوب صورتی پر وہ مر مٹا ہے، اس کا باطن کیسا ہے۔ کالج میں پڑھنے کے بجائے وہ لڑکوں سے ملنے جاتی ہے۔ بے شک ارسلان میری بات پر یقین نہ کرے۔ لیکن میں اسے ماہین سے بدظن کرنے کی اپنی سی کوشش تو ضرور کروں گی۔"

خدیجہ نے بمشکل اس کا فقرہ مکمل ہونے کا انتظار کیا تھا۔ اگلے ہی پل چٹاخ کی آواز گونجی تھی۔ انہوں نے اجیہ کے گال پر زوردار طمانچہ رسید کیا تھا۔

"امی!" غنیہ متوحش ہو کر آگے بڑھی۔ اجیہ بھی گال پر ہاتھ رکھے بے یقینی سے ماں کو تک رہی تھی۔ خدیجہ نے تو کبھی بچپن میں بھی بیٹیوں پر ہاتھ نہ اٹھایا تھا۔

"میں نے تمہاری ایسی تربیت تو نہ کی تھی اجیہ! کیوں کسی پر ناجائز تہمت اور بہتان باندھ رہی ہو۔" تھپڑ مارنے کے بعد خدیجہ کی اپنی حالت غیر ہو گئی تھی۔

"یہ ناجائز تہمت یا بہتان نہیں ہے امی۔ یہ بالکل سچ ہے۔ میں نے ماہین کے ساتھ کالج جانا کیوں چھوڑا تھا؟ صرف یہی وجہ تھی امی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی لڑکا اس کا پیچھا کرتا کالج تک آئے اور ماہین کے ساتھ میں بھی کسی کی نظر میں آؤں۔ میں نے اس وقت آپ لوگوں سے یہ بات چھپائی۔ مجھے ہمیشہ بابا کی بات یاد آتی تھی کہ کسی کے عیب اچھالنا گناہ ہے۔ لیکن میں اب مزید خاموش نہیں رہ سکتی۔"

یوں لگتا تھا کہ اجیہ تھپڑ سے ملنے والے شاک سے باہر آ چکی ہے۔ جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بالکل ہموار تھا۔

"اگر اس بات میں واقعی صداقت ہے تو اللہ کا شکر ہے ماہین کی نسبت یہاں ٹھہر گئی، وہ جتنی جلدی اپنے گھر بار کی ہو جائے اتنا ہی اچھا۔" خدیجہ بولیں تو ان کی آواز میں اجیہ سے زیادہ سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ اجیہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔

"لیکن امی! میرے دل میں اس کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں۔ میں نے جو سوچ لیا ہے، وہ کر گزروں گی۔" وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔ خدیجہ چند لمحوں تک اسے خاموشی سے تکتی رہیں۔

"جانے تمہاری تربیت میں مجھ سے کہاں چوک ہو گئی اجیہ! اب تمہارے آگے ہاتھ جوڑنے کی کسر رہ گئی ہے۔ لو میں وہ بھی جوڑ لیتی ہوں۔ ہم پہلے ہی بہت پریشان ہیں اجیہ۔ مزید نہ ستاؤ مجھے۔" خدیجہ نے حقیقتاً اپنے ہاتھ اس کے آگے جوڑ لیے تھے۔

"امی!" غنیہ تڑپ کر آگے بڑھی تھی اور ان کے بندھے ہاتھ کھولے تھے۔ پھر ایک تیکھی نگاہ اجیہ پر ڈالی جو اپنی جگہ بالکل ساکت کھڑی تھی۔

"ایسی فضول باتیں کر کے تم امی کو کیوں ٹارچر کرتی ہو اجیہ۔ جب میں اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر چکی ہوں تو تم کیوں اناڑی ایکٹ کر رہی ہو۔"

"تم جیسے بزدل لوگ، جو کچھ نہیں کر سکتے، سب کچھ قسمت پر ڈال کر مطمئن ہو جاتے ہیں اور وہ تائی جان جیسے لوگ ہمارے حصے میں آنے والی کبھی کبھار کی خوش قسمتی پر بھی جھپٹا مار لیتے ہیں۔ دنیا آگے بڑھ جائے گی اور آپ اپنی شرافت، اچھائیوں اور بزدلی کو سینے سے لگا کر سب سے پیچھے رہ جائیں گے۔ مجھے آپ لوگوں جیسا اچھا بننا منظور نہیں۔"

وہ اب ہسٹریک انداز میں چلا رہی تھی۔ خدیجہ پریشان بھی ہو رہی تھیں اور پشیمان بھی۔ اجیہ ابھی کم عمر تھی۔ جذباتی اور نادان۔ انہیں اس پر یوں ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی تو وہ اسے پیار سے بھی سمجھا سکتی تھیں۔

"ریلیکس اجیہ۔ تم کمرے میں جا کر لیٹو، میں تمہارے لیے گلوکوز بنا کر لاتی ہوں۔" اب اجیہ اپنی مٹھیاں بھینچے آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔ اس کا تنفس بھی غیر ہموار تھا۔ غنیہ نے گھبرا کر اس کے گال تھپتھپائے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں غنیہ آپی!" چند لمحے لگے تھے اجیہ کو خود پر قابو پانے میں۔

اجیہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ شام کو اس نے معمول کے مطابق پڑوس سے ٹیوشن کے لیے آنے والے بچوں کو پڑھایا۔ بچے پڑھ کر چلے گئے تو وہ اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی۔ خدیجہ سے مزید ضبط نہ ہو سکا وہ اس کے پاس آئی تھیں۔

"میرا بچہ ناراض ہے مجھ سے۔" انہوں نے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر اس کے گال پر عین اسی جگہ لب رکھے جہاں دوپہر کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ ایک پل کو اجیہ کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

"کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔" وہ بمشکل مسکرائی۔

"تم تینوں میری زندگی کا حاصل ہو اجیہ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میری بیٹیاں زندگی میں کچھ ایسا کام کریں جس سے میری تربیت پر حرف آئے۔" انہوں نے اس کی پیشانی پر آئی لٹ کو پیار سے سنوارتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔

"میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں امی کہ میں کچھ نہیں

کرنے والی۔ میری رگوں میں آپ کا ہی خون ہے۔ میں کچھ غلط سوچ تو سکتی ہوں کر نہیں سکتی۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں اعتراف کیا۔ خدیجہ نے ایک بار پھر اس کی پیشانی چوم لی۔

"اللہ سے دعا کرو۔ تمہاری بہن بھی اللہ کے فضل و کرم سے بہت جلد اپنے گھر بار کی ہو جائے گی۔" خدیجہ بھرپور یقین سے بولی تھیں۔

اجیہ بس انہیں دیکھ کر رہ گئی۔ اس کا دل ایسے کسی بھی یقین سے خالی تھا۔

اب وہ کس دل سے دعا مانگتی۔ اس کے دل کا خالی پن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نماز پڑھ کر وہ بے دلی سے جائے نماز لپیٹ کر رکھ دیتی۔

"بیٹا! دعا نہیں مانگی کیا؟" خدیجہ نے اسے ایک دن ٹوک ہی دیا۔

"جب دعا مانگنے سے فرق نہیں پڑا تو نہ مانگنے سے کیا فرق پڑے گا۔" وہ صرف سوچ کر رہ گئی تھی۔ اگر بول پڑتی تو خدیجہ کو اس سے کلمہ دوبارہ پڑھوا کر اس کے ایمان کی تجدید کروانی تھی۔

☼ ☼ ☼

تائی جان بنفس نفیس۔ تشریف لا کر خدیجہ کو ماہین کی شادی کا جگمگاتا کارڈ تھما گئی تھیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ بچیوں سمیت تمام فنکشنز میں شرکت ضرور کرنی ہے۔ خدیجہ کا خیال تھا کہ صرف وہ اور ظہیر صاحب ماہین کی رخصتی والے روز وہاں جا کر رسم نبھا دیں گے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب غنیہ نے ان سے کہا کہ وہ بہنیں بھی ذرا دیر کے لیے مایوں، مہندی کے فنکشن میں شرکت کرنے جائیں گی۔

"اتنا قریبی رشتہ ہے امی ہمارا ان سے۔ ہماری غیر حاضری پر سب رشتہ دار ہمارا پوچھیں گے نہیں اور جانے ہماری غیر موجودگی تائی جان کو کون کون سے افسانے بنانے کا موقع فراہم کر دے۔" غنیہ کے مدلل انداز پر خدیجہ قائل ہو گئی تھیں۔

"تم چلو گی نا اجیہ؟" غنیہ اب اس سے مخاطب تھی۔ اجیہ نے نگاہیں اٹھا کر اپنی بہادر بہن کو دیکھا۔

"اگر آپ اور رہنیہ جا رہے ہیں تو میں بھی چل پڑوں گی غنیہ آپی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"وہاں جا کر تم اپنی تائی جان سے کچھ الٹا سیدھا نہیں بولو گی۔ سمجھیں تم۔" خدیجہ کو خدشہ ستایا تو اسے پیشگی تنبیہ کی۔

"پتا نہیں میں اپنے متعلق آپ کی بدگمانی کیسے دور کروں۔" وہ ٹھنڈا سانس لے کر کمرے سے چلی گئی۔ پہلے کی طرح بات بات پر الجھنے، لڑنے جھگڑنے والی اجیہ ہمہ وقت سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے رکھتی۔ نقصان غنیہ کا ہوا تھا۔ لیکن چوٹ اجیہ کے دل پر پڑی تھی۔ اس کے لب تو جیسے مسکرانا بھول ہی گئے تھے۔

ماہین کی مہندی پر جانے کے لیے جب ان کی تینوں بیٹیاں تیار ہوئیں تو بے ساختہ ان کے دل سے ماشاء اللہ کی صدا نکلی تھی۔ انہوں نے کوئی بہت زرق برق کپڑے نہیں پہنے تھے۔ نہ ہی شوخ سا میک اپ کیا تھا۔ نفیس سا سنگھار کرنے سے ہی ان کی بیٹیاں پرکشش اور پروقار لگ رہی تھیں۔

مہندی کے فنکشن کا انتظام ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ ماہین اس فنکشن کے لیے بھی خصوصی طور پر بیوٹی پارلر سے تیار ہو کر آئی تھی۔ اس بات میں کوئی شبہ نہ تھا کہ وہ بے تحاشا حسین لگ رہی تھی۔ اس کی ننھیالی کزنز نے اس کو گھیر رکھا تھا۔ تائی جان شاداں و فرحاں ادھر سے ادھر پھر رہی تھیں۔ بیٹی کی شادی کے وقت جو فطری رنجیدگی بیٹی کی ماں کی آنکھوں سے جھلکتی ہے عشرت بیگم کی آنکھوں میں اس اداسی اور رنجیدگی کا شائبہ تک نہ تھا۔ ان کی آنکھیں کچھ پا لینے اور کسی کو ہرا دینے کے احساس کے زیر اثر کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں۔ وہ ذرا دیر کو خدیجہ اور ان کی بیٹیوں کے پاس آئی تھیں۔

"اے لو خدیجہ! آج تو بچیوں کو ذرا تیار شیار کر کے لے آتیں۔ سینکڑوں مہمان اکٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر ہی بچیاں کسی کی نظروں میں آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں بات بن جائے۔" انہوں نے بہت اپنائیت سے خدیجہ کو ٹوکا تھا۔

"ایسے تو نہ کہیں عشرت آپا۔ ماشاء اللہ اتنی پیاری لگ رہی ہیں خدیجہ باجی کی بچیاں کہ میری تو نظر ہی نہیں ٹھہر رہی۔ پوری محفل میں سب سے جدا اور سب سے منفرد۔" تائی جان کی چھوٹی بہن جو کچھ دیر پہلے ہی خدیجہ کے پاس آن بیٹھی تھیں، بہن کو ٹوکے بنا نہ رہ پائیں۔

"تمہیں کیا پتا مدحت! آج کل کے فیشن۔ تم تو خود سولہویں صدی کی عورت لگتی ہو۔ تمہارے مولوی میاں نے تم پر اپنا پورا پورا رنگ جما لیا۔ لگتا ہی نہیں تم ہماری بہن ہو۔" تائی جان بہن کو گھور کر نخوت سے مخاطب کرتے ہوئے دوسرے مہمانوں کی طرف مڑ گئیں۔

"آپا بھی بس۔" مدحت بہن کے بے لاگ تبصرے پر کچھ خفیف ہوتے ہوئے سر جھٹک کر مسکرا دیں۔ عشرت بیگم کی اس بات میں واقعی صداقت تھی کہ مدحت کہیں سے ان کی بہن نہیں لگتی تھیں۔ وہ شکل و صورت میں بھی ان سے مختلف تھیں اور مزاج اور عادات میں بھی۔

اجیہ ان کی باتوں سے بے نیاز ٹکٹکی باندھے ماہین کو دیکھے جا رہی تھی۔ اب اسے مہندی لگانے کی رسم کی جا رہی تھی۔ ہنستی کھلکھلاتی، اٹھلاتی ماہین، مووی میکر اس کا ایک ایک پوز محفوظ کر رہا تھا۔

"یہ میری غنیہ آپی کی جگہ تھی۔" وہ بڑبڑائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ہم آپ کے پاس بہت آس لے کر آئے ہیں خدیجہ باجی۔ ہمیں مایوس مت کیجیے گا۔" ڈرائنگ روم میں اس وقت پن ڈراپ سائیلنس تھا۔ جب مدحت کی آواز نے سناٹے کو توڑا تھا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ سوچنے سمجھنے کا تو وقت دیں۔" خدیجہ نے کچھ گھبرائے اور بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

"یہ جو میرے ساتھ نائلہ بیٹھی ہے، سارا مسئلہ اسی کا ہے۔ اس کے میاں کی چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں۔ انہوں نے واپس کینیڈا جانا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ جانے سے پہلے بھائی کی خوشی دیکھ جائے۔" مدحت نے اپنے ساتھ بیٹھی پرکشش سی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ پریشان مت ہوں آنٹی۔ سوچنے کا ٹائم ضرور لیں۔ لیکن اتنا ہمیں یقین ہے کہ آپ عثمان بھائی کو دیکھیں گی تو آپ رشتہ بھی قبول کر لیں گی اور ہمیں شادی کی تاریخ بھی دے دیں گی۔" نائلہ کھلکھلائی تھی۔

"صحیح کہہ رہی ہے نائلہ۔ سچ خدیجہ باجی! جس طرح میں نے غنیہ کو پہلی نگاہ میں عثمان کے لیے اوکے کر دیا تھا۔ اسی طرح آپ عثمان کو دیکھیں گی تو آپ کو لگے گا کہ وہ آپ کی بیٹی کا ہی نصیب ہے۔ میں نے ماہین کی شادی پر اپنے موبائل سے غنیہ کی تصویر اتار لی تھی۔ وہاں جا کر ان لوگوں کو غنیہ کی تصویر دکھائی اور ساتھ ہی اس کی شخصیت کا خاکہ بھی کھینچ ڈالا۔ ایسی ہی لڑکی کی ان لوگوں کو تلاش تھی۔ بس نائلہ تو میرے سر ہو گئی کہ چچی جان فٹافٹ ملتان جا کر غنیہ کا رشتہ مانگیں۔ عثمان بھی آیا ہے۔ آفیسرز میس میں ٹھہرا ہوا ہے۔ بلکہ ہمارا اپنا سامان بھی وہیں پڑا ہے۔ رات بارہ بجے تو پہنچے ہیں۔ عشرت آپا تک کو اطلاع نہیں دی۔ سیدھے آپ کے پاس آئے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو فون کر کے عثمان کو بھی بلا لیتی ہوں۔" مدحت جوش و خروش سے نان اسٹاپ بولے جا رہی تھیں۔

"اسی لیے تو بھائی کو ساتھ لائے ہیں آنٹی کہ آپ لوگوں کو صرف لڑکا دیکھنے کی خاطر پشاور تک نہ آنا پڑے یوں ٹائم مزید ضائع ہوتا ویسے تو بھائی کی پوسٹنگ اٹک میں ہے لیکن اٹک کون سا نزدیک ہے۔ بس آپ ظہیر انکل کو بھی بلوا لیں اور ہم عثمان بھائی کو بلوا لیتے ہیں۔ لڑکا پسند آ گیا تو ہم شادی کی تاریخ لے کر ہی ٹلیں گے۔"

نائلہ نے پھر شوخی کا مظاہرہ کیا۔ خدیجہ عجیب شش و

پنج کا شکار تھیں۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ان کی بیٹی کا رشتہ جیٹھانی کی بہن کی وساطت سے آئے گا۔ مدحت، عشرت بیگم کی سب سے چھوٹی بہن تھیں ان کا سسرال پشاور تھا سالوں بعد ہی باقی بہنوں کے پاس ملتان چکر لگتا تھا۔ ماہین کی شادی پر خود خدیجہ کی ان سے برسوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ جیٹھانی کی یہ بہن مزاج میں بہن سے بلکہ باقی سب بہن بھائیوں سے بالکل مختلف تھیں، کبھی کبھار عشرت بیگم کی زبانی ہی سننے کو ملتا کہ ان کے مرحوم والد صاحب نے سب سے چھوٹی بیٹی کو مولویوں کے خاندان میں بیاہ دیا۔ خیر خدیجہ جانتی تھیں کہ عشرت بیگم کی مولوی سے کیا مراد ہوتی تھی۔ دین کا صحیح فہم رکھنے والا ہر وہ شخص جو زندگی اسلام کے اصولوں کے مطابق گزارنے کی کوشش کرتا ان کے نزدیک "مولوی" ہوتا تھا۔ عشرت اور نصیر صاحب خود ظہیر الدین کو اس کیٹیگری میں شمار کرتے تھے۔

بہرحال ماہین کی شادی میں مدحت سے مل کر عشرت بیگم کی ان سے متعلق کی جانے والی ہر بات کی نفی ہو گئی تھی۔ مدحت کا خوش باش چمکتا دمکتا چہرہ دیکھ کر کوئی بھی شخص ان کی مطمئن اور خوش گوار ازدواجی زندگی کے بارے میں اندازہ لگا سکتا تھا اور اس وقت مدحت اپنے جیٹھ کے بیٹے کا رشتہ لے کر لڑکے کی بہن کو ساتھ لیے آئی ہوئی تھیں۔ اس کی جیٹھانی کا برسوں پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ عثمان اور نائلہ دو ہی بہن بھائی تھے۔

نائلہ کی شادی اس کے پھوپھی زاد سے ہوئی تھی جو کینیڈا میں رہائش پذیر تھا۔ نائلہ بھی بیاہ کر وہیں چلی گئی تھی۔ عثمان کا رشتہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری مدحت کے جیٹھ نے ان کے سپرد کر رکھی تھی۔ وہ اپنے سسرال کی ہر دلعزیز بہو تھیں۔ دیور، جیٹھ کے بچوں سے بھی ان کی خوب ہی دوستی تھی۔ عثمان نے بھی انہیں اختیار دے رکھا تھا کہ وہ اس کے لیے بھی اپنے جیسی لڑکی ڈھونڈ کر لا دیں۔

وہ آرمی میں میجر کے رینک پر فائز تھا۔ آج کل اس کی پوسٹنگ اٹک میں تھی۔ مدحت نے ماہین کی شادی سے واپسی پر سسرال میں خدیجہ اور ظہیر کے گھرانے اور ان بچیوں کا ایسا نقشہ کھینچا کہ عثمان کے والد نے بھی رشتہ فوراً "اوکے" کر دیا اور غنیہ کی تصویر عثمان کی اکلوتی بہن نائلہ کے من کو بھی بھا گئی ویسے بھی یہ فیملی دین کا صحیح فہم اور اعلا اخلاقی اقدار رکھنے والی فیملی تھی انہیں عثمان کے لیے کوئی سلجھی ہوئی لڑکی درکار تھی ظاہری خوب صورتی سے انہیں خاص سروکار نہ تھا۔ خدیجہ نے ظہیر صاحب کو فون کر کے بلوا لیا تو مدحت نے عثمان کو بلوا بھیجا اس کی بہن کا کہنا صحیح تھا کہ اس کے بھائی کو دیکھ کر رد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، عثمان کو دیکھ کر ان کا دل اندر تک مطمئن ہو گیا۔

اس لمبے چوڑے وجیہہ شخص کی روشن پیشانی سے ہی اس کی شرافت اور نجابت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس کی گفتگو کا سلجھا ہوا، دھیما اور مہذب انداز، خدیجہ کا من شانت ہو گیا، لیکن جب مدحت نے ان سے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"کیا یہ ممکن ہے خدیجہ باجی کہ عثمان اور غنیہ ایک دوسرے کو ایک نظر دیکھ لیں؟"

خدیجہ، مدحت کی بات سن کر کچھ پریشان ہو گئی تھیں۔ ابھی زیادہ عرصہ تو نہ گزرا تھا کہ ان کی بیٹی کو لڑکے کے گھر والوں نے اوکے مگر لڑکے نے مسترد کر دیا تھا اگر اس بار بھی وہی پریکٹس دہرائی گئی تو شاید ان کی بیٹی اپنی شخصیت کا اعتماد ہمیشہ کے لیے ہی نہ کھو دے۔ لیکن وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ بات بڑھنے سے پہلے اس بات کو یقینی بنا لیا جائے کہ عثمان کو غنیہ پسند آئی ہے یا نہیں۔

خدیجہ نے جی کڑا کر کے غنیہ کو اندر بلوا لیا تھا۔ پچھلی بار کی نسبت آج غنیہ کہیں زیادہ پزل ہو رہی تھی۔ ٹھنڈی یخ ہتھیلیوں، شرم و گھبراہٹ سے لرزتی پلکوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ غنیہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"بھائی! یہ ہیں غنیہ۔" نائلہ نے دھیمے سے لہجے میں بھائی کو مخاطب کر کے غنیہ کی جانب متوجہ کیا۔

"السلام علیکم!" عثمان نے نشست سے کھڑے ہو کر اسے شائستگی سے سلام کیا تھا۔ خواتین کو تعظیم دینے کا فوجیوں کا مخصوص طریقہ۔ غنیہ سے تو خیر کیا جواب دیا جانا تھا۔ مدحت نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

وہ لوگ جلد شادی پر زور دے رہے تھے جبکہ خدیجہ اور ظہیر ابھی تک متذبذب تھے۔

"بات دراصل یہ ہے انکل کہ صرف نائلہ کی وجہ سے ہم جلد شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ میں اپنی ذات کے متعلق خود تو آپ کو کیا اطمینان کرواؤں۔ اپنے یونٹ کے جوانوں، کپتانوں سے لے کر اپنے آفیسرز تک سے آپ کا رابطہ کروائے دیتا ہوں۔ ایک فوجی کے متعلق صحیح رپورٹ اس کے ساتھی ہی دے سکتے ہیں۔ یہ دو معزز خواتین چونکہ میرے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں سو ان کی بات پر بے شک یقین نہ کریں انہوں نے تو میری شان میں قلابے ملانے ہی ہیں۔"

میجر عثمان نے مسکراہٹ دباتے ہوئے بہن اور چچی کی جانب اشارہ کیا۔ اس کی بھوری آنکھوں میں بھی شرارت رقصاں تھی۔ ظہیر اور خدیجہ بھی مسکرا دیے۔

"میاں صاحبزادے! ہمیں وقت اس لیے درکار نہیں ہے کہ ہمیں تمہارے بارے میں انکوائری کروانی ہے۔ لیکن ہمیں شادی کی تیاری کے لیے بھی تو کچھ وقت درکار ہے۔" ظہیر صاحب نے بشاشت سے مسکرا کر عثمان کو مخاطب کیا۔ وہ ایک لمحے کو سنجیدہ ہوا تھا۔

"میں جانتا ہوں جس معاشرے میں ہم رہ رہے ہیں وہاں سب سے زیادہ پروا "دنیا والوں" کی کی جاتی ہے لیکن اگر ہم اور آپ غیر ضروری رسوم و رواج سے ہٹ کر سادگی سے شادی کی ایک مثال قائم کریں تو یقین کریں بہت سے لوگوں کو اس سے ہمت ملے گی۔ آپ لوگوں کو جہیز وغیرہ کا تردد کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ویسے بھی ہم فوجی لوگ تو خانہ بدوشوں کی سی زندگی گزارتے ہیں کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔ میں تو ضرورت کے علاوہ زیادہ سامان اکٹھا کرنے کا قائل ہی نہیں اور رہے دنیا والے تو کسی بھی اچھے کام کے لیے ہمیں دنیا کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔"

"ہماری خوش قسمتی بیٹا کہ تم جیسا روشن خیال شخص ہماری فرزندی میں آ رہا ہے۔ تمہاری باتوں سے اختلاف ممکن نہیں، لیکن میں چاہتا ہوں کہ تمہارے والد صاحب سے بھی ایک بار مل لوں پھر ان شاء اللہ سارے معاملات طے کر لیں گے۔" ظہیر صاحب نے متانت سے جواب دیا۔



چار روز بعد خدیجہ اور ظہیر پشاور چلے گئے تھے۔ عثمان سے مل کر تو ان کا من مطمئن تھا ہی۔ اس کے والد اور چچا وغیرہ سے ملاقات کے بعد دل کا اطمینان مزید بڑھ گیا تھا۔ پچیس دن بعد ہی میجر عثمان پشاور سے بارات لا کر اسے اپنے سنگ رخصت کروانے آن پہنچا تھا۔ دلہن بنی غنیہ پر اتنا روپ چڑھا تھا کہ جو دیکھتا نظر ہٹانا بھول جاتا، اس کے پہلو میں بیٹھا اس کا دولہا بھی کچھ کم نہ لگ رہا تھا۔ بلاشبہ وہ بہت وجیہہ شخص تھا۔ ساتھ ہی ساتھ بہت پروقار بھی تھا۔ شادی کی تقریب انتہائی سادگی سے منعقد کی جا رہی تھی، لیکن یہ انتہائی پروقار تقریب تھی۔ "دنیا والے" باتیں بنانے کے بجائے متاثر اور مرعوب ہی دکھائی دے رہے تھے۔

دلہن کے گھر والوں کی آنکھیں نم، لیکن دل شانت تھے فقط اجیہ ہاں اجیہ تھی جس کے دل کو اب بھی قرار نہ مل رہا تھا۔

وہ اسٹیج پر بیٹھی غنیہ اور اس کے ساتھ بیٹھے عثمان پر نگاہ ڈالتی۔ اس کے لبوں پر اپنے رب کے لیے شکر کے کلمات آنے لگتے، لیکن اس کے لب کپکپا کر خاموش ہو جاتے۔ کچھ دن پہلے تک تو اجیہ نے اپنے دل میں اس کے لیے کیسی بدگمانی پال رکھی تھی۔ وہ اس کی بارگاہ میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھانا چھوڑ چکی تھی۔ کوئی اور تو اس کے خلاف کیا فتویٰ دیتا اس نے مسلسل

اپنی ذات کو کٹہرے میں کھڑا کر رکھا تھا ندامت اور پشیمانی کے احساس سے اس کا دل لرز، لرز جاتا۔ بابا ہمیشہ کہتے تھے کہ اللہ اپنے بندوں کو کسی آزمائش سے دوچار کرکے آزماتا بھی ہے اور آزمائش پر پورا اتر کر، صبر کرکے بندے اپنے رب کا زیادہ قرب حاصل کرسکتے ہیں۔ وہ تو پہلے ہی امتحان میں فیل ہوگئی تھی۔

بابا نے بتایا تھا "دعائیں تین طرح کی ہوتی ہیں ایک وہ جو فوراً" قبولیت کا درجہ پاجائیں۔ دوسری وہ جن کے بدلے رب ان کا بہتر متبادل عطا کرے اور تیسری دعا جس کا اجر یوم آخرت کے لیے سنبھال کر رکھ لیا جاتا ہے۔"

تائی جان نے ارسلان کا رشتہ "اچک" لیا تو یہ بات اجیہ کی برداشت سے باہر ہوگئی، لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے رب سے بھی بدگمان ہوگئی اللہ نے غنیہ کو ارسلان سے بہتر بدل عنایت فرمادیا، لیکن اگر غنیہ کے لیے کی گئی دعائیں دعاؤں کے تیسرے درجے میں شمار ہوتیں جن کی قبولیت کے بجائے جن کا اجر قیامت کے لیے اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے تو کیا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے رب سے ناراض اور بدگمان رہتی۔ وہ اپنا ایمان ضائع کردیتی۔

اجیہ ضمیر کی عدالت میں کھڑی تھی اور سوالوں کی چبھن نے اسے عاجز کرر کھا تھا۔

"ابھی غنیہ آپی کی رخصتی نہیں ہوئی مسز اور تم نے ابھی سے ہی آنسوؤں کے دریا بہا رکھے ہیں۔"

اپنے قریب عون کی سرگوشی پر اس نے آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اس کی سمت دیکھا۔ وہ بہت محبت اور محویت سے اسے تک رہا تھا۔

"تمہیں اللہ سے بہت شکوے تھے نا اجیہ اور میں نے کہا تھا جواب شکوہ جلد آجائے گا۔ دیکھو کیسا شاندار جواب شکوہ آیا ہے۔" اس نے اسٹیج پر بیٹھے عثمان کی جانب اشارہ کیا تھا۔

"ویسے یار میجر صاحب اتنے ڈیشنگ ہیں کہ میں بھی کچھ کچھ جیلسی فیل کررہا ہوں۔ ان کے مقابلے کے لیے میں نے آج اپنی ڈریسنگ پر خصوصی توجہ دی ہے اگر وہ تمہارے گھر کے بڑے داماد ہیں تو میں چھوٹا داماد ہوں لوگ موازنہ کرنے لگ ہی جاتے ہیں۔ سچ سچ بتاؤ کیسا لگ رہا ہوں میں؟" عون شرارت کے موڈ میں تھا اجیہ نے اس پر ایک نگاہ ڈالی۔ اچٹتی سی نگاہ ایش گرے ٹوپیس سوٹ میں وہ واقعی بہت ہینڈسم لگ رہا تھا، لیکن اجیہ کا دھیان نہ اس کی بات پر گیا تھا نہ اس کی ڈریسنگ پر۔ وہ تو اپنے ہی مسئلے میں گرفتار تھی اور عون کو سامنے پاکر خود پر قابو نہ رکھ پائی اس نے مزید شدت سے رونا شروع کردیا تھا۔

"میں بہت بری ہوں عون۔" وہ روتے ہوئے مسلسل ایک ہی بات کی تکرار کیے جارہی تھی۔

"وہ تو ہو، لیکن ڈیر رونا تو پھر بھی میرا بنتا ہے کہ آخر میں تمہارے ساتھ گزارہ کیسے کروں گا۔ تم کیوں آنسو ضائع کررہی ہو۔" عون اب بھی سنجیدہ نہ ہوا۔

"کیا اللہ مجھے معاف کردے گا؟" اس نے آنکھیں رگڑتے ہوئے عون سے پوچھا۔

"شوہر کو خوش رکھو گی تو اللہ تمہارے بہت سے گناہ یقیناً" معاف کردے گا۔ شوہر کا رتبہ بہت بڑا ہوتا ہے۔" عون نے اسے بردباری سے آگاہ کیا تھا۔

"تم کبھی میرے ساتھ سیریس نہیں ہوسکتے؟" اس کی مشکل سمجھے بغیر عون اپنی ہی ہانک رہا تھا۔ اجیہ کو مزید رونا آگیا۔

"میں ہمیشہ سے تمہارے ساتھ ہی سیریس ہوں ڈارلنگ۔" عون نے لگے ہاتھوں رومانس بھی جھاڑ دیا جانتا تھا بیوی کسی اور ہی موڈ میں ہے ورنہ یہ فقرہ بولنے پر سر پھٹ بھی سکتا تھا اور پھوٹ بھی سکتا تھا۔ اجیہ نے فقط ایک لمحے کو اسے گھورا تھا پھر رونے کا شغل جاری رکھا۔

"غلطی انسان سے ہی ہوتی ہے میری بے وقوف زوجہ محترمہ! ابھی یقیناً" تمہارا آخری وقت تو آیا نہیں توبہ کا دروازہ کھلا ہے۔ تم نے جو کچھ بھی الٹا سیدھا بولا یا سوچا اس کے لیے توبہ کرو اور آئندہ کے لیے ایسا کچھ بھی بولنے یا سوچنے سے پرہیز کرو اور ہاں میری شان میں بھی جو گستاخانہ کلمات ادا کرتی رہتی ہو ان کے لیے الگ سے توبہ کرو۔ شوہر کی نافرمان بیویاں جنت میں داخلے کے لیے۔"

عون جانے کیا کچھ بولے جارہا تھا، لیکن اس نے یقیناً" اجیہ کا مسئلہ سمجھ بھی لیا تھا اور اس کا حل بھی بتا دیا تھا۔

"توبہ، ہاں یقیناً" توبہ ہی رب کو راضی کرنے کا بہترین طریقہ تھا۔ خالی خولی شکر کرتے ہوئے جو احساس شرمندگی حاوی ہورہا تھا پہلے سچے دل سے توبہ ضروری تھی پھر اللہ کا شکر ادا کرنا تھا جس نے غنیہ آپی کو اتنا بہترین بر عطا کیا تھا۔ دور بیٹھی بہن کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اجیہ کے لبوں پر مدھری مسکان بکھر گئی تھی۔

"واہ "دھوپ میں بارش" ہوگئی۔" اس کے رونے اور پھر ہنسنے کے لیے عون نے مسکراتے ہوئے ایک شعر کا حوالہ دیا تھا۔ اجیہ اب کھل کر ہنس پڑی تھی۔ اسے قطعاً" علم نہیں تھا کہ وہ میرج ہال میں موجود قدرے فاصلے پر بیٹھی کسی اور ہستی کی نگاہوں کی زد میں ہے۔

"خدیجہ اور ظہیر کی بیٹیوں کے نصیب بہت ہی زور آور ہیں۔" یہ عشرت بیگم تھیں جو ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن مدحت سے مخاطب تھیں۔ ان کے ساتھ ماہین بھی بیٹھی تھی جو بہت قیمتی اور خوب صورت لباس زیب تن کیے ہوئی تھی۔ سلیقے سے کیے گئے میک اپ میں اس کا حسن دو آتشہ ہورہا تھا، لیکن آج اس کے چہرے کی چمک اور لہجے کی کھنک مفقود تھی۔

"خدیجہ باجی اور ظہیر بھائی نے اپنی بچیوں کی تربیت بھی بہت اچھی کی ہے۔" مدحت بہن کے چہرے کے بگڑے زاویوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے رسانیت سے بولی تھیں۔

"پتا نہیں خدیجہ نے کیا گھول کر پلا دیا ہے تمہیں۔ تمہارے منہ سے سوائے اس کی تعریف کے کچھ نہیں نکلتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم میری چھوٹی بہن ہو۔ خدیجہ زیادہ سگی لگتی ہے تمہاری۔" توقع کے عین

مطابق عشرت بیگم بہن پر چڑھ دوڑی تھیں۔ مدحت نے افسوس سے بہن کو دیکھا۔

"کیسا ہیرا داماد ڈھونڈ کر دیا ہے خدیجہ کو۔ لڑکا ساتھ ہی رکھے گا نا غنیہ کو۔ ایسے شاندار تو ان آرمی والوں کو گھر ملتے ہیں۔ ٹھاٹ سے رہے گی غنیہ۔ ایک میری بچی ہے۔ سسرال بے شک مختصر ہے، لیکن سسرال کا عذاب سر پر مسلط تو ہے نا۔ نہ دن کا سکون نہ رات کا چین۔ کیا تھا جو تم غنیہ کے بجائے ماہین کا رشتہ اس جگہ کروا دیتیں۔" عشرت بیگم کا قلق زبان پر آیا۔

"آپا! غلط بیانی تو نہ کریں، ذرا یاد کریں۔ سب سے پہلے میں نے عثمان کے لیے ماہین کا رشتہ ہی مانگا تھا۔" مدحت نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے بہن کو یاد دلایا۔

"وہ تم نے رشتہ مانگا تھا؟ بس سرسری سی بات کی تھی۔" عشرت بیگم نے خفگی سے بہن کو گھورا۔

"تو آپ نے میری سرسری بات کا کیا جواب دیا تھا۔ نہ بابا۔ ابا جی نے جو غلطی کرلی وہ میں نہ دہراؤں گی۔ مجھے مولویوں کے خاندان میں بیٹی نہیں بیاہنی۔ تمہارا حشر ہمارے سامنے ہے۔ چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تھی۔ سسرال کا ایسا رنگ چڑھا کہ اتر کر نہ دیا۔ اتنی دقیانوسی لگتی ہو ہماری بہن تو کہیں سے لگتی ہی نہیں۔" مدحت نے بہن کو ان کے سارے الفاظ یاد دلائے تھے۔ عشرت بیگم سے کوئی بات نہ بن پڑی وہ محض انہیں تیکھی نگاہوں سے گھورتی رہ گئیں۔

"ماہین میری بھانجی ہے آپا! مجھے جی جان سے عزیز ہے یقین کریں جب میرے جیٹھ نے عثمان کا رشتہ ڈھونڈنے کی ذمہ داری میرے کندھوں پر ڈالی تو میرے ذہن میں سب سے پہلے ماہین کا نام آیا تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ہمارے اور آپ کے ماحول میں بہت فرق ہے، لیکن میں نے سوچا کہ میں نے بھی تو اپنے آپ کو ان کے رنگ میں ڈھال لیا اور لڑکیوں کی ذات میں بہت لچک ہوتی ہے وہ ہر طرح کے ماحول میں ایڈجسٹ کرلیتی ہیں پھر عثمان جیسا سلجھا ہوا بندہ، ماہین یقیناً اس کے ساتھ خوش رہتی، لیکن خیر اب تو یہ باتیں کرنا ہی فضول ہیں۔ اللہ ماہین کو اپنے گھر میں آباد، سلامت رکھے اور عثمان اور غنیہ کی جوڑی قائم رہے۔"

"لڑکے کے بارے میں بتا ہی دیتیں کہ ایسا اچھا خوب صورت لڑکا ہے، پھر آرمی آفیسر، میں ایک بار لڑکا دیکھ لیتی پھر ہو سکتا ہے میں ماہین کی بات یہیں طے کردیتی۔" عشرت بیگم کا قلق جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مدحت کو ان کی باتیں سن کر افسوس ہونے لگا۔

"آپا! آپ کو بتایا تھا کہ لڑکا میجر ہے آپ نے پھر بھی کوئی دلچسپی نہیں لی۔" مدحت نے انہیں دھیرے سے یاد دلایا۔

"ارے، تمہارے سسرال میں تو سب میجر ہیں۔ سسر تمہارا صوبیدار میجر تھا۔ اسے سب میجر صاحب میجر صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ جیٹھ تمہارا صوبیدار میجر بن کر ریٹائر ہوا مجھے کیا پتا تھا کہ لڑکا "اصلی" میجر ہے۔" عشرت بیگم مزید پچھتاوے کی لپیٹ میں تھیں، مدحت نے لمبی سانس بھری۔

"میں اب آپ کو کیا بتاؤں آپا! سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے انکار کے باوجود میں ایک بار آپ سے ملنے آرہی تھی، میں نے سوچا ٹیلی فون پر میں آپ کو قائل نہ کرپاؤں گی وہاں جاکر آپ کو اس رشتے کے پلس پوائنٹ گنواؤں گی، لیکن آپ نے اتنا اچانک ماہین کا رشتہ طے کردیا کہ میرا ارادہ ارادہ ہی رہ گیا۔ مجھے ماہین کی شادی کا کارڈ موصول ہوگیا۔ میرا آنا ہوا تو سہی مگر مقصد بدل گیا۔ شاید میرے توسط سے عثمان کا رشتہ غنیہ سے طے ہونا تھا۔ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں آپا اور یقین کریں۔ عثمان جس مزاج کا لڑکا ہے اس کا صحیح جوڑ غنیہ ہی ہے۔ میں بھی اپنے سسرال والوں کے آگے سرخرو ہو گئی۔ انہیں جیسی لڑکی کی خواہش تھی وہ میں نے ڈھونڈ دی۔"

"اچھا امی چھوڑیں۔ کیا فضول کی باتیں لے بیٹھی ہیں جو ہونا تھا ہو گیا۔" ماہین نے اکتا کر ماں کو ٹوکا۔

"تم کیوں اتنی مضمحل اور بجھی بجھی لگ رہی ہو ماہین! طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری۔" مدحت نے پیار سے بھانجی کو دیکھا۔

"شکر ہے بھانجی کا بھی خیال آگیا۔" عشرت بیگم نے طنز کیا۔ مدحت اس بار خاموش رہیں۔ بڑی بہن کی باتوں کا جواب دینا ان کے بس سے باہر تھا۔

"سوچا تھا مختصر سسرال ہے عیش کرے گی میری بچی، لیکن نہیں ہمارے ایسے نصیب کہاں۔ بوڑھی دادی ساس قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہے مگر نکتہ چینی کر کر کے میری ماہین کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔" عشرت بیگم کو کسی کے آگے تو دل کا غبار ہلکا کرنا تھا۔ سگی بہن سے زیادہ کس پر اعتماد کیا جاسکتا تھا۔ سو ساری باتوں پر مٹی ڈالتے ہوئے اس سے ماہین کی سسرال کے دکھڑے رونا شروع کردیے۔

"اب بندہ ماں سے بھی ٹیلی فون پر کھل کر بات نہ کرسکے بس یہ ہی کہا تھا ماہین نے کہ امی بڑھیا نے عاجز کر رکھا ہے، ارسلان نے سن لیا۔ اب بھلا بتاؤ۔ بندہ نوے سال کی بڑھیا کو بڑھیا نہ کہے تو کیا کہے ویسے ماہین کے آگے پیچھے پھرتا نہیں تھکتا، اس دن سے اینٹھا ہوا ہے۔ کہتا ہے۔ مجھے اپنی دادی جان سے بڑھ کر عزیز ہیں، میں ان کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔ ماہین کو رشتوں کا احترام کرنا آنا چاہیے۔" عشرت بیگم نے داماد کے لہجے کی نقل اتاری۔

"تو یہ کوئی بڑا ایشو تو نہیں۔ ماہین تم ارسلان سے ایکسکیوز کرلو اور آئندہ ایسی نوبت ہی نہ آنے دو۔" مدحت نے ماہین کو مخاطب کیا۔

"نہ، نہ کوئی ایکسکیوز کرنے کی ضرورت نہیں اور سر پر چڑھ جائے گا۔" عشرت بیگم نے بیٹی کو ٹوکا مدحت ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئیں دل ہی دل میں انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ بھانجی کی محبت میں وہ جو فیصلہ کرنے جارہی تھیں قدرت نے اسے پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچایا۔ عشرت بیگم جیسی ماں بیٹی کو سسرال میں رہنے کا صحیح ڈھنگ سکھا ہی نہ سکی تھیں اور عشرت بیگم اب دوبارہ اسٹیج کی طرف متوجہ تھیں۔ اگر وہ غنیہ کے لیے آیا ہوا ارسلان کا رشتہ کوشش کر کے ماہین کی طرف نہ موڑتیں تو ہو سکتا ہے، آج اس جگہ ان کی بیٹی بیٹھی ہوتی۔ انہوں نے جلد بازی کر کے اپنا ہی نقصان کرلیا تھا۔ عشرت بیگم کا قلق جانے کا نام نہ لے رہا تھا انہیں کون سمجھاتا کہ ارسلان اور ماہین کا جوڑ آسمانوں پر لکھا جاچکا تھا جس طرح غنیہ اور عثمان کا نصیب ایک دوسرے سے منسلک تھا۔ انہوں نے چالاکی اور ہیرا پھیری سے غنیہ کا نصیب چرانے کی کوشش کی تھی، اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہیں ان کے نامۂ اعمال میں یہ چالاکی تو "یقیناً" درج ہوتی ہوگی، لیکن کاتب تقدیر کے فیصلے چالاکیوں سے بدلے نہیں جاسکتے۔ ایسا کر کے انسان صرف خود کو فریب دے سکتا ہے۔ کوئی کسی کا نصیب چھیننے پر قادر نہیں۔

☼

سگوفی علی بٹ

پہلی ٹھوکر

"اب نکل بھی چکو۔" آذر نے انہیں ڈیوڑھی میں پھر رکتے دیکھ کر جھنجلا کر کہا۔

"آپ چلیں۔ گاڑی اسٹارٹ کریں۔ میں آرہی ہوں۔" سویرا نے شوہر کی جھنجلاہٹ کا نوٹس لیے بغیر مسکراتے ہوئے اسے باہر دھکیل دیا۔

"دو منٹ میں آجاؤ۔" وہ جاتے ہوئے بھی اسے تنبیہہ کرگیا۔

آذر کے نکلتے ہی سویرا نے ہینڈ بیگ کندھے سے اتارا۔ زپ کھول کر اس میں سے اپنا مہنگا موبائل نکالا اور دروازہ بند کرنے کے لیے منتظر کھڑی زونیو کو زبردستی پکڑا دیا۔

"ریحان کی کال دو بجے آئے گی۔ سن لینا۔ میں نے اسے ایس ایم ایس کردیا ہے۔" اس نے جلدی جلدی اسے ساری بات سمجھادی۔

"مگر امی، ابو جان آگئے تو....." اس نئی افتاد پہ تو زونیو کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اسے پہلا خیال امی، ابو کا ہی آیا تھا، جو ماہانہ چیک اپ کے لیے ڈاکٹر کے پاس گئے تھے۔

"بے وقوف! ڈاکٹر زمانی دو بجے بیٹھتے ہیں اور ابھی دو بجنے میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ امی، ابو جان کی باری آنے اور میڈیسن لے کر گھر آنے تک کافی ٹائم لگے گا۔ تب تک تم تسلی سے ریحان سے دل کی باتیں کرلینا۔" آخری جملہ سویرا نے آنکھ دبا کر بڑی مٹھاس سے ادا کیا۔

"بھیا کا فون آیا تو....." اس نے جلد ہی دوسرا نقطہ اٹھایا۔

اس کی زبان خشک ہورہی تھی۔ وہ موبائل رکھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ سویرا اس کی بھابھی بلاوجہ مصیبت کی گھنٹی اس کے گلے میں باندھ رہی تھی۔ باہر آذر ہارن پہ ہاتھ رکھ کے اٹھانا جیسے بھول گیا تھا۔

"کہہ دینا بھابھی موبائل گھر بھول گئی ہیں۔"

سویرا نے اسے نیا بہانہ بتا کر اس کی ننھی سی ناک دبائی۔ پھر مزید سنے اور رکے بغیر یہ جا وہ جا۔ جبکہ وہ دروازہ اچھی طرح بند کرکے، دھڑکتے دل سے موبائل کو گھورے جارہی تھی۔ جس ہاتھ میں موبائل پکڑا تھا۔ وہ ٹھنڈا یخ ہوگیا تھا۔

سویرا کو تفصیل سے ہی بات کرنے کی عادت تھی۔ چاہے ساس، سسر ہوں یا تھکا ماندا آفس سے لوٹا شوہر، موبائل پر کال پیکج ہو یا نہ ہو۔ سات مہینوں میں اتنا وہ اسے جان ہی گئی تھی۔ اب بھی اس نے یقیناً" ریحان کو ساری تفصیل بتائی ہوگی کہ امی، ابو جان ڈاکٹر کے پاس گئے ہیں۔ میں آذر کے ساتھ میکے جارہی ہوں اور زونیو گھر میں اکیلی ہوگی۔ اب اگر وہ موبائل آف کردیتی تو یہ اس کے حق میں بہتر بھی ہوسکتا تھا اور غلط بھی۔ وہ معاملہ کے ہر پہلو پہ غور کرتی سر پکڑ کر صوفہ پہ گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ موبائل کو اس نے سائیڈ ٹیبل پہ ڈال دیا۔

☼ ☼ ☼

سویرا اس کی اکلوتی بھابھی تھی۔ اس کی اور آذر کی شادی ارینج میرج بھی تھی اور لو میرج بھی۔ پسند تو

اسے آذر کے والدین نے ہی کیا تھا۔ محبت انہوں نے منگنی اور شادی کے درمیانی عرصہ میں ایک دوسرے کو کال کرکے، انٹرنیٹ اور کبھی کبھار ڈیٹ مار کے کی تھی۔

سویرا اکیسویں صدی کی تیز طرار اور جدید ٹیکنالوجی سے شدید متاثر تھی۔ زونیو پہ تو اس نے آثار قدیمہ کا ٹیگ لگایا ہوا تھا۔ اکثر مذاق میں وہ اسے چھیڑ بھی دیا کرتی تھی۔

زونیو کی منگنی ان کی شادی پہ ہی ابو جان کے دوست کے بیٹے سے ہوگئی تھی۔ جو کراچی میں سوفٹ ویئر انجینئر تھا۔ وہ ہر پندرہ بیس دن بعد آذر کو کال کرتا، کیونکہ وہ آذر کا دوست رہ چکا تھا تو سویرا سے بھی "ہائے ہیلو" ہوجاتی۔ اب یہ "ہائے ہیلو" بے تکلفی میں بدل چکی تھی اور اس بے تکلفی میں بھی زیادہ ہاتھ سویرا ـــــ ہی کا تھا۔ وہ بات کم کرتی، ہنستی زیادہ تھی۔ جملہ بنانے اور دلائل دینے میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ جبکہ سسرال والوں کا معاملہ برعکس تھا۔ ساس اس عمر میں بھی پردہ کرتی تھیں۔ سسر اور شوہر

بھی نمازی، پرہیزگار بندے تھے۔ زونیرہ بھی برقعہ اور حجاب پہنتی تھی۔ ان کی پردے کی اپنی روایات تھیں۔ جن سے وہ ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔

سویرا نے تو دوپٹا ٹھیک سے اوڑھنا بھی، ساس کے گھورنے اور سسر کے ہنکارے بھرنے پہ سیکھا تھا۔ البتہ حجاب وہ ابھی بھی نہیں کرتی تھی۔

ریحان نے اپنے والدین سے اس گھرانے کی شرافت کے بہت قصے سن رکھے تھے۔ اس لیے اس نے زونیرہ کو دیکھے بغیر ہی منگنی کے لیے ہاں کردی تھی۔ اب سویرا کی طویل گفتگو اور بار بار زونیرہ کے ذکر نے اسے دل کی بات کردینے پہ اکسایا۔ اس نے سویرا سے زونیرہ سے ٹیلی فون پہ گفتگو کرنے کی خواہش کا اظہار کردیا اور سویرا نے ذرا بھی اعتراض کیے بغیر اس کی یہ خواہش من وعن اپنی اکلوتی نند تک پہنچادی۔ زونیرہ تو یہ سنتے ہی یوں اچھلی۔ جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔

"بھابھی! خدا کا خوف کریں۔" اس کی آنکھیں پھٹی جارہی تھیں۔

"کیوں اس میں کیا برائی ہے منگیتر ہے وہ تمہارا۔" سویرا نے ناک پر سے مکھی اڑائی۔

"منگیتر ہی ہے نا... شوہر تو نہیں۔ میں ہرگز بات نہیں کروں گی۔ امی، ابو کو پتا چل گیا تو بہت دکھ ہوگا انہیں۔"

اس نے قدرے افسوس سے کہا۔ اسے اپنی بھابھی سے ایسی بے وقوفی کی امید ہرگز نہیں تھی۔ جبکہ وہ اسے "آثار قدیمہ" کہتی تھیں۔

"نہیں بتائے گا کون؟" سویرا نے سموسوں کی پلیٹ صاف کرتے ہوئے استفسار کیا۔

"جو بھی ہے۔ میرا ضمیر نہیں مانتا۔ پھر جس شخص کو میں جانتی نہیں، کبھی ملی نہیں، میں اس سے کیا باتیں کروں گی۔"

اس نے اپنے غصے کو دباتے صاف انکار کردیا۔ وہ تو سویرا بھابھی کی سوچ اور جرات پہ حیران ہورہی تھی۔

"میری تو یہ سوچ ہے کہ پیرنٹس نے جس شخص کو آپ کے پلے باندھ دیا ہے۔ اب ہماری جنریشن کو جدید ٹیکنالوجی سے فائدہ اٹھا کر اس شخص کو سمجھنا اور انڈر اسٹینڈنگ ڈویلپ کرنا چاہیے۔ تاکہ فیوچر میں کچھ آسانی رہے۔" سویرا بھابھی نے تو سیاست والوں کی طرح پوری تقریر کر ڈالی۔

"جسٹ سپوز، ریحان میرے معیار پہ پورا نہ اترے تو میں انہیں چھوڑ دوں؟" زونیرہ نے جرح کی۔

"آف کورس۔" سویرا بھابھی نے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ زونیرہ کا تو دل ہی دہل گیا۔

"پیرنٹس کو کیا جواب دوں گی؟"

"ڈونٹ وری! میں ہوں نا... خود ہی سنبھال لوں گی۔" سمیرا کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

زونیرہ کا دل کانپ کے رہ گیا۔ بھابھی تو بہت آگے جانے کو بھی تیار تھیں۔ ریحان اتنا اچھا تو تھا کہ اس کے والدین نے اس کے لیے پسند کیا تھا۔ پھر وہ اپنے والدین کی فرماں بردار بیٹی، کیسے ان کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے کا باعث بن سکتی تھی۔

اس نے بھابھی سے ان کی شادی سے قبل آذر کو فون کرنے اور باہر ملنے ملانے کے قصے سن رکھے تھے۔ وہ اسے اکثر بڑے مزے لے لے کر سب بتاتی۔ تب بھی زونیرہ کو اس کا انداز ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ اب وہ اسے بھی یہی طریقہ اپنانے کی ترغیب دے رہی تھی۔

وہ سویرا کے جس عمل کو ناپسند کرتی آئی تھی۔ اسے اپنے لیے کیسے پسند کرسکتی تھی۔ سویرا اسے ریحان کی ہر فون کال پر اس کی بے تابیوں اور خوابوں کے قصے سناتی رہتی تھی۔ زونیرہ کو یہ سب اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ اس کی بھابھی تھی۔ وہ اس کے شرم و لحاظ میں یہ کہہ ہی نہ پائی کہ آپ ان سے اتنی کھلی گفتگو نہ کیا کریں۔

سویرا بھابھی کے بارہا اصرار اور ناراضی پہ بھی اس نے کبھی ریحان سے بات کرنے کی ہامی نہ بھری۔ کیونکہ وہ اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ نہ ہی اکلوتی بھابھی سے بگاڑنا۔ اس نے کبھی اسے سختی سے جواب دینے کی جسارت نہ کی۔

وجہ تھی کہ سویرا نے اس کی خاموشی کا ناجائز فائدہ اٹھا کر آج موبائل اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

پورے دو بج گئے تھے۔ موبائل کی بیل ہوئی تو زونیرہ اپنے خیالات سے بری طرح چونکی۔ زونیرہ کا دل اسکرین پہ "ریحان کالنگ" چمکتا دیکھ کر دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ پیر سرد پڑنے لگے۔ سویرا اکیسویں صدی کی جدید ٹیکنالوجی سے ناجائز فائدہ اٹھانے والی، زونیرہ کی نظروں میں باپ کی شرافت اور ماں کا اس عمر میں بھی پردہ کرنا، خود اس نے باشعور ہوتے ہی حجاب شروع کردیا تھا۔ پورے اکیس برس اپنے والدین کی نصیحتوں کی تقلید کرنے والی، اب سویرا کی سوچ اور روش کیسے اپنا سکتی تھی۔

وہ کل کو اپنے والدین اور اپنے ضمیر کے سامنے اپنی غلطیوں کا کیا جواز پیش کرے گی۔ سویرا کے کہنے میں آکر اس نے اپنے صاف ستھرے کردار میں جھول پیدا کرلیا۔

امی جان کو سویرا کی حرکات اور عادات سے کتنا اختلاف رہتا تھا۔ وہ گھر اور اکلوتے بیٹے کے سکون کی خاطر بہت سی باتوں کو درگزر کرجاتیں۔ وہ تو ماں کے رویے اور ماتھے کے بلوں کو گن سکتی تھی۔

بیل مسلسل ہورہی تھی۔ اس نے بٹن دبا کر موبائل آف کرکے سائیڈ دراز میں ڈال دیا۔ یہ اس کی سوچ اور فیصلہ تھا۔

☼ ☼ ☼

آذر، سویرا کو لنچ ٹائم پر ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر میکے چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اسے باہر ہی اتار کر چلا گیا۔

"امی! آنکھیں کھولیں۔ پلیز امی! آنکھیں تو کھولیں۔" اس نے برآمدے میں چھوٹی بہن نوریہ کے چلانے کی آواز سنی تو بھاگتی ہوئی ماں کے کمرے میں پہنچی۔

"کیا ہوا امی جان کو؟"

امی کارپٹ پہ بے ہوش گری ہوئی تھیں۔ روتی چلاتی نوریہ کو بہن کو دیکھ کر ڈھارس ہوئی۔ بھائی اور باپ گھر پہ نہیں تھے۔ وہ اکیلی پریشان تھی۔

سویرا الٹے پاؤں باہر بھاگی۔ ہمسائیوں سے مدد درکار تھی۔ ڈاکٹر آیا تو پتا چلا کہ شائستہ بیگم کا بی پی بہت ہائی ہوگیا تھا۔ بروقت ڈاکٹر کے پہنچ جانے سے نروس بریک ڈاؤن ہونے سے بچ گیا تھا۔ اب ان کی طبیعت خطرے سے باہر تھی اور وہ دواؤں کے زیر اثر پرسکون نیند سو رہی تھیں۔

"نوریہ! ڈاکٹر بتا رہے تھے "انہیں یقیناً" کوئی بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ حالت ہوئی۔" اس نے گھر واپسی سے قبل بہن سے استفسار کیا۔ نوریہ سر جھکائے رونے لگی۔ سویرا کھٹک گئی۔

"کیا بات ہے نوریہ! پلیز مجھے بتاؤ۔ مجھے شک ہے کہ تم کچھ چھپا رہی ہو۔" سویرا نے اسے بازو سے جکڑ کر پوچھا۔

"وہ... وہ منیب کے گھر والوں نے رشتے سے انکار کردیا ہے۔" اس نے آنسوؤں کے درمیان اٹکتے ہوئے اسے وجہ بتائی۔

منیب اس کا منگیتر تھا۔ جو انگلینڈ میں جاب کے سلسلے میں مقیم تھا۔ ان کی ڈیڑھ سال قبل منگنی ہوئی تھی اور چھ ماہ بعد شادی طے تھی۔

"کک... کیوں۔" سویرا کی آواز بھی حلق میں اٹک کر رہ گئی۔

"وہ منیب کا ایک دوست پاکستان آیا ہے۔ منیب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ میرے لیے کیا بھجوائے تو میں نے ہینڈ بیگ، پرفیومز، شیمپو اور گلاسز کی فرمائش کردی۔ سب چیزیں منیب کے گھر والوں کو مل گئیں۔ منیب نے کسی پرابلم کی وجہ سے اس ماہ انہیں خرچا نہیں بھجوایا تو وہ لوگ اس میں سارا میرا قصور نکال رہے ہیں کہ ابھی انہوں نے منیب کے بیرون ملک جاتے ہوئے رشتے داروں سے لیا ہوا قرضہ بھی واپس نہیں کیا اور پچھلے ماہ ہی وہ مجھے دس ہزار عیدی دے کر گئے تھے اور اس ماہ پھر میں نے ہزاروں خرچ کروادیے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو ابھی سے اپنی منگیتر کا اتنا فرماں بردار ہے۔ کل کو وہ جب اس کی بیوی بنے گی تو

وہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ انہیں اتنی فضول خرچ بہو بھی نہیں چاہیے۔ جو منہ پھاڑ پھاڑ کے ان کے بیٹے سے یوں فرمائشیں کرتی ہو۔"

نورہ نے روتے ہوئے ساری تفصیل بتائی۔ سویرا ہکا بکا رہ گئی۔

"انہوں نے امی کو فون پہ بہت برا بھلا کہا۔ ان کی تربیت پہ انگلی بھی اٹھائی۔ امی تو اسی وقت گر گئیں۔ اب وہ ہوش میں آئیں گی تو میں ان کی نظروں کا کیسے سامنا کروں گی۔ میں نے ان کے اعتماد کو زک پہنچائی ہے۔" اس کا رونا منگنی ٹوٹنے پر نہیں' ماں کے اعتماد کو توڑنے پہ تھا۔

سویرا کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ زونیو بھی تو یہی کہا کرتی ہے کہ وہ۔ "اپنے والدین کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچا سکتی۔" وہ اس کی بات کو یوں ہی ہنسی میں اڑا دیا کرتی تھی۔ کبھی گہرائی میں نہ جھانکا۔ اب اپنی ماں' بہن پہ گزری تو اسے تکلیف ہو رہی تھی۔

"سویرا آپی! دنیا کتنی دوغلی ہے۔ مجھے منگنی کے بعد موبائل بھی منیب نے ہی انگلینڈ سے بھجوایا تھا۔ تب اس کی بہنیں خود موبائل اور سم مجھے گفٹ کر کے گئی تھیں۔ اب میں نے اپنی مرضی سے کچھ منگوالیا تو انہیں تکلیف ہو رہی ہے۔"

"مزمل کدھر ہے؟" وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"بھائی تو امی کی میڈیسنز لینے گئے ہیں۔" روتی نورہ نے حیرانی سے بہن کو دیکھا۔

"نورہ! میں کل صبح پھر آجاؤں گی۔ ابھی مجھے بہت ضروری کام یاد آگیا۔" اس نے اٹھ کر پھرتی سے اپنا ہینڈ بیگ کندھے پہ ڈالا۔

"آپ کو آذر بھائی لینے آئیں گے۔" نورہ نے بہن کو یاد دلایا۔

"میں انہیں گھر جا کے انفارم کر دوں گی۔ تم امی کا خیال رکھنا۔ میں صبح جلدی آجاؤں گی۔" وہ نورہ کو حیران و پریشان چھوڑ کے باہر بھاگی۔ قریبی مین روڈ سے ہی اسے ٹیکسی مل گئی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس نے بیگ سے گلاسز نکال کے آنکھوں پہ ٹکالیے۔

اس کی آنکھوں میں پشیمانی' دکھ اور ندامت کے آنسو تھے۔ جنہیں وہ چھپا لینا چاہتی تھی۔ وہ دلائل دینے میں ماہر تھی۔ لیکن آج اس کو نہ کوئی تمہید نہ ہی الفاظ کی ترتیب درست کرنی تھی۔ سیدھے سبھاؤ زونیو سے معافی مانگنی تھی۔ وہ اسے ورغلاتی آئی تھی اور ورغلانے کا کام شیطان کے سپرد ہے۔ ریحان کے باپ نے اس خاندان کی شرافت اور زونیو کے باپردہ رہنے سے متاثر ہو کر ہی اپنے لائق بیٹے کا رشتہ کیا تھا اور وہ اس خاندان کی عزت اور نیک نامی کو ڈبونے کا باعث بن رہی تھی۔ وہ اپنے کیے پہ بے حد نادم تھی۔ وہ روتے ہوئے اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ زونیو نے ریحان سے ہرگز بات نہ کی ہو۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ریحان کو فون کر کے بتائے گی کہ وہ کتنا خوش قسمت ہے کہ زونیو جیسی لڑکی اس کا نصیب ہے اور وہ آئندہ کبھی زونیو کو الٹی سیدھی پٹیاں نہیں پڑھائے گی۔

دوسرا کام اسے نورہ کے سسرال جا کے کرنا تھا۔ بچوں سے غلطیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ بڑے معاف کر دیتے ہیں۔ وہ بھی اپنے' بہن کے کیے کی معافی مانگے گی۔ اس نے کسی کی بیٹی کے لیے اچھا سوچا تھا۔ اللہ یقیناً" اس کی بہن کے حق میں بھی اچھا ہی کرے گا۔ اس نے پہلی ٹھوکر پہ ہی سیدھی راہ پکڑ لی تھی۔



نگہت سیما

دسمبر کے آنسو

"احمد رضا! تم کہاں چلے گئے تھے۔ ہم نے بہت ڈھونڈا تمہیں۔ تمہارے ابو کے ساتھ میں ہر اس جگہ گیا جہاں تمہارے ملنے کا امکان تھا۔"

ابراہیم احمد رضا کے سامنے اس کے بیڈ روم میں بیٹھا تھا۔ ثمینہ حیدر نے اسے ابراہیم کے ساتھ آتے بے حد حیرت سے دیکھا تھا۔

"سر! آپ کہاں چلے گئے تھے۔ گاڑی کی چابی بھی

مکمل ناول



یہاں ہی تھی اور آپ نے لباس بھی چینج نہیں کیا تھا۔"

"میں یوں ہی باہر واک کر رہا تھا۔" ثمینہ حیدر کی نظریں ابراہیم پر تھیں۔

"میرا دوست ہے' اچانک باہر روڈ پر نظر آ گیا۔ بہت عرصہ بعد ہم ملے ہیں۔" ثمینہ حیدر کی کھوجتی نظروں سے بچنے کے لیے وہ ابراہیم کے ساتھ اپنے بیڈ روم میں آگیا تھا۔ ثمینہ حیدر نے اتنی دیر میں بیڈ روم کی حالت درست کردی تھی۔ اب سب چیزیں اپنے اپنے مقام پر تھیں۔

"پتا ہے احمد رضا! میں تمہارے ابو سے بہت شرمندہ تھا۔ وہ جب آتے میں ان سے نظریں نہ ملا پاتا کہ یہ میں تھا جو تمہیں اسماعیل کے پاس لے کر گیا تھا۔ پھر انہوں نے میرے پاس آنا چھوڑ دیا۔ لیکن میں نے انہیں کئی بار یونیورسٹی میں دیکھا۔ وہ لڑکوں کو روک کر تمہارے متعلق پوچھ رہے ہوتے تھے۔"

احمد رضا خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔

"یار! تم اتنے ذہین' اتنے عقل مند تھے۔ پھر کیوں پھنس گئے۔ اس کے جال میں۔۔۔ کیا تمہیں نہیں لگا تھا کہ وہ شخص جھوٹا ہے۔ کذاب۔" ابراہیم کے لہجے میں تاسف تھا۔

"جب تقدیر کا پہیہ الٹا چل پڑے تو عقل خبط ہو جاتی ہے۔"

"تمہارے ابو کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔

دیوانوں کی طرح تمہیں ڈھونڈتے پھرتے تھے اور میرا احساس جرم کئی بار مجھے اکیلے اس کوٹھی میں لے کر گیا جہاں پہلی بار تم میرے ساتھ گئے تھے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا' خالی تھی۔ آخری بار جب میں وہاں گیا تو ایک وکیل صاحب کی فیملی وہاں رہ رہی تھی۔"

"ابراہیم! کیا تم جانتے ہو' ابو کہاں ہیں آج کل۔" اس نے ابراہیم کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"کیا تم۔۔۔ میرا مطلب ہے' تمہیں نہیں معلوم وہ کہاں ہیں اور کیا تمہاری اس وقت سے اب تک ان سے ملاقات نہیں ہوئی؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے اپنے آنسو اندر اتارے۔ "انہوں نے سمن آباد والا گھر بیچ دیا اور کہیں چلے گئے۔ بہت ڈھونڈا۔ محلے میں کسی کو نہیں پتا' وہ کہاں گئے ہیں۔ ابراہیم! اگر تمہیں پتا ہے تو پلیز مجھے بتا دو۔"

"نہیں۔۔۔" ابراہیم نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں جب آخری بار ان سے ملا تھا تو انہوں نے اس طرح کی کوئی بات نہیں کی تھی کہ ان کا ارادہ کہیں جانے کا ہے۔ بلکہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب بھی مجھے تمہارا پتا چلے انہیں بتاؤں۔ فون کردوں' خود انہوں نے ایک' دو بار فون کر کے پوچھا بھی تھا۔ پھر میں سعودیہ چلا گیا۔ تمہیں پتا ہے نا' وہ میرا فائنل ایر تھا۔ مجھے فوراً" ہی جاب مل گئی تھی۔ پھر وہاں سے فرم نے مجھے کینیڈا بھیج دیا۔ چند دن پہلے ہی وطن آیا ہوں۔ ادھر کسی دوست سے ملنے آیا تھا۔"

"ابراہیم!" اس نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔ "میری مدد کرو پلیز۔۔۔ میں خود سے انہیں تلاش نہیں کر سکتا۔ تھک گیا ہوں۔ میں ایک بار ابو اور امی سے مل کر ان سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ میں نے ان کا دل دکھایا۔ میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں نے وہ سب نہیں کہا تھا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری نبی ہونے پر یقین رکھتا ہوں۔ میں ایک ایسے جال میں پھنس گیا ہوں' جس سے نکل نہیں سکتا۔"

"کیسا جال؟" ابراہیم نے پوچھا تو بیڈ روم کے باہر دروازے سے لگی کھڑی ثمینہ حیدر چونکی۔

"کچھ نہیں جانتا ابراہیم! یوں لگتا ہے جیسے اسماعیل کذاب کے مرنے کے بعد بھی میں اس کی قید میں ہوں۔"

باہر کھڑی ثمینہ حیدر کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تمہیں اپنا یقین پختہ رکھنا چاہیے احمد رضا! اور یہ یقین بھی کہ وہ ایک جھوٹا شخص تھا۔"

"میں اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں ابراہیم' لیکن خیر۔۔۔ تم یہ بتاؤ' میری مدد کرو گے؟"

"ہاں۔۔۔ میں پوری کوشش کروں گا' شاید اس طرح میں اس غلطی کا کفارہ ادا کرسکوں جو تمہیں وہاں لے جاکر مجھ سے سرزد ہوئی۔"

"تھینک یو ابراہیم! تمہیں دیکھ کر پتا نہیں کیوں مجھے امید ہو چلی ہے کہ جس طرح اچانک تم مل گئے ہو اسی طرح اچانک کسی روز وہ سب بھی مل جائیں گے۔"

"تم اپنی امید ہمیشہ زندہ رکھنا' مایوس مت ہونا۔ ان شاء اللہ ایک روز وہ تمہیں ضرور ملیں گے۔" ابراہیم نے بے حد خلوص سے اس کا کندھا تھپکا اور کھڑا ہو گیا۔

"میں ابھی تقریباً" دو ماہ تک یہاں ہوں' پھر ملاقات ہوتی رہے گی' ان شاء اللہ۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے ابراہیم! کسی روز پورا ایک دن میرے ساتھ Spend کرو۔ کسی اپنے سے بات کرنے کو ترس گیا ہوں یار۔"

"ٹھیک۔۔۔ کسی روز پلان بنا لیتے ہیں۔ دراصل گھر میں میری اور میری سسٹر شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں' جیسے ہی وقت ملتا ہے' میں آتا ہوں۔"

"تھینک یو ابراہیم!" احمد رضا بھی کھڑا ہو گیا۔ تب ہی اسے لگا جیسے زمین اس کے پاؤں کے نیچے کانپی ہو۔ پھر اسے جھٹکا لگا اور اس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔

"زلزلہ۔۔۔" ابراہیم کے لبوں سے نکلا۔

وہ دونوں بھاگ کر لان میں آئے تھے۔ آس پاس کے گھروں کے گیٹ بھی کھل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد زلزلے کے جھٹکے رک گئے تو ابراہیم دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ لیکن بعض وعدے صرف لفظوں میں ہی دھرے رہ جاتے ہیں۔ احمد رضا کی پھر کبھی ابراہیم سے ملاقات نہیں ہوئی۔

☼ ☼ ☼

اس رات وہ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا زلزلے کی خبریں سن رہا تھا۔ سب چینل ہی زلزلے کے متعلق اطلاعات دے رہے تھے۔ لاہور میں تو کچھ جھٹکے لگے تھے۔ لیکن شمالی علاقہ جات مظفر آباد اور کئی دوسرے علاقوں کی خبریں مسلسل آرہی تھیں۔ اسلام آباد کی خبر بھی آچکی تھی اور خوف ناک خبریں دل دہلائے دے رہی تھیں۔

فلاں اسکول میں اتنے بچے دب گئے۔

فلاں گاؤں پورا کا پورا زمین میں دھنس گیا۔ اتنے مکانات' اتنی عمارتیں' ہوٹلز' کالج۔

اینکرز کوئٹہ کے زلزلے کی باتیں کر رہے تھے۔ شاید اس زلزلے میں بھی اتنی ہی تباہی ہوئی تھی یا اس سے کہیں زیادہ۔ ابھی کچھ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا۔

"کاش میں بھی وہاں کہیں ہوتا اور دب جاتا ملبے تلے۔"

ٹی وی دیکھتے دیکھتے وہ وہاں ہی ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر سو گیا تھا۔ جب الوینا کے فون سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

اور اب رات کے اس پہر الوینا نہ جانے کیا کہہ رہی تھی' اس نے بمشکل آنکھیں کھولی تھیں۔ "ہیلو الوینا۔"

"سنو۔۔۔ صبح تمہیں زلزلہ زدہ علاقوں کی طرف جانا ہے۔"

"میں وہاں جاکر کیا کروں گا الوینا۔"

"مدد۔۔۔ ان لوگوں کی مدد' جو بے چارے ملبے تلے دبے ہیں۔ انسان کی پہچان ایسے ہی مشکل لمحوں میں ہوتی ہے ڈیر۔ تمہارے ہم وطنوں کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"اچھا۔۔۔ میرے ہم وطنوں سے تمہیں کب سے ہمدردی ہو گئی؟" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

"مجھے ہمیشہ سے ہی تمہارے ہم وطنوں سے ہمدردی ہے۔ لیکن افسوس تم نہیں جانتے۔"

"لیکن مجھے جانا کہاں ہے' کیا کرنا ہے' زلزلہ زدہ علاقے تو بے شمار ہیں۔" اس نے ٹی وی پر نظر ڈالی جو ابھی بھی چل رہا تھا۔

"میں نہ تو کوئی ڈاکٹر ہوں۔ نہ۔۔۔"

"رضاکار تو بن سکتے ہو۔ ملبے تلے دبے لوگوں کو نکالنے میں مدد دے سکتے ہو۔"

"لیکن میں وہاں جاؤں گا کیسے۔ پتا نہیں کوئی ذریعہ ہے وہاں جانے کا یا نہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ جنید تمہارے ساتھ جائے گا۔ صبح تمہیں راولپنڈی کی طرف جانا ہے۔ وہاں دو' تین دن قیام کرو گے۔ کہاں کس ہوٹل میں؟ جنید کو معلوم ہے۔ وہاں تم کو انتظار کرنا ہے۔ ریڈ کراس کی ایک ٹیم کا۔ وہ خود ہی تم سے رابطہ کرلیں گے اور تمہیں ان کے ساتھ شامل ہونا ہے۔ ان کی ٹیم کا حصہ بن کر ان کے ساتھ جانا ہے۔"

"ان لوگوں کی رسائی بھی کہاں کہاں ہے۔" اس نے سوچا اور پوچھا۔

"کیا احمد حسن کی حیثیت سے یا۔"

"اسی حیثیت سے۔۔۔ تمہیں اپنا امیج ریز کرنا ہے احمد رضا۔ وہ جو تمہارے فین ہیں' ان کے دل میں تمہارا مقام بڑھے گا کہ تم مشکل کے ان لمحوں میں ان کے ساتھ ہو۔"

"کیا مقصد صرف یہی ہے ان آفت زدہ لوگوں کی مدد کرنا یا پس پردہ کچھ اور بھی ہے؟"

احمد رضا! تم بہت حجت کرنے لگے ہو۔ اس کے علاوہ اور کیا مقصد ہو سکتا ہے بھلا۔ تم صبح تیار رہنا۔"

الوینا نے فون بند کر دیا تھا۔ احمد رضا جھنجلا گیا۔ وہ

کہیں نہیں جانا چاہتا تھا۔ آج ابراہیم سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ آج اس نے خود کو یقین دلایا تھا کہ بس، بہت جلد وہ سب سے ملے گا اور اب پتا نہیں وہاں کتنے دن لگ جائیں۔

"بھلا کتنے دن لگیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

"اور مجھ سے کتنی غلطی ہوئی، نہ میں نے ابراہیم سے اس کا نمبر لیا، نہ اپنا دیا۔ خیر خان بابا کو دے جاؤں گا کہ اگر ابراہیم آئے تو اسے میرا نمبر دے دے۔" اس نے بہر حال خود کو صبح جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا، اس امید کے ساتھ کہ وہ جلد لوٹ آئے گا۔

☼ ☼ ☼

سمیرا سحری کے بعد سوئی نہیں تھی۔ قرآن شریف پڑھنے کے بعد اس نے اپنا بیگ تیار کیا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ ڈائیوو کا اڈہ ان کے گھر سے کافی دور تھا۔ ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ پھر بھی ابھی کافی ٹائم تھا۔ وہ لیٹ گئی اور احمد رضا کے متعلق سوچنے لگی۔ احمد رضا اسے دیکھ کر کیا رد عمل ظاہر کرے گا اور وہ کیا کہے گی۔ وہ دل ہی دل میں لفظ ترتیب دینے لگی۔ اگر اس نے اسے پہچان لیا تو وہ ناراضی کا اظہار کرے گی۔ وہ اس سے کہے گی اس نے ایسا کیوں کیا اور اب یہ ایک اجنبی روپ دھار کر کیوں بیٹھا ہے۔ اس نے انہیں ڈھونڈا کیوں نہیں۔ نہیں وہ پہلے پوچھے گی۔

"احمد رضا کیا تم کلمہ طیبہ پر یقین رکھتے ہو۔ کیا تم مانتے ہو کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں اور ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا تو۔۔۔"

وہ یوں ہی سوچتے سوچتے سو گئی تھی۔ ڈائیوو نے بارہ بجے جانا تھا۔ حسن رضا اسے جگانے آئے تھے۔ دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی انہیں زور سے جھٹکا لگا۔ انہوں نے دروازے کو تھام لیا۔ سمیرا ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

زلزلے سے کیا تباہی آئی تھی اور کتنی ابھی وہ اس بات سے بے خبر تھے۔ لیکن زبیدہ نے اسے جانے نہیں دیا۔

"امی! میری پڑھائی کا حرج ہو گا۔ لاہور میں زلزلہ نہیں آیا۔ معمولی جھٹکے لگے ہیں۔"

لیکن وقفے وقفے سے ہونے والے آفٹر شاک نے زبیدہ کو بوکھلا دیا تھا۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔ ابھی ایک کو کھو چکی ہوں، تمہیں کھونے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔"

"ٹھیک ہے امی! نہیں جاتی۔" وہ زبیدہ کو اس طرح پریشان چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

"لیکن اس طرح مت کہیں۔ وہ کھویا نہیں ہے۔ موجود ہے۔ بہت جلد وہ ہم سے آ ملے گا۔ اگلی بار آؤں گی تو وہ میرے ساتھ ہو گا۔ دیکھ لیجیے گا۔"

وہ تسلی آمیز انداز میں ان کا بازو تھپتھپاتی رہی۔

لیکن زبیدہ اگلے کئی دن ٹی وی پر ہونے والی تباہی دیکھ کر دہلتی رہیں اور وہ پورا ہفتہ گزار کر لاہور آئی۔

☼ ☼ ☼

"کل سنڈے ہے مرینہ! ہم احمد حسن سے ملنے جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے چلے چلیں گے۔ لیکن تم احمد حسن کی کچھ زیادہ فین نہیں ہو گئی ہو۔"

"نہیں، مجھے کسی اور سلسلے میں اس سے ملنا ہے۔"

"کس سلسلے میں؟" مرینہ حیران ہوئی تھی۔

"ملنے کے بعد بتاؤں گی۔ پلیز۔۔۔ ابھی مجھ سے مت پوچھو۔"

اور مرینہ خاموش ہو گئی تھی۔

وہ اس وقت الریان میں تھی۔ مرینہ، یاسین کے ساتھ اسے ڈائیوو کے اڈے سے لے کر سیدھی الریان آئی تھی۔

"منڈے کو اکٹھے کالج چلیں گے۔ بلکہ میں کہتی ہوں، رمضان میں تم ادھر ہی رہو الریان میں۔"

وہ دل سے مرینہ اور الریان والوں کے خلوص کی قدر دان تھی۔ لیکن وہ اس طرح پورا مہینہ بھر الریان میں نہیں رہ سکتی تھی۔

الریان میں ان دنوں زلزلے۔۔۔ آفت زدہ علاقے، ملبے میں دبے لوگ ہی موضوع تھے۔ بلکہ الریان ہی کیا شاید سب کے ہاں یہی موضوع تھا۔ مرینہ سے اسے پتا چلا تھا کہ ایک اپنی تنظیم کے کارکنوں کے ساتھ آفت زدہ علاقوں میں گیا ہوا ہے اور کل صبح ہمدان بھی کچھ دنوں کے لیے جا رہا ہے۔

"یہ اچھی بات ہے۔ ہمارے عوام مصیبت کے وقت گھروں سے نکل آتے ہیں۔"

اس نے کہا تھا، تب ہی مرینہ نے بغور اسے دیکھا۔

"ایک بات کہوں سمیرا۔ برا تو نہیں مانو گی۔"

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں کبھی بھی تمہاری کسی بھی بات کا برا نہیں مان سکتی رینا۔ تم اس دنیا میں میری واحد دوست ہو۔"

مرینہ کچھ سوچنے لگی۔

"کیا کچھ ایسی بات ہے رینا! جو مجھے بری لگ سکتی ہے۔"

"ہو بھی سکتا ہے تم میرے یا میری فیملی کے متعلق کچھ غلط سوچو۔"

"نہیں پر امس ہمیں ایسا کچھ نہیں سوچوں گی۔"

"میرا خیال ہے چھوڑو، ہو سکتا ہے، مجھے وہم ہوا ہو۔" مرینہ نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں رینا! اب تمہیں بتانا ہی ہو گا۔ مجھے تجسس رہے گا۔"

"میں نے کہا نا، ہو سکتا ہے میرا وہم ہو۔ لیکن مجھے لگا کہ ہمدان بھائی تمہیں پسند کرتے ہیں۔ زلزلے کی خبر سن کر جس طرح وہ پریشان ہوئے تھے اور جس طرح بار بار مجھ سے آ کر پوچھتے کہ تمہارا کوئی فون آیا اور مجھے کہتے کہ تمہیں فون کر کے تمہاری خیریت دریافت کروا۔ اس وقت تو یہی پتا چلا تھا نا کہ زلزلے نے راولپنڈی، اسلام آباد میں نقصان پہنچایا۔ تفصیلات تو بعد میں آئی تھیں نا۔"

سمیرا خاموش رہی تھی۔

"کیا تمہیں برا لگا سمیرا؟ اسی لیے میں نہیں بتا رہی تھی۔" مرینہ پریشان ہوئی۔

"نہیں۔۔۔" سمیرا نے نفی میں سر ہلایا۔ "لیکن میرے پاس ابھی ان باتوں کے لیے وقت نہیں ہے مرینہ! ہمدان بھائی یقیناً بہت اچھے ہوں گے۔ الریان کا ہر فرد ہی اپنی جگہ بے مثال ہے۔ لیکن آئندہ مجھ سے اس طرح کی کوئی بات نہ کرنا۔ میں اپنے ذہن کو بھٹکانا نہیں چاہتی۔ بہت پہلے میں نے تمہیں بتایا تھا نا کہ مجھے اپنے ابو کا خواب پورا کرنا ہے۔ بغیر ادھر ادھر دیکھے سیدھے چلتے جانا ہے اور اس کے بعد میری زندگی کا فیصلہ میرے والدین کریں گے۔"

اور اگر ہمدان بھائی کا پروپوزل آیا تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

"نہیں۔ مجھے کسی بھی پروپوزل پر جسے میرے والدین قبول کریں گے اعتراض نہیں ہو گا۔ چاہے وہ ہمدان ہو یا کوئی اور۔۔۔ چلو اب مجھے پڑھنے دو۔ ایک ہفتے کا نقصان پورا کرنا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی پرابلم ہوا تو میں تمہاری ہیلپ کر دوں گی۔"

مرینہ کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔ چند دن پہلے ہی تو عاشی

نے چپکے سے آکر اسے بتایا تھا کہ ہومی بھائی کو سمیرا باجی اچھی لگتی ہیں اور اس نے خود سنا ہے۔ وہ اور ایبک بھائی بات کر رہے تھے۔ اسے اس بات کا افسوس تھا کہ رابیل نے ہمدان سے شادی سے انکار کردیا ہے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ہمدان بھی ایسا نہیں چاہتا تھا اور سمیرا کتنی کیوٹ ہے۔ رابیل جتنی خوب صورت نہ سہی، لیکن کتنی کشش ہے اس میں اور اگر وہ ہمدان کی دلہن بن کر الریان میں آجائے تو سچی کتنا مزا آئے گا۔ کتاب کھولے وہ آپوں آپ مسکرائے جارہی تھی۔

"کیا کتاب میں کچھ لطیفے لکھے ہیں؟" سمیرا نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں... لیکن یوں ہی ایک خیال آگیا تھا۔"

"سنو... صبح کتنے بجے جائیں گے احمد حسن سے ملنے... ہم اکیلے چلے جائیں گے یا مونا کو ساتھ لے کر جانا ہوگا؟" سمیرا نے کتاب بند کردی تھی۔

"نہیں۔ ہم خود ہی چلے جائیں گے۔ یاسین کو پتا ہے اس کا گھر، رابیل اپنی دوست کے ساتھ ایک بار گئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔"

"تو کیا تم رابی کو ساتھ لے کر چلوگی؟"

وہ کچھ پریشان ہوگئی تھی۔ رابیل پہلی ملاقات میں اسے کچھ خود پسند سی لگی تھی اور الریان کی لڑکیوں میں سے یہ واحد لڑکی تھی جو سمیرا کو پسند نہیں آئی تھی۔

"نہیں رابیل اور آنٹی، مائدہ تو۔ رحیم یار خان گئی ہوئی ہیں۔ رابی کا ننھیال وہاں ہی ہے نا۔"

"اچھا...!" وہ مطمئن سی ہو کر پھر کتاب کھول کر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اس کا دھیان بار بار احمد حسن کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسے دیکھ کر احمد حسن کا کیا تاثر ہوگا۔ وہ اندازہ نہیں کرپارہی تھی۔ احمد حسن ہی احمد رضا ہے۔ یہ تو اسے یقین تھا۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی ایک ننھی سی شک کی لکیر اس یقین میں دراڑ ڈال رہی تھی۔ اسے صبح کا بے چینی سے انتظار تھا۔

اسے احمد حسن سے سمیرا کی حیثیت سے ملنا تھا اور یہ انتظار وہ کب سے کررہی تھی۔ لیکن انتظار تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

ایبک نے کچھ دن پہلے ہی ایک فلاحی تنظیم "وطن دوست" جوائن کی تھی۔ سیاسی پارٹیوں سے وہ ازحد مایوس تھا۔ احمد حسن سے پھر اس کی ملاقات نہیں ہوسکی تھی چنانچہ اس نے وطن دوست میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ یہ تنظیم بہت خاموشی سے فلاح و بہبود کے کام کرتی تھی۔ وہ اس کے منشور سے متاثر ہوا تھا۔ چنانچہ دو دن بعد وہ اس تنظیم کے چند کارکنوں کے ساتھ خیموں اور دوسرے سامان سے لدے دو ٹرک لے کر آفت زدہ علاقوں کی طرف چلا گیا۔ جانے سے پہلے اس کی عمارہ سے تفصیل سے بات ہوئی تھی اور عمارہ نے اسے بتایا تھا کہ ان کی بات مروہ سے ہوگئی ہے اور اتفاق سے مروہ دو تین روز تک واپس پاکستان آرہی ہیں پھر ان کے ساتھ وہ خود جائیں گی اریب فاطمہ کے گھر، لیکن مروہ پھپھو ان سے فون پر بات کرلیں گی پہلے۔ اور وہ مطمئن ہوگیا تھا۔

آفت زدہ علاقے میں بے حد کام تھا۔ لوگ ملبے میں دبے ہوئے تھے۔ وہ بے طرح مصروف ہوگیا تھا۔ ایک قیامت صغریٰ تھی جو بپا تھی اس نے واقعی پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اڑتے دیکھا۔

اٹھارہ اکتوبر... دس دن ہوچکے تھے، لیکن لوگ ابھی تک ملبے میں دبے ہوئے تھے۔ یہ پہلی امدادی ٹیم تھی جو اس دور دراز جگہ تک پہنچی تھی۔ کچھ لوگ اپنی مدد آپ کے طور پر کام کررہے تھے۔ خاندان کے خاندان ختم ہوگئے تھے۔ "وطن دوست" کے کارکنوں نے کچھ فاصلے پر اپنا خیمہ لگالیا اور کام میں مصروف ہوگئے۔

ان کے کارکنوں نے آفت زدہ لوگوں کے لیے بھی خیمے لگالیے تھے اور انہیں ابتدائی طبی امداد دے رہے تھے۔ احمد رضا نے ملبے تلے دبی بچی کو اپنے ساتھی کی مدد سے نکالا۔

وہ بے حد خوف زدہ تھی اور اس کا ایک بازو اور ٹانگ عالباً ٹوٹ چکی تھی۔ ایبک نے اسے اٹھالیا اور اس خیمے کی طرف بڑھا جہاں ابتدائی طبی امداد دی جارہی تھی۔ زیادہ سیریس لوگوں کو اسلام آباد اور راولپنڈی بھجوادیا جاتا تھا۔ وہ تیز تیز جارہا تھا جب اس نے سامنے سے آتے احمد حسن کو دیکھا اور ٹھٹک کر رک گیا۔ احمد حسن نے بھی اسے پہچان لیا۔

"آپ یہاں ایبک صاحب...؟"

"یہی بات میں آپ سے بھی کہہ سکتا ہوں۔"

"مشکل کی اس گھڑی میں ہمیں یہاں ہی ہونا چاہیے تھا۔" احمد حسن مسکرادیا۔ "میں دس تاریخ کو اس علاقے میں آیا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہوں۔ میرے ساتھ ریڈ کراس کا عملہ ہے۔ آپ چلیں اس بچی کو ادھر ہی لے چلتے ہیں۔ ہمارے پاس دو ڈاکٹر بھی ہیں۔"

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے خیمے تک آئے۔ بچی کو عملے کے حوالے کرکے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔

"میں ایک دو بار آپ سے ملنے گیا تھا، لیکن آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔"

"ہاں۔ میں رحیم یار خان چلا گیا تھا۔"

"پتا چلا تھا۔" ایبک نے کہا تو اس نے بے حد حیرت سے اسے دیکھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

ایبک مسکرادیا اور اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی احمد حسن! کہ آپ صرف باتیں ہی نہیں کرتے، عملی طور پر بھی کچھ کررہے ہیں۔"

"یہ میرے لیے بہت مشکل تھا ایبک شاہ کہ میں وہاں کسی چینل پر بیٹھ کر تبصرہ کرتا رہتا اس لیے یہاں آگیا۔"

"اچھا کیا احمد حسن! یہاں بہت کام ہے۔ سیکڑوں بلکہ ہزاروں لوگ ابھی بھی ملبے میں دبے ہوئے ہیں۔ بہت رضاکاروں کی ضرورت ہے۔" ایبک نے دل گرفتی سے کہا اور کھڑا ہوگیا۔

"میں چلتا ہوں۔ امید ہے اب ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ رکیں گے یہاں یا ابھی واپس چلے جائیں گے؟"

"نہیں۔ ہم یہاں کچھ دن رہ کر کام کریں گے۔ اس علاقے میں ہماری ضرورت ہے۔" احمد حسن نے جواب دیا۔

"زیادہ شدید زخمیوں کو بھجوانے کا کچھ انتظام کیا ہے یا ابھی کرنا ہے۔" احمد حسن نے بات جاری رکھی۔

"ہاں۔ اطلاع کردی ہے۔ ہیلی کاپٹر آرہا ہے۔"

اس ملاقات کے بعد بھی ایبک کی احمد احسن سے کئی بار ملاقات ہوئی۔ کئی مقامات پر انہوں نے اکٹھا کام کیا بلکہ دو تین بار تو انہوں نے ایک ہی خیمے میں رات گزاری۔ اگرچہ اس ماحول میں ذاتی باتیں کرنے کا کوئی موقع محل نہ تھا۔ وہ جب اپنے خیمے میں آتے تو بہت تھکے ہوئے ہوتے تھے اور لیٹتے ہی سوجاتے تھے۔

ان کے درمیان زیادہ تر گفتگو زخمی اور ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کے حوالے سے ہوتی تھی، لیکن اس رات کو کافی پیتے ہوئے اچانک ہی ایبک نے احمد حسن کی طرف دیکھا۔

"مجھے آپ کا شکریہ بھی ادا کرنا ہے۔"

"کس لیے؟"

"اریب فاطمہ کو بچانے کے لیے۔" احمد حسن نے بے حد حیرت سے چونک کر اسے دیکھا۔

"آپ... آپ اریب کو کیسے جانتے ہیں؟" ایبک کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"الریان" میرے نانا جان کا گھر ہے۔"

اریب کی والدہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ لاہور میں "الریان" میں رہ کر اپنی تعلیم مکمل کررہی ہے۔

"لیکن کیا اریب فاطمہ نے وہاں "الریان" میں سب کو بتادیا ہے کہ..." احمد حسن گھبرایا۔

"نہیں۔" ایبک نے اس کی بات کاٹی۔ "اریب

فاطمہ نے صرف مجھ سے ذکر کیا ہے۔"

"صرف آپ سے!" احمد حسن کی آنکھوں کی حیرت واضح تھی۔

"ہاں۔ صرف مجھ سے اور اس لیے کہ اریب فاطمہ وہ لڑکی ہے جسے میرے والدین نے میرے لیے منتخب کیا ہے اور اریب فاطمہ کے ایگزام کے بعد وہ اس کے ہاں جانے والے تھے۔"

احمد حسن نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

"آپ بہت لکی ہیں ایبک شاہ! اریب فاطمہ یقیناً" ایک اچھی لڑکی ہے۔"

ایبک مسکرا دیا۔ "احمد حسن! کیا آپ مجھے اس شخص کے متعلق کچھ بتائیں گے جو شیخ عبدالعزیز کے نام سے وہاں رہتا ہے۔ اور۔۔۔" ایبک جھجکا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا! کہ وہ شخص مسلم نہیں ہے اور اس نے بہروپ بھر رکھا ہے۔"

"محض اتفاقاً"۔۔۔" احمد حسن نے آہستگی سے کہا۔ "میں ضلع رحیم یار خان میں اپنے عزیزوں سے ملنے جاتا رہتا ہوں۔ میرا ایک دوست ہے وہاں وہ اس کے پاس کام کرتا ہے۔ میں اس سے ملنے گیا تھا تو وہاں اتفاقاً" ہم نے اسے فون پر بات کرتے سن لیا تھا۔" اسے خبر نہیں ہو سکی تھی۔ احمد حسن ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔

"وہ ضرور "را" موساد یا سی آئی اے کا ایجنٹ ہوگا۔ یہ لوگ ہمارے ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے سارے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آپ کو کسی ذمہ دار شخص کو اطلاع دینی چاہیے تھی۔"

"کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ ملک چھوڑ کر چلا گیا ہے۔"

"ضرور اسے خبر مل گئی ہوگی کہ اس کی حقیقت کا علم ہو گیا ہے آپ کو۔"

"ہے جی۔" احمد حسن نے ٹھنڈی ہو جانے والی کافی ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار لی تھی۔

رچی اس ملک سے جا چکا تھا اور شاید ابھی اسے واپس نہیں آنا تھا۔ اسے لیبیا یا شام بھیج دیا گیا تھا۔ اسے اب وہاں اپنا جال پھیلانا تھا۔ لیکن یہاں اس کے کارندے موجود تھے اور اپنے کام میں مصروف جو ٹارگٹ لے کر وہ یہاں آئے تھے" اس پر مسلسل کام جاری تھا۔ لیکن احمد حسن انہیں بے نقاب نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا وہ ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن وہ اسے ختم کر دیں گے۔ اور ابھی وہ مرنا نہیں چاہتا تھا اسے ایک بار حسن رضا اور زبیدہ سے ملنا تھا اور ان سے معافی مانگنی تھی۔ پھر چاہے زندگی ختم ہو جاتی لیکن ایک بار وہ ان سے مل لیتا" اسے لگتا تھا جیسے یہاں بھی کئی آنکھیں اس کی نگران ہوں۔

"کیا سوچنے لگے احمد حسن؟" ایبک نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ یوں ہی ان لوگوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو چند دن پہلے ہنستے بستے تھے اور اب۔۔۔"

گفتگو کا موضوع بدل گیا تھا۔ وہ دونوں اب ان کوششوں کے متعلق باتیں کرنے لگے جو دبے ہوئے لوگوں کو نکالنے کے لیے کی جا رہی تھیں۔

ایبک نے اسے بتایا کہ وہ صبح پیچھے واپس جا رہا ہے۔ دوائیاں' خوراک بہت سی چیزوں کی ضرورت ہے جو اسے لانی ہیں' وہ وطن دوست کے ایک کارکن کے ساتھ صبح کسی وقت ہیلی کاپٹر کے آنے پر چلا جائے گا۔

"تم تو ابھی یہاں ہی ہو۔ واپسی پر شاید ملاقات ہو یا نہ ہو۔"

"ہاں۔ ہو سکتا ہے ہم کسی اور علاقے کی طرف نکل جائیں یا پھر پیچھے جائیں۔ میرے چینل سے بھی لوگ آ رہے ہیں۔"

"سیمل سے؟" ایبک نے پوچھا۔

"ہاں۔ ویسے وہاں میرا پروگرام ختم ہو گیا ہے۔ لیکن اب زلزلے کے حوالے سے میری رپورٹس وغیرہ وہاں سے دکھائی جاتی ہیں۔" ایبک نے سر ہلا دیا۔

سیمل سے اکثر اس کے بھیجے جانے والے ویڈیو کلپس دکھائے جا رہے تھے اور رپورٹس بھی۔ ذریعہ بھی ارباب حیدر اور الوینا کے کہنے پر ہوا تھا بلکہ سیمل نے کئی بار اس کی ان خدمات پر اسے سراہا گیا تھا کہ وہ آفت زدہ لوگوں کے لیے کام کر رہا ہے۔ حالانکہ

شار لوگ بغیر کسی غرض کے اس سے زیادہ کام کر رہے تھے۔ ینگ ڈاکٹرز نوجوان طلبا اور عام رضاکار پاکستانی قوم میں یہ جذبہ بہت تھا۔

ایبک نے اسے پھر سوچوں میں گم دیکھا تو سونے کے لیے اٹھ گیا۔

"گڈ نائٹ احمد حسن! یہاں دوبارہ ملاقات نہ بھی ہوئی تو ان شاء اللہ لاہور میں ملیں گے اور میں آپ کو "وطن دوست" جوائن کرنے کی دعوت دوں گا۔" احمد حسن مسکرایا۔

"ان شاء اللہ!" ایبک اٹھ کر اپنے بستر پر لیٹ گیا تھا۔

آج اتنے دنوں بعد پھر اریب فاطمہ اسے شدت سے یاد آ رہی تھی۔ وہ لاہور جا کر اریب فاطمہ سے ملے گا پھر ایک روز کے لیے بہاول پور جائے گا بابا اور ماما سے ملنے یقیناً" اب تک ساری بات طے ہو چکی ہوگی۔ مسکراہٹ نے پھر اس کے لبوں کو چھوا تھا اور وہ اریب فاطمہ کا تصور آنکھوں میں بسائے سو گیا۔ احمد حسن بہت دیر تک جاگتا رہا اور پھر الوینا کی کال آنے پر باہر نکل گیا۔

ایبک گہری نیند سو رہا تھا۔ الوینا نے کوئی خاص بات نہیں کی تھی بلکہ اسے ابھی وہاں ہی رہ کر کام کرنے کی تلقین کی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک خیمے سے باہر پتھر پر بیٹھا رہا اسے ایبک پر رشک آ رہا تھا۔ وہ اس کی طرح قیدی نہیں تھا۔ آزاد تھا اور اس ماحول میں بھی سکون کی نیند سو رہا تھا۔ وہ بہت دیر سے سویا تھا۔ اس لیے صبح جب ایبک اٹھا تو وہ سویا ہوا تھا۔ البتہ دوسرے لوگ اٹھ چکے تھے۔ ایبک کی آتے ہوئے اس سے ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے اسے جگایا نہیں تھا۔



لاہور پہنچتے ہی وہ پروگرام کے مطابق "لریان" گیا تھا۔ رات اسلام آباد میں گزار کر وہ صبح پانچ بجے اسلام آباد سے نکلا تھا' لیکن اریب فاطمہ سے ملاقات

نہیں ہو سکی تھی۔ وہ کالج گئی ہوئی تھی اور اسے ایک گھنٹے بعد کی فلائٹ سے ول پور جانا تھا۔ بہاول پور میں وہ دو دن رہا تھا۔ عمارہ نے اسے بتایا تھا کہ انہوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔

"لیکن کیوں ماما؟" وہ پریشان ہوا۔

"لڑکی والے "فوراً" ہی تو جواب نہیں دے دیتے سوچتے ہیں۔۔۔ تم سے ملیں گے۔ ہمارا گھر بار دیکھیں گے اور۔۔۔"

"اچھا۔" اسے اطمینان ہوا۔

"تم بے فکر رہو ان شاء اللہ جواب ہاں میں ہی ہوگا۔" عمارہ مسکرائی تھیں۔

اور وہ واقعی بے فکر ہو گیا اور واپس آفت زدہ علاقوں میں آ گیا۔ چھ ماہ تک وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری جگہ جاتا رہا۔ بحالی کا کام اگلے دو سالوں تک بھی مکمل ہونے والا نہیں تھا۔ چھ ماہ بعد وہ واپس بہاول پور آیا۔ اس کا ارادہ چند دن بہاول پور رہ کر واپس لاہور جانے کا تھا۔ فلاحی کاموں کے لیے پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور انہیں اب یہ کام کرنا تھا۔

لوگوں نے حکومت کو دل کھول کر دیا تھا، لیکن کتنا خرچ ہو رہا تھا اور کتنا اکاؤنٹوں میں جمع ہو رہا تھا۔ دور دراز علاقوں میں بے شمار لوگوں کو خیمے بھی میسر نہیں تھے اور وہ کھلے آسمان تلے بیٹھے تھے۔

وہ بغیر اطلاع کے بہاول پور آیا تھا سو فریش ہو کر جب فلک شاہ کے کمرے میں آیا تو اسے عمارہ اور فلک شاہ کچھ خاموش سے لگے وہ اتنے مہینوں بعد آیا تھا اور عمارہ کی آنکھوں میں خوشی کی وہ چمک نہیں تھی جو ہمیشہ اس کے آنے پر ہوتی تھی۔

"کیا بات ہے بابا! سب ٹھیک تو ہیں نا؟" اس نے پریشانی سے پوچھا۔

"سب ٹھیک ہیں بیٹا!" فلک شاہ مسکرائے۔ "ابھی کل ہی تو شانی اور مروہ پھپھو لاہور گئے ہیں۔ ایک ہفتے سے آئے ہوئے تھے پتا ہوتا کہ تم آ رہے ہو تو انہیں روک لیتے۔"

"خیر۔ تین چار دن تک لاہور جاؤں گا تو ملاقات ہو جائے گی۔ آپ سے مروہ پھپھو کے متعلق سن سن کے ان سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے مجھے۔" دل اریب فاطمہ سے ملنے کو تڑپ رہا تھا۔

"مروہ پھپھو کیا کچھ دن رہیں گی لاہور میں؟"

عمارہ نے سر ہلایا۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔ جتنی بار بھی فون پر اس سے بات ہوئی تھی وہ بتا نہیں پائی تھیں اور اب بھی انہیں حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اسے بتائیں، وہ اریب فاطمہ کے متعلق اس کے احساسات کو سمجھتی تھیں۔ تب فلک شاہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"ایبک۔۔۔ تمہاری ماما اور مروہ پھپھو اریب فاطمہ کے گھر گئی تھیں۔"

"ہاں۔ ماما نے بتایا تھا۔ انہوں نے سوچ کر جواب دینے کو کہا ہے۔"

"ایبک! انہوں نے انکار کر دیا ہے۔"

"نہیں۔۔۔" اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"انہوں نے کہا وہ اس کا رشتہ اپنے خاندان میں ہی کریں گے۔ غالباً "اریب فاطمہ کے ددھیال میں۔"

"لیکن یہ بات وہ پہلے بھی تو کہہ سکتے تھے جب انہوں نے سوچنے کے لیے کہا تھا۔" ایبک کے لبوں سے نکلا۔

"ہاں لیکن مروہ پھپھو نے بتایا ہے کہ اریب کی اماں نے کہا ہے کہ اس کے ابا کی مرضی اپنے خاندان میں کرنے کی ہے۔"

عمارہ بتا رہی تھیں، لیکن وہ سن نہیں رہا تھا۔ اس نے کتنے یقین سے اریب فاطمہ سے کہا تھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا، لیکن سب ٹھیک نہیں ہوا تھا اور اریب فاطمہ۔۔۔ وہ تو بہت دکھی ہو گی، بہت اداس۔

"بابا! میں کل لاہور جاؤں گا۔"

"اریب فاطمہ "الریان" سے چلی گئی ہے واپس اپنے گھر۔" عمارہ نے بتایا وہ اس کے دل کی کیفیت سمجھ رہی تھیں۔

"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں ماما۔" اس نے گلہ

کیا۔

"تم پریشان ہو جاتے بیٹا۔ ہم نے سوچا تم آؤ گے تو بتا دیں گے۔"

پھر اگلے بہت سارے دن وہ اریب فاطمہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ زینب آپا کا نمبر اس کے پاس محفوظ تھا، لیکن زینب آپا نے صرف ایک بار فون اٹینڈ کیا۔

"وہ لوگ گاؤں سے چلے گئے ہیں۔" انہوں نے بتایا۔

"کہاں؟" وہ بے چین ہوا تھا۔

"پتا نہیں۔۔۔"

"کیا۔۔۔ کیا اریب فاطمہ کی شادی ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ لیکن انہوں نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ میرے پاس ان کا ایڈریس نہیں ہے، غالباً "کراچی سیٹل ہونے کا کہہ رہے تھے۔"

"پلیز زینب آپا! اگر کبھی پتا چلے تو مجھے ضرور انفارم کیجئے گا۔ میرا نمبر محفوظ کر لیں۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔"

زینب آپا نے وعدہ کیا کہ وہ اسے بتا دیں گی۔

☆ ☆ ☆

لاہور آ کر اس نے احمد حسن سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن احمد حسن کا فون مسلسل بند تھا۔ شاید اس نے سم تبدیل کر لی تھی۔

"الریان" میں بھی کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ منیبہ نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایگزام دیے بغیر چلی گئی تھی۔ دو ماہ پہلے اس کا بھائی آ کر اسے لے گیا تھا، یہ کہہ کر کہ اب وہ واپس نہیں آئے گی" وہاں جا کر اس نے ایک بار بھی فون نہیں کیا اور ہم خوامخواہ اسے یاد کر کر کے مر رہے ہیں۔" منیبہ نے گلہ کیا۔

"تو تم فون کر لیتیں۔" ایبک کے لبوں سے نکلا۔

"آپ کا کیا خیال ہے ایبک بھائی! کیا ہم نے فون نہیں کیا ہو گا۔ اس کا جو پی ٹی سی ایل کا نمبر تھا۔ وہ بند ہے اور سیل تو اس کے پاس تھا ہی نہیں۔"

وہ بے حد دل گرفتہ سا "الریان" آیا تھا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

"کیا اس کے والد اور بھائیوں نے اسے شیخ عبدالعزیز کے ساتھ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ اس کی امی تو سب جانتی تھیں، وہ ایسا نہیں کر سکتیں۔"

احمد حسن نے اسے بتایا تھا کہ وہ ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ احمد حسن کا دوست اس کے پاس کام کرتا تھا۔ کیا خبر وہ لوٹ آیا ہو۔ احمد حسن، صرف احمد حسن اسے بتا سکتا تھا کہ اریب فاطمہ کی شادی شیخ عبدالعزیز سے ہو گئی ہے یا۔۔۔

وہ منیبہ کو پھر آنے کا کہہ کر عبدالرحمان شاہ سے ملے بغیر ہی "الریان" سے نکل آیا اور اب وہ احمد حسن کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔



احمد حسن چھ ماہ آفت زدہ علاقوں میں خوار ہونے کے بعد ایک دن پہلے ہی لاہور آیا تھا اور اس کا ارادہ کل صبح ابراہیم کے گھر جانے کا تھا۔ اگر وہ اتنا تھکا ہوا نہ ہوتا تو شاید ایک لمحہ کا انتظار کیے بغیر وہ ابراہیم کے گھر پہنچ جاتا۔

ان چھ ماہ کا ہر دن اس نے اس پچھتاوے کے ساتھ گزارا تھا کہ اس نے ابراہیم کا نمبر کیوں نہیں لیا تھا اور ہر دن اس نے واپس لاہور آنے کی خواہش کی تھی چاہے چند دن کے لیے ہی سہی لیکن نہیں آ سکا تھا۔

ثمینہ حیدر اس کے آنے کے کچھ دیر بعد ہی آ گئی تھی۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے ہی رات کا کھانا لگوا کر واپس گئی تھی۔ صبح میں اس کے آنے سے پہلے ہی نکل جاؤں گا۔ اسے ابراہیم کا گھر ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہو گی کیونکہ وہ ابھی تک اسی پرانے گھر میں رہتا تھا۔

"خدا کرے وہ کینیڈا واپس نہ گیا ہو۔" پورے چھ ماہ اس نے یہ ہی دعا کی تھی۔

اس نے میز پر پڑے آج کے اخبارات کو دیکھا۔ وہ

صبح سے یونہی سستی سے پڑا تھا اور اس نے آج کے اخبارات اٹھا کر بھی نہیں دیکھے تھے جو صبح ثمینہ حیدر اس کے کمرے میں رکھ گئی تھی۔ کل تھکا ہونے کے باوجود اسے نیند نہیں آئی تھی اور آج بھی یہی حال تھا کہ نیند نہیں آرہی تھی۔

ابراہیم سے ملنے کے بعد وہ ایبک کا پتا کرے گا۔ پتا نہیں وہ اس وقت کہاں ہے۔ واپس آیا۔۔۔ یا۔۔۔ نہیں۔ ضرور وہ اب بھی ان آفت زدہ لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ کررہا ہوگا۔ اسے ایبک اچھا لگا تھا۔ وہ بہت خلوص سے سرگرم تھا جب کہ وہ خود وہاں اس لیے موجود تھا کہ الوینا نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا۔

"اگر میں ان کے جال سے نکل آیا تو ضرور "وطن دوست" کو جوائن کروں گا۔" تب ہی اس کا سیل بجنے لگا تھا۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کیا اور فون اٹھایا' دوسری طرف الوینا تھی۔

"سو گئے تھے کیا؟"

"ہاں۔ کل نیند نہیں آئی تھی۔" احمد رضا کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔ "الوینا! مجھے بہت سخت نیند آرہی ہے۔ کیا ہم کل بات نہیں کرسکتے۔" وہ سخت بے زار ہورہا تھا۔

"ابھی زیادہ دیر تو نہیں ہوئی' بارہ ہی بجے ہیں۔ احمد رضا! تم جانتے ہو رضوان عامر نے اپنے اداریے میں تمہارے متعلق کیا لکھا ہے؟"

"میں نے چھ ماہ سے اخبارات نہیں دیکھے۔ تم جانتی ہو۔"

"لیکن میں آج کے اخبار کی بات کررہی ہوں' کیا آج کے اخبار تمہارے ہاں نہیں آئے؟" الوینا نے پوچھا۔

"میرے سامنے پڑے ہیں' لیکن میں نے دیکھے نہیں۔ کون سا اخبار؟" الوینا نے اخبار کا نام بتایا۔

"لیکن یہ اخبار تو کبھی بھی میرے ہاں نہیں آیا۔"

"ہر اخبار تمہارے زیر مطالعہ رہنا چاہیے تھا۔ میں نے ثمینہ حیدر سے کہا تھا کہ تمام اخبارات آنے چاہئیں' بہرحال رضوان عامر نے صاف الفاظ میں کہا ہے کہ احمد حسن دراصل احمد رضا ہے۔ اسماعیل کذاب کا مقرب خاص ہے۔"

"اچھا پھر۔۔؟" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ "یہ جھوٹ تو نہیں ہے۔"

"ہاں جھوٹ نہیں ہے' لیکن اب دیکھنا بہت سے صحافی تمہارے پیچھے پڑ جائیں گے اور وہ ثابت کرکے ہی چھوڑیں گے کہ تم ہی احمد رضا ہو۔"

"تو کرلیں ثابت۔ کب تک اپنی شناخت چھپاؤں گا الوینا!" اس نے اپنے اندر ایک انجانی سی خوشی کی لہر اٹھتی محسوس کی۔

ہوسکتا ہے۔ کبھی ابو کی نظر سے بھی یہ خبر گزرے اور وہ جو مجھے مردہ سمجھ بیٹھے ہیں۔۔۔ مجھ تک پہنچ پائیں۔ ابراہیم نے بتایا تھا کہ وہ اسے بے چینی سے ڈھونڈ رہے تھے۔

"یہ کہنا آسان ہے احمد رضا! لیکن اس کے بعد کیا ہوگا' اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے۔ خیر دیکھتے ہیں۔"

الوینا نے اس وقت فون بند کردیا تھا' لیکن رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب دوبارہ بیل ہوئی تھی۔ احمد رضا نے یونہی بند آنکھوں کے ساتھ فون اٹینڈ کیا۔

"سوری احمد رضا! میں نے تمہیں پھر جگادیا۔" دوسری طرف پھر الوینا تھی۔

اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔

"ہمیں کچھ دیر پہلے ہی پتا چلا ہے کہ لاہور کے ایک مولوی صاحب نے تمہارے خلاف ایک اشتہار چھپوایا ہے اور آج رات مختلف علاقوں میں تقسیم کرنے کے علاوہ دیواروں پر بھی چسپاں کردیا گیا ہے۔ اسلام آباد میں بھی تمہارے کسی مفتی نے ایک پمفلٹ چھپوایا ہے' جس میں تمہیں مرتد اور اسماعیل کذاب کا قائم مقام کہا گیا ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ صبح یہ اشتہارات مزید تقسیم کیے جائیں گے اور تمہاری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔ کوئی سرپھرا تمہیں مار بھی سکتا ہے۔"

"تو مار دے۔ مجھے کہیں نہیں جانا الوینا! میں تھک چکا ہوں۔"

"ہم نے تم پر پیسہ خرچ کیا ہے احمد رضا! اور ہم تمہیں ضائع نہیں کرسکتے۔" الوینا کا لہجہ سخت تھا۔ "تیاری کرلو۔ جنید علی تمہیں لینے آرہا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے تم وہاں سے نکل آؤ۔"

"الوینا پلیز' مجھے یہاں ہی رہنے دو۔۔۔ مجھے۔۔۔" اس نے التجا کی۔

"پاگل مت بنو احمد رضا! زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اسے جان بوجھ کر ضائع کردیا جائے تمہارا تو مذہب بھی زندگی بچانے کی تلقین کرتا ہے۔" الوینا نے لہجے میں نرمی پیدا کی۔

"تم میرے مذہب کے متعلق کتنا جانتی ہو الوینا؟" وہ تلخ ہوا۔

"اس بات کو چھوڑو۔ تم تیاری کرلو۔"

"مجھے کہاں جانا ہوگا اب؟" اس نے پوچھا۔

"فی الحال تو صبح کی فلائٹ سے تم رحیم یار خان آرہے ہو۔ باس کا حکم ہے کہ تم جو ٹریننگ ادھوری چھوڑ گئے تھے۔ اسے مکمل کرو' اس کے بعد تمہیں رچی کے پاس بھیج دیا جائے گا' ویسے بھی وہ تمہارے لیے اداس ہورہا ہے ڈیر۔" احمد رضا کو لگا جیسے فون کے دوسری طرف وہ مسکرا رہی ہو۔

"یعنی ایک بار پھر جلاوطنی۔۔۔ اور نہ جانے کتنے عرصے کے لیے۔" وہ بڑبڑایا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا فی الحال تو تمہیں یہاں آنا ہے' ڈارلنگ۔۔۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میں تمہارے یہاں آنے سے بہت خوش ہوں۔ اوکے پھر ملتے ہیں جلد۔" اس نے فون بند کردیا۔

"ہم صرف ایمپلائی (ملازم) ہیں احمد رضا۔" اس کے کانوں میں ارباب حیدر کی آواز گونجی۔

"اور ہمیں وہی کرنا ہے جو ہمیں کہا جائے ورنہ ایک ان چاہی موت ہمارا مقدر ہوگی۔ کوئی ان دیکھی گولی۔۔۔ کوئی بم دھماکہ۔۔۔ کوئی حادثہ۔۔۔ اور پھر سب کچھ ختم۔"

"تو کیا اب سب کچھ ختم ہوجائے گا اور وہ کبھی اپنے گھر والوں سے نہیں مل سکے گا۔۔۔ کبھی حسن رضا کو نہیں بتا سکے گا کہ وہ سب جھوٹ تھا۔۔۔ ایک جال' حرص وہوس کا جال جس میں وہ پھنس گیا تھا۔ اس کے دل نے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کسی اور کو نبی آخرالزماں نہیں مانا تھا۔ کیا حسن رضا یہ کبھی نہیں جان سکیں گے کہ۔۔۔"

"نہیں۔۔۔" وہ جو کچھ دیر پہلے زندگی سے بے زار ہورہا تھا' ایک دم اس کے دل میں جینے کی امنگ جاگ اٹھی۔ کیا خبر۔ کیا پتا اب اس طرح اس کے متعلق چھپنے کے بعد ایک روز حسن رضا اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس تک پہنچ جائیں۔ بھلے اسے قتل کرنے کے لیے ہی سہی۔

"بس اتنی زندگی میرے اللہ۔ اتنی زندگی دے دے کہ میں ایک بار انہیں مل کر بتا سکوں کہ۔" وہ اٹھا اور جلدی جلدی اپنی پیکنگ کرنے لگا۔

☆ ☆ ☆

"فاطمہ۔۔۔!" سائرہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

وہ بہت دیر سے یونہی دیوار کی طرف کروٹ لیے لیٹی تھی۔ سائرہ بہت دیر سے سامنے موڑھے پر بیٹھی اسے دیکھ رہی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ جاگ رہی ہے اور اسے سائرہ کی کمرے میں موجودگی کا بھی علم ہے' لیکن وہ ان سے ناراضی کے اظہار کے لیے ان کی طرف نہیں دیکھ رہی۔

"اٹھ جاؤ بیٹا! شام ہونے والی ہے۔"

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"اماں! آخر آپ مجھے بتاتی کیوں نہیں ہیں کہ آپ نے اس طرح اچانک مجھے "الریان" سے کیوں بلوایا ہے۔ میرے امتحان میں تھوڑا سا وقت رہ گیا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوگیا تھا کہ آپ نے مجھے پیپرز بھی نہیں دینے دیے۔ حالانکہ آپ چاہتی تھیں۔ میں کم از کم بی اے تو کرلوں۔ آپ کی تو خواہش تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں' کتنی ہی بار آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ ڈاکٹر نہیں بن سکی لیکن ماسٹرز ضرور کروں اور اب آپ نے مجھے بی اے بھی نہیں کرنے دیا۔"

اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ سائرہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اریب فاطمہ! تم جانتی ہو کہ تمہارے ابا اور بھائیوں کو تمہارا پڑھنا پسند نہیں تھا۔"

"نہیں اماں! آپ یہ مت کہیے گا کہ ابا نے مجھے بلوایا ہے' اس بار تو آپ نے مجھے بلوایا ہے اماں! اسفند بھائی نے مجھے بتایا تھا۔ اماں پلیز' مجھے سچ بتائیں کیا ہوا؟ کیوں آپ نے ایسا کیا؟" اس نے سائرہ کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"اماں پلیز' مجھے جانے دیں میں ایگزام دے کر آجاؤں مجھے کون سا ہمیشہ وہاں رہنا تھا' صرف چند ماہ کی بات تھی۔"

اور وہ بات جو پچھلے تین مہینوں سے سائرہ اس سے نہیں پوچھ سکی تھیں آج بھی نہیں پوچھ پائیں اور باہر نکل گئیں۔

یہ تین ماہ پہلے کی ہی تو بات تھی جب انہیں اپنے تایا زاد بھائی کی وفات پر رحیم یار خان جانا پڑا تھا اور وہاں ہی کسی نے انہیں بتایا تھا کہ رافعہ آپا کی طبیعت خراب ہے۔ مائرہ بھی آئی ہوئی ہے اور وہ ان کی مزاج پرسی کے لیے "حسن لاج" آئی تھیں۔ رافعہ آپا ان سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں۔

"بہت عرصہ بعد آئی ہو سائرہ! بچے کیسے ہیں؟"

"سب ٹھیک ہیں آپا! آپ کی طبیعت کیسی ہے وہاں تایا جان کے گھر پتا چلا تھا آپ کی بیماری کا۔"

"اللہ کا شکر ہے اب بہتر ہوں معمولی سا انجائنا کا اٹیک ہوا تھا۔ شکر ہے۔ مائرہ آئی ہوئی تھی اور اس وقت میرے پاس ہی بیٹھی تھی۔"

"مائرہ چلی گئی کیا۔ میں نے تو شادی سے پہلے دیکھا تھا اسے۔ شادی کے بعد وہ لاہور چلی گئی اور میرا کبھی ادھر آنا ہی نہ ہوا۔ اماں جب تک زندہ رہیں کبھی کبھار ان سے ملنے آتی تھی اور ایک دو دن رہ کر چلی جاتی تھی۔"

"تم مائرہ کی شادی میں بھی نہیں آئی تھیں حالانکہ تمہارے بھائی صاحب خود گئے تھے دعوت دینے۔"

انہوں نے گلہ کیا۔

"میں آنے کی پوزیشن میں نہیں تھی آپا! جس روز مائرہ کی بارات آنا تھی اسی روز تو اسفند پیدا ہوا تھا۔"

"خیر۔ تم تو بس گاؤں کی ہی ہو کر رہ گئی ہو۔ بندہ یوں اپنے رشتہ داروں عزیزوں کو چھوڑ تو نہیں دیتا۔"

"آپا! میں نے مائرہ کا پوچھا تھا' چلی گئی کیا؟"

"ارے نہیں۔ رمضان میں آئی تھی میں نے عید تک روک لیا کہ شادی کے بعد ساری عیدیں سسرال میں ہی تو کی ہیں اس نے۔ احسان مانتا ہی نہیں تھا۔ ہر بار فون کرتی تو کہتا نہیں عید تو "الریان" میں ہی کریں گے۔ لیکن اس بار مان گیا اور عید کے بعد میں ہی بیمار پڑ گئی۔ اب آیا ہوا ہے "عثمان" اس کا جیٹھ اسے لینے۔ رات ہی آیا ہے۔ آج کل میں چلی جائے گی۔ رابی بہت اداس ہو رہی ہے اس کا دل نہیں لگ رہا یہاں پہلی بار اتنے دن رہی ہیں دونوں ماں بیٹی یہاں ارے ہاں تمہاری بیٹی بھی تو وہاں رہ کر پڑھ رہی ہے۔ مائرہ نے بتایا تھا مجھے۔"

وہ کچھ دیر رافعہ آپا سے باتیں کرتی رہیں' لیکن وہ بات کرتے کرتے سو گئی تھیں۔ شاید دواؤں کے زیر اثر۔ وہ اٹھ کر باہر آئیں تو انہیں مائرہ نظر آئیں۔ وہ لاؤنج میں کھڑی کسی ملازمہ سے بات کر رہی تھیں۔

"مائرہ!" انہوں نے انہیں بلایا تو مائرہ نے مڑ کر دیکھا۔

"ارے یہ تم ہو سائرہ!" وہ ذرا سا حیران ہوئی تھیں۔ "میں بھی میں رانو سے پوچھ رہی تھی کہ کون مہمان آیا ہے اماں کے پاس۔"

"آپا سو گئیں تو میں باہر آگئی۔ تم نے منیر بھائی کی ڈیتھ کا تو سنا ہوگا۔ ادھر ہی آئی تھی۔ وہاں رافعہ آپا کی بیماری کا پتا چلا تو ملنے آگئی تھی۔"

"اچھا کیا۔ مجھے بھی تم سے ملنا تھا۔ آؤ لاؤنج میں بیٹھتے ہیں۔ رانو! تم یہاں کھڑی منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ جاؤ چائے بناؤ اور ہاں امی جان کو دوا دے دی تھی؟"

وہ رانو سے مخاطب ہوئیں اور انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سائرہ نے بغور انہیں دیکھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی

تھیں۔ عمر کے آثار ضرور دکھتے تھے، لیکن آنکھوں میں وہی پر غرور سی چمک تھی اور انداز گفتگو بھی وہی جس سے خود پسندی جھلکتی تھی۔

"تو تمہارے تایا کے خاندان سے تعلقات ہیں؟"

مائرہ نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن غمی خوشی میں ہی آنا ہوتا ہے۔"

"اچھا، لیکن میں نے تو یہی سنا تھا تب تمہاری شادی سے پہلے کہ تایا نے تم لوگوں سے میل جول ختم کر دیا ہے۔"

"نہیں۔ تم نے غلط سنا تھا مائرہ!" سائرہ نے سنجیدگی سے کہا۔ اور سوچا کہ وہ مائرہ سے وضاحت کریں کہ تایا ابا کو غلط فہمی ہوئی تھی اور انہیں حقیقت پتا چل گئی تھی۔ کم از کم حقیقت جان لینے کے بعد وہ اریب فاطمہ سے ایسی کوئی بات نہیں کہیں گی جس سے اس کا دل دکھے۔

"ہو سکتا ہے۔" مائرہ نے کندھے اچکائے۔ اور پھر چونکنے کی اداکاری کی۔

"ارے تم نے اپنی بیٹی کے متعلق نہیں پوچھا۔"

"ہاں!" اریب فاطمہ کے ذکر پر سائرہ کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "کیسی ہے وہ؟"

"بالکل تمہارے جیسی سائرہ۔" مائرہ کے لبوں پر ایک معنی خیز سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ "شکل و صورت میں بھی اور عادت و مزاج اور اخلاق و کردار میں بھی۔۔۔"

سائرہ چونکیں اور ان کے چہرے کی بدلتی کیفیات نے مائرہ کو محظوظ کیا۔ بچپن میں سائرہ جب بھی رحیم یار خان آتی تھی تو مائرہ کو اس کی تعریف سن کو جلن محسوس ہوتی تھی۔ وہ تقریباً" ہم عمر تھیں اور جب بھی وہ لوگ رحیم یار خان آتے تو خاندان بھر میں اس کی ذہانت کا ذکر ہونے لگتا جبکہ مائرہ چاہتی تھی کہ لوگ صرف اس کی خوب صورتی کی تعریف کریں اور صرف سراہیں۔

"یہ تم نے اپنی بیٹی کی کیسی تربیت کی ہے سائرہ! سنسان دوپہروں میں پارک میں جا کر لڑکوں سے ملتی ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں "الریان" کے لڑکوں پر بھی ڈورے ڈالنے نہ شروع کر دے اس سے پہلے کہ "الریان" کی عزت اچھلے اپنی بیٹی کو وہاں سے لے آؤ۔"

"فاطمہ ایسی نہیں ہے مائرہ۔" بمشکل ان کے لبوں سے نکلا تھا۔

"وہ ایسی ہی ہے سائرہ بی بی! بالکل تمہاری کاپی اس سے پہلے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائے اسے وہاں سے لے آؤ۔ مخلصانہ مشورہ دے رہی ہوں۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنسی تھی۔

"کہتے ہیں بیٹیاں ماں کا پرتو ہوتی ہیں اور تمہاری بیٹی تو تم سے بھی دو ہاتھ آگے ہے اسے تو کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں نے خود دو بار اسے پارک میں کسی لڑکے کے ساتھ دیکھا ہے۔ مجھے تو ڈر ہی لگا رہتا ہے۔ جس طرح تم اپنے ساتھ کسی کو لگائے گھر تک آگئی تھیں کہیں تمہاری بیٹی بھی کسی روز اپنے ساتھ کسی کو لگائے "الریان" کے دروازے تک نہ لے آئے۔"

وہ نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں سائرہ سن نہیں رہی تھیں اور اگر سن بھی رہی تھیں تو لفظ ان کی سماعت کی گرفت میں نہیں آرہے تھے۔

کاش وہ یہاں نہ آئی ہوتیں۔

کاش ان کی ملاقات مائرہ سے نہ ہوئی ہوتی۔ ان کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ بول نہیں پا رہی تھیں اور نہ ہی مائرہ کی بات کی تردید کر پا رہی تھیں۔۔۔ جوان کے ماضی کے اوراق کھولے مسلسل ان کی تذلیل کر رہی تھیں اور لاؤنج کے اندر آتے عثمان شاہ نے بہت تاسف سے مائرہ کی باتیں سنی تھیں، جب مائرہ خاموش نہیں ہوئیں تو وہ ایک قدم آگے بڑھے تھے۔

"کسی کی تحقیر اور بلا تحقیق بہتان لگانا قتل سے بڑا جرم ہے مائرہ بھابھی! کسی پر بہتان لگانے والا ذلت کی عمیق پستیوں میں گر جاتا ہے۔"

مائرہ نے مڑ کر انہیں دیکھا اور یک دم خاموش ہو گئیں۔ ان کے سامنے بیٹھی سائرہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھر ایک دم ہی ان کی آنکھوں میں بہت ساری حیرتیں اتر آئیں اور وہ ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ عثمان شاہ بے حد حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ پھر جیسے وہ چونک کر مائرہ کے پیچھے سے نکل کر اس کے دائیں طرف آکھڑے ہوئے۔

"بہت افسوس کی بات ہے مائرہ بھابھی! آپ وہ الزام لگا رہی ہیں جس کی حقیقت سے آپ خود بے خبر ہیں اور ان کے بزرگوں نے بھی بلا سوچے سمجھے تحقیق کیے اس بات کو تسلیم کر لیا تھا کہ ان سے ہی غلطی ہوئی۔ آپ ایک بے بنیاد بات کو لے کر ان کے پیچھے پڑی ہیں۔ یہ میں تھا جس نے انہیں دیکھ کر ان کے کردار کی پختگی سے متاثر ہو کر انہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ یہ تو بے خبر تھیں میرے خوابوں اور میری سوچوں سے۔"

انہوں نے حیران کھڑی سائرہ کی طرف دیکھا۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی انہیں مائرہ کو پہچاننے میں چند لمحے لگے تھے۔ وہ بالکل ویسی ہی تھیں۔

وہ دو قدم سائرہ کی طرف بڑھے تھے۔

"میں ساری زندگی خود کو معاف نہیں کر سکا کہ میری وجہ سے آپ کے خواب کرچی کرچی ہوئے اور آپ نے ایک ان چاہی زندگی گزاری، خوشیوں سے دور۔" ان کی آواز ندھم ہو گئی تھی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" وہ کہنا چاہتی تھیں کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ایک خوش حال اور بہترین زندگی گزار رہی ہیں۔

"پلیز مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میری اس غلطی پر جو آپ کی پوری زندگی پر محیط ہو گئی اور پوری زندگی کی خوشیوں کو کھا گئی۔ جس روز مجھے پتا چلا کہ آپ کے تایا جان نے آپ کے ناکردہ جرم کی سزا میں آپ کی تعلیم ختم کر کے آپ کی اچانک شادی کر دی ہے تب سے لے کر آج تک ہر رات جب میں بستر پر لیٹتا ہوں تو سوچتا ہوں میں نے ایک لڑکی کے خواب کرچی کرچی کر دیے جو ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔"

انہوں نے پھر ایک تاسف بھری نظر مائرہ پر ڈالی۔

"سوری۔۔۔ عثمان بھائی! وہ یہاں اودھر رحیم یار خان میں خاندان میں ایسا ہی مشہور تھا اور مجھے تو کبھی پتا ہی نہیں چلا کہ وہ آپ تھے۔ میرا مطلب ہے گھر میں بھی کبھی کسی نے ذکر نہیں کیا۔"

"کسی لڑکی کو دیکھ کر اس کے گھر رشتہ بھجوانا کوئی قابل ذکر بات نہیں تھی مائرہ بھابھی۔"

اور سائرہ کو پہلی بار پتا چلا تھا کہ اس شخص کا نام عثمان شاہ ہے جو ان کی زندگی کے افق پر چند لمحوں کے لیے نمودار ہو کر زندگی کا پورا منظر نامہ ہی تبدیل کر گیا تھا۔ لیکن سائرہ کو ان سے کوئی گلہ نہ تھا۔ شاید روز ازل سے کتاب میں ایسا ہی ہونا رقم تھا۔

"آپ ان سے سوری کریں مائرہ بھابھی جن پر بے بنیاد الزام لگا رہی تھیں مجھ سے نہیں۔"

پتا نہیں عثمان شاہ نے مائرہ کی کتنی بات سنی تھی۔ لیکن انہوں نے سائرہ کو مائرہ کے سامنے سرخ رو کر دیا تھا۔ وہ دل ہی دل میں عثمان شاہ کی ممنون ہوئی تھیں اور انہوں نے دل میں بے حد فخر محسوس کیا تھا کہ انہیں اپنی زندگی میں شامل کرنے کی چاہ رکھنے والا شخص ہر لحاظ سے اعلا و افضل تھا۔ بلند ظرف۔ بلند کردار۔ اور عثمان شاہ مائرہ سے کہہ رہے تھے۔

"بخدا مائرہ بھابھی! جب میں اماں جان اور بابا جان کے ساتھ یہاں ان کے تایا کے گھر آیا تھا اور پتا چلا تھا کہ ان کی شادی ہو چکی ہے تو میں نے اپنی سوچ کو بھی کسی خیانت کا مرتکب نہیں ہونے دیا اور آپ۔۔۔"

انہوں نے پھر ایک تاسف بھری نظر مائرہ پر ڈالی جو اس اچانک صورت حال سے ابھی تک سنبھل نہ پائی تھیں۔

"بیٹھیں نا عثمان بھائی! اور سائرہ تم بھی۔۔۔ میں دیکھوں۔ رانو ابھی تک چائے کیوں نہیں لائی۔"

"نہیں مائرہ! میں بس اب چلوں گی۔" سائرہ نے مائرہ کی طرف دیکھا اور اپنی چادر درست کرتی دروازے کی طرف بڑھی تھیں۔

"اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا سائرہ۔"

"میں نے تو کبھی آپ کو قصور وار گردانا ہی نہیں۔" سائرہ نے آہستگی سے کہا تھا۔

"لیکن میں نے ہمیشہ خود کو مجرم سمجھا آپ کا۔" اپنی بات کہہ کر عثمان شاہ وہاں رکے نہیں تھے۔

"میں ضروری کام سے جارہا ہوں۔ مائرہ بھابھی! آپ کا کیا پروگرام ہے۔ تیاری کرلیجئے گا' دو گھنٹے تک نکل جائیں گے۔"

"نہیں۔ امی کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی ہے۔ رابی گھبرائی ہوئی ہے۔ آپ اسے ساتھ لے جائیں۔ میں دو چار دن میں آجاؤں گی۔"

اور عثمان شاہ سرہلاتے ہوئے چلے گئے تھے اور پھر سائرہ' مائرہ کے اصرار کے باوجود نہیں رکی تھیں اور پھر وہ پوری رات نہیں سو سکی تھیں۔

اور صبح ہونے تک وہ فیصلہ کرچکی تھیں۔ اریب فاطمہ کو واپس بلانے کا اور گاؤں واپس جاتے ہی انہوں نے اریب فاطمہ کے والد سے کہا تھا۔

"میں نے اریب فاطمہ کے متعلق بہت برا خواب دیکھا ہے۔ اسفند کو بھیج کر اسے واپس بلوالیں۔"

"تم نے ہی ضد کرکے اسے بھیجا ہے۔ اچھی بھلی آ تو گئی تھی۔ کہا بھی تھا۔ لڑکیوں نے اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرنا ہوتا ہے۔ پھر شیخ صاحب کا کیا پتا۔ کب آجائیں۔ زبان دی ہے میں نے انہیں' صبح ہی اسفند کو بھیجتا ہوں لاہور۔ لیکن پھر دوبارہ اسے بھیجنے کی ضد نہ کرنا۔ اب۔۔۔ ہم لاہور کے چکر ہی لگاتے رہیں گے کیا۔"

اور یوں اریب فاطمہ واپس چک نمبر 151 آگئی تھی۔

"اماں! آپ نے مجھے کیوں بلوالیا۔ پیپرز تو دینے دیتیں۔"

"بس بہت پڑھ لیا فاطمہ تم نے۔" ان کی نظروں نے اس کے چہرے کو کھوجا۔

"اماں پلیز۔ ایسا مت کریں۔ ابا کو منالیں۔" اریب فاطمہ یہ جان کر کہ اب وہ مزید نہیں پڑھے گی۔ تڑپ تڑپ کر روئی تھی۔ "آپ ابا کو مناسکتی تھیں اماں! آپ نے ہمیشہ انہیں منایا۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن اب منانا نہیں چاہتی تھی۔"

"کیوں اماں۔۔۔ آپ تو چاہتی تھیں میں پڑھوں۔"

"ختم کردی میں نے اپنی خواہش۔"

انہوں نے اریب فاطمہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ اتنے دن گزرنے کے بعد بھی نہیں۔ حالانکہ کئی بار ان کا جی چاہا تھا۔ وہ اس سے پوچھیں کہ وہ دوپہر کے وقت کس سے ملنے پارک میں گئی تھی۔ لیکن پھر نہیں پوچھ سکی تھیں۔

"نہیں' اسے دکھ ہوگا۔ میری بیٹی ایسی نہیں ہے۔ ضرور مائرہ نے الزام لگایا ہوگا۔"

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ نہیں پوچھ سکی تھیں۔

اریب فاطمہ بال ٹھیک کرتی ہوئی باہر آئی اور ایک نظر تخت پر خاموش بیٹھی سائرہ کی طرف دیکھا اور صحن میں پڑے حمام کے سامنے چوکی پر بیٹھ کر وضو کرنے لگی۔

"اریب فاطمہ۔" سائرہ نے ایک گہرا سانس لیا اور اسے پکارا۔ اریب فاطمہ نے مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔

"تم پرائیویٹ امتحان بھی تو دے سکتی ہو نا؟"

اریب فاطمہ نے ایک شاکی سی نظر ان پر ڈالی اور پھر مڑ کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔ الریان میں سب کو ہی اس کے اس طرح تعلیم یوں ادھوری چھوڑ کر آجانے پر دکھ تھا۔ منیبہ' حفصہ' مریبہ حتیٰ کہ سمیرا نے بھی فون کیا تھا۔ وہ کیا کہتی سوائے اس کے کہ ابا نے منع کردیا ہے۔

"تم کہو تو بابا جان سے کہوں۔ تمہارے ابا سے بات کریں۔" منیبہ ہمیشہ کی طرح پریشان ہورہی تھی۔

"نہیں منیبہ! میں خود بھی ایسا نہیں چاہتی۔"

اس نے اپنی افسردگی چھپائی تھی اور منیبہ سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ ایبک زلزلے والے علاقے میں گیا ہوا ہے اور یہ کہ وہاں سگنل نہیں ملتے۔ عمر دن میں چھ بار فون ملاتا ہے۔ تب کہیں اس کی بات ہوپاتی ہے۔

"اور پتا نہیں ایبک کب واپس آئے گا اور کب عمارہ آنٹی کو بھیجے گا۔" وضو کرتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی۔ لیکن نہیں جانتی تھی کہ ایبک کا رشتہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

☼ ☼ ☼

مروہ پھپھو نے باقاعدہ ایبک کا رشتہ مانگا تھا۔ وہ عمارہ کے ساتھ آئی تھیں۔

"مروہ آنٹی!" وہ ان کے گلے لگ کر بے تحاشا روئی تھی۔ "میں نے آپ کو بہت مس کیا۔"

"میں نے بھی میری جان!" وہ اسے ساتھ لے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن اماں نے منع کردیا۔ پھر بھی وہ خوش تھی۔ اماں اور ابا نے انہیں سوچ کر جواب دینے کو کہا تھا۔ ایبک نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا۔ وہ پر یقین تھی کہ اماں' ابا کو ضرور منالیں گی۔ وہ جانتی تھیں کہ وہ ایبک کو پسند کرتی ہے۔

پھر پتا نہیں کیوں ایبک کے رشتے کا انکار کردیا گیا تھا۔ ابا نے کہا تھا۔ وہ اس کی شادی اپنی بہن کے گھر کرنا چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں زبان دے چکے ہیں۔

سائرہ خاموش رہی تھیں۔ حالانکہ پہلے جب بھی اس سلسلے میں بات ہوتی تھی تو وہ صاف صاف کہتی تھیں' میں اپنی بیٹی کی شادی ان اجڈ لوگوں میں ہرگز نہیں کروں گی۔

مروہ پھپھو نے انکار سننے کے باوجود گاؤں کا چکر لگایا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ نہ ابا مانے تھے' نہ اماں نے کچھ کہا تھا۔

شہریار سے اسے اتنا پتا چلا تھا کہ شیخ عبدالعزیز واپس اپنے ملک چلے گئے ہیں اور ان کا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں۔

ارباب حیدر نے عظمت یار کو بتایا تھا اور انہوں نے فوراً" ہی پھپھو کو ہاں کردی تھی جو پچھلے کئی سالوں سے خواہش مند تھیں۔

"اریب فاطمہ! انسان کی عزت نفس ہر چیز سے زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔" اس رات سائرہ نے اسے روتے دیکھ کر کہا تھا۔ "میں نہیں چاہتی کہ تمہاری شادی مائرہ کے خاندان میں ہو۔ وہ ہمیشہ تمہاری عزت کی بھوجو کرتی رہے گی۔"

"ایبک "الریان" میں نہیں رہتا اماں! آپ جانتی ہیں' پھر بھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ آپ نے ابا کو اپنی مرضی کرنے دی۔"

"ہاں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ اس لیے کہ میں بھی نہیں چاہتی۔ جانتی ہو' مائرہ نے تمہارے متعلق کیا کہا؟"

"کیا کہا؟"

"اس نے تمہارے کردار پر شک کیا۔ اس نے کہا کہ تم ایسی لڑکی ہو کہ اسے ڈر ہے کہ تم الریان کے لڑکوں کو بھی پھنسالوگی۔ میں نہیں چاہتی کہ مائرہ کی بات سچ ہو اور وہ کل میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہے کہ وہ سچی تھی اور تم نے۔۔۔"

"لیکن اماں! آپ تو جانتی ہیں' ایسا نہیں ہے۔ آپ کی بیٹی ایسی نہیں ہے۔" وہ رونے لگی تھی۔ "صرف اتنی سی بات کے لیے آپ نے۔۔۔"

"یہ اتنی سی بات نہیں اریب فاطمہ! یہ پوری زندگی پر محیط ہوجاتی ہے۔ میں نے صرف اتنی سی بات پر ہی پوری زندگی لوگوں سے ڈر کر اور نظریں جھکا کر گزاری ہے۔"

"لیکن اماں! آپ کیوں ڈریں لوگوں سے۔ آپ نے کچھ نہیں کیا تھا۔ آپ کا ضمیر مطمئن تھا۔" اریب فاطمہ کو سائرہ سے اختلاف تھا۔ لیکن وہ انہیں قائل نہیں کرسکی تھی۔

"اریب فاطمہ! مجھے شرم سار نہ کرنا۔ یہ شرمندگی میری جان لے لے گی۔" ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔ بے بسی تھی اور اس پر یقین بھی کہ وہ ان کا مان نہیں توڑے گی۔

اور اس نے ایبک کا نمبر پھاڑ کر پھینک دیا کہ کہیں کسی کمزور لمحے میں اماں کی نظروں میں وہ بے اعتبار نہ ہوجائے۔

زینب نے اسے ایبک کے بار بار آنے والے فون کا بتایا تو اس نے کہہ دیا کہ وہ اسے بتادے کہ وہ یہاں سے جاچکے ہیں۔ اس نے ہر وہ راستہ بند کرنے کی کوشش کی جو ایبک کو اس تک لاسکتا تھا۔

عظمت یار' اسفند یار' ابا سب کے پاس اپنے اپنے سیل فون تھے۔ سو لینڈ لائن فون بند کردیا گیا تھا کہ ابا کو

فضول خرچی کی عادت نہ تھی۔ یوں "اریان" سے بھی اس کا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ مروہ پھپھو ایک بار پھر ملک سے باہر چلی گئی تھیں اور اماں سے چونکہ اس رشتے کی وجہ سے ناراض تھیں۔ اس لیے نہ تو جانے سے پہلے ملنے آئیں۔ نہ کوئی اطلاع بھجوائی۔ فون تو بند ہی ہو گیا تھا۔ یہ رابطہ بھی نہیں رہا کہ ایبک ان کے ذریعے ہی گھر تک آجاتا۔

☼ ☼ ☼

اور پھر سچ مچ ہی انہوں نے گاؤں چھوڑ دیا تھا اور زمینیں ٹھیکے پر دے دی تھیں۔ ارباب حیدر کے اصرار پر وہ صادق آباد منتقل ہو گئے تھے۔ بہت بڑا اور خوب صورت گھر رہنے کے لیے ارباب حیدر نے سیٹ کروا دیا تھا۔ اسفند یار اور عظمت یار اس کے ساتھ کام کرتے تھے اور ان کے پاس بے تحاشا پیسہ آگیا تھا۔ اپنی گاڑی تھی جو رجی نے گفٹ کی تھی۔ اس کے علاوہ اسفند یار نے بھی ایک گاڑی خرید لی تھی۔ وقت گزاری کے لیے اس نے بھی ان کے ادارے میں جاب کر لی تھی۔ اس کا کام سلائی کرنے والی عورتوں کی نگرانی کرنا تھا۔ یوں اس نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔

صادق آباد کا مرکز چک 151 کے مرکز سے خاصا چھوٹا تھا یہاں صرف آٹھ' دس عورتیں کام کرتی تھیں۔ ایک گھر کی نچلی منزل میں یہ کام ہوتا تھا۔ جبکہ فرسٹ فلور پر ارباب حیدر کا آفس تھا۔ جو ہفتے میں تین دن صادق آباد اور چار دن چک میں رہتا تھا۔ جب وہ صادق آباد آتا تو اسفند یار یا عظمت میں سے کوئی اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ پس پردہ یہاں کیا ہوتا تھا۔ اریب فاطمہ نہیں جانتی تھی۔ گھر میں اسفند یار' عظمت یار اور ابا کے درمیان اس کے رشتے کے سلسلے میں تکرار رہنے لگی تھی۔

ابا چاہتے تھے کہ وہ اریب فاطمہ کی شادی اپنے بھانجے سے کر دیں۔ جبکہ دونوں کا خیال تھا کہ شیخ کا انتظار کیا جائے۔ وہ کسی وقت بھی آسکتا ہے۔ اپنے بزنس کے سلسلے میں مصروف ہو گیا ہے۔

"ارباب حیدر نے بتایا ہے مجھے کہ اس کے جلد آنے کا امکان نہیں ہے۔ میں ساری زندگی اسے نہیں بٹھا سکتا۔" ابا کا موقف تھا۔ لیکن اسفند یار اور عظمت یار کا اسٹیٹس بدل چکا تھا اور انہیں اپنا پھوپھی زاد پسند نہیں تھا۔ وہ بھول گئے تھے کہ کبھی وہ بھی زمینوں پر کام کرتے تھے۔ اریب فاطمہ نے خود کو بے نیاز کر لیا تھا۔ وہ صبح مرکز میں چلی جاتی' دو بجے گھر آتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کوئی کام ہوتا کر دیتی۔ کوئی بات کرتا جواب دے دیتی' ورنہ چپ رہتی اور ایبک کو بھلانے کی کوشش کرتی۔ لیکن اسے بھولنا اس کے بس میں نہیں تھا وقت گزر رہا تھا اپنی رفتار سے۔ لیکن اریب فاطمہ کو لگتا جیسے ایک ایک لمحہ' ایک ایک صدی بن کر گزر رہا ہو۔

☼ ☼ ☼

احسان شاہ اپنے بیگ کی زپ بند کر رہے تھے کہ رابیل دستک دے کر کمرے میں آئی۔

"آپ کہیں جا رہے ہیں پاپا؟"

"ہاں۔۔۔ آجاؤ بیٹا! کیا بات ہے؟" احسان شاہ نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"پاپا! میں ایم فل کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور کرو بیٹا۔" انہوں نے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر کچھ کاغذات نکالے اور بیگ کی زپ کھول کر بیگ میں رکھے۔

"تو پاپا! میں اپلائی کر دوں ایڈمیشن کے لیے۔ سارا دن گھر میں بور ہوتی ہوں۔"

"کوئی ضرورت نہیں ایم فل کرنے کی۔" مائرہ واش روم کا دروازہ کھول کر باہر آئی تھیں۔ "اگلے ماہ منیبہ کی شادی ہے۔ پھر مریّنہ کی ہو جائے گی۔ تم بیٹھی پی ایچ ڈی کرتی رہنا۔ چند دن میں فیصلہ کر لو۔ اس وقت اچھے رشتے آرہے ہیں۔ بعد میں کسی نے پوچھنا تک نہیں۔"

رابیل نے کوئی جواب نہیں دیا اور احسان شاہ سے پوچھنے لگی تھی۔

"پاپا! آپ نے بتایا نہیں' آپ کہاں جا رہے ہیں؟"

"بہاول پور جا رہا ہوں۔" انہوں نے بیگ اٹھا لیا۔

"پھپھو کی طرف؟" رابیل کی آنکھیں چمکیں۔

"مجھے بھی لے چلیں پاپا! میں نے آج تک پھپھو کا گھر نہیں دیکھا۔ ہمدان بھائی نے بتایا تھا ایک دفعہ۔۔۔ پرانے اسٹائل کا بنا یہ گھر بہت خوب صورت ہے۔ کھڑکیوں پر رنگین شیشے اور چھتوں پر بھی آئینے لگے ہیں اور گھر کا نام بھی مراد محل ہے۔"

وہ بہت اشتیاق سے کہہ رہی تھی اور مائرہ غصے سے بل کھا رہی تھیں۔

"ہاں' پھر کبھی گیا تو لے چلوں گا۔ اس وقت تو مجھے دیر ہو رہی ہے۔ فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔"

"سچ پاپا!" وہ بے حد خوش ہوئی۔

"ہاں! تمہاری پھپھو کو بھی بہت خوشی ہو گی۔" انہوں نے سر ہلایا۔ اس کے سر پر پیار کیا۔

"اور ہاں تم۔۔۔ ایم فل' پی ایچ ڈی جو کچھ کرنا چاہو میری طرف سے اجازت ہے۔"

انہوں نے ایک اچٹتی سی نظر مائرہ پر ڈالی۔ جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے اور رابیل کو خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل گئے۔

رابیل نے مڑ کر مائرہ کی طرف دیکھا۔

"تھینک گاڈ! پاپا نے پھپھو اور موی انکل سے اپنی ناراضی ختم کر دی۔ اب آپ بھی ختم کر دیں ماما۔"

مائرہ ہونٹ بھینچے کھڑی تھیں۔

"اب جبکہ پاپا سمیت سب ہی کی صلح ہو گئی ہے تب آپ اکیلی رہ جائیں گی اس طرح۔"

اکیلی تو وہ ہو گئی تھیں۔ لیکن اس کے لیے وہ موی کو کبھی معاف نہیں کریں گی' کبھی نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ جب وہ رحیم یار خان چلی جائیں گی تو احسان شاہ ان کی جدائی برداشت نہیں کر پائیں گے۔ اتنی ہی شدید محبت تھی انہیں مائرہ سے' لیکن مائرہ کا خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ نہ ایک ماہ کے عرصہ میں احسان نے انہیں فون کیا تھا اور نہ ہی واپس آنے کو کہا تھا۔ رابیل سے ان کی بات ہوتی رہتی تھی۔ لیکن۔۔۔

عثمان شاہ' رحیم یار خان آئے تو وہ سمجھیں' ضرور احسان شاہ نے بھیجا ہو گا۔ لیکن پھر پتا چلا تھا کہ وہ اپنے کسی کام سے رحیم یار خان آرہے تھے تو عبدالرحمن شاہ نے انہیں کہا تھا کہ وہ مائرہ کو بھی لیتے آئیں۔

عبدالرحمن شاہ نے دو' تین بار احسان شاہ سے پوچھا تھا کہ مائرہ کے ساتھ ان کا کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا اور احسان شاہ نے انہیں یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن عبدالرحمن شاہ مطمئن نہیں ہوئے تھے اور انہوں نے عثمان سے کہا تھا کہ وہ مائرہ کے گھر ضرور جائیں اور ساتھ لے کر آئیں۔

وہ بہت خوش خوش واپس آئی تھیں۔ عثمان شاہ کے واپس آنے کے چند دن بعد ان کا خیال تھا کہ احسان شاہ والہانہ ملیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ احسان شاہ رات گئے کمرے میں آئے تھے اور ان سے بات کیے اور ان کی طرف دیکھے بغیر سو گئے تھے اور وہ تب سے لے کر اب تک جل رہی تھیں۔ غصے' نفرت اور انتقام سے۔۔۔ انہیں اپنے کیے پر کوئی شرمندگی نہ تھی۔

رابیل نے مائرہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں کو بغور دیکھا اور مسکرائی۔

"آپ سوچیے گا ضرور' پھر اکٹھے جائیں گے بہاول پور۔ عمر بھی بہت خوش ہو گا۔"

وہ جانے کے لیے مڑی تو مائرہ نے چونک کر اس کا بازو پکڑا' ان کی گرفت کافی سخت تھی۔ "بیٹھ جاؤ ادھر رابی۔"

"اوہ مما! کیا مسئلہ ہے؟"

"رابی!" وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔ "میں نے تم سے کچھ کہا تھا۔ تم طاہر سے مل چکی ہو۔ بات چیت بھی کی ہے۔ روبی کا بیٹا بھی اچھا ہے۔ مجھے دو' تین دن میں تمہارا فیصلہ چاہیے۔"

"مما! میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ مجھے نہ طاہر بھائی سے اور نہ ہی آنٹی روبی کے بیٹے سے شادی کرنی

ہے۔"

"دیکھو رابی! احمقانہ بات مت کرو۔ یہ تم اس لیے کہہ رہی ہو کہ تم ایبک کو پسند کرنے لگی ہو۔ جبکہ اگر عقل سے کام لو تو طاہر اور روبی کا بیٹا دونوں ہی ایبک سے اچھے ہیں۔ پھر ایبک تمہیں پسند بھی نہیں کرتا۔"

رابیل نے ایک نظر مائرہ کو دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

"آپ کو کیا پتا مما! میں ایبک کو صرف پسند نہیں کرتی اس سے محبت کرنے لگی ہوں اور محبت۔۔۔ یہ کیا ہے' آپ نہیں جانتیں' میں بھی نہیں جانتی تھی' لیکن اب جان گئی ہوں۔ اس محبت نے مجھے سرتاپا بدل ڈالا ہے۔ میری روح تک کو مہکا دیا ہے اس محبت نے۔ میں دن رات ایبک کو سوچتی ہوں۔ میں اپنی زندگی کا ہر لمحہ اس کے ساتھ بتانا چاہتی ہوں۔ اس میں کسی طاہر یا ہمدان کی گنجائش نہیں ہے۔ میں جانتی ہوں' میں نے محبت نہیں کی' نارسائی خریدی ہے۔ پھر بھی میں خود کو اس محبت سے باز نہیں رکھ سکتی' جو خودرو پودوں کی طرح میرے دل میں اگ آئی ہے۔"

وہ سچ مچ اس محبت کے معاملے میں بے بس ہو چکی تھی۔ خود کو بے طرح مصروف کر دینے کے باوجود وہ ایبک کا خیال دل سے نکال نہیں سکی تھی۔ پڑھتے ہوئے' تھیسس لکھتے لائبریری میں بیٹھے ہر وقت اس کے ذہن میں ایبک کا خیال رہتا تھا۔ ایبک بہت کم الریان آتا تھا۔ لیکن جب آتا تو یہ ایک ملاقات اسے مہینوں شاد رکھتی تھی اور وقت یوں ہی گزر رہا تھا ہولے ہولے رینگ رینگ کر۔

☼ ☼ ☼

تین سال بیت گئے تھے' پورے تین سال اور یہ ستمبر 2008ء کی صبح تھی' ملک ہاؤس کے ایک بیڈ روم میں احسان شاہ اور فلک شاہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ فلک شاہ کے ہاتھ میں "زمین کے آنسو" کا مسودہ تھا اور دونوں اس کا آخری باب ایک ساتھ پڑھ رہے تھے۔ پڑھتے پڑھتے احسان شاہ نے صفحات اپنی طرف کھینچے اور ہنس پڑے۔

"یاد ہے موی! جب ہم یو ای ٹی میں تھے تو یوں ہی ایک ہی نوٹ بک سے اکٹھا پڑھا کرتے تھے۔ زیادہ تر نوٹس تو تم ہی تیار کرتے تھے۔"

فلک شاہ مسکرا دیے۔ ان کا دھیان مسودے کی طرف تھا۔ تین سال پہلے ایبک نے اس ناول کو ادھورا چھوڑ دیا تھا اور اب تین سال بعد انہوں نے بے حد اصرار کر کے اسے مکمل کروایا تھا۔

"یار! پڑھنے دو نا۔" وہ جھنجلائے۔

"ہاں' ہاں تم پہلے پڑھ لو۔ بعد میں پڑھ لوں گا میں بھی۔" وہ بالکل ماضی کی طرح روٹھے تھے اور فلک شاہ ان کی ناراضی تو برداشت کر ہی نہیں سکتے تھے۔ بالکل ماضی کی طرح انہوں نے مسودہ ان کی طرف بڑھایا تھا۔

"لو پہلے تم پڑھ لو شانی!"

"اچھا چلو' دونوں پڑھتے ہیں۔" احسان شاہ مسکرائے اور اب صفحات احسان شاہ کے گھٹنوں پر تھے اور دونوں پڑھ رہے تھے۔ سب کچھ پہلے جیسا تھا۔ لیکن الریان کی جگہ ملک ہاؤس تھا۔ سارے تلخ اور اذیت ناک سال دونوں نے اپنی زندگی سے نکال دیے تھے۔ دونوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس موضوع پر کبھی بات نہیں کریں گے۔ شروع شروع میں فلک شاہ نے احسان شاہ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مائرہ کو معاف کر دیں۔ لیکن احسان شاہ نے کہہ دیا تھا کہ

"وہ اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے۔ یہ ان کا اور مائرہ کا معاملہ ہے۔ وہ اپنا دل اتنا بڑا نہیں کر سکتے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ وہ اسے دیکھنا نہیں چاہتے۔ لیکن اسے دیکھتے ہیں۔ اسے الریان میں ایک لمحہ کے لیے برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن کرتے ہیں۔ اس سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ لیکن دوسروں کے سامنے بات کرتے ہیں۔ اسے سننا نہیں چاہتے' لیکن سنتے ہیں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے۔ اس سے زیادہ وہ نہیں موی بس۔"

اور فلک شاہ پھر کبھی کچھ نہ کہہ سکے تھے۔

"تو دارو سائیں مر گیا تھا اور دور گاؤں سے اس کے چچیرے اور ممیرے بھائی اس کی میت لینے آئے تھے۔" احسان شاہ نے بلند آواز میں پڑھا۔

"دل میں پڑھو یار۔"

"اچھا۔۔۔!" احسان شاہ برا سا منہ بنا کر صفحات پر جھک گئے۔

"اب یہ تو غلط تھا نا کہ شریکے اس کا کفن دفن کرتے۔ عمر بھر کا طعنہ' آنے والوں میں مریم کا چھوٹا بھائی چوہدری ایاز بھی تھا۔ جو اپنے پھوپھی زاد بھائی کی میت لینے والوں کے ساتھ آیا تھا اور اس وقت چوہدری فرید کی حویلی کے بڑے کمرے میں بیٹھا مریم کو روتے دیکھ رہا تھا اور غصے سے بل کھا رہا تھا۔ رقیہ نے اسے سب بتا دیا تھا اور اس کے آگے ہاتھ جوڑے تھے۔

"ماما! رابعہ کو اپنے ساتھ لے جائیں' اسے بچالیں' پھوپھو کا بیٹا تو پاگل ہے۔"

چوہدری ایاز پڑھا لکھا تھا اور اپنے بڑے بھائیوں سے مختلف مزاج رکھتا تھا۔ اس نے چوہدری فرید سے بات کی تو وہ بھڑ گیا۔

"رابعہ میری بیٹی ہے۔ مجھے اس کا رشتہ کہاں کرنا ہے۔ اس کے لیے مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے چوہدری ایاز۔"

"تو اسے مارنا چاہتا ہے فریدہ کی طرح۔ میری بہن جس دن سے تیری حویلی میں آئی ہے' اس کی آنکھیں خشک نہیں ہوئیں۔ لیکن اب وہ رابعہ کو نہیں روئے گی چوہدری فرید۔"

"تیری بہن' بیٹی کو نہیں روتی۔ دارو کو روتی ہے' اپنے عاشق کو' میں نے خود دیکھا ہے' اسے دارو کے پاس بیٹھ کر روتے۔"

"خبردار! اس سے آگے ایک لفظ مت کہنا۔ چوہدری فرید! ورنہ میرے ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گے۔"

اس کے لہجے میں کچھ تھا' ایسا کہ چوہدری فرید خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن مریم پھٹی پھٹی آنکھوں سے چوہدری فرید کو دیکھتی تھی اور سوچتی تھی' کیا صرف اس تہمت کی کسر رہ گئی تھی۔

وہ دس سال کی تھی' تقریباً" جب دارو آخری بار پھپھو کے ساتھ گاؤں آیا تھا۔ واپس جا کر پھپھو مر گئی اور اس کے بعد دارا کو اس نے تب دیکھا تھا جب اس کی گود میں رابعہ تھی اور دارا اس کے گاؤں کی گلیوں میں ننگے پاؤں بھاگتا پھرتا تھا۔ دور گاؤں سے نکل کر جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتا وہ یہاں ٹھہر گیا تھا۔

اس روز تو ایاز میت کے ساتھ چلا گیا تھا۔ لیکن وہ پھر آیا تھا۔ چوہدری فرید ڈیرے پر تھا اور ثریا نے اس کی مدد کی تھی اور وہ مریم' حورعین' رابعہ اور رقیہ کو لے کر چلا گیا اور ثریا نے چوہدری فرید کو ان کی طرف پلٹنے ہی نہیں دیا۔ اب وہ حویلی کی تنہا مالک تھی اور اس نے چوہدری فرید کی بہن کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ لیکن مریم کے بڑے دونوں بھائیوں اور بھابھیوں کو ان کا اپنی حویلی میں رہنا پسند نہیں آیا تھا۔"

حورعین بتا رہی تھی اور میں چپکے چپکے اس کے ملیح چہرے کو تکتا تھا۔

"ایاز ماما فاریسٹ آفیسر تھے اور یہاں وادی میں رہتے تھے۔ وہ مریم اور اس کی تینوں بیٹیوں کو ساتھ لے آئے تھے اور مریم بھائی اور بھابھی کے ساتھ اس بنگلے میں رہنے لگی تھی جو اسے ملا ہوا تھا۔ مامی بھی اچھی تھی۔ سب کا خیال رکھتی بھی۔ مریم روتی تو اس کے آنسو پونچھتی تھی۔"

چوہدری ایاز نے رابعہ اور حورعین کو اسکول میں داخل کروا دیا تھا اور رقیہ کو گھر پر خود ہی پڑھانے لگا تھا۔ اسے نوکری کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن وہ اپنے علاقے کے زمین دارانہ نظام سے نفرت کرتا تھا۔ سو اسے زمینوں سے دلچسپی نہ تھی۔ حورعین نے پہلی بار مریم کو مطمئن اور پرسکون دیکھا تھا۔ گو اس کی آنکھیں اب بھی نم رہتی تھیں۔ لیکن چہرہ پرسکون ہوتا۔ لیکن پھر سب کچھ الٹ پلٹ گیا۔

8 اکتوبر دو ہزار پانچ کی صبح نے حورعین سے سب کچھ چھین لیا۔ رقیہ' رابی' مریم اور چوہدری ایاز کا اکلوتا بیٹا سب ملبے تلے دب گئے۔ حورعین اکیلی رہ

گئی۔ مہینوں اس کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔ لیکن پھر ماما ایاز اور مامی کے بار بار سمجھانے پر اس نے پڑھائی شروع کی اور پڑھ کر وادی کے اسکول میں ہی ٹیچر لگ گئی۔

لیکن حورعین کے آنسو خشک نہیں ہوئے۔

اس کی آنکھیں لہو روتی ہیں۔

اسے سب یاد آتی ہیں۔ سعدیہ، فریدہ، رقیہ، رابعہ، مریم۔

وہ رو رہی تھی اور میری آنکھیں حورعین کے ساتھ آنسو بہا رہی تھیں۔

اس زلزلے نے لاکھوں زندگیوں کے چراغ بجھا دیے تھے۔ میں کتنی ہی بار مظفر آباد اور دوسرے زلزلہ زدہ علاقوں میں گیا تھا۔ مجھے اپنی ہی لکھی ہوئی ایک نظم یاد آ رہی تھی جو میں نے اس سانحے کے بعد لکھی تھی۔

"ایک نظم سنو گی حورعین!؟"

اس نے سر ہلا دیا۔ تو میں نے اپنی نظم کے کچھ حصے اسے سنائے۔

وہ ملبے کے اک ڈھیر کے پاس
آنکھوں میں آنسو لیے چپ کھڑا سوچتا تھا
وہ پیارا سا بچہ
یہاں میرا کمرہ تھا
یہاں میرے بابا کا اور میری ماما کا
یہیں پر کہیں میری تختی پڑی تھی
اور یہیں پر کہیں میری ماما بھی سوئی ہوئی ہیں
یہیں پر کہیں میری آپا کا کمرہ بھی تھا
میری پیاری سی اچھی سی آپا
کہاں کس جگہ ہے
شاید یہاں کہ یہاں
یہ چھوٹی سی گڑیا اس کی پڑی ہے
میری اچھی آپا، میری پیاری آپا
ملبے کے اس ڈھیر سے ڈھونڈ لو
کوئی ننھا سا رستہ

احسان شاہ جھرجھری لے کر سیدھے ہو گئے "کیا قیامت تھی وہ بھی۔ اتنی تباہی و بربادی تین سال گزر گئے۔ لیکن ابھی تک بحالی کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔"

اب وہ اکتوبر 2005ء میں آنے والے زلزلے پر بات کر رہے تھے۔

"یار! یہ پڑھنے دو۔ ابھی ایبک آجائے گا لینے۔ جب تک میں پورا ناول نہیں پڑھوں گا۔ تبصرہ کیسے لکھوں گا۔" احسان شاہ نے کچھ صفحات ان کے ہاتھ سے لے لیے۔

حورعین رو رہی تھی اور میں کہہ رہا تھا۔

"مت رؤ حورعین! میں نے تمہاری ہنسی کی آواز کبھی نہیں سنی اور تمہارے رونے کی آواز مجھے اذیت دیتی ہے۔ تمہارے رونے سے میرا بدن اور میرا دل ترخ ترخ کر ریت کی طرح آہستہ آہستہ مٹی میں ملنے لگتا ہے۔

حورعین میری تمام اذیتوں میں سے سب سے بڑی اذیت یہ ہے کہ میں تمہارا دکھ کم نہیں کر سکتا۔ لیکن خود دکھی ہو سکتا ہوں تمہارے لیے۔ اتنا زیادہ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھڑائے نہیں۔ بس نم آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی۔

"حورعین!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "میں تمہارے ماموں اور مامی کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے شریک زندگی کرنا چاہتا ہوں حورعین! مجھے تمہاری رفاقت کی بہت شدید تمنا ہے۔ بہت نزدیک سے تمہاری مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تمہاری ہنسی سننا چاہتا ہوں۔ تمہارے آنسوؤں کے بدلے تمہیں اپنی محبت دان کرنا چاہتا ہوں۔ اپنے آنسو مجھے دے دو حورعین۔"

حورعین نے اپنے ہاتھ چھڑا لیے اور کھڑی ہو گئی۔

"ماما ایاز ماما نے جاب چھوڑ دی ہے اور ہم آج کراچی جا رہے ہیں تمہارے شہر۔"

"تو؟" میں اس کے پیچھے لپکا۔ "میں کہاں ڈھونڈوں گا تمہیں اس اتنے بڑے شہر میں مجھے اپنا پتا تو دے دو پلیز۔"

"میں تمہیں ڈھونڈ لوں گی۔" اس نے مڑ کر دیکھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے گمان ہوا کہ اس کی بھیگی آنکھوں میں مسکراہٹ کا جگنو سا چمکا ہو۔

"حورعین! رکو پلیز۔"

لیکن وہ رکی نہیں تھی اور میں اس کے لفظوں کے معنی ہی ڈھونڈتا رہ گیا تھا۔

"اس کے بعد والے صفحات دو یار۔"

احسان شاہ نے پڑھے ہوئے صفحات انہیں پکڑائے۔ فلک شاہ اوراق الٹ پلٹ کر رہے تھے۔

"آخری صفحات تو نہیں ہیں شانی۔ یہ تمہارے پاس 451 صفحہ ہے۔ اس کے بعد کوئی صفحہ نہیں ہے۔"

"دکھاؤ۔" احسان شاہ نے مسودہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور صفحات کے نمبر دیکھنے لگے۔ تب ہی عمارہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"چائے بھجواؤں؟"

"ضرور۔" فلک شاہ نے ان کی طرف دیکھا۔ "اور ذرا ایبک سے کہنا آخری صفحات نہیں ہیں فائل میں۔"

ایبک بھی اس وقت ملک ہاؤس میں ہی تھا۔ ان بیتے تین سالوں میں کتنی ہی بار عمارہ اور فلک شاہ ملک ہاؤس آئے تھے اور کتنی ہی بار احسان شاہ بہاول پور گئے تھے۔ فلک شاہ اور عمارہ ملک ہاؤس آتے تو احسان شاہ بھی بابا جان کے ساتھ ادھر منتقل ہو جاتے اور "الریان" کی رونقیں ملک ہاؤس میں منتقل ہو جاتیں۔ عمر نے ملک ہاؤس کو الریان ثانی کا نام دے رکھا تھا۔

احسان شاہ فلک شاہ کے کمرے میں براجمان رہتے تو عمارہ بابا جان کے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیتیں اور پھر اس سارے عرصہ میں احسان شاہ، فلک شاہ کا ہر کام اپنے ہاتھوں سے کرتے۔ ان کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ہمیشہ ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتیں اور ہر بار ہی پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر فلک شاہ جان جاتے کہ اس کی آنکھیں نم ہو رہی ہیں اور وہ ہنس کر کہتے۔

"شانی یار! اب اس معذور کو اسی ٹوٹی پھوٹی حالت میں قبول کر لو۔ کب تک سوگ مناتے رہو گے۔"

احسان شاہ مصنوعی طور پر ناراض ہوتے، خفا ہونے کی دھمکی دیتے۔ لیکن ان کی وہیل چیئر دھکیلتے رہتے اور کچھ دیر بعد ہی ملک ہاؤس ان کے قہقہوں سے گونج اٹھتا۔

ایبک ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑا برش کر رہا تھا۔ آج اسے اپنے پبلشر سے ملنا تھا۔ فلک شاہ کے بے حد اصرار پر اس نے اپنا ناول مکمل کر لیا تھا۔ ورنہ پچھلے تین سال سے وہ عجیب مشینی سی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ انسان سے ایک روبوٹ میں ڈھل گیا ہو۔ صبح، دوپہر، شام کام، کام اور کام، اس نے اپنی زندگی بہت سے خانوں میں بانٹ لی تھی۔ شاید اس طرح وہ اریب فاطمہ کو بھلانا چاہتا تھا۔

لیکن کیا واقعی وہ اریب فاطمہ کو بھلانے میں کامیاب ہو گیا تھا؟ اس نے بارہا خود سے سوال کیا تھا۔ لیکن ہر بار اسے اس کا جواب نفی میں ملا تھا۔

وہ اریب فاطمہ کو شاید کبھی نہیں بھلا پائے گا، کبھی نہیں۔ اس نے کبھی اریب فاطمہ سے بڑے بڑے ڈائیلاگ نہیں بولے تھے۔ ان کے درمیان بہت کم بات ہوئی تھی۔ لیکن وہ اس کے دل میں براجمان تھی روز اول کی طرح۔ جب وہ چھپ چھپ کر منیبہ کی اوٹ سے... اسے دیکھتی تھی۔ تب ہی وہ چپکے سے اس کے دل میں اتر آئی تھی۔

سہمی ہوئی ہرنی جیسی، پتا نہیں کیا ہوا تھا اس کے ساتھ اور کہاں تھی وہ اور کس کے شبستان میں دمکتی تھی۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

وہ قلم اٹھاتا تو اریب فاطمہ کا چہرہ اس کے سامنے آجاتا۔ حورعین کا سراپا اس نے اریب فاطمہ کو ہی سامنے رکھ کر تراشا تھا۔ پھر رات جاگتے اور سگریٹ پھونکتے گزر جاتی تھی اور سگریٹ پینا اس نے تین سال پہلے ہی تو شروع کیا تھا۔

فلک شاہ چاہتے تھے۔ وہ اپنا ناول مکمل کر لے اور

اس فیز سے باہر نکل آئے جو اچانک ہی اس کی زندگی میں آگیا تھا۔ سو۔۔۔

"ایبک۔۔۔" عمارہ نے کھلے دروازے سے جھانکا۔ "تمہارے بابا کہہ رہے ہیں' آخری صفحات نہیں ہیں۔"

"یہ رہے۔" ایبک نے بیڈ پر پڑے کلپ بورڈ کی طرف دیکھا۔ "میں ایک نظر دیکھ کر لا رہا ہوں۔"

"میں چائے بنوانے جا رہی تھی۔ تم بھی پیو گے۔"

"یس پلیز۔"

ایبک مسکرایا اور پرفیوم کا اسپرے کر کے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اس نے کلپ بورڈ اٹھایا۔ جس میں آخری چند صفحات لگے ہوئے تھے۔ اس نے سرسری سی نظر ڈالی۔

"یہ میرا شہر کراچی ہے۔

میرا شہر محبت۔"

لیکن اس شہر نے مجھے بہت دکھ دیے ہیں۔ زخم' زخم ہوں' کرچی کرچی ہوں۔

جانتی ہو' اس میں زندگی کو کتنی سفاکی سے ختم کیا جا رہا ہے۔

موت ارزاں ہے۔

میرے اس شہر محبت کو اجاڑا جا رہا ہے۔

میری آنکھوں میں رو' رو کے زخم ہو گئے ہیں۔

میں جتنا تمہاری جدائی میں' تمہارے بچھڑ جانے کے دکھ سے رویا ہوں۔ اس سے کہیں زیادہ اس شہر کے لیے رویا ہوں۔

یہ شہر جس کی گود ماں کی طرح مہربان تھی۔

اور جس نے ہر زبان بولنے والے کو ایک ماں کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

اب یہاں گولیاں چلتی ہیں حور عین!

بوری بند لاشیں ملتی ہیں۔

اس نے آنسوؤں کی سوداگری کر لی ہے اور اب آنسو بیچتا اور خریدتا ہے۔

گلیاں' چوک' راستے لاشوں سے بھر جاتے ہیں۔

لوگ لاشیں اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔

میرے ملک کے سارے شہروں میں آنسوؤں کی برسات ہوتی ہے۔ خون کی ندیاں بہتی ہیں اور لاشوں کی فصل اٹھائی جاتی ہے۔ یہ آج کی تاریخ ہے۔

میرے بلوچستان کی۔

میرے سرحد اور پنجاب کی۔

میرے سندھ اور کراچی کی۔

تم تاریخ کے المیوں پر روتی ہو۔ ماضی کے المیے' مجھے آج کی تاریخ رلاتی ہے۔ حور عین! ہماری تاریخ کی جھولی میں اتنے آنسو' اتنے المیے کہاں سے آ گئے۔ کیسے آ گئے۔ کبھی اس پر ضرور سوچنا اور کچھ جان پاؤ تو مجھے بھی بتانا۔ میں تو تمہارے لیے ہنسی خریدنے نکلا تھا حور عین! میری جھولی آنسوؤں سے بھری ہوئی ہے اور میں آنسو بیچتا پھرتا ہوں۔

میرے شہر میں اب لہو کا کاروبار ہوتا ہے۔"

آج میں کہہ رہا تھا اور حور عین سن رہی تھی۔ اس نے مجھے ڈھونڈ لیا تھا۔

"تم نے مجھے اتنی دیر سے کیوں ڈھونڈا حور عین؟"

میں نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں غم پھیلتا جا رہا تھا۔ آج اس نے سفید اوڑھنی لے رکھی تھی۔

سیاہ اور سفید دونوں ہی رنگ اس پر سجتے تھے۔

"میرا خیال تھا کہ تم اتنے نامور شاعر ہو۔ جس کسی سے پوچھوں گی' تمہارا پتا مل جائے گا۔ لیکن تمہیں ڈھونڈنے میں اتنا وقت لگ گیا۔"

"ہاں حور عین! لوگ اب ادیبوں اور شاعروں کو نہیں جانتے' ان سے تو دھماکوں' گولیوں اور بموں کا پوچھو' کس شہر میں کتنے دھماکے' کتنے ڈرون حملے ہوئے' کتنے لوگ مرے' لوگوں نے ایک دن میں کتنی لاشیں اٹھائیں' وزیرستان میں ہونے والے ڈرون حملوں میں کتنے بے گناہ مارے گئے۔ وہاں کے لوگ تو اب ان بے گناہوں کے لاشے اٹھاتے اٹھاتے تھک گئے ہیں۔"

"ہاں تم صحیح کہتے ہو' لوگوں کو آنسو بہت پسند آ گئے ہیں۔ وہ صرف آنسوؤں کا کاروبار کرنے لگے ہیں۔"

حور عین! کے آنسو اس کے رخساروں پر ڈھلک آئے تھے۔

"تم نے کہا! حور عین ہر میاہ نبی نے یروشلم کا مرثیہ لکھا تھا۔ عراق و ڈھاکہ کے مرثیے کون لکھے گا۔ اب میں تم سے پوچھتا ہوں' میرے شہروں کی سڑکوں پر بے گناہ مرنے والوں کے مرثیے کون لکھے گا۔ ان بچوں کے جن کے ابھی کھیلنے کے دن تھے۔ ان جوانوں کے جنہوں نے بوڑھوں کا سہارا بننا تھا۔"

میں نے اپنے ٹیبل پر پڑے اخبار کی طرف دیکھا' جسے حور عین کے آنے سے پہلے میں پڑھ رہا تھا۔ پہلے صفحے پر اس کی تصویر تھی۔ اس بچے کی جو گھر سے شاید کچھ لینے نکلا تھا۔ اب سڑک پر اوندھا پڑا تھا اور اس کے ایک ہاتھ کی بند مٹھی میں شاید پیسے تھے اور زمین پر چند ٹافیاں پڑی تھیں اور زمین اس کے خون سے رنگین ہو رہی تھی۔

"آہ۔۔۔" میرے لبوں سے نکلا۔ لوریاں سننے والا۔ لہو کی گلابی ردا اوڑھ کر سو گیا۔ غضب کا نشانہ ضروری نہیں۔

اور وہ جو کچے گھروندے کا ماہ پارہ تھا۔ شب کا مقدر لکھا جا چکا۔

"ایبک۔۔۔ ایبک بیٹا! چائے بن گئی ہے' آ جاؤ۔"

عمارہ نے باہر سے آواز دی تو وہ کاغذ سمیٹ کر باہر آ گیا۔ عمارہ خود ہی چائے لیے فلک شاہ کے کمرے کی طرف جا رہی تھیں۔

"یار! ناول تو تمہارا اچھا ہی ہے۔" اسے کمرے میں آتے دیکھ کر احسان شاہ مسکرائے تھے اور اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔

"پتا نہیں اب اسے پذیرائی ملے گی یا نہیں' جو پہلے ناولوں کو ملی تھی۔ میں نے اس میں ایک نیا تجربہ کیا ہے۔"

"بھئی۔۔۔ مجھے تو بہت پسند آیا۔ یہ بتاؤ' تم اپنی حور عین سے کب ملوا رہے ہو؟"

اور ایبک کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔ اندر دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی تھی۔

"تم اور ہمدان اب قسم توڑ دو' تاکہ بے چارے زبیر کی باری آئے۔"

"آپ زبیر کو انتظار کیوں کرواتے ہیں ماموں جان! میرا اور ہمدان کا کیا پتا' بس اچانک ہی دھماکہ کریں گے۔" ایبک زبردستی مسکرایا۔

فلک شاہ نے اس کی آنکھوں میں تیرتے درد کو محسوس کیا اور احسان شاہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے موضوع تبدیل کیا۔

"بابا جان کی طبیعت تو ٹھیک ہے شانی! ابھی تک نظر نہیں آئے۔"

"وہ صبح صبح الریان چلے گئے تھے۔ مصطفیٰ بھائی کے ساتھ کہیں جانا تھا انہیں۔"

عمارہ نے چائے بناتے ہوئے جواب دیا اور چائے کا کپ ان کی طرف بڑھایا۔

"عمو! تم آج بھی چائے بہت اچھی بناتی ہو۔" شانی نے چائے کا گھونٹ بھرا اور محبت سے انہیں دیکھا۔ جبکہ فلک شاہ بغور ایبک کو دیکھ رہے تھے اور اس کے دل میں کروٹیں لیتے درد کو محسوس کر رہے تھے جو چھپانے کے باوجود اس کی آنکھوں سے جھانکتا تھا۔

"یا اللہ! میرے بیٹے کی نارسائی ختم کر دے۔ کیا تھا اگر اریب فاطمہ اس کی زندگی میں شامل ہو جاتی اور۔۔۔"

ایک گہری سانس لے کر وہ چائے پینے لگے۔ انہوں نے اپنے طور پر کسی کو بتائے بغیر مروہ پھپھو کے ذریعے کوشش کی تھی کہ بات بن جائے' لیکن مروہ پھپھو نے جانے سے پہلے انہیں بتایا تھا کہ چند روز بعد اس کی شادی ہونے والی ہے اور اس صورت میں ان کا یا عمارہ کا وہاں جانا اریب فاطمہ کی آئندہ زندگی کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔ انہیں اریب فاطمہ اپنی بیٹی کی طرح عزیز تھی۔ انہیں سائرہ بھی عزیز تھی اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ اریب فاطمہ کی زندگی بھی اپنی ماں کی طرح گزرے سر جھکائے۔ وہ چاہتی تھیں کہ اریب فاطمہ اپنے سسرال میں سر اٹھا کر اس طرح زندگی گزارے کہ ماضی کا کوئی حوالہ اس کے ساتھ نہ ہو۔

بار بار وہاں جانے اور منتیں کرنے سے ان لوگوں کو شک ہو سکتا ہے۔

یہ بات انہوں نے فلک شاہ کو ہی نہیں ایبک کو بھی سمجھائی تھی۔

اس کا باپ اور بھائی بڑے اکھڑ ہیں اور اس کے ددھیال والے بھی۔ اگر تمہیں اریب فاطمہ کا ذرا سا بھی خیال ہے تو تم ایسا کچھ نہیں کروگے جس سے اس کی زندگی خراب ہو۔

اور فلک شاہ نے ہی نہیں ایبک نے بھی یہ بات سمجھ لی تھی۔

"محبت صرف پالینے کا نام نہیں ہے۔" ایبک نے خود کو سمجھایا تھا۔

"اور محبت کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

یہ اس نے ان تین سالوں میں جان لیا تھا۔ خود کو بے طرح مصروف کر لینے کے باوجود اریب فاطمہ اس کے دل میں روز اول کی طرح موجود تھی۔ ان تین سالوں میں اس کا نام ایک بے باک صحافی کے طور پر جانا جانے لگا تھا۔ وہ ایک چینل پر سیاسی تبصرے بھی کرنے لگا تھا۔ گو وطن دوست ایک فلاحی تنظیم تھی۔ لیکن وہ خود کو سیاست سے دور نہیں رکھ پا رہا تھا۔ شاید کوئی بھی محب وطن شخص خود کو ان حالات میں دور نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب تین سالوں میں کیا کچھ نہیں ہوا تھا۔

چیف جسٹس کا معطل ہونا۔

لال مسجد کا خونی واقعہ۔

پوپ بینیڈکٹ کی گستاخی اور معذرت۔

نواز شریف کی واپسی۔

سمجھوتا ٹرین بم بلاسٹ۔

بلوچستان کے حالات۔

فاٹا میں دہشت گردی کی خود ساختہ جنگ۔

بے نظیر کی واپسی پر سیکڑوں افراد کی ہلاکت۔

نارتھ وزیرستان میں سیکڑوں افراد کی اموات۔

ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ۔

بے نظیر کی شہادت۔

اور پھر مشرف سے چھٹکارا اور پی پی کی حکومت ابھی چند دن پہلے ہی تو زرداری نے صدارت کا حلف اٹھایا تھا۔

2005ء سے 2008ء تک کے اوراق آنسوؤں اور خون سے بھیگے ہوئے تھے اور ابھی نہ جانے کتنے آنسو برسنا تھے اور کتنا خون بہنا تھا۔ وہ سیاسی پروگرام کرتا تو اس کی آواز بھیگ جاتی تھی۔ اس نے اس وطن کو بنتے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ وطن اور آزادی کی اہمیت جانتا تھا۔ دن بھر مصروف رہنے کے بعد جب وہ رات کو بیڈ پر لیٹتا تو اریب فاطمہ کا خیال بے چین کر دیتا۔

پتا نہیں کہاں ہوگی، کس حال میں۔

یہ خیال آتے ہی وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"تم کیا جانو اریب فاطمہ! ایبک فلک شاہ نے کسی کی اتنی چاہ نہیں کی اور کبھی اتنا تڑپ کر کسی کا ساتھ نہیں چاہا جتنا تمہارا۔ میں بابا اور ماما کی منتظر سوالیہ نظروں سے ہر روز نظر چرا لیتا ہوں۔ میں جانتا ہوں، وہ کیا چاہتے ہیں، لیکن اریب فاطمہ، پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے اگر میں نے تمہارے تصور سے منہ موڑا تو یہ بہت بڑی بددیانتی ہوگی۔ دغا بازی، تم نے کہا تھا نا اریب فاطمہ کسی کو دل میں بسا کر کیسے کسی اور کے ساتھ زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ تو میں بھی ایسا نہیں کر سکتا اور کیا تم نے ایسا کر لیا ہے اریب فاطمہ؟"

وہ اکثر راتوں کو سو نہ پاتا تھا۔

"ایبک! تمہارا کیا خیال ہے۔ میریٹ ہوٹل میں بم بلاسٹ کرنے والے کون لوگ تھے؟" فلک شاہ نے خالی کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا تو ایبک نے چونک کر انہیں دیکھا اور ٹھنڈی چائے ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتار کر خالی کپ ٹیبل پر رکھا۔

"آپ نے ایک بار کہا تھا بابا! وہ ہماری خامیوں اور غلطیوں کے سوراخوں سے چیونٹیوں کی طرح اندر در آئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہر گزرتا دن ان کی تعداد میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ یہاں وہاں ہر جگہ ان کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے بابا! جیسے اس وقت

ہم اس دنیا کا سب سے بے بس ملک اور سب سے بے بس قوم ہیں۔ جس کی ڈوریاں اس کے سیاستدانوں اور لیڈروں کے ہاتھوں میں ہیں اور وہ خود کسی اور کی ڈگڈگی پر ناچ رہے ہیں۔" وہ کھڑا ہو گیا۔

"مجھے جانا ہے بابا۔ پبلشر سے ملنا ہے۔ شام کو ملاقات ہوتی ہے۔"

"اللہ حافظ بیٹا۔"

عمارہ، احسان شاہ اور فلک شاہ نے باری باری اس کی پیشانی چوم کر اسے رخصت کیا۔ وہ لاؤنج سے گاڑی کی چابیاں لیتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور ہر بار کی طرح اس بار بھی ایبک فلک شاہ سے ملتے ہوئے احسان شاہ کو رابیل کا خیال آیا تھا اور ہر بار کی طرح بہت دکھی دل سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ مائرہ ایسا کبھی نہیں چاہے گی۔ وہ اپنی پرسکون زندگی میں کسی طرح کا طوفان نہیں چاہتے تھے۔ ان تین سالوں میں مائرہ کے ساتھ ان کا رویہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ایک کمرے میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے دور ہیں۔ ان تین سالوں میں ایک بار بھی مائرہ کی آنکھوں میں اپنے کیے پر ندامت نظر نہیں آئی تھی۔ ایک بار بھی اس نے پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا تھا۔

اور انہوں نے اس عورت سے محبت کی تھی۔ جس نے کبھی ان سے محبت نہیں کی تھی۔ کیسی عورت تھی وہ، منتقم مزاج، ظالم اور اس نے اپنی اس فطرت کی وجہ سے اپنے گھر کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر عمر زبیر اور رابیل کا خیال بار بار ان کا دامن نہ پکڑتا تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے اپنے گھر میں برداشت نہ کرتے۔

نارسائی بہت سے لوگوں کا مقدر بنتی ہے۔ وہ اپنی محبت کو نہیں پا سکتے، لیکن وہ مائرہ کی طرح نہیں کرتے۔ شاید مائرہ نے فلک شاہ سے بھی محبت نہیں کی تھی۔ اسے صرف اپنی ذات سے محبت تھی، بس۔

کبھی کبھی وہ بے حد دکھی ہو جاتے تو بیگ میں کپڑے رکھتے اور بہاول پور چلے جاتے یا پھر فلک شاہ کو فون کرتے۔

"ممو! میری طبیعت خراب ہے آجاؤ۔ میں نہیں آ سکتا۔"

کبھی بابا جان کا بہانا بناتے۔

"وہ بہت یاد کر رہے ہیں ممو! عمو کو لے کر آجاؤ زندگی کا کیا بھروسا۔"

"تمہیں بہت ڈرامے کرنے آ گئے ہیں شانی!" فلک شاہ ہنستے۔

"کیا سوچنے لگے ہو شانی؟" فلک شاہ نے بغور انہیں دیکھا۔

"آ۔ ہاں کچھ نہیں!" احسان شاہ چونکے۔

احسان شاہ کیا سوچتے تھے فلک شاہ نہیں جانتے تھے، لیکن ان کے دل میں بارہا خیال آیا تھا۔ اگر اریب فاطمہ نہ ہوتی تو ایبک اور رابیل۔۔۔

رابیل کی آنکھوں میں ایبک کے لیے جو جذبہ نظر آیا تھا، ایبک اس سے بے خبر تھا، لیکن انہوں نے جان لیا تھا کہ رابیل کے دل میں کیا ہے۔

اگر ایبک اریب فاطمہ سے محبت نہ کرتا ہوتا تو وہ رابیل کو اس کے لیے مانگ لیتے ہر بات فراموش کر کے۔۔۔ انہیں رابیل کی آنکھوں کی اداسی اور خاموشی سے دکھ ہوتا تھا۔

"یار! یہ آخری صفحات تو دو ایبک کے ناول کا انجام پڑھ لوں۔"

احسان شاہ نے بیٹھتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے تو فلک شاہ نے صفحات ان کی طرف بڑھا دیے۔ عمارہ نے چائے کے خالی برتن سمیٹے اور باہر نکل گئیں۔

"شانی! اونچا اونچا پڑھو، میں بھی سن لوں۔" فلک شاہ نے تکیے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور احسان شاہ پڑھنے لگے۔

☆ ☆ ☆

اپنے مخصوص انداز میں رابیل دونوں بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کیے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے نہ جانے کن سوچوں میں گم اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی جب مائرہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"رابی!" انہوں نے رابیل کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ "یہ اپنی کیا حالت بنالی ہے تم نے۔ ہروقت کمرے میں گھسی رہتی ہو۔ باہر نکلو، ہنسا بولا کرو۔ موفی نے اپنے بیٹے کی تصاویر بھیجی ہیں۔ سب مرینہ کے کمرے میں بیٹھے تصویریں دیکھ رہے ہیں۔"

"اچھا!" اس نے خالی خالی نظروں سے مائرہ کی طرف دیکھا۔

تین سال گزر گئے تھے۔ موفی بیاہ کر کینیڈا چلی گئی تھی اور اب اس کا بیٹا بھی پیدا ہو گیا تھا اور وہ جو موفی سے عمر میں بڑی تھی۔

"دیکھ لوں گی ماما! جب نیچے جاؤں گی تو... ابھی تو میں سوچ رہی تھی کہ..."

"کیا سوچ رہی تھیں؟" مائرہ پاس ہی بیٹھ گئی تھیں۔

"مما! وہ... میں مجھے اسکالرشپ مل رہا ہے پی ایچ ڈی کے لیے... امریکہ میں۔ سوچ رہی ہوں کہ ایکسیپٹ کرلوں۔ میرے پروفیسر صاحب کہہ رہے تھے کہ مجھے..."

"تم نے ایم فل کرلیا۔ ٹھیک۔ اب مجھے اور مت ستاؤ۔ روبی کے بیٹے کی شادی ہو گئی ہے، لیکن طاہر کے لیے بھابھی اب بھی خواہش مند ہیں۔ ہمدان نے بھی ابھی تک شادی نہیں کی۔ ایک دو رشتے اور بھی ہیں۔ تم ہاں بھرو تو۔"

"مما! آپ جانتی ہیں کہ مجھے شادی نہیں کرنا۔"

"رابی! کیوں سزا دے رہی ہو خود کو۔ مجھے۔ ضد چھوڑ دو۔"

مائرہ اس کی ضد سے تھکنے لگی تھیں۔

"میں کسی کو سزا نہیں دے رہی مما! بس مجھے شادی نہیں کرنا۔"

"عثمان بھائی اور تمہارے پاپا مرینہ اور زبیر کی شادی کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ مرینہ ڈاکٹر بن گئی۔ زبیر کی تعلیم ختم ہو گئی۔"

"تو کردیں۔"

"بڑی ہو تم زبیر سے؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، جب مجھے شادی ہی نہیں کرنا۔"

"ایبک سے بھی نہیں۔" مائرہ کے لبوں پر بجھی بجھی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ تین سال سے رابیل کو دیکھ رہی تھیں یہ وہ رابیل نہیں تھی۔ شوخ و شنگ، تنک مزاج یہ اس سے بالکل مختلف رابیل تھی۔

سنجیدہ اور خاموش طبع۔

"کیا وہ اتنی شدید محبت کرتی ہے ایبک سے؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں جبکہ رابیل کی حیران نظریں مائرہ کے چہرے پر تھیں۔

"آپ کیا کہہ رہی ہیں مما؟"

"میں کہہ رہی تھی تم کیا ایبک سے بھی شادی نہیں کرو گی؟"

"مذاق مت کریں مما!" وہ افسردہ ہوئی۔

"میں مذاق نہیں کررہی رابی؟ لیکن میں تمہارے سامنے ہار گئی ہوں... تم میری بیٹی ہو، میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی... میں بابا جان سے بات کرتی ہوں کہ وہ عمارہ اور موی سے بات کریں۔ میرا عمارہ اور فلک شاہ کے ساتھ کتنا بھی اختلاف کیوں نہ ہو، وہ بابا جان کی بات نہیں ٹالیں گے۔"

"نہیں مما پلیز۔ بابا جان سے کچھ مت کہیں۔ میں نے کہا نا، مجھے کسی سے بھی شادی نہیں کرنا۔ بس مجھے پاپا سے باہر جانے کی اجازت دلوادیں۔ پتا ہے سر کہہ رہے تھے۔ میں بہت لکی ہوں کہ مجھے یہ اسکالرشپ ملا۔ مجھے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔"

"پاگل ہو تم رابی! ایسے زندگی نہیں گزرتی۔"

"جب زندگی نہ گزری تو کرلوں گی، لیکن ابھی نہیں ماما..."

"تم نے کہا تھا، تم ایبک کو پسند کرتی ہو تو اب تمہیں ایبک سے شادی کرنے میں کیا اعتراض ہے۔"

"میں نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔"

"کیا وہ کسی اور کو پسند کرتا ہے۔"

"ہاں!"

"پھر اس نے شادی کیوں نہیں کی ابھی تک۔ تمہارا وہم ہے... اگر وہ کسی کو پسند کرتا تو اب تک شادی کرچکا ہوتا۔"

"اس نے شادی نہیں کی تھی ابھی تک، لیکن کبھی اس کی طرف نظر بھر کر دیکھا بھی تو نہیں تھا اس نے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔

ان تین سالوں میں وہ جب جب "الریان" آیا۔ اس کے دل نے خواہش کی کہ وہ اس کے سامنے بیٹھ کر باتیں کرے ہر موضوع پر ایسے ہی جیسے وہ مرینہ اور مقصود سے کرتا تھا، لیکن اس نے سوائے رسمی سلام دعا کے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ آنکھوں میں حسرت لیے ملتجی نظروں سے اسے دیکھتی تو وہ نظر چرا لیتا۔

کیا وہ اس کی نظروں کی التجا سمجھتا تھا اور اسے نظر انداز کرتا تھا۔ اس روز وہ دیر تک سر ریاض کے ساتھ اپنے تھیسس کے سلسلے میں کام کرتی رہی تھی۔ یاسمین کو اس نے گھر بھیج دیا تھا کہ اسے دیر ہو جائے گی اور وہ اپنی فرینڈ کے ساتھ گھر آجائے گی جو اس کے ساتھ ہی سر ریاض کے ماتحت ایم فل کررہی تھی۔ ماما کو کہیں جانا تھا۔ اس لیے اس نے فون کرکے انہیں بتا دیا تھا کہ وہ یاسمین کو واپس بھیج رہی ہے۔ وہ چلی جائیں، وہ کام ختم کرکے باہر نکلی تھی، دونوں روڈ کے کنارے کھڑی انتظار کررہی تھیں ابھی فرینڈ کی گاڑی نہیں آئی تھی ایبک کی گاڑی قریب آکر رکی۔

"رابیل! کیا گاڑی نہیں آئی گھر سے... کیسے جانا ہے؟"

"میری دوست مجھے ڈراپ کردے گی۔"

"میں "الریان" جارہا ہوں اگر آپ مناسب سمجھیں تو آجائیں۔"

اور وہ خاموشی سے گاڑی کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی تھی۔

"آپ کی مما کو شاید اعتراض ہو، لیکن اس وقت مجھے مناسب نہیں لگا کہ آپ یہاں کھڑے ہو کر انتظار کریں۔ میں کار نز پر آپ کو ڈراپ کردوں گا۔"

اور ٹپ ٹپ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔

"آپ مما کی بات کو ابھی تک دل میں رکھے ہوئے ہیں۔"

کیا ہوا رابیل پلیز روؤ نہیں، میں نے احتیاطاً بات کی تھی کہ مائرہ آنٹی کو اعتراض نہ ہو... اپنے لیے نہیں صرف آپ کے لیے ڈر رہا تھا میں۔ پلیز روئیں مت۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ دوسروں کو رلا دیتی ہیں... جبکہ آپ..." وہ مسکرایا تھا۔ رابیل نے ایک شاکی سی نظر اس پر ڈالی تھی۔

"غلط سنا تھا آپ نے..."

"آپ کے برادر خورد نے ہی بتایا تھا۔"

"سنی سنائی پر اعتبار نہیں کرتے، آنکھوں دیکھے پر یقین کرتے ہیں۔"

"کبھی کبھی آنکھوں دیکھا بھی دھوکا ہوتا ہے رابیل بی بی۔" ایبک یک دم سنجیدہ ہو گیا تھا۔

"ایک بات پوچھوں؟" اس نے سوچا تھا پھر ایسا موقع نہیں ملے گا۔

"پوچھ لیں۔"

"آپ شادی کیوں نہیں کررہے ہیں؟"

"یہ بات میں آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کیوں نہیں شادی کرنا چاہتیں... رینا نے بتایا تھا مجھے آپ نے منع کردیا۔"

"میں...!" اس کی آنکھیں نم ہوئی تھیں، لیکن اس نے ایبک کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پھر سوال کردیا تھا۔

"کیا آپ کسی سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں۔" ایک لمحہ سوچنے کے بعد ایبک نے کہا تھا وہ رابیل کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا بالکل۔ اس کی نظریں سامنے تھیں اور ہاتھ اسٹیئرنگ پر سختی سے جمے تھے۔

"اریب فاطمہ سے؟" رابیل کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ ایبک نے چونک کر اسے دیکھا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کس سے محبت کرتا ہوں وہ جو کوئی بھی ہے... اس کی محبت میری رگ

وپے میں سرایت کرچکی ہے۔ میں اس محبت کے ساتھ خیانت نہیں کرسکتا۔ اس لیے میری زندگی میں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔"

اور رابیل احسان شاہ کو لگا تھا کہ جیسے ایبک فلک شاہ نے اس کی آنکھوں میں چھپے جذبوں کی تحریر پڑھ لی ہے اس لیے اسے بتا رہا ہے کہ اس کے دل میں کوئی اور بستا ہے اور وہاں کسی اور کی گنجائش نہیں۔ مائرہ رابیل کی طرف بغور دیکھ رہی تھیں ان تین سالوں میں اس کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

اور یہ ایبک کی وجہ سے تھا۔

پہلے فلک شاہ اور اب ایبک

کئی بار مائرہ نے سوچا تھا کہ اگر رابیل ایبک کو پسند کرتی ہے، تو پھر بابا جان سے کہہ کر یہ شادی کروادیں، لیکن پھر نفرت ہر جذبے پر غالب آجاتی تھیں۔ مگر آج ایک بار پھر بیٹی کی محبت نفرت پر غالب آگئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ انہیں اپنی محبت نہیں ملی تھی، لیکن رابی کو اس کی محبت ضرور ملنی چاہیے۔ ان کی بیٹی ان کی طرح نارسا نہیں رہے گی۔ وہ ضرور بابا جان سے بات کریں گی۔

"رابی! میں بابا جان سے آج ہی بات کروں گی۔ تم پریشان مت ہو۔"

"ماما پلیز۔ اس موضوع کو ختم کردیں۔ وہ کسی اور سے محبت کرتا ہے۔ اتنی شدید محبت کہ کوئی دوسری لڑکی اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اسے اپنی محبت ملے یا نہ ملے، لیکن اس کے دل میں موجود محبت اسی طرح رہے گی۔ وہ بابا جان کی بات نہیں مانے گا۔ چلیں مومی کے بیٹے کی تصویریں دیکھ آئیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اس روز اس نے جان لیا تھا کہ ایبک فلک شاہ اریب فاطمہ سے محبت کرتا ہے ایسی محبت جو جلا کر راکھ کردے، لیکن ختم نہ ہو۔

"کیسے نہیں مانے گا بابا جان کی بات!" مائرہ کی آواز میں غصہ اور ناراضی تھی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ ہر صورت میں بابا جان کے ذریعے یہ شادی کروائیں گی۔ اور دیکھتی ہیں فلک شاہ اور عمارہ کیسے انکار کرتے ہیں۔ بابا جان کو۔ ان کی بیٹی نامراد نہیں رہے گی ان کی طرح۔ اور وہ رابیل کے ذریعے انتقام لیں گی اب فلک شاہ سے اس کا بیٹا چھین کر۔ ایک بار ایبک اور رابیل کی شادی ہوجائے تب وہ رابی کے ذریعے مومی سے اس کا بیٹا چھین لے گی۔ حیرت ہے اسے یہ خیال پہلے کیوں نہیں آیا۔

اور رابیل سوچ رہی تھی وہ آج احسان شاہ سے اپنے اسکالرشپ کی بات ضرور کرے گی۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم سیڑھیاں اتر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں اریب فاطمہ آنکھیں موندے لیٹی تھی اور باہر صحن میں سائرہ بے چینی سے ادھر ادھر ٹہل رہی تھیں۔ باپ بیٹوں میں فیصلہ ہوگیا تھا۔ شیخ کی واپسی جانے کب ہو۔ ہو بھی یا نہیں۔ ارباب حیدر نے انہیں یقین دلایا تھا۔

"بہتر ہے کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی کردیں اور یہ بات شیخ نے خود کہی ہے، مجھ سے فون پر۔"

اسفند اور عظمت مایوس تو ہوئے تھے، لیکن انہوں نے باپ سے کہہ دیا تھا۔ "ٹھیک ہے۔ وہ اریب کی شادی پھپھو کے بیٹے سے کردیں۔"

اور جب وہ چک 151 میں آنے کی تیاری کررہے تھے تو ارباب حیدر نے اپنا پروپوزل دے دیا تھا۔ اسفند اور عظمت خوش ہوگئے تھے اور انہوں نے باپ کو بھی قائل کرلیا تھا اب گھر میں شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ اور وہ لوگ شادی کے سلسلے میں گاؤں آئے ہوئے تھے۔

اریب فاطمہ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹی رہتی تھی۔ اس کی روئی روئی آنکھیں سائرہ کو تڑپاتی تھیں، وہ بے بس تھیں، لیکن اریب فاطمہ نے فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ فیصلہ کرکے اٹھی اور باہر صحن میں آکر تخت پر بیٹھ گئی۔ سائرہ بھی ٹہلتے ٹہلتے تھک کر تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔

"اماں! اللہ کے لیے ابا کو منع کردیں۔ مجھے شادی نہیں کرنا۔" اریب فاطمہ نے ان کے ہاتھ تھام لیے۔ سائرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ان تین سالوں میں کتنی بجھ گئی تھی۔

"کسی سے بھی نہیں۔ آپ ابا کو منع کردیں۔ میں آپ کی طرح بہادر نہیں ہوں اور میں آپ کی طرح کی زندگی نہیں جی سکتی۔"

"میری طرح کی زندگی؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اریب فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"میں نے کب گلہ کیا اپنی زندگی سے فاطمہ! ٹھیک ہی تو ہے۔"

"آپ نے گلہ نہیں کیا اماں، لیکن آپ نے پورے من سے زندگی کو جیا بھی نہیں اور میں پورے من سے زندگی جینا چاہتی ہوں۔ ٹھیک ہے اماں! میں نے تسلیم کرلیا۔ مان لیا کہ میری زندگی کی کتاب میں اس کا ساتھ مقدر نہیں ہے، لیکن میں کسی اور کی ہمراہی میں بھی یہ سفر کاٹنا نہیں چاہتی۔" وہ رونے لگی۔

"اماں پلیز مجھے خود سے جدا نہ کریں۔ مجھے اپنے پاس رہنے دیں ہمیشہ۔"

سائرہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"میں نے کبھی ان تین سالوں میں آپ سے گلہ نہیں کیا۔ کبھی ضد نہیں کی۔ میں نے ہر وہ راستہ بند کردیا جو ایبک کی طرف جاتا تھا تاکہ آپ کو مائرہ آنٹی کے سامنے شرمندگی نہ ہو۔ میں اب بھی گلہ نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں، لیکن آپ مجھے کسی اور کے ساتھ چلنے پر مجبور نہ کریں۔ آپ نے محبت نہیں کی تھی اماں پھر بھی پورے من کے ساتھ جی نہیں سکیں۔ میں نے تو محبت کی ہے اماں! میں تو مرجاؤں گی مجھے اس کانٹوں بھرے رستے پر چلنے پر مجبور نہ کریں۔"

اس کے آنسوؤں میں روانی آگئی۔ سائرہ خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

یہ عثمان شاہ اور یہ اریب فاطمہ دونوں نے کیسے جان لیا تھا کہ انہوں نے زندگی پورے من کے ساتھ نہیں جی۔ عثمان شاہ نے بھی کہا تھا کہ وہ دکھ جو ان کی پوری زندگی پر محیط ہو کر ان کی زندگی کی خوشیاں کھا گیا۔ تو کیا انہوں نے زندگی کو پورے من کے ساتھ نہیں جیا.... وہ ایک شخص جو فقط چند لمحوں کے لیے ان کی زندگی میں آیا تھا جبکہ ایبک اور اریب فاطمہ۔

انہوں نے پھر روتی ہوئی اریب فاطمہ کو دیکھا۔

انہوں نے تو زندگی آدھے من کے ساتھ جی لی تھی اور اریب فاطمہ وہ کہہ رہی تھی وہ مرجائے گی۔

اریب فاطمہ ملتجی نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

"ارباب حیدر اچھا آدمی ہے۔ زیادہ عمر کا بھی نہیں ہے۔ تم خوش رہوگی۔" ان کے لہجے میں بے یقینی تھی اور وہ اسے تسلی دینے کی کوشش کررہی تھیں۔

"مجھے زندگی سے اب کسی خوشی کی چاہ نہیں ہے اماں پلیز۔ آپ منع کردیں ابا کو کسی بھی طرح۔ آپ نے ابا کو منالیا تو اسفند یا عظمت کچھ نہیں کرسکیں گے۔"

سائرہ بغیر کچھ کہے اٹھ کر کمرے میں چلی گئیں اور اریب فاطمہ یونہی تخت پر بیٹھی آنسو بہاتی رہی اور وہ کمرے میں پرانی ڈائری سے مروہ کا نمبر تلاش کررہی تھیں۔ تین سال پہلے انہوں نے مروہ سے درخواست کی تھی کہ وہ ایبک کو ادھر آنے سے روکیں گی۔ وہ انہیں اور اریب فاطمہ کو بے بھرم ہونے سے بچالیں گی۔

مروہ نے ہمیشہ ان کا مان رکھا تھا اور ڈائری میں اس کا نمبر ڈھونڈتے ہوئے اب بھی انہیں یقین تھا کہ وہ ان کا مان رکھیں گی۔

☆ ☆ ☆

احمد رضا لاؤنج میں ٹانگیں پسارے بیٹھا تھا اور ٹی وی پر خبریں چل رہی تھیں۔ خبروں کے بعد میریٹ ہوٹل میں ہونے والے بم بلاسٹ پر تبصرہ ہونے لگا تو اس نے ٹی وی آف کردیا۔

شاید ہمارے میڈیا جتنا غیر ذمہ دار میڈیا کسی ملک کا

نہیں ہے۔ کیا دکھانا ہے کیا نہیں دکھانا۔ کون سی خبر ملکی سالمیت کے لیے نقصان دہ ہے اور کون سی فائدہ مند۔ کسے اچھالنا ہے۔ کسے ہلکا پھلکا لینا ہے۔ کسے چھپانا ہے ہر بات سے بے خبر۔

اس نے سر جھٹک کر میز پر پڑا اخبار اٹھالیا۔

"تو تم صبح لاہور جارہے ہو۔ ایک بار پھر؟" رباب حیدر نے لاؤنج میں قدم رکھا۔ اس کے قدموں میں ہلکی لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھوں میں سرخی۔ غالباً" اس نے بہت پی رکھی تھی۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔

"غالباً" تین سال بعد۔" احمد رضا نے سر ہلایا۔

تین سال پہلے جب وہ جنید کے ساتھ اس کے گھر اور پھر وہاں سے رحیم یار خان آیا تھا تو نہیں جانتا تھا کہ اگلے تین سال تک اس کے قدم یہاں کی سڑکوں کو نہیں چھوئیں گے اور وہاں کے مناظر اس کے لیے اجنبی ہوجائیں گے۔

کئی دن تک اخبارات میں اس کے متعلق کالم چھپتے رہے تھے۔ کسی نے اسے احمد رضا کہا اور کسی نے احمد حسن، کسی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ اسے اس کی اسپینش ماں کے ساتھ دیکھ چکا ہے اور وہ احمد رضا ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اگر کسی نے اس کی مذمت کی تو چند ایک نے اس کی تعریف بھی کی۔ ایک مداح نے تو اس کا توہین آمیز خاکوں کی مذمت میں لکھا جانے والا مضمون مختصرا" دوبارا چھاپ کر دعوا کیا کہ کوئی مرتد شخص ایسا مضمون نہیں لکھ سکتا۔

"مجھے بیان دینے دو۔ میں ایک پریس کانفرنس کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے الوینا سے درخواست کی۔ "میں تسلیم کرلوں گا کہ میں ہی احمد رضا ہوں اور کچھ عرصہ کے لیے ضرور اس ملحد کا رفیق رہا ہوں، لیکن میں۔۔۔"

"ہرگز نہیں۔ ہم احمد رضا کی حیثیت سے تمہاری شناخت نہیں چاہتے۔"

"تو کیا میں اب ساری زندگی یہاں چھپا رہوں گا؟"

"کچھ عرصہ بعد دھول بیٹھ جائے گی تو تم واپس چلے جانا۔"

اور اس دھول بیٹھنے میں تین سال لگ گئے تھے یا اسے باور کرائے گئے تھے۔ یہ تین سال اس نے مختلف جگہوں پر گزارے تھے۔ کچھ عرصہ رحیم یار خان رہنے کے بعد وہ اختر مسعود کی درس گاہ میں آگیا تھا۔ درس گاہ میں زیادہ تر وہ اپنے کمرے میں ہی محدود رہتا تھا۔ اس نے اختر کے پاس ملکی اور غیر ملکی لوگوں کو دن رات آتے دیکھا تھا۔ کئی نام اور چہرے، جن میں کچھ اینکرز صحافی اور سیاست دان بھی شامل تھے۔

یہاں کیا ہورہا ہے۔ اس نے کھوج لگانے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔ پھر بھی اسے لگتا تھا جیسے پس پردہ کچھ نہ کچھ سازشوں کے تانے بانے بنے جاتے تھے اور شاید کچھ مخصوص افراد کو خاص تربیت بھی دی جاتی تھی۔ وہاں سے اسے حیات آباد جانے کا حکم ملا تھا اور کچھ دن طیب خان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس کے عقیدت مندوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوتا رہا کہ کیسے لوگ ہیں جو اللہ کے بجائے اس کے بندوں سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

حیات آباد کے قیام کے دوران ہی اس پر انکشاف ہوا تھا کہ طیب خان ڈبل ایجنٹ ہے۔ را کا بھی اور سی آئی اے کا بھی وہ نہ افغانی ہے نہ مسلمان ہے۔

پتا نہیں کس کس نے کیا کیا بہروپ بھر رکھا تھا۔ خود وہ بھی تو بہروپیا تھا۔ احمد رضا سے احمد حسن اور پھر احمد حسن سے عبداللہ۔

عربی پر دسترس حاصل کرنے اور ٹریننگ مکمل کرنے کے بعد اسے پہلے انگلینڈ اور پھر لیبیا رچی کے پاس جانے کا حکم ملا تھا۔

وہ جب انگلینڈ سے روانہ ہوا تھا تو اس کے چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی تھی یوں تقریباً" دو سال اس نے رچی کے ساتھ لیبیا میں گزارے تھے یہاں وہ عبداللہ تھا۔

اور پھر اب ایک بار پھر وہ پاکستان کے ضلع رحیم یار خان کے چک نمبر 151 میں تھا اور صبح اسے لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔

"تو اب تم مستقل لاہور میں ہی رہو گے؟" ارباب حیدر پوچھ رہا تھا۔

"ہاں۔ پتا نہیں۔ یہاں آنے سے پہلے رچی نے کہا تھا کہ مجھے اب اپنے پرانے منصوبے پر ہی کام کرنا ہے۔ نیوز چینل لانچ کرنے کا۔"

"ہاں یہ بہت ضروری ہے اب۔" ارباب حیدر نے کہا۔ "میڈیا کے ذریعے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔"

"ہوں۔" اس نے آہستگی سے کہا۔ "اپنا چینل ہوگا تو ہمارے کام میں تیزی آجائے گی۔" ارباب حیدر نے جیب سے ایک چپٹی شیشی نکالی اور گھونٹ بھرا۔

"پیوگے؟"

"نہیں۔" اس نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر پھر گھونٹ بھرا۔

"میرے خیال میں تم پہلے ہی کافی پی چکے ہو۔" احمد رضا نے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں لگ رہا ہے ورنہ میں نے اتنی نہیں پی جتنی پینی چاہیے تھی۔ آؤ میرے ساتھ میرے کمرے میں۔ مل کر خوشی سیلیبریٹ کرتے ہیں۔"

"کیسی خوشی؟"

"بھئی۔ تم پاکستان آئے ہو واپس اپنے وطن اور میں شادی کرنے والا ہوں۔"

"کیا تم پہلے سے شادی شدہ نہیں ہو ارباب حیدر؟"

"ہرگز نہیں۔ میں جس ملک میں رہتا تھا وہاں شادی کا رواج نہیں تھا اور یہاں آکر بس فرصت ہی نہیں ملی۔"

"مبارک ہو کس سے شادی کررہے ہو؟"

"رچی کی منگیتر سے۔"

"کیا؟" احمد حسن چونکا۔

"کیوں تمہیں حیرت ہوئی؟"

"ہاں۔ وہ رچی۔۔۔" احمد حسن سنبھلا۔

"رچی کو اب یہاں نہیں آنا اور وہ لڑکی۔۔۔ وہ ہر روز میرا صبر آزماتی تھی۔ تم نے دیکھا ہے اسے۔ اسفندیار کی بھتیجی۔ کیا نام ہے اس کا اریب فاطمہ۔" اس نے پھر ہاتھ میں پکڑی چھوٹی سی چپٹی شیشی سے گھونٹ بھرا۔

"اریب فاطمہ۔۔۔ اس کے باپ کی سیکنڈ کزن کی بیٹی جو۔۔۔"

اور پھر اس کی آنکھوں کے سامنے ایک منظر آیا۔ آفت زدہ علاقوں میں پتھروں پر بیٹھے بیٹھے ایک شاہ نے بتایا تھا کہ۔۔۔ تو کیا ہوا پھر۔ ان تین سالوں میں اریب فاطمہ کی ایک سے شادی کیوں نہیں ہوئی۔

ارباب حیدر اٹھ کھڑا ہوا اور لہراتا ہوا لاؤنج سے باہر نکلا۔۔۔ اور جاتے جاتے مڑ کر اسے دیکھا۔

"دل کہیں وہاں کسی عرب دوشیزہ کے پاس تو نہیں چھوڑ آئے ہو؟" وہ زور سے ہنسا۔

"موڈ بنے تو آجانا میرے کمرے میں۔۔۔ بہت اعلا چیز ہے میرے پاس۔" وہ پھر ہنسا اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

وہ کچھ دیر یونہی چپ بیٹھا رہا۔

یہ شخص ارباب حیدر اگرچہ تھا تو مسلمان، لیکن اریب فاطمہ کے ہرگز قابل نہ تھا۔

"تو مجھے کیا؟" اس نے کندھے اچکائے۔

"کیا اریب فاطمہ کی جگہ سمیرا ہوتی تو تب بھی تم یہی کہتے۔" دل نے سرگوشی کی تو وہ چونکا۔

"شاید نہیں۔"

ان تین سالوں میں اس نے اللہ سے صرف ایک ہی دعا کی تھی۔۔۔ یااللہ سمیرا، امی، ابو وہ جہاں بھی ہوں ان کی حفاظت کرنا اور مجھے اتنی مہلت ضرور دینا کہ ایک بار میں ان سے مل سکوں۔

ان تین سالوں میں وہ بہت بار اپنے کمرے میں اکیلا رویا تھا اور توبہ کی تھی۔ سجدے میں گر کر بار بار دعائیں مانگی تھیں۔ معافی طلب کی تھی۔ رحم کی التجا کی تھی۔

حاجی صاحب کہتے تھے۔ وہ ہر رات رو رو کر گڑگڑا کر دعا کرتے ہیں اللہ سے رحم کی اور معافی کی سو اس نے بھی تین سالوں میں یہی کچھ کیا تھا۔ جب وہ یہاں تھا اور جب وہ رچی کے ساتھ تھا۔

رچی مختلف عرب ممالک میں گھومتا پھر رہا تھا اور وہ اس کے ساتھ تھا، کبھی وہ اکٹھے سفر کرتے اور کبھی الگ

الگ۔ جس روز رچی نے کہا تھا کہ وہ امریکا جارہا ہے وہ پاکستان چلا جائے تو اس روز وہ لندن میں تھے اور اس روز اسے لگا تھا جیسے اللہ نے اس کی دعا سن لی ہے اور اللہ نے اسے معاف کردیا ہے وہ سمیرا' امی اور ابو سے ضرور ملے گا۔

اس بار وہ لاہور میں خاموش نہیں بیٹھے گا' وہ خود تلاش کرے گا انہیں۔ اس نے سوچا تھا۔

سمیرا تو اب ڈاکٹر بن چکی ہوگی۔ ہوسکتا ہے۔ اس کی شادی بھی ہوگئی ہو۔

اس نے پھیلے ہوئے پاؤں سیدھے کیے اور جھک کر جوتے پہننے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ چک نمبر 151 کی اس رہائش گاہ سے نکل کر اسفندیار کی حویلی کی طرف جارہا تھا۔ وہ وہاں کیوں جارہا تھا اور اسے وہاں جاکر کیا کہنا تھا۔ نہیں جانتا تھا پھر بھی جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

ایبک نے انیکسی میں آکر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے۔ باہر موسم خوشگوار تھا۔ اگرچہ ستمبر کا آخری ہفتہ تھا' لیکن فضا میں اس وقت ہلکی خنکی تھی۔ حالانکہ دن کے وقت کافی گرمی تھی۔ وہ بہت دنوں بعد یہاں آیا تھا۔ اب بھی اس کا قیام انیکسی میں ہی ہوتا تھا۔ ہاں جن دنوں فلک شاہ اور عمارہ ملک ہاؤس میں ہوتے تو وہ بھی وہاں منتقل ہوجاتا تھا۔ آج کچھ دیر پہلے ہی وہ عمارہ اور فلک شاہ کو ایرپورٹ چھوڑ کر آرہا تھا۔ جواد کسی کام سے لاہور آیا تھا تو انہوں نے بھی واپسی کا پروگرام بنالیا۔ وہ تقریباً" ایک ماہ یہاں رہ کر جارہے تھے اور احسان شاہ منہ پھلائے ایرپورٹ پر کھڑے تھے۔

"تمہیں تو بس جانے کی پڑی رہتی ہے ہمیشہ۔۔۔"

اور فلک شاہ دھیمے دھیمے مسکرا رہے تھے۔

"یار ہماری بیٹی ہے وہاں' اداس ہوگئی ہے ہمارے لیے۔"

"تو بیٹی کو بھی ساتھ کیوں نہیں لاتے۔"

"شادی شدہ ہے میری جان!"

اور جواد ان کی باتوں پر مسکرا رہا تھا۔ ایرپورٹ پر ہی کرنل شیر دل کا فون آگیا تھا۔

"تمہاری آنٹی صبح سے کچن میں گھسی ہوئی ہیں' یاد رکھنا۔ کہیں وہ تمہارا ماموں وہاں سے ہی تمہیں اغوا کرکے نہ لے جائے۔"

"نہیں انکل! میں گھر ہی آرہا ہوں۔" وہ مسکرایا تھا۔

"شیر دل کا فون ہوگا۔" احسان شاہ سمجھ گئے تھے "یہ شخص تو رقیب ہی بن گیا ہے میرا۔ جب لاہور آتے ہو' بھگا کرلے جاتا ہے دو چار دن کے لیے۔"

اور فلک شاہ نے قہقہہ لگایا تھا۔

ان کی گفتگو یاد کرکے ایبک کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر کھڑکیوں کے پردے ہٹاکر وہ دروازہ بھیڑ کر انکل شیر دل کی طرف چلا آیا تھا۔ کھانے کے بعد بھی دیر تک ملکی حالات پر گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے ناول کا ذکر بھی ہوا اور جب مسز شیر دل نے ہمیشہ کی طرح اس کی شادی کی بات چھیڑی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ وہ موضوع تھا جس سے وہ کتراتا تھا انیکسی میں آکر وہ بہت دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑا باہر آسمان پر پھیلے ستاروں کو دیکھتا رہا۔ وہ جانتا تھا عمارہ اور فلک شاہ کی خواہش کو۔

اسے انجی کی آرزو کی بھی خبر تھی۔

اور اسے مسز شیر دل کی محبتوں اور شفقتوں کا احساس بھی تھا جو اس کے لیے لڑکیاں ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔

وہ سب چاہتے تھے کہ وہ اریب فاطمہ کا خیال دل سے نکال کر کسی بھی لڑکی کو اپنی زندگی کا ساتھی بنالے لیکن وہ اریب فاطمہ کو بھلانے پر قادر نہیں تھا۔

اس نے اریب فاطمہ کو کھودیا تھا اور اسے حاصل کرنے کے لیے کوئی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ مما پھپھو نے اسے روک دیا تھا۔

"ایبک! کبھی اس کے گھر مت جانا۔ اگر تم اس سے محبت کرتے ہو تو ایسا کچھ مت کرنا کہ زندگی اس کے لیے مشکل ہوجائے۔"

اور وہ اریب فاطمہ سے محبت کرتا تھا۔

کبھی کبھی دل شدت سے اسے دیکھنے کی تمنا کرتا تھا لیکن۔ کتنا خوش نصیب ہوگا وہ' جس کے نصیب میں ہے۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور جھک کر جوتے اتارنے لگا تب ہی اس کا سیل فون بج اٹھا۔ اس نے نمبر دیکھا۔

"احمد حسن!" بے حد حیران ہو کر وہ بڑبڑایا اور فون اٹھالیا۔

☼ ☼ ☼

احمد رضا نے بیڈ روم میں قدم رکھا اور اپنا فون اور والٹ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر کھڑکی کے پردے ہٹائے باہر روشنیاں جل رہی تھیں۔ گیٹ کے پاس چارپائی پر خان لیٹا ہوا تھا۔ وہ تین سال بعد لاہور آیا تھا اور اسے آئے ایک گھنٹہ ہوچکا تھا سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا تین سال پہلے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گیا ہی نہیں تھا۔

گیٹ پر خان چاچا موجود تھا' لان' لاؤنج' پورچ سب صاف ستھرے تھے یقیناً" یہ ثمینہ حیدر کا کمال تھا۔ اسے گھر میں داخل ہوتے ہی ثمینہ کا فون ملا تھا۔

"سر! صبح آجاؤں گی۔۔۔ کھانا میں نے آرڈر کردیا تھا۔ کچھ دیر بعد آجائے گا۔ گھر کی دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ امید ہے آپ کو شکایت نہیں ہوگی۔ صبح دوسرے ملازم بھی آجائیں گے۔"

"تھینک یو ثمینہ! مجھے کوئی شکایت نہیں ہے اور کھانے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ خیر صبح بات کریں گے۔"

اس نے فون بند کردیا تھا اور اب وہ بیڈ روم میں کھڑا کھڑکی سے لاہور کا آسمان دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لی۔

اور یہ لاہور کی ہوا کی خوشبو تھی۔

لاہور کی خوشبو۔

میرے ملک کی خوشبو۔

پاکستان جیسا ملک دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ وہ اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔ کتنے سالوں بعد وہ خود کو یوں پرسکون محسوس کررہا تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے' اب وہ کہیں نہیں جائے گا اور ہر صورت امی' ابو اور سمیرا کو ڈھونڈے گا۔

وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا۔

ایبک نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس تلاش میں اس کی مدد کرے گا۔

"ایبک۔۔۔!" اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

ایبک اور اریب فاطمہ' سب ٹھیک ہوگیا تھا۔ وہ بچھڑ کر پھر مل گئے تھے تو یقیناً" وہ بھی ایک دن بچھڑے ہوؤں سے ملے گا۔ اس کے اندر امید جاگی تھی اور ایبک نے اسے یقین دلایا تھا کہ ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔ اس شام وہ اریب فاطمہ کے گھر کی طرف جاتے جاتے واپس پلٹ آیا تھا۔ اگر انہوں نے کہا کہ تم کون ہوتے ہو ہمارے گھر کے معاملات میں دخل دینے والے پہلے بھی ایک بار تم نے۔۔۔ اور اریب فاطمہ سے تمہارا کیا تعلق ہے' جو۔۔۔

"نہیں یہ مناسب نہیں ہے۔۔۔ تو۔۔۔"

ایبک۔۔۔ اسے ایبک کا خیال آیا تھا۔ اس نے ایبک کی آنکھوں میں اریب فاطمہ کے لیے محبت دیکھی تھی۔ اریب فاطمہ کو اس کے والدین نے پسند کیا تھا۔ لیکن ہوسکتا ہے' اس کی اب تک شادی ہوچکی ہو۔ تین سال کم تو نہیں ہوتے۔ لیکن ہوسکتا ہے نہ ہوئی ہو۔ کوشش کرلینے میں کیا حرج ہے۔

اور ایبک کا نمبر۔ اپنی رہائش گاہ کی طرف جاتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ جب وہ پاکستان آرہا تھا تو سامان پیک کرتے ہوئے اسے اپنے پرانے والٹ میں وہ پرانی سم نظر آئی تھی۔ جو پاکستان سے جانے سے پہلے اس نے نکال دی تھی۔ پھینکتے پھینکتے وہ رک گیا تھا۔

اس میں پرانے نمبر تھے۔ شاید کسی کی ضرورت پڑ جائے۔ وہ پرانا والٹ کہاں تھا شاید اس کے بیگ میں اور پھر تھوڑی سی تلاش کے بعد اسے وہ سم مل گئی تھی

اور جب وہ ایبک کو فون کر رہا تھا تو اس نے ارباب حیدر کو اپنے کمرے سے باہر نکل کر گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ تھی اور پہلی بار احمد رضا نے اسے اتنا مدہوش دیکھا تھا۔ شاید اس نے بہت زیادہ پی لی تھی۔

بعد میں اریب فاطمہ سے اسے پتا چلا تھا کہ وہ نشے میں اس کے گھر پہنچ گیا تھا اور صحن میں اسفندیار کے ساتھ بات کرتی اریب فاطمہ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا تھا۔

"چلو... یوں بھی تو تم نے میرا ہی ہونا ہے تو آج رات کیوں نہیں... آج میں بہت تنہا ہوں۔ چلو میری جان میرے ساتھ۔ آج میری پیاس بجھا دو۔"

اسفندیار سادہ تھا۔ اسے چالاکیاں نہیں آتی تھیں، لیکن وہ بے غیرت نہیں تھا۔

"کمینے...!" اس نے ارباب حیدر کو دھکا دے کر اریب فاطمہ کا ہاتھ چھڑایا تھا۔ "گندے، غلیظ انسان۔"

اندر سے عظمت یار اور شہریار بھی نکل آئے تھے اور ارباب حیدر جو کئی لوگوں پر بھاری تھا۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے پٹ رہا تھا۔

"چھوڑ دو اسے۔ کہیں مر مرا گیا تو۔" اریب فاطمہ کے والد نے کہا تھا۔

اور انہوں نے اسے گھر سے باہر پھینک دیا تھا اور اب باپ کے سامنے سر جھکائے شرمندہ کھڑے تھے کہ ارباب حیدر کا انتخاب ان کی ضد پر ہی کیا گیا تھا۔

"میری بہن تو اب ناراض ہوں گی۔ پھر بھی منت کرتا ہوں ان کی..."

"نہیں۔" سائرہ کمرے سے نکلی تھیں۔ "منت کر کے رشتہ دینے پر میری بیٹی کا سر سسرال میں ہمیشہ جھکا رہے گا عظمت کے ابا! وہ ہمیشہ اس کو طعنہ دیں گے کہ تمہارے باپ نے زبردستی رشتہ دیا۔ میری بیٹی میرے جیسی زندگی نہیں گزارے گی۔"

"تو ہے کوئی رشتہ تمہارے پاس۔ میں جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ان کی آواز دھیمی تھی۔

"ہاں...!" سائرہ مسکرائی تھیں۔ "کل ہی میری مروہ بھابھی سے بات ہوئی تھی، وہ اپنی بھتیجی کے بیٹے کے لیے اب بھی خواہش مند ہیں۔ آپ جانتے ہیں انہیں فاطمہ سے کتنا پیار ہے اپنی بیٹی کی طرح چاہتی ہیں وہ اسے۔"

"ٹھیک ہے۔ بلا لو انہیں۔"

اور پھر سب کچھ فلمی انداز میں ہو گیا تھا۔

ایبک عمارہ کو لے کر رحیم یار خان آیا تھا۔ مروہ بھی آگئی تھیں۔ اور سادگی سے نکاح ہو گیا تھا۔

اور جب وہ لاہور کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو ارباب حیدر بھی حیات آباد کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

"اب میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ گاؤں کے لوگ جتنی محبت دیتے ہیں اتنی ہی نفرت بھی کریں گے۔ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا میں نے اتنی کبھی نہیں پی اور پی بھی لوں تو آپے سے باہر نہیں ہوتا۔"

یہ سب قدرت کی طرف سے تھا، لیکن وہ نہیں جانتا تھا اور احمد رضا دل ہی دل میں مسکرایا تھا۔

"تمہارا یہاں رہنا اب ہمارے کاز کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ تمہارا جانا ہی بہتر ہے۔" الوینا نے تائید کی تھی۔

"یہاں کوئی اور آجائے گا۔ میرا خیال ہے فی الحال جنید علی کو بلواتے ہیں۔ اچھا ہے اور خالص پاکستانی۔ لوگوں کو جلد متاثر کر لے گا۔"

احمد رضا نے الوینا کی بات پر تبصرہ نہیں کیا تھا۔ وہ تو خوش تھا کہ اریب فاطمہ بچ گئی تھی۔

ڈور بیل بج رہی تھی وہ اٹھا۔ ثمینہ نے جو کھانا آرڈر کیا تھا، وہ شاید آگیا تھا۔ بیڈروم سے نکل کر وہ لاؤنج میں آیا۔ اندرونی گیٹ پر دستک ہوئی تھی۔ اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے سے صرف گیٹ اور گیٹ کے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ اندرونی گیٹ کے پاس کھڑا شخص نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے گیٹ کھولا اور حیران ہو گیا۔ باہر طیب خان کھڑا تھا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ اندر چلا آیا۔ احمد رضا نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا اور اس کی داڑھی بھی کافی چھوٹی تھی۔ پہلی بار وہ آج اسے اس لباس میں دیکھ رہا تھا۔

"خیریت ہے طیب خان؟"

"نہیں... " طیب خان نے ماتھے سے پسینہ پونچھا۔ "کچھ لوگ میرے پیچھے ہیں۔ مجھے ایک رات یہاں رہنا ہے کل رات چلا جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ اندر بیڈروم میں جا کر آرام کرو۔ میں تمہارے لیے چائے بناتا ہوں۔"

طیب خان کو کمرے میں بھیج کر وہ کچن کی طرف جا رہا تھا کہ بیل ہوئی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف جنید تھا۔

"طیب خان پہنچ گیا ہے؟"

"ہوں..."

"ٹھیک ہے۔ اندر کی روشنیاں بند کر دو اور خان سے کہو کہ بیرونی گیٹ کو لاک کر کے اپنے کوارٹر میں چلا جائے۔ طیب خان کے متعلق ایجنسیوں کو پتا چل گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اس کے گرد گھیرا تنگ ہوتا وہ وہاں سے نکل آیا ہے۔ کل رات اس کے آدمی اسے بارڈر کراس کرا دیں گے۔ تمہارا ٹھکانا محفوظ ہے، لیکن پھر بھی احتیاط اچھی ہے۔ صبح کسی مناسب ٹائم میں وہ تمہارے گھر سے نکل جائے گا کیونکہ باس نہیں چاہتے کہ تم کسی کی نظر میں آؤ۔"

اور احمد رضا نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ ابراہیم کے گھر جا کر اس کا نمبر لے سکتا تھا۔ طیب خان کھانا کھا کر جلد ہی سونے چلا گیا تھا اور اس نے جنید علی کی ہدایت کے مطابق گیٹ لاک کروا دیا تھا۔

صبح ناشتے کے بعد طیب خان مسلسل فون پر مصروف رہا تھا۔ گیارہ بجے کے قریب جنید علی کا فون آیا تھا۔

"تم پچھلے گیٹ سے طیب خان کو لے کر نکلو بی بلاک کے پارک کے پاس میں گاڑی لے کر منتظر ہوں گا۔"

اس نے طیب خان کو بتایا اور کچھ دیر بعد وہ دونوں گھر سے نکلے۔ جنید کے کہنے کے مطابق وہ پیدل جا رہے تھے۔ سی بلاک سے نکل کر وہ جیسے ہی بی بلاک میں داخل ہوئے، کسی سمت سے گولیاں آئی تھیں۔ احمد رضا نے طیب خان کو لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا اور غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے لگا جیسے اس کے پیٹ میں کوئی انگارہ گھس گیا ہو۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے اوندھا گر گیا۔

☼ ☼ ☼

سمیرا نے گاؤن اتار کر کرسی پر رکھا اور خود بھی کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گئی۔ وہ مسلسل چار گھنٹوں سے لیبر روم میں تھی اور کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ ڈاکٹر عاصمہ نے آج سات سیزیرین نبٹائے تھے اور وہ مسلسل ان کے ساتھ تھی۔ چند ماہ پہلے ہی اسے اور مرینہ کو یہاں ہاؤس جاب ملا تھا۔ اس کی نائٹ تھی، لیکن ڈاکٹر عاصمہ نے اسے روک لیا تھا اور اب اسے مرینہ کا انتظار تھا جسے ایک بجے آف کرنا تھا۔ آج کل وہ "الریان" میں ہی رہ رہی تھی۔

اس نے کرسی کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے آنکھیں موند لیں اور آنکھوں کے سامنے احمد رضا کی تصویر آگئی تھی۔ تین سال۔ تین طویل سال گزر گئے تھے اب جبکہ تصدیق ہوئی تھی کہ احمد حسن ہی احمد رضا ہے تو وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ بہت سارے صحافیوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اسے یقین تھا۔ بند آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔

"یااللہ کب ہماری دعائیں مستجاب ہوں گی۔"

زبیدہ نے ایک بار پھر چپ سادھ لی تھی انہوں نے احمد رضا کے متعلق پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔

"مس سمیرا! میں اندر آسکتا ہوں؟" ہمدان دروازے میں سے جھانک رہا تھا۔

سمیرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ کبھی کبھار ہمدان آجاتا تھا انہیں لینے۔

"رینا ابھی مصروف ہے۔ آج بہت رش ہے مریضوں کا۔" اس نے ہاتھوں کی پشت سے نم آنکھوں کو پونچھا۔ ہمدان نے بغور اسے دیکھا۔

"آپ اتنا روتی کیوں ہیں مس سمیرا۔ مانا آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔ کسی ٹھہری ہوئی جھیل کی طرح۔ اگر ان میں جھانکا جائے تو بندہ ڈوب ہی جائے۔ اتنے آنسو مت بہایا کریں کہ ہم ہی ڈوب جائیں۔" اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

"آپ کو بہت باتیں بنانی آگئی ہیں۔ رومانی ناول کم پڑھا کریں۔"

"سمیرا۔۔۔!" وہ یک دم سنجیدہ ہوا تھا۔ "کیا میں اپنے والدین کو اب آپ کے گھر بھیج سکتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کسی روز پاپا کو غصہ آگیا تو مجھے سہرا باندھ کر کہیں بھی ہنکا کر لے جائیں گے۔"

سمیرا کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ہمدان نے دیکھا اس کی آنکھیں اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ ان میں ہمیشہ جیسی اداسی تھی۔

"سمیرا میں۔۔۔" وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک وارڈ بوائے اندر داخل ہوا۔

"ڈاکٹر سمیرا! ڈاکٹر فیروز نے آپ کو ایمر جنسی میں بلایا ہے۔ بیک وقت کئی زخمی آگئے ہیں۔ ایک گاڑی اور وین کا حادثہ ہوا ہے اور ایک شخص کو گولی لگی ہے۔"

سمیرا ایک دم کھڑی ہوگئی۔ اس نے ہمدان کو وہاں ہی انتظار کرنے کا کہا اور وارڈ بوائے سے پوچھا۔

"ایمر جنسی میں کون کون ڈاکٹر ہے؟"

"ڈاکٹر حبیب، ڈاکٹر فیروز اور ڈاکٹر عاصمہ ہیں۔ حادثے میں زخمی ہونے والوں کی تعداد پندرہ بیس سے زیادہ ہی ہے۔ چند ایک کی حالت تو بہت نازک ہے۔"

وہ تیزی سے باہر نکلی۔ یقیناً" وہاں اس کی ضرورت تھی۔

"مس سمیرا مجھے اسسٹ کیجئے۔" ڈاکٹر حبیب نے اسے دیکھتے ہی کہا۔ وہ آپریشن ٹیبل کے پاس کھڑے تھے۔

"اس شخص کے پیٹ میں گولی لگی ہے اور بازو پر بھی۔ مجھے پہلے اس شخص کے پیٹ کی گولی نکالنا ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے۔"

سمیرا نے ان کے قریب جا کر جھک کر دیکھا اور اس کی چیخ نکل گئی۔

"رضی۔۔۔! رضی!" اس نے ایک دم ہی اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔ "رضی! آنکھیں کھولو، ادھر دیکھو۔"

احمد رضا نے یک دم آنکھیں کھول کر اسے دیکھا۔

"سمیرا۔۔۔!" اس نے ذرا سا ہاتھ اونچا کیا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس کا ہاتھ نیچے گر گیا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ اس کے لب ہولے ہولے لرز رہے تھے شاید وہ کچھ کہہ رہا تھا۔

"رضی۔۔۔ احمد رضا۔" وہ دیوانوں کی طرح اس سے لپٹی جا رہی تھی۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا بھائی۔ آنکھیں کھولو مجھے دیکھو میں سمیرا ہوں۔"

"اسٹاف! ڈاکٹر سمیرا کو کچھ دیر کے لیے باہر لے جائیں۔" ڈاکٹر حبیب نے اسٹاف سے کہہ کر سمیرا کی طرف دیکھا۔

"ریلیکس۔۔۔ ڈاکٹر سمیرا۔"

"ڈاکٹر حبیب! یہ میرا بھائی ہے۔ پلیز اسے بچالیں۔ میرا اکلوتا بھائی۔۔۔ ڈاکٹر پلیز۔"

"بچانے والی ذات اللہ کی ہے ڈاکٹر سمیرا!"

انہوں نے اشارہ کیا اور نرس سمیرا کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گئی۔

"نہیں پلیز۔ مجھے اندر ہی رہنے دو۔ کیا پتا، وہ آنکھیں کھولے اور مجھے۔۔۔"

"ڈاکٹر سمیرا پلیز۔"

اسٹاف نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔ ایمر جنسی زخمیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ڈاکٹرز نرسیں سب مصروف تھے۔ ایمر جنسی کے باہر کچھ زخمیوں کے عزیز بھی تھے۔ پولیس بھی نظر آرہی تھی۔ وہ کھیٹر کی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ رو رہی تھی جب مرینہ نے آکر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شاید کسی نے اسے بھی حادثے کا بتا دیا تھا۔

"سمیرا! کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟"

"رینا!" وہ اس سے لپٹ گئی۔ "میرا بھائی۔ ہمارا رضی۔ وہ اندر ہے، زخمی ہے پلیز اس کے لیے دعا کرو۔"

اتنے سارے برسوں میں اس نے مرینہ سے صرف اتنا شیئر کیا تھا کہ اس کا ایک بھائی ہے جو برسوں پہلے ملک سے باہر چلا گیا تھا اور پھر پلٹ کر نہیں آیا۔

"آٹھ سالوں بعد میں نے اسے دیکھا ہے اور وہ مر رہا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا، اس نے کہا ڈاکٹر سمیرا۔۔۔ وہ مسکرایا۔"

وہ جیسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہو رہی تھی۔ مرینہ نے اسے لپٹا لیا۔ تسلی دی۔

اس روز ہمدان اور مرینہ سارا وقت اس کے ساتھ رہے تھے۔ ڈاکٹر حبیب نے آپریٹ کر کے گولی نکال دی تھی۔ ہمدان نے خون بھی دیا تھا۔ اسے آئی سی یو میں منتقل کرنے کے بعد ڈاکٹر حبیب نے اسے ہلکی سی سرزنش بھی کی تھی کہ ڈاکٹر کی حیثیت سے اسے خود پر قابو رکھنا چاہیے تھا۔ اس نے سوری کر لیا تھا۔ لیکن اسے اپنے اوپر اب بھی اختیار نہیں تھا آنسو اب بھی اس کے رخساروں پر پھسل رہے تھے۔

مرینہ اور ہمدان اسے بہت ساری تسلی دے کر تھوڑی دیر کے لیے گھر گئے تھے۔ "ہم ابھی آجائیں گے تم پریشان مت ہونا۔"

اس نے سر ہلا دیا تھا اور احمد رضا کے بیڈ کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھی وہ قطرہ قطرہ خون اس کی رگوں میں اترتا دیکھ رہی تھی جب اس نے آنکھیں کھولیں۔

"رضی!" وہ بے اختیار اس کی طرف جھکی۔

"سمیرا! تم لوگ کہاں چلے گئے تھے، کہاں کھو گئے تھے۔"

"رضی۔۔۔!" سمیرا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور روتے ہوئے کہا۔ "تم کھو گئے تھے رضی؟"

"امی۔۔۔ ابو کہاں ہیں؟ بہت ناراض ہیں مجھ سے؟" اس کی آنکھیں بند ہوئیں۔

"وہ راولپنڈی میں ہیں رضی!" وہ اس کی طرف جھکی۔

"سمیرا۔۔۔!" احمد رضا نے پھر آنکھیں کھولیں۔

"ابو سے میری سفارش کرنا۔ ان سے کہنا میں لڑکھڑایا ضرور تھا، لیکن گرا نہیں تھا۔ میں نے اس کے ساتھیوں میں شامل ہونے کا گناہ کیا تھا، لیکن میں نے اسے نبی کبھی نہیں مانا۔۔۔ گواہ رہنا سمیرا کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آخری نبی مانتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ ان کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔۔۔ میری موت کے بعد میرے ایمان کی گواہی دینا۔"

احمد رضا کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"سمو! امی ابو سے میری طرف سے معافی مانگنا میں نے انہیں دکھ دیا۔ تکلیف دی۔ لیکن میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس پر انہیں شرمندگی ہو۔ کاش میں مرنے سے پہلے ان سے معافی مانگ سکتا۔" اس کی آواز لڑکھڑا گئی اور سانس اکھڑنے لگی۔

"رضی۔۔۔ رضی!" وہ چیخی اور ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر کو آواز دی۔

"ڈاکٹر۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔"

ڈاکٹر سمیرا کو پیچھے ہٹا کر چیک کرنے لگا تو وہ حسن رضا کو فون کرنے آئی سی یو سے باہر بھاگی۔

☆ ☆ ☆

مائرہ لاؤنج میں خاموش بیٹھی تھیں، کسی گہری سوچ میں ڈوبی۔ انہوں نے لاؤنج میں آتی رابیل کو بھی نہیں دیکھا جو مرینہ کے کمرے سے نکل کر لاؤنج میں دائیں طرف والے صوفے پر بیٹھ گئی تھی اور مائرہ سوچ رہی تھیں پتا نہیں بابا جان نے عمارہ سے بات کی یا نہیں۔ اس رات انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ سے بات کی تھی۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے تھے۔

"کیوں بابا جان! کیا ایسا ممکن نہیں ہے؟" انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر مائرہ نے پوچھا تھا۔

"ممکن ہو سکتا تھا۔ اگر درمیان میں یہ سب کچھ نہ ہوا ہوتا کہ میں نے بھی ایسا ہی چاہا تھا۔" مائرہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کیا شانی نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔" لیکن ان کے چہرے سے وہ کچھ اندازہ نہ کر سکیں۔

"جب ایبک پہلی بار الریان آیا تھا تو میرے دل میں خیال آیا تھا ایک بار... دل نے چاہ بھی کی تھی کہ الریان کی کوئی لڑکی مراد محل کی بہو بنتی۔"

"بابا جان! اگر آپ چاہیں۔ اگر آپ عمارہ سے کہیں تو کیا اب بھی یہ ممکن نہیں ہے۔ میری خواہش ہے اور شانی کی بھی۔"

"کیا شانی نے تم سے ایسا کہا؟" وہ چونکے تھے اور مائرہ نے نظریں چرالی تھیں۔

"ہمدان اور رابیل ایک دوسرے سے شادی نہیں کرنا چاہتے تو میرا دل بار بار ایبک کی طرف لپکتا ہے۔"

عبدالرحمٰن شاہ کو مائرہ کی بات پر حیرت ہوئی تھی اور مائرہ نے اس حیرت کو محسوس بھی کرلیا تھا۔ پھر بھی اصرار کیا تھا۔

"بابا جان! آپ بات کریں گے نا؟ رابی' رابی بھی شاید ایبک کو ہی پسند کرتی ہے۔ اسی سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

مائرہ دبے لفظوں میں کہہ کر اٹھ کر چلی آئی تھیں۔ لیکن انہوں نے عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات کو نوٹ کیا تھا اور انہیں یقین ہو گیا تھا کہ بابا جان اب ہر ممکن کوشش کریں گے رابی کی خاطر... پھر میں دیکھ لوں گی۔ موی کو بھی اور عمارہ کو بھی۔

اور پتا نہیں انہوں نے عمارہ اور موی سے بات کی تھی یا نہیں۔

مائرہ نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور ان کی نظر رابیل پر پڑی۔

"رابی..." ان کے دل پر چوٹ پڑی تھی۔

یہ ان کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اس وقت بکھرے بالوں اور شکن آلود کپڑوں کے ساتھ افسردہ سی بیٹھی تھی۔ ایسا حلیہ کب ہوتا تھا اس کا۔

"رابی!" وہ اٹھ کر اس کے قریب آئیں۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے۔ کل سے کپڑے بھی نہیں بدلے۔"

"مما..." رابیل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "میرا دل نہیں چاہتا۔ پلیز آپ پاپا سے اجازت دلوا دیں۔ مجھے پی ایچ ڈی کرنے کی۔"

"میری جان! شادی کے بعد جو دل چاہے کرتی رہنا۔" مائرہ نے اس کی پیشانی پر بکھرے بال پیچھے کیے۔ "میں زبیر کے ساتھ ہی تمہاری شادی کرنے کا بھی سوچ رہی ہوں۔"

"مما..." رابیل نے زخمی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میں نے بابا جان سے بات کرلی ہے رابی! اور وہ بات کریں گے عمارہ سے اور پھر جیسا تم چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا۔ بابا جان کی بھی یہی خواہش ہے۔" انہوں نے اپنا یقین رابیل کے دل میں انڈیل دیا تھا۔

"کیا بابا جان نے کہا آپ سے ایسا؟"

"ہاں..." رابیل کو یقین نہیں آرہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں جگنو سے چمک اٹھے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔

"مما! آپ کو یقین ہے کہ..." رابیل کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"پورا یقین میری جان! تم جاؤ فریش ہو کر آؤ تو ذرا مارکیٹ تک چلتے ہیں۔"

رابیل دل کی دھڑکنوں پر قابو پاتی کھڑی ہوگئی تھی۔ مائرہ کچھ دیر لاؤنج میں کھڑی رابیل کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھتی رہیں اور پھر عبدالرحمٰن شاہ کے کمرے کی طرف بڑھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کتاب پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر کتاب رکھ دی۔ "آؤ بیٹا! آجاؤ۔"

"بابا جان! میں پوچھنے آئی تھی کہ آپ نے بات کی عمارہ اور موی سے۔"

"یہ باتیں فون پر کرنے کی نہیں ہوتیں بیٹا! دو' تین روز میں وہ لوگ آنے والے ہیں۔ ایبک کی کتاب کی تقریب رونمائی ہے۔ تب بات کروں گا میں عمو سے۔ لیکن..."

"بابا جان! رابی ایبک سے محبت کرتی ہے اور وہ اس کے سوا کسی اور سے شادی نہیں کرے گی۔"

مائرہ بات کرکے وہاں رکی نہیں تھیں۔ عبدالرحمٰن شاہ کو پریشان کرکے وہ اپنی مسکراہٹ چھپاتی ان کے کمرے سے نکل آئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

آج الحمرا آرٹس کونسل میں ایبک فلک شاہ کے ناول "زمین کے آنسو" کی تقریب رونمائی تھی۔ ہمدان نے تمام انتظامات کا جائزہ لیا۔ چند کرسیوں پر کچھ مہمان بیٹھے تھے۔ کچھ آرہے تھے۔ وہ مہمانوں کے استقبال کے لیے ہال کے دروازے کی طرف بڑھا تو ایک جگہ رکا۔

"ارے میم پاؤلن آپ۔" ہمدان بھی ایبک کے ساتھ کچھ دن فرنچ سیکھنے جاتا رہا تھا۔ "میں نے سمجھا آپ فرانس واپس چلی گئی ہوں گی۔ بہت محبت تھی آپ کو فرانس سے۔"

"آہ فرانس... پیارا فرانس اور پیرس... خوب صورت پیرس اداس اور غم زدہ پیرس۔ کسی دلہن کی طرح سجا ہوا خوب صورت اور اداس۔ میں اسے بہت یاد کرتی ہوں ہوم وان۔"

وہ ہمیشہ اسے ہوم وان کہتی تھیں اور ایبک بہت ہنستا تھا۔

"لیکن میں یہاں تمہارے پاکستان میں بہت خوش ہوں۔ جب میں وہاں تھی تو مجھے وہاں مہینے میں دو' تین بار بھوکا سونا پڑتا تھا اور کبھی شاید زیادہ بار۔" وہ بڑبڑائی تھیں۔

"مجھے ایبک کا دعوت نامہ پاکر بہت خوشی ہوئی تھی۔ کہاں ہے وہ؟"

"آتا ہی ہوگا' میں چلتا ہوں۔" اس نے ہال میں داخل ہوتے سمیرا اور احمد رضا کو دیکھ لیا تھا اور ان کے استقبال کے لیے بڑھا۔

"کیسے ہیں آپ احمد رضا؟"

"فائن... لیکن ابھی کچھ زخم کچے ہیں بھرنے میں وقت لگے گا۔" اس نے ذو معنی بات کی۔

ہمدان نے مسکرا کر اگلی نشستوں کی طرف اشارہ کیا۔ سمیرا کی آنکھوں میں آج اداسی کے رنگ نہ تھے بلکہ کرنے والی خوشیوں کے رنگ جھلملا رہے تھے۔ احمد رضا لوٹ آیا تھا اور ہمدان کے والدین اس تقریب کے بعد ان کے گھر آنے والے تھے۔

احمد رضا نے پریس کانفرنس کرکے اعتراف کرلیا تھا کہ وہ اسماعیل سے وقتی طور پر متاثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن اس نے اسے نبی تسلیم نہیں کیا تھا۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ لیکن اب لوٹ آیا ہے اور سچے دل سے ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔

طیب خان کے متعلق اخبار میں چھوٹی سی خبر چھپی تھی کہ افغان مجاہد کسی دہشت گرد کی گولی کا نشانہ بن گیا۔ جبکہ پاس سے گزرنے والا ایک راہ گیر بھی زخمی ہوگیا تھا۔ احمد رضا کا کہیں نام نہ تھا۔

الوینا نے فون کیا تھا اور دھمکی دی تھی کہ ان کے بارے میں اگر اس نے کوئی ایک لفظ بھی کسی سے کہا تو انجام وہ جانتا تھا۔

اسے انجام کی پروا نہیں تھی۔ حسن رضا نے اس کا یقین کرلیا تھا۔ اسے معاف کردیا تھا۔ اب اگر راہ چلتے کوئی گولی آکر اس کی زندگی ختم کردیتی تو اسے اپنے مرنے کا کوئی دکھ نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ لوگ جن کے جال سے وہ نکل آیا تھا۔ وہ... معاف نہیں کرتے۔ شاید کسی گولی پر اس کا نام بھی لکھا جاچکا ہو۔ لیکن ابھی سب ٹھیک تھا۔ اس کی دعائیں قبول ہوگئی تھیں اور جتنی بھی زندگی تھی۔ اسے وہ ملک و قوم کے لیے وقف کرچکا تھا۔

ہال آہستہ آہستہ مہمانوں سے بھرتا جارہا تھا۔ عمر زبیر اور عادل ہمدان کے ساتھ ہی مہمانوں کا استقبال کررہے تھے۔ جب رابیل اور مائرہ نے ہال میں قدم رکھا۔ رابیل آج بڑے دنوں بعد بہت دل سے تیار ہوئی تھی۔ عمر اور زبیر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ وہ ان دونوں کے آنے کی توقع نہیں کررہے تھے۔ عمر کو بے تحاشا خوشی ہوئی۔

"رابی آپی! ادھر اگلی نشستوں پر۔" عمر نے سرگوشی کی تو اس نے ایبک کو دیکھنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا اور عبدالرحمٰن شاہ کے پاس والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک ھیتیں آیا؟"
"آتے ہی ہوں گے ابھی۔" عمر نے جواب دیا۔
"ہاں بھئی۔ باراتی تو آگئے ہیں۔ دولہا کی کمی ہے بس۔" مصطفیٰ شاہ مسکرائے تھے۔
"ایک کہاں رہ گیا بھئی۔ کیا آپ کے ساتھ ہی بہاول پور سے نہیں آیا تھا۔"
عثمان شاہ نے پاس بیٹھے فلک شاہ سے پوچھا۔ وہ لوگ رات ہی بہاول پور سے آئے تھے اور ان کا قیام کرنل شیردل کے گھر پر تھا۔
"لو بھئی۔ دولہا بھی آگیا اور دلہن بھی۔"
کرنل شیردل نے پیچھے مڑکر دیکھا اور قہقہہ لگایا۔ رابیل نے یک دم رخ موڑ کر انہیں دیکھنے کی کوشش کی تھی۔
ایک اریب فاطمہ کا ہاتھ تھامے سیٹوں کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ اریب فاطمہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی۔
رابیل کو ایک دم کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔ یہ اریب فاطمہ تین سالوں بعد ایک کے ساتھ۔
اسے اپنا دل ڈوبتا سا محسوس ہوا۔
ابھی کچھ دیر پہلے وہ کتنی خوش تھی۔ مائرہ نے اسے یقین دلایا تھا کہ آج رات جب وہ لوگ ملک ہاؤس آئیں گے تو بابا جان ان سے بات کریں گے۔
اور اب عمارہ عبدالرحمٰن شاہ کے سامنے اریب فاطمہ کا ہاتھ تھامے کھڑی تھیں۔ ایک اسٹیج کی طرف بڑھ گیا تھا۔
"بابا جان! یہ اریب فاطمہ ہماری بہو۔۔۔ چند دن قبل ہی نکاح ہوا ہے ایمرجنسی میں۔ اب ولیمہ دھوم دھام سے کریں گے۔ ان شاء اللہ۔ ایک سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اطلاع نہیں کی۔"
عبدالرحمٰن شاہ نے بے اختیار پاس بیٹھی رابیل کو دیکھا۔ جس کی آنکھیں ایک دم بجھ گئی تھیں اور عبدالرحمٰن شاہ کے چہرے پر سکون اتر آیا تھا۔ برسوں سے جوان کے دل میں ایک ناکردہ جرم کی پھانس چھپی تھی اس میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔ سائرہ کی بیٹی ان کے خاندان کا حصہ بن گئی تھی۔ انہیں لگا جیسے ان کے اس جرم کا کچھ کفارہ تو ادا ہو گیا ہو۔
"دیکھا۔ میں نے کہا تھا نا" آپی بھائی ربا آپی سے ہی شادی کریں گے اور میں کبھی غلط نہیں کہتی۔"
رابیل کے پیچھے بیٹھی عاشی نے مرینہ کے کان میں سرگوشی کی اور جو سرگوشی ہرگز نہ تھی۔ رابیل کا جی چاہا وہ مڑ کر عاشی سے کہے۔
"ہاں۔ تم نے صحیح کہا تھا۔" لیکن اس کے اندر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ تھی۔ وہ ضبط کیے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ کو سہ رہی تھی۔ اس نے پاس بیٹھی مائرہ کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ مائرہ کا چہرہ چیخ رہا تھا۔ انہوں نے کرسی کے ہتھے پر رکھے رابیل کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ان کی بیٹی کے مقدر میں جو نارسائی آئی تھی۔ اس کے لیے وہ قصوروار تھیں۔ ان کے جرم کی سزا ان کی بیٹی کو ملی تھی۔
بلاشبہ جھوٹی تہمت لگانے والا گناہ گار ہے۔
آج پہلی بار مائرہ نے دل میں پچھتاوا محسوس کیا تھا۔ پہلی بار انہیں احساس ہوا تھا کہ انہوں نے جو کیا تھا غلط کیا تھا۔ محبتیں اس طرح حاصل نہیں کی جاتیں۔
وہ مجرم تھیں۔ عمارہ اور موی کی۔
اور الریان کے ہر فرد کی اور اپنی بیٹی کی بھی۔
انہوں نے رابی کے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ شاید اس طرح وہ اسے حوصلہ اور تسلی دینا چاہتی تھیں۔ لیکن نہیں جانتی تھیں کہ محبت کھونے کا دکھ لفظوں سے کم نہیں ہوتا اور کوئی حرف تسلی رابیل کا درد کم نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ رابیل نے ایک سے محبت کی تھی اور محبت کبھی نفرت میں نہیں بدل سکتی جبکہ انہوں نے فلک شاہ کو صرف جیتنا چاہا تھا اور ہارنے پر نفرت کرنے لگی تھیں۔
ایک اسٹیج پر بیٹھ چکا تھا۔ دو، تین سینئر ادیب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ ہمدان روسٹرم کے پیچھے کھڑا کتاب کا تعارف کروا رہا تھا۔ دو، تین لوگوں نے کتاب پر بھی کیا۔ اس کے بعد ہمدان نے کتاب کے چیدہ چیدہ پیراگراف پڑھے اور اب وہ آخری صفحہ پڑھ رہا تھا۔ ہال میں مکمل خاموشی تھی۔ صرف ہمدان کی آواز گونج رہی تھی۔
اور حورعین اپنی سفید اوڑھنی سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
"میں چلتی ہوں۔"
باہر کہیں گولیاں چلنے کی آواز آئی تھی۔
"لگتا ہے کہیں خون کی برسات ہوئی ہے۔"
میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
ہاں ہاتھ اٹھاؤ کہ قیامت کی گھڑی ہے۔
"رکو حورعین ابھی رک جاؤ۔"
حورعین نے مڑ کر مجھے دیکھا۔ اس کی غزال آنکھوں میں سہم تھا اور اس کی پلکیں بھیگ رہی تھیں۔
"میرے شہروں سے یہ خون کی برسات کب ختم ہوگی شاعر؟"
اس نے رخ موڑا اور تیزی سے آفس سے باہر نکل گئی۔
"رکو۔۔۔ حورعین! میری بات تو سن لو۔۔۔ میں تمہارے گھر آنا چاہتا ہوں۔ تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے کچھ اپنا اتا پتا بتاؤ۔"
وہ فٹ پاتھ پر رک گئی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا اس کے قریب آیا تھا۔
"حورعین پلیز۔۔۔ بتاؤ۔ کیا مجھ سے شادی کرو گی؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک دم رخ موڑ کر چلنے لگی۔ میرا جی چاہا میں ناچنے لگوں۔ میرے اردگرد جیسے رنگ ہی رنگ اتر آئے تھے۔
یہ اتنی خوب صورت دنیا۔ میں نے گھوم کر چاروں اور دیکھا۔ سال نو کا یہ پہلا دن میرے لیے ہر دن سے زیادہ حسین ہے۔
حورعین خراماں خراماں جا رہی تھی۔
"حورعین! رکو۔"
میں اس کی طرف لپکا۔ وہ مڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔ اس کی ہر دم بھیگی رہنے والی آنکھوں میں جگنو چمک رہے تھے۔ میں وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا کہ یک دم فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ہوئی، میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے قریب سے گزرتے موٹر سائیکل سوار کو دیکھا۔ جس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور پھر حورعین کو جو لڑکھڑائی تھی۔
"حورعین!"
میں چیخ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس کی سفید اوڑھنی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔ میں اسے بانہوں میں سنبھالے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ اس کا سر میری گود میں تھا۔
"حورعین۔۔۔ خمسی آنکھیں کھولو۔"
میں اسے دیوانہ وار پکار رہا تھا اور میرے اردگرد لوگ اکٹھے ہو رہے تھے اور اس کے ساتھ دوسرے زخمی ہونے والوں کو دیکھ رہے تھے۔

پھر زمین روتی ہے
پھر لہو کا اک دریا
شور ہے قیامت کا
سال نو کا اک تحفہ
صرف ایک گولی ہے
پھر زمین روتی ہے

حورعین کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔ پھر اس کے لب ساکت ہو گئے اور آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں دیوانہ وار اسے پکارتا تھا۔ لیکن میری آواز اس کے کانوں تک نہیں جاتی تھی اور زمین کے آنسو سمندر کے نمکین پانی میں اکٹھے ہوتے تھے۔

☼

ثریا انجم

کہیں ایسا نہ ہو

شام ڈھلنے کو تھی مگر گرمی کی شدت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی تھی۔

نفیس بانو کچھ دیر پہلے ہی نہا کر نکلی تھیں ' ہلکے سبز رنگ کے لان کے سوٹ میں ان کی سرخ و سفید رنگت کچھ اور نمایاں ہو رہی تھی ' سیاہ نم بالوں میں کہیں کہیں سفید بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے ' ان کے پروقار سراپے میں ایک خاص قسم کا رعب بھی شامل تھا جو ان سے مخاطب ہونے والے کو احتیاط سے کام لینے پر مجبور کر دیتا تھا مگر اس وقت ان کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر پھیلا ہوا تھا ' آج ثانیہ پورے چار ماہ بعد میکے آئی تھی ' ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اتنے دنوں تک نہ آنے کی وجہ اس کی ساس کی بیماری اور پھر ان کی موت تھی۔ ان پر فالج کا شدید حملہ ہوا تھا اور وہ نا صرف اپنے بستر تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں بلکہ بات کرنے اور ہلنے جلنے سے بھی معذور ہو گئی تھیں اور چونکہ ثانیہ ان کی اکلوتی بہو تھی لہٰذا ایسی حالت میں انہیں چھوڑ کر میکے آنا ناممکن تھا ' حالانکہ ان کی چاروں بیٹیاں بھی اسی شہر میں رہتی تھیں مگر ماں سے تمام تر محبت اور ان کی حالت پر پریشان ہونے کے باوجود وہ اپنے اپنے گھروں کے بکھیڑوں میں اس طرح الجھی ہوئی تھیں کہ بس مہمانوں کی طرح آ کر خیریت دریافت کرنے اور فکر مندی کا اظہار کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھیں۔

ثانیہ نے ایک اچھی بہو کی طرح جی جان سے ساس کی خدمت کی مگر وہ ڈھائی ماہ مکمل معذوری کی تکلیف جھیل کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ ان کے انتقال کے بعد سوئم سے لے کر چہلم تک تمام رسومات نبھانا بھی ظاہر ہے ثانیہ کی ذمہ داری تھی لہٰذا ان کے چہلم کے دو روز بعد وہ پہلی بار گھر سے نکلی تھی۔

نفیس بانو اتنے دنوں بعد بیٹی کے آنے سے بہت خوش تھیں مگر داماد کے سامنے خاموش رہ کر اپنی خوشی چھپانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔ حالانکہ احسن تو بڑے ریلیکس انداز میں ان کے بیٹے فہیم سے سیاست میں آنے والی حالیہ تبدیلیوں پر بات کر رہا تھا ' اس کے چہرے پر رنج کا شائبہ تک نہ تھا۔ اس کے برعکس ثانیہ کا انداز کچھ گم صم سا تھا وہ ہر تھوڑی دیر بعد جیسے کسی خیال میں کھو جاتی تھی ' جیسے وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی ذہنی طور پر وہاں حاضر نہ ہو۔

نفیس بانو نے کئی بار بیٹی کی طرف دیکھا ' وہ اس کے چہرے کی بدلتی کیفیت کا اندازہ کر رہی تھیں مگر اس وقت کچھ پوچھنے کا موقع نہیں تھا۔

"ہو سکتا ہے اتنے دنوں کی تھکن اور ٹینشن کی وجہ سے ایسی ہو رہی ہو ' دو چار دن یہاں رہے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔" انہوں نے جیسے خود کو یقین دلایا۔ ان کی بہو حنا ' ثانیہ اور احسن کے آنے کے بعد کچن میں مصروف تھی اور اب گھر میں پھیلتی اشتہا انگیز خوشبو سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کھانا تیار ہو چکا تھا۔

حنا فریش ہو کر آئی تو ثانیہ نے اس کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگا دیا۔ احسن نے بڑی بے تکلفی سے ہر ڈش کے ساتھ بھرپور انصاف کیا جیسے بہت دنوں بعد اچھا کھانا کھایا ہو ' کھانے کے بعد چائے کا دور چلا جس کے تھوڑی دیر بعد احسن بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر واپس چلا گیا کیونکہ ثانیہ ویک اینڈ میکے میں گزارنے کے ارادے سے آئی تھی۔

ثانیہ اپنے دونوں بچوں کو سلا کر نفیس بانو کے پاس آئی تو انہوں نے ایک بار پھر اس کی خاموشی کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔

"تم نے اپنی ساس کی موت کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے؟" انہوں نے اپنے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے فکر مندی سے کہا تو ثانیہ ایک گہری سانس لے کر خالی خالی نظروں سے ان کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔

"ہر آنے والا اپنی عمر لکھوا کر لاتا ہے ' حمیدہ باجی کی عمر ایسی کم بھی نہیں تھی اور پھر فالج نے انہیں بالکل معذور کر دیا تھا۔ اگر ایسی حالت میں وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہتیں تو خود سوچو ' انہیں تو جو تکلیف ہوتی تم لوگوں کا کیا حال ہوتا ' ڈھائی تین مہینے کی بیماری میں تو تمہارا سارا گھر تلپٹ ہو کر رہ گیا ' بچوں کی پڑھائی الگ

متاثر ہو رہی تھی' اور پھر میں خود ایسے کئی لوگوں کو جانتی ہوں جو ایسی حالت میں کئی کئی سال تک زندہ رہے کہ نہ زندوں میں شمار ہوتے تھے نہ مُردوں میں' اللہ تعالیٰ نے حمیدہ باجی پر بڑا کرم کیا کہ ان کی مشکل آسان کر دی اور تم نے بھی ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تو اب کیوں اپنے ذہن پر اتنا بوجھ ڈال رہی ہو' ایسے تو بیمار پڑ جاؤ گی۔"

نفیس بانو اپنی چھوٹی بیٹی کی حساس طبیعت سے واقف تھیں اسی لیے محبت آمیز انداز میں اسے سمجھانے لگیں مگر وہ اب بھی ان کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے اپنے ہی کسی خیال میں گم تھی۔

"ثانیہ" انہوں نے آہستہ سے اس کا کندھا ہلایا تو وہ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"امی! ایک بات بتائیں' کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اولاد کے لئے اپنی سگی ماں کا دنیا سے چلے جانا اطمینان اور سکون کا باعث بن جائے۔" اس کی سوالیہ نظریں نفیس بانو کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ خود حیرت سے اس کا منہ تک رہی تھیں کہ بھلا یہ کیسا سوال تھا اور ثانیہ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

"آپ کو تو پتا ہے کہ احسن کس قدر نرم طبیعت کے مالک ہیں اور وہ اپنی ماں کا تو ہمیشہ بہت خیال رکھتے تھے' ان کی وجہ سے ہی میں نے بھی اماں کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں کی مگر ان کے انتقال کے بعد میں نے بڑی عجیب سی بات محسوس کی کہ احسن کو اپنی ماں کے انتقال کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا کہ ایک بیٹے کو ہونا چاہیے' وہ تعزیت کے لیے آنے والوں کے سامنے بس رنجیدگی کا اظہار ہی کرتے تھے ورنہ تو وہ بالکل نارمل ہیں اور آج تو یہاں آتے ہوئے راستے میں انہوں نے ایک ایسی بات کہی کہ میں اب تک حیرت سے زیادہ دکھ محسوس کر رہی ہوں کہ وہ ایسی بات اتنی آسانی سے کیسے کہہ سکتے ہیں۔"

ثانیہ خاموش ہو کر بے چینی سے اپنی انگلیاں مسلنے لگی اور نفیس بانو جو اس کی اس قدر لمبی تمہید سے اکتا گئی تھیں کسی قدر چڑ کر بولیں۔

"آخر ایسا کیا کہہ دیا احسن نے جس کا تم نے اتنا اثر لے لیا۔"



سعادت کا اچانک ہارٹ فیل ہو جانے سے انتقال ہوا تو بیوگی کی سفید چادر اوڑھ کر میں مہینوں شدید رنج اور صدمے سے دوچار رہی مگر میری گرہستی کے معمولات میں کوئی ایسا بدلاؤ نہیں آیا مگر جب مجھے اطلاع ملی کہ ندیم نے امریکہ میں شادی کر لی ہے اور اس کا فی الحال واپس لوٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے گھر میں بھونچال سا آ گیا ہو۔

وہ بیٹا جسے ہم نے نجانے کن کن مشکلات سے گزر کر اعلیٰ تعلیم کے لیے یو۔ ایس بھیجا تھا اور جس کو باپ کے مرنے پر بھی میں نے پاکستان آنے سے روک دیا تھا کہ اس کا فائنل سمسٹر ہونے والا تھا اور اب جبکہ میں اس کی واپسی کے دن گن رہی تھی تو میرے پوچھنے پر اس نے کس آسانی سے کہہ دیا۔

"میں فی الحال پاکستان نہیں آ سکتا۔" کئی لمحے تو مجھے اس کی بات سمجھنے میں لگ گئے اور جب میں نے بمشکل تمام اپنے آپ پر قابو پا کر اس کے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

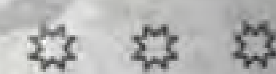
"امی! مجھے ابھی بہت آگے جانا ہے' محض ایک ڈگری حاصل کر لینے سے کچھ نہیں ہو گا' اسی لیے میں نے یہاں کی گرین کارڈ ہولڈر لڑکی سے شادی کر لی تاکہ مجھے یہاں رکنے میں کسی طرح کے مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔" وہ بڑے آرام سے بتا رہا تھا اور میرا سارا وجود شل ہوتا جا رہا تھا۔

"تم نے ایک بار بھی میرے بارے میں' اپنے بھائی اور بہن کے بارے میں نہیں سوچا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی میری آواز بھر آ گئی۔

"امی! میں نے اپنے اچھے مستقبل کے بارے میں ہی تو سوچا ہے' کوئی غلط کام تو نہیں کیا جو آپ اس قدر سیریس ہو رہی ہیں۔" اس کے لہجے کی بیگانگی نے میرے دل میں خنجر اتار دیا۔ رانیہ کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی اور اب ثانیہ کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے بعد ہی میں نے ندیم سے واپس آنے کے لیے کہا تھا مگر اس کے صاف انکار سے میرے اندر باہر سناٹا سا چھا گیا۔

سب سے پہلی اولاد پر انسان کو کیا کیا گمان ہوتے ہیں۔

پیدائش کے پہلے دن سے ہی خوابوں اور خواہشوں کے محل کی بنیاد پڑ جاتی ہے' حال کی ساری خوشیاں تج کے ماں باپ مستقبل کے کینوس میں رنگ بھرنا شروع کر دیتے ہیں' ایسا کینوس جس پر انہوں نے اپنی ناآسودہ تمناؤں کی تصویر بنائی ہوتی ہے' مگر پھر ایسا ہوتا ہے کہ خواہشوں کے محل کچھ اس طرح زمین بوس ہوتے ہیں کہ ان کی اڑتی دھول کے سامنے ہر منظر دھندلا جاتا ہے' تصور کے رنگ اس طرح پھیلتے ہیں کہ بس ایک ہی رنگ باقی رہ جاتا ہے' سوگ کا رنگ۔۔۔ مگر میں نے سوگ نہیں منایا۔ بس اللہ کا شکر ادا کیا کہ سعادت یہ دن دیکھنے کو زندہ نہیں تھے ورنہ وہ میری طرح اس قدر آسانی سے یہ صدمہ نہ سہار پاتے' آسان تو خیر میرے لئے بھی کہاں تھا مگر میں نے اس دکھ کو اپنی طاقت بنا لیا' آنکھوں میں آنے والے ہر آنسو کو اپنے اندر اتار لیا اور جتنے آنسو میرے اندر جمع ہوتے گئے اتنا ہی مجھ میں حالات سے لڑنے کا حوصلہ بڑھتا گیا۔



ثانیہ کی شادی پر ہر سوال کرنے والے سے میں مسکرا مسکرا کر یہی کہتی رہی۔ ندیم تو تڑپ رہا تھا بہن کی شادی میں شریک ہونے کے لیے' میں نے ہی منع کر دیا' اس کی بیوی ابھی ایسی حالت میں نہیں کہ اتنا لمبا سفر کر سکے اور ظاہر ہے اسے وہاں اکیلا چھوڑ کر بھی نہیں آ سکتا۔

ندیم کی شادی کے بارے میں بھی میں نے ایسا ہی ظاہر کیا تھا جیسے میری مرضی اور اجازت سے ہوئی ہو' یہ جانتی تھی کہ کچھ لوگ اصل حقیقت سے واقف ہیں اور جب کچھ لوگ واقف ہوتے ہیں تو سب ہی جان جاتے ہیں مگر مجھے اپنے منہ سے اپنے بیٹے کی نافرمانی اور بے حسی کا اظہار کر کے لوگوں کی ہمدردیاں سمیٹنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔

ثانیہ کی شادی کر کے میں ایک بڑے فرض سے سبک دوش ہو گئی' اب میری ساری توجہ کا مرکز فہیم تھا۔

اس سے قبل میرے چاروں بچے میرے لیے یکساں اہمیت رکھتے تھے' میں نے ان کی پرورش میں بھرپور ممتا کے ساتھ اپنا کردار نبھایا تھا' مگر اب معاملہ کچھ اور تھا' اب مجھے کسی قسم کے حالات یا کسی بھی رشتے سے شکست کھانا منظور نہیں تھا اس کے لیے مجھے ایک لائحہ عمل طے کرنا تھا۔ میں نے اپنے بچوں کی ایسی تربیت کی تھی کہ وہ بچپن ہی سے اپنے ذاتی کام خود کرنے کے عادی تھے مگر اب آہستہ آہستہ میں نے فہیم کی ہر ذمہ داری اپنے سر لے لی' اس کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے ہاتھوں سے کرنے لگی' شروع شروع میں وہ حیران ہوا اور مجھے روکنے کی کوشش بھی کی مگر پھر آسانیاں ملیں تو عادی ہوتا چلا گیا۔

کچھ دن گزرے تو میں نے اس کے وقت کا حساب بھی رکھنا شروع کر دیا۔ وہ کہاں جا رہا ہے' کس سے مل رہا ہے اس کے ایک ایک پل کی خبر رکھنا میں نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا' یہ نہیں کہ فہیم اس وقت کوئی کچی عمر کا نوجوان تھا' وہ ایم۔ بی۔ اے کر رہا تھا۔ اس کے دوستوں کی تعداد اچھی خاصی تھی جن کے ساتھ کمبائن اسٹڈی کرنا اور آؤٹنگ پر جانا اس کا معمول تھا مگر پھر "کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟ کب تک واپس آؤ گے؟" کی فون کالز کی وجہ سے اس کے دوستوں کی تعداد محدود ہوتی چلی گئی۔ یونیورسٹی جانا ہی اس کے گھر سے باہر نکلنے کا واحد سبب رہ گیا۔

اس تبدیلی پر بھی اس نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا کیونکہ اسے اس بات کا احساس تھا کہ میں کس قدر اکیلی ہو گئی ہوں اور ندیم کی شادی اور واپس نہ آنے کا غم کس طرح اندر ہی اندر مجھے کھائے جا رہا ہے' اس احساس کے تحت میری ہر بات وہ بلا کسی حجت

کے مان لیتا تھا بلکہ اکثر تو مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑتی تھی۔وہ میرے چہرے کے تاثرات سے ہی میری مرضی کا اندازہ کرلیتا تھا۔

فہیم کی محبت بے لوث تھی مگر میری مامتا میں خود غرضی شامل ہوچکی تھی' میرا لاشعور اولاد کی فرماں برداری کے بجائے اس کی محکومیت کا طالب تھا' میں دنیا کو دکھا دینا چاہتی تھی کہ کیا ہوا اگر ایک بیٹا میرے ہاتھوں سے نکل گیا۔ میرا دوسرا بیٹا تو پوری طرح سے میری مرضی کا تابع تھا۔

☼ ☼ ☼

وقت آہستہ آہستہ گزرتا گیا۔ فہیم کی تعلیم مکمل ہوگئی اور اپنی خواہش کے برخلاف اس نے مزید تعلیم کے لیے باہر جانے کا نام تک نہ لیا' کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ بات کسی طور میرے لیے قابل قبول نہ ہوگی۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اس کو ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب مل گئی اور میں نے فوری طور پر بڑے شوق اور چاہ سے اس کے لیے لڑکیاں دیکھنا شروع کردیں۔

"آخر آپ کس قسم کی لڑکی چاہتی ہیں؟" رانیہ نے بیزاری کا شدید اظہار کرتے ہوئے مجھ سے سوال کیا۔

یہ چوتھی لڑکی تھی جسے دیکھ کر آنے کے بعد میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا' بظاہر تو میں نے یہ کہا تھا کہ لڑکی اکلوتی ہونے کی وجہ سے لازمی طور پر لاڈلی اور نخریلی ہوگی' لہٰذا اس کا ہمارے گھر میں ایڈجسٹ ہونا ذرا مشکل ہی ہوگا مگر حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی خوبصورتی اور خود اعتمادی سے ڈر گئی تھی' مجھے خوف تھا کہ ایسی لڑکیاں بڑی آسانی سے مردوں کو اپنے قابو میں کرلیتی ہیں اور میں ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ فہیم بھی ندیم کی طرح بیوی اور بچوں کا ہو کر رہ جائے۔

گزشتہ سالوں میں ندیم دو مرتبہ پاکستان آیا تھا' ایک بار اکیلا اور دوسری مرتبہ بیوی اور دونوں بچوں کے ساتھ۔

اس کی بیوی ارسہ مجھ سے بہت محبت اور ادب سے پیش آئی اور جتنے دن رہی مہمان بن کر رہنے کے بجائے گھر کے ہر کام میں میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتی رہی' بچوں کو بھی اس نے میرے رشتے سے روشناس کروایا ہوا تھا اسی لیے وہ دادی دادی کہتے ہوئے میرے گرد رہتے تھے' مگر اس سب کے باوجود میرے دل میں پڑی وہ گرہ نہ کھل سکی جو ندیم کے اپنے طور پر شادی کے فیصلے کی وجہ سے پڑی تھی۔

ڈیڑھ دو سال کی جدوجہد کے بعد مجھے اپنی پسند بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ اپنی سوچ کے مطابق لڑکی مل ہی گئی۔

حنا دراز قد' قبول صورت اور خاموش سی لڑکی تھی' اس کے گھر والے بھی ہمارے سامنے دبے دبے سے لگ رہے تھے شاید اس کی وجہ ان کے گھر میں لڑکیوں کی تعداد میں زیادتی ہو یا حیثیت میں کمی' بہرحال مجھے حنا پسند آگئی اور میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے رشتے کی بات کرلی۔واپسی پر رانیہ اور ثانیہ نے خوب شور مچایا۔

"ہمارے شہزادے جیسے بھائی کے لیے یہی لڑکی رہ گئی تھی۔"

انہوں نے گھر واپس آتے ہی فہیم کی موجودگی کا احساس کیے بغیر حنا میں کئی خرابیاں گنوادیں' میں نے ان کی باتوں پر توجہ دینے کے بجائے بغور فہیم کے چہرے کا جائزہ لیا جو مسکراتے ہوئے بہنوں کی باتیں سن رہا تھا۔

"امی نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔" اس کا اطمینان بھرا لہجہ مجھے پرسکون کرگیا۔

میں نے بھرپور طریقے سے شادی کی تیاریاں شروع کردیں' میں اپنے دل کے سارے ارمان پورے کرنا چاہتی تھی اس لیے میں نے ایسی شان دار بری بنائی کہ جس نے دیکھا عش عش کر اٹھا۔

شادی کی تاریخ میں نے صریحاً" ایسے مہینے میں رکھی تھی کہ ندیم کا شرکت کرنا ممکن نہ ہو' اس طرح میں ایک بار پھر اسے ثانیہ کی شادی میں شریک نہ ہونے کی سزا دینا چاہتی تھی' رانیہ اور ثانیہ نے بہت

کہا' خود ندیم نے بڑے ملال کے ساتھ شکوہ کیا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔

☼ ☼ ☼

ندیم کی شادی ہوگئی اور میری امید کے عین مطابق حنا نے آتے ہی سارا گھر سنبھال لیا' وہ ایک سلیقہ مند لڑکی تھی اور سعادت مندی اس کی سرشت میں شامل تھی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ فہیم سے کمتر تھی مگر اپنے اچھے اخلاق اور دوسروں کی مرضی کے مطابق آسانی سے ڈھل جانے کی خوبی کی وجہ سے اس نے شوہر کے دل میں بھی جگہ بنالی تھی اور فہیم کی خوشی کے لیے تو یہی کافی تھا کہ میں خوش تھی۔

رانیہ اور ثانیہ بھی بھاوج کی خاطرداریوں سے نہال ہوجاتیں اور دبے لفظوں میں میرے انتخاب کی داد دیے بنا نہ رہ پاتیں۔

میرے گھر کے پرسکون ماحول کی لوگ مثال دیتے تھے اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نے تمام معاملات اپنے کنٹرول میں رکھے ہوئے تھے۔ آنا جانا' ملنا جلنا' سب میری مرضی کے مطابق ہوتا تھا' زندگی کسی پرسکون ندی کی طرح مخصوص رفتار سے گزر رہی تھی کہ ثانیہ کی ساس کا انتقال ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

رات کا نجانے کون سا پہر تھا' ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا صرف پنکھے کی گھر گھر کمرے میں چھائی خاموشی کو توڑنے کا باعث بن رہی تھی۔

ثانیہ کی ہموار سانسیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ گہری نیند سو چکی ہے مگر نفیس بانو کی آنکھوں میں نیند کا شائبہ تک نہ تھا' ان کی آنکھیں چھت پر مرکوز تھیں اور ان کا سارا وجود کسی کرب آمیز کیفیت سے گزر رہا تھا۔

سعادت حسین کے انتقال کے بعد کی ساری زندگی کسی فلم کی طرح ان کی نظروں کے سامنے سے گزرتی جارہی تھی۔ ایک ایک واقعہ' ہر ہر منظر پوری طرح واضح ہو کر سامنے آرہا تھا' اپنے ہر عمل کے درپردہ چھپی خواہش کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے کتنی بار اپنی ہی اولاد کے ساتھ ناانصافی سے کام لیا تھا۔ اس کا احساس انہیں بے چین کررہا تھا' ان کے چاروں بچے اعلا تعلیم یافتہ تھے تو کیا وہ نہیں سمجھتے ہوں گے کہ ان کی ماں نے صرف اپنی انا کی تسکین کے لیے انہیں کن آزمائشوں کے حوالے کیا تھا اور خاص طور سے فہیم تو ناکردہ خطاؤں کی سزا کے طور پر ان کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا' اس کی اگر کوئی خطا تھی تو بس اتنی کہ وہ ندیم کا بھائی تھا جس نے اپنے اچھے مستقبل کے لیے ایک غیر ملک میں مستقل رہائش اختیار کرکے اپنی پسند سے شادی کرلی تھی اور اس کے اس عمل کا خمیازہ فہیم کو اس وقت تک بھگتنا تھا جب تک نفیس بانو کی زندگی تھی۔

نفیس بانو کے جسم میں اس خیال سے ہی جھرجھری سی دوڑ گئی۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ حمیدہ بیگم کا اپنے بیٹے احسن کے ساتھ کیسا سلوک تھا' بظاہر تو وہ ایک خوش اخلاق خاتون تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد احسن کا ثانیہ سے یہ کہنا کہ

"ثانیہ! اماں کے جانے کے بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں برسوں کسی آہنی شکنجے میں جکڑے رہنے کے بعد آزاد ہوگیا ہوں۔"

"تو کیا میرے مرنے کے بعد فہیم بھی کچھ ایسا ہی محسوس کرے گا۔" نفیس بانو اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

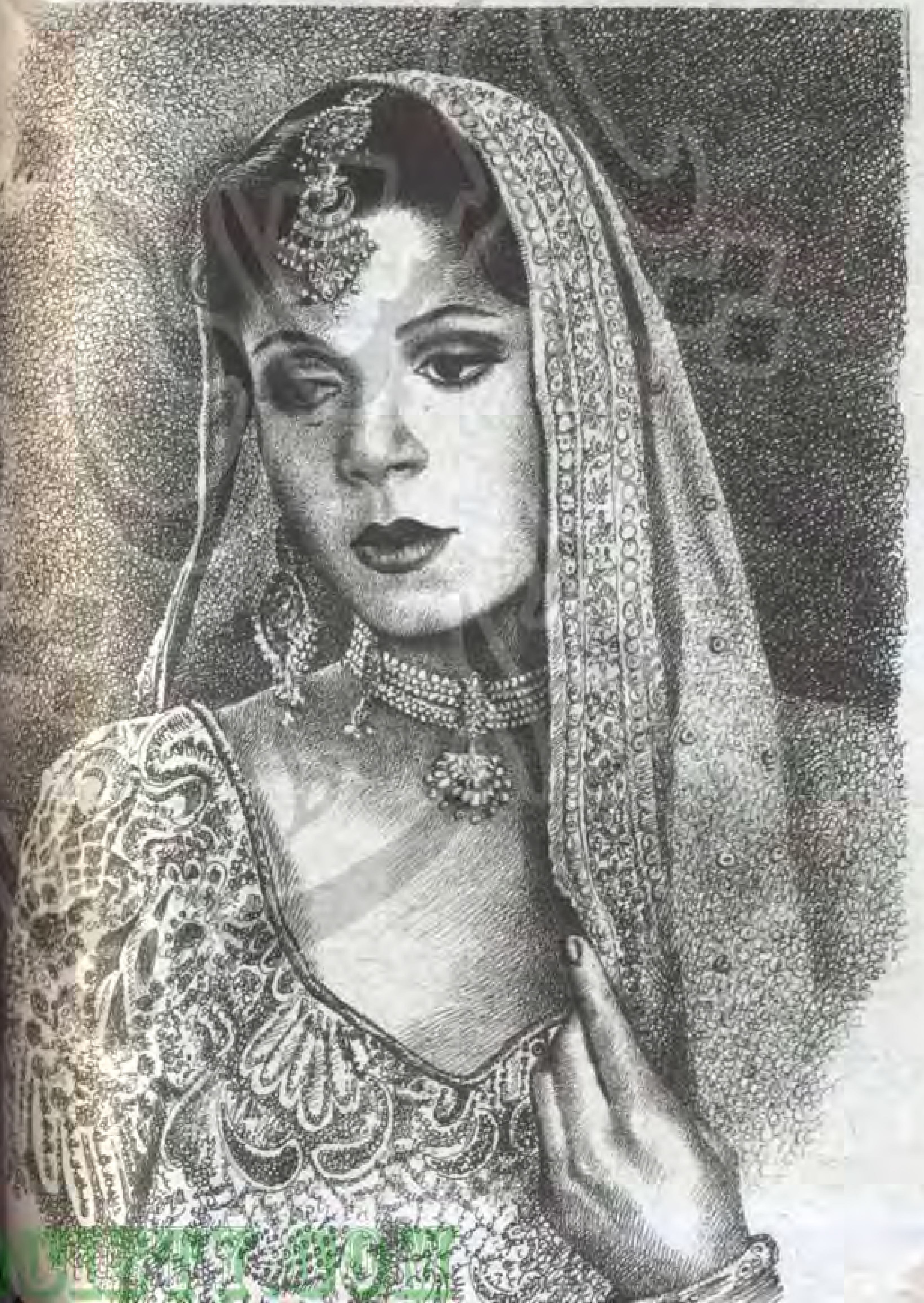
"نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی' وقت ایک بار ہاتھ سے نکل جائے تو لوٹ کر نہیں آتا اور ابھی وقت میری دسترس میں ہے۔ میں اپنے بچوں کو اپنی زندگی آپ جینے کے لیے آزاد کردوں گی۔"

نفیس بانو نے ایک گہری سانس لی اور سر تکیے پر ٹیک دیا۔





سعدیہ عزیز آفریدی



اس وقت وہ بہت مصروف تھی۔ آج ماحول سازگار تھا۔ دونوں بھابھیاں شاپنگ پر گئی ہوئی تھیں سو وہ مطمئن ہو کر کچن میں گھسی لنچ کی تیاری میں مصروف تھی۔

"یہ خوش نصیبی ہمارے لیے تو نہیں ہو سکتی ابا؟" جواد نے اسے تیز تیز پیاز کاٹتے دیکھ کر للچائی نظروں سے کباب کے آمیزے کو دیکھا۔

"صحیح سمجھے۔ آج یہ صرف جیا کے لیے ہے۔"

"اوہو تو جیا جی آرہی ہیں۔" اس نے چٹخارہ لیا۔ وہ تینوں بہت گہرے دوست تھے۔ ہانیہ، جیا اور وہ۔ باقی دونوں بھائی ہانیہ سے چھ سال بڑے تھے۔ اس لیے اس کی جواد کے ساتھ خوب بنتی تھی۔ حقیقت میں وہ ان کی میری سہیلی تھی۔

"کتنی دیر کے لیے آرہی ہیں جیا آپی۔" وہ دلچسپی سے کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

"شام تک رہے گی۔ رات کا کھانا کھلا کر بھیجوں گی۔" کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر اس نے حیرت سے دیکھا۔ "لیکن یہ تم کس خوشی میں یہاں تخت سنبھال کر بیٹھ گئے ہو؟"

"مجھے جیا آپی سے ملنا ہے۔ اس لیے آج ٹیوشن سینٹر نہیں جاؤں گا۔ جب سے افضل بھائی کی شادی ہوئی ہے وہ غائب ہی ہو گئی ہیں۔ دونوں بھابھیوں سے ڈرتی ہوں گی۔"

جواد پڑھائی میں بہت ماٹھا تھا لیکن ابا کی کوششوں سے وہ بھولے بھٹکے ٹیوشن سینٹر چلا ہی جاتا تھا۔ ہانیہ اور نوید دونوں ہی اس کا مورال بلند کرتی رہتی تھیں۔

"اپنی اپنی قسمت۔ کیوں کسی پاکستانی ناکام ہیرو کی طرح خود کو انڈر اسٹیمیٹ کرتا ہے۔" اور وہ ایسے ہر ... کہتا۔

"... بچے آپ کا خواب پورا کر دیں گے۔ مجھ ... ہوئی پڑھائی۔ پہلے ہی دن آپ دونوں کی گود میں ڈال دوں گا پھر آپ خود طے کیجیے گا اسے ارسطو بنانا ہے، سقراط بنانا ہے یا بو علی سینا۔ ہڈیاں میری پاس آپ کا۔"

وہ دونوں پڑھتی نہیں تھیں۔ "آج کل اتنی اچھی بیویوں کی میکنگ بند ہو گئی ہے بیٹا! بچے کو گھور کے بھی دیکھ لو نا تو بھابھی صاحبہ کو پورا سیاق سباق بتانا پڑتا ہے ان کے بچے کی شان میں یہ گستاخی کیوں کی گئی تھی۔ چہ جائیکہ مار پیٹ... تو چاہتا ہے ہم تیری بیوی کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر جائیں۔"

"بیوی آواز تو نکال کر دیکھے۔ دو لگاؤں گا۔ بچے کوئی اپنے میکے سے لائی ہو گی، جو اس کی یہ مجال ہونی ہے۔ میری اولاد ہے، میں چاہے ماروں، کاٹوں، پھینکوں، کچھ بھی کروں...."

وہ دونوں خوب قہقہے لگا لگا کر ہنستیں مگر پھر صدیق بھائی، شازیہ بھابھی، افضل بھیا اور نعیمہ بھابھی یاد آجاتیں تو ان کی ہنسی کو بریک لگ جاتے۔

"بس کر دے۔ تیری آنے والی پرانی بھابھیوں سے کوئی اچھی تربیت نہیں لے گی۔ اس کا مجھے پتا ہے۔"



"آپ کہو تو دیوار چین اٹھا دوں گا ان کے اور اپنی بیوی کے بیچ۔۔۔"

جیا اس کے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر بولی۔ "یہ جو بیوی ہوتی ہے نا' یہ برسوں کے پرانے رشتوں کو نئے سرے سے ایڈریس کرواتی ہے۔ بالکل بدل کر رکھ دیتی ہے اور اگر شوہر سر جھکانے کی عادت نہ ڈالے تو محبت کا تاج محل بنوا کر شوہر کو اس میں دفن بھی کر دیتی ہے۔"

"بس کریں۔ اتنا خطرناک نقشہ بھی نہ کھینچیں بیوی کا کہ میں رات کو خواب میں ڈرتا رہوں۔" اس نے مسمسی سی شکل بنائی تھی اور ہانیہ نے کان پکڑ لیا تھا۔

"بس کر دے کتنا ہی تو معصوم بے بی ہے نا۔ دو' دو باجیوں کو بے وقوف بناتا ہے۔"

"بنانے کی ضرورت نہیں ہوتی' اپیا! بے وقوف پیدا ہوتے ہیں' بنائے نہیں جاتے۔" وہ کہاں ہار ماننے والا تھا۔ وہ دونوں ہنس پڑیں۔ اپنی گودوں میں کھلایا بھائی اپنے قد سے اونچا ہونے لگے تو عجیب طرح کی خوشی' فخر سا پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اس وقت وہ دونوں محسوس کر رہی تھیں۔ اس بات سے بے خبر کہ منجھلی بھابھی کچن کے سامنے رکھے کولر سے پانی پیتے ہوئے ان کی ساری باتیں سن کر جا چکی ہیں۔

ان تینوں کی میٹنگ کا یہ مخصوص وقت ہوتا تھا۔ وہ شام سات بجے گھر میں ہوتا تھا۔ جیا پرابر میں رہتی تھی سو کچن میں ان کی مکمل حکمرانی ہوتی تھی۔

ان دنوں تینوں کے اپنی اپنی عمروں کے نئے نئے تجربے تھے' سو تینوں ہی اپنے اردگرد سے بے خبر صرف اپنی زندگی میں مگن رہتے تھے' مگر رات کھانا کھا کر وہ برتن سمیٹ ہی رہی تھی' جب بالکل اچانک اس کی دس سالہ بھتیجی اسے بلانے چلی آئی۔

"بابا بلا رہے ہیں۔"

بابا بلا رہے ہیں۔۔۔ یہ ہمیشہ کسی ہنگامے کا اعلان ہوتا تھا۔ پندرہ سال میں اسے ان لائن حاضریوں کی عادت پڑ چکی تھی' سو وہ ہاتھ دھو کر دوپٹے سے خشک کرتے ہوئے بڑے بھیا کے کمرے میں چلی گئی۔ اماں سامنے ہی کرسی پر بیٹھی تھیں۔

"پوچھیے اس سے یہ جواد کے دل میں شازیہ اور نعیمہ کے لیے کیوں زہر بھر رہی ہے۔ گھر کو گھر رہنے کیوں نہیں دیتی۔ ایک ہی بہن ہے' مگر کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ اگر یہ ایک بھی نہ ہوتی تو گھر کا ماحول کتنا خوش گوار ہوتا۔"

اس کا ننھا سا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔ لوگ تو بہنوں کی آرزوئیں کرتے ہیں اور یہاں ہر شخص اس کے وجود سے بے زار تھا۔

"تم نے جواد سے نعیمہ اور شازیہ کی برائی کیوں کی؟" اماں دونوں بھائیوں پہ جان دیتی تھیں۔ اس لیے اس کی کبھی جگہ ہی نہیں بن سکی تھی ان کے دل میں۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ بھابھی اپنے دل سے بات بنا رہی ہیں۔" وہ بھی ایک دم سے اچھل پڑی۔

"دیکھا آپ نے۔ اس کے دیدوں کا پانی کیسے مر گیا ہے۔ منہ پر جھوٹ بولنے لگی ہے۔ میں کہتی ہوں۔ ابھی کے ابھی اسے زنجیر ڈالیں' ورنہ ہاتھ سے بالکل نکل جائے گی۔ اس کا کالج جانا چھڑوا دیں۔"

"کیوں چھڑوا دیں۔ کیا میں آپ کے شوہر کی کمائی سے کالج پڑھ رہی ہوں؟"

"ہانیہ۔۔۔ بی ہیو یور سیلف!" منجھلے بھیا نے یکدم تیز آواز میں کہا۔ اسے لگا اس کا دل بند ہو جائے گا۔ تب ہی بابا کی کھنکھار سے بند ہوتے دل نے پھر سے سنبھالا لیا۔

"آخر یہ ہر روز مسائل کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں گھر میں۔۔۔"

"اپنی چہیتی سے پوچھیے ابا! چھوٹے بڑے سے بات کرنے کی تمیز ہی نہیں ہے اسے۔"

"آپ چائے بنا دیں گی ہانیہ؟" ابا ہمیشہ اسے اتنی ہی عزت اور محبت سے پکارتے تھے۔

"جی ابا! ابھی لائی۔" وہ آنکھوں میں آئی نمی صاف کرتی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ ابا نے سب پر طائرانہ نظر ڈالی۔

"آپ سب اپنی عمریں دیکھیں اور اس بچی کی عمر کا خیال کریں۔ ابھی وہ فرسٹ ایر میں گئی ہے' زندگی کو بس انداز سے دیکھتی ہے۔ اسی انداز سے بول دیتی ہے۔ ابھی اسے آپ سب کی طرح سیاست نہیں آئی ہے' لیکن میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔ ایک ہی شخص ہمیشہ غلط نہیں ہو سکتا۔ بقول شاعر اس کے دشمن ہیں بہت آدمی اچھا ہو گا۔۔۔ آپ لوگ بڑے ہیں تو بڑے ہونے کا فرض بھی نبھائیں کچھ بردباری کا مظاہرہ کریں۔"

نعیمہ بھابھی تو ابا کے سامنے ہی "ہونہہ" کرتی کمرے سے چلی گئی تھیں۔ اماں انہیں ناگواری سے دیکھ رہی تھیں' مگر وہ اثر لیے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے' اماں بھی ان کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلی تھیں۔

"آپ کو اس طرح اس کا حوصلہ نہیں بڑھانا چاہیے تھا۔"

ابا نے عینک کی اوٹ سے دلچسپی سے اماں کو دیکھا۔ "سچ بتائیے! ہانیہ ہماری اولاد ہے نا' کہیں سے اٹھائی ہوئی تو نہیں۔ میں تو باہر رہتا تھا۔ اس لیے آپ کے بیان کو بیان حلفی سمجھا ہے اب تک۔"

"کیا انٹ شنٹ بول رہے ہیں' پتا بھی ہے۔ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"آپ کی اپنی بیٹی سے پرخاش کی وجہ ڈھونڈ رہا تھا بیگم۔ آپ کا رویہ کبھی کبھی حیران کر جاتا ہے مجھے۔ مائیں تو اولاد کے لیے چھتر چھایا بن جاتی ہیں۔ خاص طور پر بیٹیوں کو سپورٹ کرنے کے لیے کبھی کبھی سچائی سے بھی منہ موڑ لیتی ہیں۔"

"مگر آپ جانتے ہیں' میں جھوٹ کو ناپسند کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر سچ کو سننے کا حوصلہ بھی رکھا کریں۔ سچ ہمیشہ وہ تو نہیں ہو سکتا جو آپ کے بیٹے آپ کے گوش گزار کریں۔"

"ابا چائے۔۔۔" وہ جو باتیں سن رہی تھی' اماں ابا کے درمیان چائے کو سیز فائر کے طور پر لے آئی۔ ابا نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"تم روئی ہو؟" ابا نے بے قرار ہو کر پوچھا۔ اماں نے کروٹ بدل لی۔ ابا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا' پھر محبت سے بولے۔

"میں بہت بڑے بڑے دعوے کرتا ہوں' نہ بہت بڑے بڑے دعوے کرنے والوں کو پسند کرتا ہوں' لیکن بس ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ان آنکھوں میں آنسو اب تب ہی آنے چاہئیں' جب تمہارے ابا اس دنیا سے رخصت ہو جائیں۔"

"ابا۔۔۔!" ہانیہ نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آپ کو میری عمر بھی لگ جائے ابا! آئندہ ایسی بات مت کیجیے گا۔"

ابا ہنس پڑے۔ "پھر آپ بھی آئندہ ان پیاری پیاری آنکھوں میں آنسو نہیں لائیں گی۔ یہ وعدہ کریں۔"

وہ مسکرا دی۔ "صرف آپ کی محبت ہی کا تو حوصلہ ہے ابا!"

ابا نے شوخی سے ہانیہ کو دیکھا۔ "اچھا۔ وہ جو جواد

ابھی تک تمہاری گوشمالی کے خوف سے جاگ رہا ہے۔ اس کا نام تک نہیں۔"

وہ کچھ نہیں بولی۔ چپ کر کے بیٹھی رہی۔

"ہر معاملہ جو ہمیں کبھی کبھی اپنے خلاف لگتا ہے حقیقت میں وہ ہمیں اپنے اندر اترنے ' خود کو دریافت کرنے کا ایک راستہ دکھاتا ہے۔ دکھ برا ہوتا ہے نہ رویوں کی حوصلہ شکنی بری ہوتی ہے۔ ایک لمحے کو دل کو دھکا ضرور لگتا ہے۔ یہ فطری سی بات ہے ' لیکن دوسرے لمحے سوچنا شروع کر دینا چاہیے۔ پرابلم ' ناسازگار حالات صرف ان لوگوں کی زندگی میں آتے ہیں جنہیں اللہ عام کنگھیری سے ہٹ کر کسی مقام پر لے جانا چاہتا ہے۔"

"ابا! آپ نیگیٹو سے نیگیٹو حالات میں بھی امید کی کرن کیسے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔"

"جو اللہ پر پورے دل سے یقین رکھتے ہیں ' ان کے لیے نیگیٹو حالات کوئی معنی نہیں رکھتے۔ حالات جب بھی بگڑیں یہ ہی سوچو ' اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ' تم خود دیکھو گی تمہارے اندر ایک طاقت سی ابھرتی چلی جائے گی اور پہلے جن معاملات کو تم لاینحل سمجھ کر مایوس ہونے لگی تھیں ' وہ تبدیل ہو سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے۔"

وہ خالی چائے کا کپ لے کر اٹھ گئی اور ابا نے اماں کی پشت سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ سے زیادہ سمجھ دار ہے آپ کی بیٹی۔ بہت حساس ہے وہ آپ کو مجھے بلکہ ہر رشتے کو لے کر۔ بس آپ کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہے۔"

اماں نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دوسری صبح حیرت انگیز تھی۔ وہ کالج کے لیے تیزی سے کمرے سے نکل رہی تھی ' جب شازیہ بھابھی کونے میں سے اچانک اس کے سامنے آگئیں۔ اس نے خود کو بہت مشکل سے روکا ' لیکن شازیہ بھابھی کے ہاتھ سے ٹرے چھوٹ گئی۔ وہ شور مچانے لگیں۔ گرم چائے سے ان کے ہاتھ کی اوپری جلد سرخ ہو گئی تھی۔

"کیا ہو گیا ہے صبح ہی صبح؟" بڑے بھیا غصے میں اٹھ کر آئے۔

"یہ سب کیا ہے شازیہ! مجھے آفس کے لیے دیر ہو رہی ہے نا۔"

"اپنی بہن سے پوچھیے ' یہی ٹکرائی ہے مجھ سے شاید رات کی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔" چبا چبا کر کہتے ہوئے وہ برتن اٹھانے لگیں۔

"تمہیں ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیا؟"

"نہیں تو بھیا! بھابھی خود ٹکرائی ہیں مجھ سے۔" وہ بس اتنا کہہ سکی۔

"وہ کیوں ٹکرائے گی پاگل ہو گیا تم لڑائی کے بہانے تلاش کرتی ہو بس۔ پتا نہیں کون کون سے ڈرامے دیکھ کر پلاننگ کرتی رہتی ہو۔ ایک لمحہ سکون حرام ہے۔ جو کبھی ملا ہو اس گھر میں۔" بڑے بھیا بکتے جھکتے اپنے ہی چلے گئے اور وہ ایک بار پھر لائن حاضر تھی۔

"تم روز روز یہ فضیحتے اٹھا کر تھکتی نہیں ہو ہانیہ؟" اماں سے بھی پہلے نعیمہ بھابھی نے اسکور لگایا۔

"آج میں کچھ نہیں بولوں گی۔" اس نے دل میں تہیہ کیا۔

"اب دیکھ رہی ہیں ' کیسے دیوار کی طرح خاموش ہے۔ یہ چاہتی ہے ' ہم سب چیخ چیخ کر پاگل ہو جائیں اور یہ پورے گھر پر راج کرے۔"

"اپنے گھر پر مجھے راج کرنے کے لیے ان مصنوعی واقعات کی ضرورت نہیں ہے بھابھی!" وہ تہیہ کیے بیٹھی تھی کہ نہیں بولنا ' مگر جب سامنے والے مسلتے ہی جائیں تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ وہ تو پھر احساسات رکھنے والی لڑکی تھی۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" شازیہ بھابھی نے دو ٹوک لہجہ اپنایا۔ جیسے اس کا کوئی بہت بڑا سیاسی ایجنڈا تھا ' جس کے تحت واقعات ترتیب دیتی تھی وہ۔

"سکون۔۔۔ میں سکون سے جینا چاہتی ہوں۔ مجھے کسی نمبر گیم میں شامل ہونے کا شوق نہیں ہے۔ نہ ہی راج پاٹ میرا درد سر ہے۔"

"اس کی زبان دیکھی ہے۔ کیسے چل رہی ہے۔ جیسے باپ کی پٹی پڑھائی ہوئی ہے ' جس پر یہ چل رہی ہے۔" منجھلے بھیا نے ہانک لگائی اور امی چائے کا کپ لے کر اندر آگئیں۔ شور شرابا تو سنا تھا انہوں نے ' لیکن وجہ کیا ہو سکتی ہے اس کا گمان تک نہیں تھا۔ وہ ٹیبلٹ لے کر سوئی تھیں۔ سو جاگنے کے بعد بھی کافی دیر لگتی تھی ان کو ذہنی طور پر جاگنے میں۔

"ہوا کیا ہے۔ کوئی مجھے کچھ بتائے گا۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"یہ جان بوجھ کر شازیہ بھابھی سے کل رات کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے ان سے ٹکرائی۔ ناشتا کی ٹرے گر گئی۔ بھابھی کا ہاتھ الگ جلا اور صدیق بھائی لڑ جھگڑ کے آفس گئے ' وہ الگ۔۔۔!"

"ہانیہ! تم ہر روز مجھے کٹہرے میں کیوں لا کر کھڑا کر دیتی ہو؟"

جملے تھے کہ تیر۔ اس کی آنکھوں میں اتنی جلدی آنسو کبھی نہیں آتے تھے ' مگر آج آگئے تھے۔

"میرا کیا قصور ہے اماں؟" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر سارے نامہربان رشتوں کو دیکھنے لگی تھی۔ اماں خاموشی سے اسے دیکھنے لگیں۔ حیرت تھی کہ آج اماں بھی خاموش تھیں۔ اور پھر یہ تیسرا دن تھا جب ابا نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔

"ہانیہ بیٹا! اپنا سامان پیک کریں ' ہمیں اسلام آباد جانا ہے۔"

الماری میں کپڑے رکھتی اماں چونک اٹھیں۔ "اسلام آباد کیوں جانا ہے۔"

ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ "دو چار جوڑے میرے بھی پیک کر دیں اگر آپ کی اماں کو فرصت نہ ملے تو۔"

"میں پوچھ رہی ہوں۔ اسلام آباد کیوں جانا ہے؟"

"میں نے وہاں کے کالج میں ہانیہ کا ایڈمیشن کروا دیا ہے۔ اب میری بیٹی ہاسٹل میں رہے گی۔"

"ہانیہ ہاسٹل میں رہے گی۔۔۔ آپ بھی کبھی کبھی دماغ سے بھی کام لیا کریں۔ کچھ نہیں سوچتے۔" اماں کی توپوں کا رخ ابا کی طرف ہو گیا۔

"کیوں ہانیہ ہاسٹل میں کیوں نہیں رہ سکتی۔ صدیق اور افضل نے ہاسٹل میں رہ کر نہیں پڑھا کیا؟"

"صدیق اور افضل لڑکے تھے۔ آپ کو اندازہ بھی ہے ' آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"میں سوچے سمجھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا اور بیٹی جیسی قیمتی دولت کے لیے میں بغیر سوچے سمجھے اسٹینڈ کبھی نہیں لوں گا۔ یہ آپ بھی جانتی ہیں۔"

"صدیق اور افضل بالکل نہیں مانیں گے۔"

ابا نے تکیے کو بیڈ پر زور سے پٹخا۔ "ہانیہ میری بیٹی ہے۔ اس کے لیے فیصلہ کرنے کا اختیار اور حق مجھے ہے۔ میں جو اچھا سمجھوں گا اس کے لیے کروں گا۔ مجھے کسی کے مشورے یا اعتراض کا خیال ہے نہ ضرورت۔"

اتنے غصے میں ہانیہ نے ابا کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے کان دبائے کپڑے پیک کرنے لگی اور ڈرائنگ روم سے بڑے بھیا کی غصے میں بھری آواز کمرے میں گھسنے لگی۔

"پتا نہیں ابا کو اس نے کیا گھول کے پلایا ہوا ہے۔ آنکھ بند کر کے اس کی باتوں پر چلتے ہیں۔ آپ کی یہ بیٹی ابا کا نام نہ اچھالے تو کہیے گا۔" دروازے پر دستک ہوئی۔

"مجھے آپ پر اتنا ہی اندھا اعتماد اور اعتبار ہے بیٹا! جتنا اس وقت صدیق کے لہجے میں غصے کی شدت ہے۔ سچ پوچھیں تو جب کوئی آپ کے خلاف بولتا ہے تو میری محبت آپ سے کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔"

"کیوں بڑھ جاتی ہے ابا؟"

"اس لیے کہ میں نے بہت منتوں مرادوں کے بعد آپ کو پایا ہے۔ آپ کے آنے کے بعد ہمارے گھر میں روشنی ہوئی۔ خوشی نے دروازہ دیکھا۔"

"صرف آپ کو لگتا ہے میرا ہونا خوشی اور روشنی جیسا ' ورنہ تو سب کو میں اماوس کی کالی رات لگتی ہوں۔"

ابا مسکرانے لگے۔ "اتنا بھی رنگ سانولا نہیں میری بیٹی کا کہ وہ خود کو اماوس کی کالی رات سمجھے۔"

"ابا! آپ بھی نا۔۔۔" اس نے مصنوعی چڑ کا مظاہرہ کیا کیونکہ اسے اپنے باقی بھائیوں سے دبتے ہوئے رنگ کا بھی اچھا خاصا کمپلیکس تھا۔

"شام سات بجے کی گاڑی ہے ہماری' تیار رہیے گا۔"

ابا کہہ کر چلے گئے اور وہ کتابوں سمیت ضروری سامان اکٹھا کرنے لگی۔ عجب سا لگ رہا تھا اپنی مرضی کے بغیر اپنا گھر چھوڑنا جیسے اچانک اسے سزا ملی ہو۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر رونے لگی۔ بس رونے پر ہی تو اختیار تھا اس کا۔

☼ ☼ ☼

میں نے جب گھر میں آنکھ کھولی 'اماں کو پانچ بیٹوں کے باوجود ناخوش دیکھا اور ان سے زیادہ ناخوش ابا جان رہتے تھے۔ چھوٹا تھا تو صرف دیکھتا تھا۔ بڑا ہو گیا تو ایک دن ابا سے جا کر پوچھ بھی بیٹھا۔ ابا جو دیوان غالب کھولے بیٹھے تھے یکدم آنکھیں مجھ پر ٹکا کر حیران ہو گئے۔

"آپ کو یہ سوال پوچھنے کی ضرورت کیوں ہوئی بیٹا۔"

"پتا نہیں ابا جان! لیکن گھر میں دنیاوی ہر طرح کی آسائش اولاد سمیت سب موجود ہے' لیکن ایک نامعلوم سی بے کلی' اک نامحسوس سی بدمزگی ہے آپ کے اور اماں جان کے بیچ۔"

"آپ اتنی باریک بینی سے ہمارا مشاہدہ کر رہے ہیں اور ہمیں خبر تک نہ ہوتی۔ سی آئی اے جوائن کر لی ہے کیا؟" ابا جان نے شوخی میں میری بات ٹالنے کی کوشش کی' مگر میں ٹلا نہیں۔ بی کام کر رہا تھا۔ اچھا خاصا سمجھ دار ہو گیا تھا' سولاڈ سے ابا جان کے پاؤں پکڑ کے بیٹھ گیا۔

"بتایئے نا ابا جان! آپ دونوں ناخوش کیوں نظر آتے ہیں؟"

"ارے پاگل ہو گئے ہو۔ ہم ناخوش ہیں نہ ایک دوسرے سے دور۔۔۔ ارے بیگم! سنتی ہیں۔ یہ آپ کا پڑھا کو بیٹا کیا کیا فتوے لگا رہا ہے ہم دونوں پر۔"

اماں پہلی آواز پر بھاگی آئیں۔ ان کا خیال تھا ہم دونوں کے درمیان ہونے والا اختلاف آج کچھ سنجیدہ رخ اختیار کر گیا ہے' مگر مجھے ابا جان کے قدموں میں بیٹھا دیکھ کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ ڈرتے ہوئے کمرے تک آئی تھیں۔

"توبہ ہے جی۔ آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" اماں نے مسکراتے ہوئے ابا جان کو مخاطب کیا۔

"کیوں بھئی۔ آپ ہر وقت مجھ سے اتنا بدگمان کیوں رہتی ہیں کہ میں ہر وقت آپ کی اولاد سے الجھنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھا رہتا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا ابا جان بات کی سنجیدگی کو اپنی شوخی سے غائب کر دینا چاہتے ہیں' لیکن میں آج ٹھان کر آیا تھا کہ یہ معمہ حل کر کے رہنا ہے' سو ابا جان کی جگہ میرا رخ اماں جان کی طرف ہو گیا۔ میری باتیں سن کر اماں کے چہرے کا رنگ بھی فق ہو گیا۔ میرا اصرار بڑھا تو وہ جھنجلا کر بولیں۔ "اپنے ابا جان سے پوچھو' مجھے نہیں پتا۔"

"بتایئے نا ابا جان! ایسی کیا بات ہے' جو سب جانتے ہیں۔ بس میں نہیں جانتا۔"

"یہ بات کوئی بھی نہیں جانتا۔ کوئی ایسی قابل فخر بات نہیں جس کا ڈھنڈورا پیٹا جائے۔" ابا جان کا موڈ سخت خراب ہوا' مگر میں کہاں ہار ماننے والا تھا۔

"بتائیں نا۔"

"یار! جان کر کیا کرو گے' بلاوجہ دل برا ہو گا اور اپنے ساتھ دشمنی کرو گے۔ سب من جانب اللہ ہے' سو میں اب اسے تسلیم کر چکا ہوں۔ وہ بادشاہ ہے' وہ مالک ہے۔"

ابا جان ٹال گئے' مگر میں بھی تھا تو ان کا ہی بیٹا' اس راز کی کھوج میں لگ گیا اور پورے ایک سال کی کوشش کے بعد ایک سال خوردہ ڈائری برآمد کر ہی لی۔ یہ ابا جان کی خاص ڈائری تھی۔ ان کی رائٹنگ ٹیبل میں ہمیشہ لاک رہتی تھی' مگر اس دن ابا نے زمین کے کاغذات مجھ سے منگوائے تو میری نظروں سے راز ٹکرا گیا۔ میں نے اس وقت تو اپنی طبیعت میں کوئی اچھل پیدا نہیں ہونے دیا' مگر خاموشی سے اس دراز کی چابی بنوا ڈالی اور جب ابا جان زمینوں پر گئے ہوئے تھے' میں وہ ڈائری لے اڑا۔

پائیں باغ کا ایک پرسکون گوشہ اور ابا کی ڈائری' میں نے تیز تیز سانسوں سے اسے کھولا اور پھر میری بینائی اس دکھ میں اترتی چلی گئی۔ ابا جان ٹھیک کہتے تھے' یہ ایک خاموش آگ تھی' جس میں وہ انسان پورا کا پورا جل جاتا تھا جو اس راز کو اپنے سینے سے گزرگاہ دیتا تھا۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہمارے خاندان میں تین بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ ایک کو بیاہا جا چکا تھا۔ ایک رہتی تھی اور وہ چار بھائیوں میں سب سے زیادہ لاڈلی تھیں۔ سب کا یہی ماننا تھا کہ بیٹیوں سے محبت کرنے کی وجہ سے ہمارے گھر میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل اور شان تھی' مگر بڑے بھیا بہت جذباتی اور فوری فیصلے لینے والے انسان تھے۔ جس وقت کسی کام کی انہیں سنک چڑھ جاتی پھر پوری دنیا بھی مل کر انہیں اس سے روک نہیں سکتی تھی۔ وہ سب سے چھوٹی بہن سے بہت محبت کرتے تھے۔ بہت حساس تھے اور کبھی کبھی ان کی بیوی اس وجہ سے ان سے جیلسی فیل کرتیں' وہ چاہتی تھیں' ان کی جلد سے جلد شادی ہو جائے تاکہ ان کے شوہر کی پوری توجہ انہیں مل سکے۔ ان کی ساس دبے لفظوں میں انہیں اس عمل سے روک چکی تھیں کیونکہ وہ اکثر اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں لگا کر دونوں بہن بھائیوں میں بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کر چکی تھیں' مگر کبھی کامیاب نہ ہو پائیں۔ ان کے شوہر ہمیشہ ایسی ہر بات رد کرتے۔

"کوئی بات نہیں' بچہ ہے۔ ابھی اگر اس کی کسی بات سے تمہارا دل دکھا ہے تو میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں' مگر تم جانتی ہو۔ میں اس سے کسی بات کے لیے باز پرس نہیں کر سکتا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو میں سہا یہ برداشت نہیں کر سکتا۔" اور بس۔۔۔ ان

کی بیوی کو یہی بات لگ گئی۔

انہوں نے کچن کے اوپری کام کے لیے ایک نیا لڑکا بھرتی کیا اور کھیل رچانے بیٹھ گئیں۔ اب اکثر اوقات جان جان کر وہ ایسے مواقع پیدا کرتیں کہ ضمیر بھائی، عائشہ اور اس ملازم کو ایک ساتھ دیکھ پاتے۔ ان کی نظر میں وہ بچی تھیں۔ اس لیے ان مواقع سے بھی ان کے اندر کوئی اچھال پیدا نہیں ہو رہا تھا کہ ایک دن وہ کچن میں کچھ اپنے لیے بنا رہی تھیں کہ دھوکے سے بھابھی بیگم نے اس ملازم کو اندر بھیج کر دروازہ بند کر دیا۔ شور پر سب جمع ہوئے اور حیران رہ گئے۔ دروازہ کھلا تھا اور عائشہ ابھی تک دروازہ بجا رہی تھیں۔ ضمیر بھیا نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور پہلی بار ان کے چہرے پر غصہ کی لالی کوندی۔

"دروازہ کھلا ہے پھر آپ ایسے دروازہ کیوں دھڑ دھڑا رہی ہیں اور یہ شامو کچن میں کیا کر رہا ہے؟"

عائشہ گم صم ہو گئیں۔ "بھیا! دروازہ باہر سے بند تھا۔ اگر کھلا ہوتا تو ہم شور کیوں مچاتے۔"

"تاکہ کوئی تم پر شک نہ کرے، من مرضی بھی کرو اور پاکیزہ ایسی رہو کہ فرشتے تمہارے دامن پر نماز پڑھیں۔" ان کی بیگم فوراً بولی تھیں۔

"فضول مت بولو رانی۔" بھیا نے سب لوگوں کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر ان پر ہاتھ چھوڑ دیا، مگر بھابھی بیگم کو یہ تھپڑ اور بے عزتی اتنی زور سے نہیں لگی کیونکہ جو وہ کروانا چاہتی تھیں، کروا چکی تھیں۔ بدگمانی کا بیج تو بویا ہی تھا۔ یہ بھی احساس دلا دیا تھا بڑے بھیا کو کہ ان کی بہن اب بچہ نہیں رہی۔ ایک تیر سے دو شکار ہوئے تھے۔ اس منظر کے بعد وہ جو دکھاتیں، اس کو دیکھنے کا ان کا زاویہ الگ ہو جاتا۔ دوسرے وہ جلد سے جلد اب ان کا خود گھر بسانے کی جلدی کرتے اور تیسرا پہلو جو بعد میں کھلا، وہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنے نکھٹو اور بگڑے ہوئے بھائی کا رشتہ گھر میں ڈال دیا تھا، کوئی اور موقع ہوتا تو ضمیر بھیا کبھی نہ مانتے، لیکن جیسے جیسے وہ کسی اچھے رشتے کی تگ و دو میں ناکام ہو رہے تھے ویسے ویسے وہ بیوی کے بھائی کے لیے نرم گوشہ دل میں بنائے جا رہے تھے۔

عائشہ ان کے بدلتے تیوروں سے گھبرا کر ان کے کمرے میں جا پہنچی تھیں۔

"بھیا! ہمیں ابھی شادی نہیں کرنی ہے۔"

"بہن گھر میں بٹھائے جانے والی چیز نہیں۔" روکھائی سے جواب دیا۔ عائشہ نے ڈرتے ڈرتے بھائی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "آپ بہت بدل گئے ہیں بھیا؟"

انہوں نے آہستگی سے ہاتھ چھڑا لیا۔ "نہیں بدلا نہیں، بس آنکھ بند کر کے چلنا چھوڑ دیا ہے۔"

"آپ جہاں چاہیں شادی کر دیں، لیکن ہماری پڑھائی پوری ہونے دیں۔" بہن نے التجا کی۔ بھائی نے مان لی، مگر بھابھی بیگم نے وہی کیا۔ اپنے بھائی سے کہہ کر کچھ اوچھے لڑکوں کو عائشہ کے پیچھے لگا دیا۔ عائشہ گھر سے بگھی میں جاتی تھیں پورے پردے میں، لیکن جب کوچوان کو روز ہی پریم پتر ملنے لگے تو ابا جان، اماں جان اور باقی گھر کے کسی فرد کی ضمیر بھیا کے آگے ایک نہ چلی۔

"میں نہیں مان سکتا۔ کیا ساری دنیا اس ایک لڑکی کو بدنام کرنے کی مہم پر لگی ہوئی ہے۔ کوئی تو اس کی بنیاد میں بھی ٹیڑھ ہے نا بابا جان!" عائشہ کو گھر بٹھا لیا گیا اور سخت گیر ضمیر بھیا نے بھابھی کے بھائی کو بلایا اور نکاح کی تاریخ طے کر دی۔

"قتل کر دیتے آپ اپنے ہاتھ سے تو اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی تکلیف آپ کے اس فیصلے سے ہوئی۔ پوری دنیا میں صرف عباس رہ گئے تھے آپ کی بہن کے لیے۔"

عائشہ سخت صدمے میں تھیں اور رخصتی کے وقت جو وہ چکرا کر گریں تو پھر اٹھ نہ سکیں۔ ضمیر بھیا سکتے کی حالت میں رہ گئے۔ بہن سے جتنی بدگمانی تھی مگر ان کی موت کے بارے انہوں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ بھابھی بیگم ہونق ہو گئیں۔ تب زارا بھابھی نے اپنے لب کھول دیے۔

"یہ سب سازش تھی رانی بھابھی کی۔ وہ آپ کی عائشہ کی محبت سے جیلس تھیں۔ عائشہ بالکل معصوم اور پاکیزہ تھیں۔ میں اب چپ نہیں رہ سکتی۔ مجھے نہیں معلوم میرا اپنا انجام کیا ہوگا، لیکن میں حلفیہ بیان دیتی ہوں۔ یہ سب رانی بھابھی کی چال تھی۔ میں نے رانی بھابھی کو ہر ہر قدم پر روکا۔ کئی مواقع پر عائشہ کو بچانے کی کوشش کی، مگر رانی بھابھی آگ سے کھیل رہی تھیں اور یہی آگ گھر کو جلا کر راکھ کر گئی ہے۔"

ابا روئے جا رہے تھے اور امی جان کو پتا نہیں کیا ہوا۔ انہوں نے دامن پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھ کے کہا۔

"نہ دے بیٹیاں ان کو جو سوہنے نبی ﷺ کی سنت سمجھ کر بھی اپنی بیٹی سے محبت نہیں کرتے۔ مالک! اتنی ذلیل خوار ہو کر مرنے کے لیے پھر نہ دینا کسی کو بیٹی۔ یہ میری لوگوں کے لیے بددعا ہے۔"

سب اماں جان! کو چپ کرواتے رہے، لیکن قبولیت کی گھڑی تھی وہ۔ ضمیر بھیا نے کھڑے کھڑے بھابھی بیگم کو طلاق دے دی اور دیوانے ہو کر گھر سے نکل گئے۔ ابا جان کو جہاں سے خبر ملتی کہ ضمیر کو ادھر دیکھا ہے، "ضمیر کو ادھر دیکھا ہے۔" وہ بھاگے جاتے، مگر ضمیر بھیا دو چار دن گھر رہتے، پھر کسی دن چپکے سے چل پڑتے۔ چھوٹے بھیا بھی اپنی بیوی کو فارغ کرنا چاہتے تھے بلکہ باقی تینوں بھائی بھی اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہے تھے مگر ابا جان نے انہیں روک لیا۔

"وہ مری تھی تم سب پر۔ اگر اپنا گھر اجاڑو گے تو کیا وہ اس جہان میں خوش رہے گی۔ تم چاہتے ہو وہ وہاں بھی تسکین نہ رہے۔" سب نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا، مگر تعلقات میں ایک سرد مہری آ گئی تھی، دونوں بہنوں کی بچیاں بیاہ کر آتی رہیں، مگر بیٹیاں پھر کسی بھائی کے آنگن میں نہیں کھیلیں۔"

امی کہہ کر چپ ہو گئی تھیں اور میری آنکھیں تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ماں کی بددعا سے میرے دل میں بیٹی کی یہ میری خواہش شدت پکڑ گئی کہ میرے ہاں بیٹی ہو۔ نفل نمازوں میں دعائیں کرتا، معافیاں مانگتا، سوہنے نبی کی سنت پوری کرنے کے لیے بیٹی مانگتا۔ "میں اسے ساری دنیا سے زیادہ عزیز رکھوں گا، جو مانگے گی دوں گا۔ جو چاہے گی کرے گی۔ جتنا پڑھنا چاہے گی پڑھاؤں گا، اگر شادی میں اپنی مرضی چاہے تو بھی انکار نہیں کروں گا۔"

دل ایک بیٹی کی چاہت سے بھر گیا تھا، میرا پیالہ اپنی اس محبت کا زور سہہ نہیں پا رہا تھا۔ پھر میں باہر تھا جب مجھے پتا چلا میرے ہاں بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ میں اور میری بے قراری... دل چاہتا تھا پنکھ لگ جائیں اور میں اڑ کر اپنے وطن لوٹ جاؤں، مگر کانٹریکٹ کے مطابق مجھے ابھی چھٹی نہیں مل سکتی تھی اس زمانے میں اتنی جدیدیت بھی نہیں تھی۔ میں بس بیوی سے ٹیلی فون پر اس کے متعلق باتیں کرتا رہتا، میری بے قراری دیکھ کر ایک بار بیوی بولی۔

"شکر ہے میں نے اپنی بہن کی باتوں پر عمل نہیں کیا۔ وہ کہتی تھی، آئیڈیل فیملی ہے۔ چار بچے کافی ہیں۔ انہیں ہی پڑھاؤ لکھاؤ، اب پہلے جیسا تو مال متاع نہیں۔ کچھ پارٹیشن میں دے آئے۔ کچھ کلیم میں واپس نہ لے سکے۔ سو بس بچوں کو پڑھاؤ لکھاؤ، مستقبل بناؤ۔ میں اس اولاد کے حق میں نہیں تھی، بہت کوشش کی، مگر اس نے دنیا میں آنے کی ایسی ضد باندھی کہ پھر دنیا میں آ کر رہی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کو بیٹیاں اتنی پسند ہیں۔ مجھے تو لگتا تھا باقی سب کی طرح آپ بھی بس زبانی کلامی بیٹیوں کا دم بھرتے ہیں۔"

اس دن میرا دل یک بارگی دھڑکا تھا۔ اگر جو یہ ایسا کر گزرتیں اور وہ سب کامیاب ہو جاتا تو میری محبت، تمنا، التجا کا کیا ہوتا۔

میں گھر آنے سے پہلے عمرہ کر کے آیا تھا اور پھر سارا دن میں ہوتا اور میری بیٹی ہانیہ۔ میں اسے واقعی شہزادیوں کی طرح رکھنا چاہتا تھا اور اس بات پر کبھی کبھی میری بیوی سے ٹھن بھی جاتی۔ اسے بیٹیاں اچھی نہیں لگتی تھیں کیونکہ وہ خود سات بہنیں تھیں اور ان کے باپ نے پیدا ہونے کے دن سے لے کر شادی تک انہیں بیٹی ہونے پر کبھی بخشا نہیں تھا۔

بیٹیاں پیدا کرنے کے جرم میں ان کی ماں بھی معتوب ٹھہری تھی، دوسری شادی کرنے کے اخراجات نہیں رکھتا تھا۔ اس لیے ساری کمی اور نامساعد حالات کا ذمہ دار بھی بیوی کو سمجھ لیا تھا۔ یہ میری دعا اور لگن تھی کہ چار بھائی اللہ کی رحمت سے محروم تھے اور اللہ نے مجھے اپنی رحمت سے نوازا۔

وقت اور حالات الگ تھے، لیکن ہانیہ بالکل اسی نگر پر لا کر کھڑی کردی گئی جہاں سے عائشہ نے زندگی کی بازی ہاری تھی، میں اپنی ہانیہ کے لیے ایسی کسی کہانی کی بھیتم ٹریک بنتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسی لیے میں نے اپنی جان پر جبر کرکے یہ فیصلہ لیا تھا۔ معاملہ بس اتنا تھا کہ وہ دونوں جذباتی طور پر خود کو ہانیہ سے کم تر سمجھتی تھیں۔ غیر محفوظ سمجھتی تھیں اس لیے انہوں نے ایک الگ گروپ بنا لیا تھا۔ گھر کی سیاست تک اگر اس گروپ کی سرگرمیاں رہتیں تو شاید میں برداشت کرلیتا، لیکن اس کے داؤ پیچ کے اثرات میری راج دلاری تک پہنچنے لگے تھے۔ رحیمہ نے چلتے چلتے کہا بھی تھا۔

"بیٹی کے دیوانے ہیں، رہ لیں گے اس کے بغیر۔" میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔

اور اس وقت وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ٹرین میں بیٹھے تھے۔ انہیں پہلے لاہور اترنا تھا۔ پھر اسلام آباد کے لیے نکلنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں آپ کے بغیر کیسے رہوں گی ابا!" انہیں چپ دیکھ کر اس کا ڈر باہر آگیا تھا، وہ سمجھ رہی تھی شاید ابا کسی شریر بچے کی طرح اسے سزا کے طور پر ہاسٹل کی زندگی دینے جارہے ہیں۔

"میں نے کچھ لکھا ہے تمہارے لیے۔" ابا نے اسے ڈائریاں تھمائیں۔ وہ پڑھنے میں مگن تھی اور وہ اس کے لیے کھانے کے لیے کچھ لینے اتر گئے تھے۔

اسٹیشن کا کھانا اچھا نہیں تھا، تب ہی انہوں نے صرف پھل خریدے تھے، مگر بھاؤ تاؤ کرنے میں ان کی ٹرین چھوٹ گئی تھی۔ وہ کسی نہ کسی طرح کسی اور ڈبے میں چڑھ گئے اور پھر جب ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی تو بمشکل اپنے ڈبے تک پہنچے۔

ہانیہ ڈائری کو یوں بھینچے بیٹھی تھی جیسے وہ ڈائری نہیں، پورے کے پورے ابا تھے۔ اس کے چہرے پر بڑا سا ملال تھا، مگر خوف زدہ نہیں تھی وہ۔

حادثے کبھی کبھی ہمیں ایسے تبدیل کر جاتے ہیں کہ شاید اتنی تیزی سے ساری دنیا بھی مل کر ہمیں نہیں بدل سکتی۔

"آپ سمجھ رہی تھیں، میں آپ کو بیر کھلانے کے بہانے لے گیا اور جنگل میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ گیا۔"

اس نے ابا کی طرف دیکھا اور یقین سے بولی۔

"آپ کی جگہ کوئی بھائی ہوتا تو شاید میں ایسا سوچتی، لیکن یہ آپ تھے، آپ کی محبت پر تو مجھے آنکھ بند کرکے یقین ہے ابا! مجھے معلوم ہے ساری دنیا بھی مجھے چھوڑ دے تو بھی آپ میری پشت پر کھڑے ہوں گے۔"

"میری محبت پر اس قدر یقین رکھنے کا شکریہ بیٹا!" وہ اس کے قریب بیٹھ گئے۔ "میرے غائب ہوتے ہی آپ کی سینس نے کیا مشورہ دیا تھا۔"

وہ ہنس کر ابا کو دیکھ کے بولی۔ "میں نے بیگ میں سے ڈائری نکالی۔ اس میں سب کے فون نمبر لکھے تھے۔ کہاں سے مدد حاصل کی جاسکتی ہے۔ کون کس حد تک ساتھ دے سکتا ہے۔ بہت سارے لوگوں میں سے ان دو، چار لوگوں کو ان کی پرانی کارکردگی پر الگ کیا۔ لاہور میں جو آپ انکل مشرف صہبائی کو مجھ سے خط لکھواتے تھے۔ ان کا ایڈریس اور فون نمبر نکالا اور سب سے آخر میں جواو نے جو پیسے زبردستی بیگ میں رکھے تھے۔ اس کا حساب لگایا کہ اگر کچھ بھی نہ ہوسکا تو واپس کا ٹکٹ کرواسکوں گی کہ نہیں۔"

ابا قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ "تمہی ذہانت سے رہنا ہے تم نے وہاں... میں جو تمہیں سمجھا نہیں سکا تھا، تم اس ایک لمحے میں سمجھ گئی ہو۔ یعنی مشکل حالات کا مقابلہ کرسکتی ہے میری بیٹی۔"

"نہیں ابا! آپ کی بیٹی بس بہادر لگتی ہے۔"

نہیں۔ میری ساری طاقت صرف آپ سے ہے۔"

ابا کچھ نہیں بولے اور حسب پروگرام اس کا ایڈمشن کروا کے اسے ہاسٹل شفٹ کروا آئے اور نعمان غوری کے ذمے یہ لگا دیا کہ ہر ویک اینڈ کو اسے گھر لے آئے۔ تاکہ وہاں بچی مضبوطی محسوس کرے۔ جو بچے گھر نہیں جاتے۔ وہ اندر سے جذباتی طور پر بہت زیادہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوجاتے ہیں۔

نعمان غوری نے سرہلا کر بات کو بہت گہرائی سے تسلیم کرلیا تھا۔ ابا واپس لوٹ آئے تھے مگر گھر میں سب ہی ان کے اس فیصلے سے برگشتہ تھے۔ بس جواو تھا، جو ان کے ساتھ ساتھ چلتا ساری تفصیل لیتا رہا تھا۔

"تو کھی بیٹی پل رہی ہے۔ جب یہی بیٹی سر جھکا دے گی تو معلوم ہوگا ابا کو کہ بیٹیوں کو سر چڑھانے کا کیا نقصان ہوتا ہے۔" صدیق بھائی نے تبصرہ جاری کیا مگر ابا نے سنی ان سنی کردی۔

"کیسے رہیں گے آپ اس کے بغیر؟" اماں... ابا کی چپ سے ہراساں ہورہی تھیں۔

"رہ لوں گا، مجھے رہنا ہی پڑے گا بیگم! بچوں کو اچھا مستقبل دینے کے لیے سینے پر پتھر رکھنا ہی پڑتا ہے۔"

مگر یہ سچ تھا۔ ابا کا تو پہلا دن اپنی بیٹی کے بغیر نہیں گزر رہا تھا۔ ٹرین میں بھی سارے راستے ان کی آنکھیں بھیگتی آئی تھیں۔ ہر اسٹیشن پر دل ہانک لگاتا۔

"مت جاؤ۔" وہ اپنی سیٹ سے اٹھتے اور پھر بیٹھ جاتے۔

بیٹی کی محبت نے واقعی پاگل کردیا۔ اولاد بڑا امتحان سہی مگر بیٹی کی محبت کسوٹی کی طرح ہے۔ ادھر چوک ہوئی ادھر کوئی بڑا گڑھا منہ کھولے نگلنے کو تیار، پل صراط تھا یہ۔ جہاں ابا کو بھی اپنی محبت کو ثابت کرنا تھا اور ہانیہ کو بھی ثابت کرنا تھا کہ اس کے باپ نے جو اس پر یقین کیا، وہ غلط نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اس وقت ہراساں بیٹھی تھی۔ ہانیہ کے جاتے ہی جیسے وہ بھری دنیا میں اکیلی ہوگئی تھی۔ ابا سے سب سے پہلے باقاعدہ لڑائی اس نے ہی تو کی تھی۔

"کون سا بدلہ نکالا ہے ابا جی! مجھ سے۔ میری تو دنیا میں ایک ہی دوست تھی، آپ نے وہ بھی چھین لی۔"

ابا پریشان ہو کر لال بھبھوکا سی جیا کو دیکھ کر لفظ جوڑنا بھول گئے تھے کہ ہانیہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"او جیا کی بچی! میرے ابا کو اکیلے دیکھ کر ڈرانے آگئی ہے انہیں۔ پتا ہے نا، بے چارے سے ہیں تیرے آگے ایک لفظ نہیں بولیں گے۔"

"ہاں تو بولیں نا، ایک نہیں دس لفظ بولیں۔ مگر میرے سوال کا جواب دیں۔ میری بات ابھی تک جواب طلب ہے۔"

ابا اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گئے اور جو کتاب انہوں نے پڑھنے کے لیے ریک سے نکالی تھی۔ وہ انہوں نے تپائی پر رکھ دی تھی، پھر نرمی سے کہا۔

"آپ کی رائے میرے بارے میں کیا ہے بیٹا!"

اب ہونق ہونے کی باری جیا کی تھی۔ "اس سوال کا مطلب ابا جی!"

"جواب دو تو بتاتا ہوں۔" ابا رسان سے بولے۔

"میری رائے میں... میں نے بچپن سے لے کر آپ کو اب تک جتنا دیکھا ہے، سمجھا ہے۔ اس کے حساب سے آپ ایک سمجھ دار اور رہائی سے ٹوٹ کر پیار کرنے والے ابا ہیں۔"

انہوں نے عینک صاف کرکے آنکھوں پر لگائی۔

"جب آپ کی رائے میرے بارے میں اتنی اچھی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے۔ میں کوئی ایسا فیصلہ لوں گا، جو میری بیٹی کے لیے نقصان دہ ہوگا۔ رہی آپ سے دوری تو اچھے دوستوں کے بہتر مستقبل کے لیے کچھ زہر کے گھونٹ پینے بھی پڑیں، جدائی کے تو پی لینے چاہئیں، دیکھیے گا جب فارماسیوٹیکل میں ڈگری لے کر آئیں گی تو آپ کا ہی سر فخر سے بلند ہوگا کہ آپ کی دوست کتنے اعلا مقام پر ہے۔"

اور بس پھر جیا نے سرہلا کر اس جدائی کو این او سی دے دیا تھا۔ لیکن آج محض دوسرا دن ہی تھا اور وہ اکیلے پن سے پاگل ہوگئی تھی۔

ان کے ہاں لڑکیوں کو پڑھانے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ وہ صرف مڈل پاس تھی لیکن ہانیہ کے ساتھ رہ رہ کر ہانیہ کی کتابوں کو پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے دو بھائی تھے۔ دونوں فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ ابا نہیں تھے۔ اماں ہر وقت بیمار رہتی تھیں۔ دونوں بھائی شادی شدہ تھے۔ اس لیے گھر میں گزر اوقات بہت مشکل سے ہوتی تھی۔ جیا گھر کے کاموں میں ایک ملازمہ کی طرح لگی رہتی تھی۔ سو جب وہ ہانیہ کے گھر جاتی اور اتنا پیارا پروٹوکول ملتا تو اسے لگتا وہ کسی فیری لینڈ میں آگئی ہے۔ اس کے اپنے گھر میں تو ہمیشہ اسے تیسرے درجے کا شہری بنا کر رکھا گیا تھا۔ کبھی کبھی یہی سب کچھ اس کے اندر غصہ اور احساس کمتری پیدا کر دیتا تھا۔ لیکن وہ مایوسی کی باتیں ہانیہ کے سامنے کرتی تو وہ اس سے لڑ پڑتی۔ اس کا خیال تھا۔

"دنیا اچھی جگہ نہیں ہے۔ اسے ہم اپنے عمل سے اچھا بنا کر اس میں رہ سکتے ہیں۔ اگر ہم ساری ذمہ داری دوسرے کے اعمال پر چھوڑ دیں تو خود ہمارا نامۂ اعمال "سم ٹیکسٹ مسنگ" کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ غم نہ کیا کرو، ہم بس ور کر ہیں اور ہمیں اپنی زندگی کو پل صراط سمجھ کر گزارنا ہے ۔۔۔ جہاں ایک چوک ہمیں گرا سکتی ہے۔"

وہ کبھی تو یہ بات مان لیتی کبھی انکار کر دیتی کیوں کہ اس کی زندگی میں کچھ بھی اچھا نہیں تھا۔ اب وہ ہانیہ کے گھر بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اس کے آنے جانے کو بھابھی اور اماں پسند ہی کب کرتی تھیں۔ پھر جواد ان سے چھوٹا ہی سہی۔ مگر اب اس کا قد اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ اس سے کسی بھی قسم کا تعلق اس کے لیے قابل اعتراض صورت حال پیدا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دیواروں سے باتیں کرنے پر مجبور کر دی گئی تھی۔ موبائل صرف بھابھی کے زیر استعمال تھا۔ کسی سے رابطہ کرنا ہوتا تو بھابھی سے موبائل مانگنا پڑتا تھا۔ ایک سے دو دفعہ مانگ لینے پر کہانیاں بن جاتی تھیں۔

"تم نے لسٹ نہیں دیکھی۔ کس کے میسجز تھے، کس کا نمبر تھا؟" بھائی کھوج لگانے کو کہتا اور چھوٹی بھابھی کہتی۔

"ہانیہ بی بی کے ساتھ رہ رہ کر بہت چالاک ہو گئی ہے۔ سب کچھ ڈیلیٹ کر کے تھماتی ہے موبائل۔"

"مت دینا اب موبائل۔" حکم صادر ہوا اور یوں ہانیہ سے رہا سہا تعلق بھی ختم ہو گیا۔ گھر میں ایک ریڈیو تھا۔ جس پر وہ گانے سنتی رہتی، اس پر بھی اعتراض ہوا۔

پھر یکدم اس کی زندگی میں ایک کھڑکی کھلی۔ گھر سے اکتائی ہوئی اکیلے پن سے پریشان ہو کر وہ اس کی طرف ملتفت ہو گئی۔ وہ لڑکا اس کے بھائی کی ورکشاپ میں کام کرتا تھا اور روز بھابھی سے دوپہر کا کھانا لے کر جاتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر اسے دیکھتی مسکاتی رہتی۔ آہستہ آہستہ بہانے سے باہر بھی ملنے چلی گئی۔ سیل فون بھی مل گیا۔ باتیں بھی ہونے لگیں۔ اماں بیمار رہتی تھی۔

ایک دن وہ ہانیہ کے گھر گئی۔ جواد سیڑھیوں سے پھسل گیا تھا۔ سب نے ہی اسے دیکھ کر منہ بنایا تھا۔ مگر وہ پاگلوں کی طرح اس کے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"جیا آپا۔۔۔" جواد اسے دیکھ کر رو پڑا تھا۔ ڈیل ڈول ہی میں بڑھ رہا تھا۔ اندر سے ابھی تک وہ دس سال کا جواد ہی تھا۔

"میں پتا نہیں دوبارہ چل سکوں گا کہ نہیں۔" اس نے جیا کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ معمولی سا فریکچر ہے۔ جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے، دیکھ لینا۔"

"ہانیہ آپی کا فون بھی نہیں آیا۔ بہت مصروف ہوتی ہیں شاید۔" وہ شکوے کرنے بیٹھ گیا۔

"پھسل کر چوٹ لگے تو بہت درد ہوتا ہے نا جواد۔۔۔" "پتا نہیں ابا اچانک کہاں سے چلے آئے تھے۔"

"ظاہر ہے ابا! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" ابا سر ہلا کر بیٹھ گئے۔ ہانیہ کا ذکر چلا اور ابا کی محبت امنڈ آئی۔

"میں جانتا ہوں میری بیٹی کتنی بہادر اور کتنی سمجھ دار ہے اور جب بیٹیاں سمجھ دار ہو جائیں تو ماں باپ کی ان سے امیدیں بڑھ جاتی ہیں اور بحیثیت باپ کے میں ہمیشہ یہی چاہوں گا۔ میری بیٹی میری عزت کا غرور بن کر رہے۔"

جیا کی آنکھوں میں پتا نہیں کیوں نمی آگئی تھی اور ابا نے بالکل اچانک اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"میں نے تمہیں ہمیشہ ہانیہ کی طرح اپنی بیٹی سمجھا ہے۔ تم بھی میری عزت کا غرور ہو۔ میری ذات کا سب سے مضبوط حوالہ ہو۔ جب آپ کو لگتا ہو آپ مطمئن ہوں مسرور ہوں۔ ایک سیکنڈ کی بھی بھول چوک کا اندیشہ نہ ہو تو پھر گر جانا ایسا ہی جیسے ہینڈ گرنیڈ کی پن غلطی سے نکل جائے۔ حادثہ کیسا بھی ہو زندگی کو اوپر سے لے کر نیچے تک بدل دیتا ہے۔"

وہ جو سمجھانے آئے تھے، سمجھا کے چلے گئے تھے جیا اسے سوپ پلا کر پھر آنے کا کہہ کر گھر واپس آگئی۔ اس نے موبائل سے سم نکالی۔ بکسے میں رکھ کر تالا لگایا اور اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ ان تلوں میں تیل ہے کہ محض کھیل ہے لفظوں کا۔

☼ ☼ ☼

زندگی پر سکون ہو گئی تھی کہ اس کا رشتہ آگیا۔ ان کی طرح کا لوئر کلاس سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ٹھونک بجا کر معلومات کی اور ایک ہفتہ کا ٹائم دیا۔

"ایک ہفتہ؟ کیا ہو گا اس میں۔۔۔" چھوٹی دلہن نے سوال اٹھایا۔

بڑے بھائی نے پیسے نکال کر ہتھیلی پر رکھ دیے۔ "جو کچھ ہو سکتا ہے کر لو۔ وہ کون سا کوٹھی بنگلے میں جا رہی ہے۔ ہمارے جیسے ہی غریب لوگ ہیں وہ۔ کھوٹ ہوتا تو الٹا ان کی جیب خالی کروانی پڑتی۔ پر نسلوں سے یہاں آباد ہیں۔ یہاں کے طور طریقوں پر بیٹی بیاہنی پڑے گی۔ ہمارے ملک میں ہمارا کون بیٹھا ہے۔ سو طرح کی پریشانی ذات قبیلے والوں کو ہوتی ہے۔"

چھوٹی دلہن نے پیسے اٹھا کر رکھ لیے۔ چھوٹی دلہن شہر کی ہی تھی۔ اس لیے خریداری کے معاملے میں سب اسی پر انحصار کرتے تھے۔ بڑی دلہن بالکل اجڈ گنوار تھی۔ پندرہ سال کی تھی۔ جب اس گھر میں آئی تھی۔ اب پینتیس سال کی ہو گئی تھی لیکن چال ڈھال، حلیہ لہجہ زبان کچھ نہیں بدل سکی تھی۔ دوسری طرف جیا تھی۔ جب سے اپنی شادی کا سنا تھا۔ اسے صرف ایک غم کھائے جاتا تھا کہ ہانیہ اس کی شادی میں شریک نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ جو تاریخ اس کی رکھی گئی تھی۔ اسی تاریخ میں ہانیہ کے سمسٹر تھے۔ جواد نے اسے بتایا تھا۔

جب سے شادی کی بات طے ہوئی تھی۔ وہ اب بے دھڑک جواد سے موبائل لے کر ہانیہ سے بات کر لیتی تھی ڈرائنگ روم میں۔ تاکہ آتی جاتی بھابھیوں کے کان میں بھی آواز پڑتی رہے اور وہ اپنی طرف سے کوئی کہانی نہ بنا سکیں۔

☼ ☼ ☼

"میں نے زندگی میں جو کچھ اچھا دیکھا۔ وہ ہانیہ سے دوستی کے بعد دیکھا۔ میں دو سال کی تھی، جب بابا حادثاتی طور پر مر گئے۔ پھر میری ماں بیمار ہو گئی اور گھر کا انتظام سنبھالنے کے لیے بڑا بھائی اپنی بیوی لے آیا۔ گھر ایک دم سے گاؤں بن گیا تھا۔ میری بھابھی کو صفائی ستھرائی کا کوئی ڈھنگ نہیں تھا۔ کوئی تصور ہی نہیں گھر گرہستی کا۔ اس کے ذہن میں بس تین وقت کا کھانا پکانا، کھانا کھانا اور شوہر کو خوش کرنا اور بچے پیدا کرنے کے سوا زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ ہم کئی نسلوں سے شہر میں رہتے آرہے تھے۔ آہستہ آہستہ ہماری خاندانی رکھ رکھاؤ میں بہت زیادہ تبدیلی آگئی تھی۔ میری ماں مڈل پاس تھی۔ جب میرے بابا زندہ تھے۔ گھر ایک دم دھلا دھلایا، چمچماتا ہوا سا رہتا تھا۔ میری سمجھ بہت چھوٹی سہی مگر میں نے اپنی ماں کو ہمیشہ صاف ستھرا اور مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر بابا مر گئے تو ایک دم سے ماں بھی مر گئی۔ میرا دم گھٹتا تھا اس ماحول میں۔ جب تک میں چھوٹی تھی، بھابھی کا ماں کے ساتھ ناروا

سلوک دیکھتی اور کڑھتی مگر پھر اپنی ماں کی ذمہ داری میں نے اپنے سر لے لی۔

پھر ہانیہ سے ملاقات ہوئی تو زندگی میں ایک بڑی تبدیلی آگئی۔ جواد ملا اور زندگی قہقہہ خوشی میں ڈھل گئی۔ میری اور ہانیہ کی ڈریسنگ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے اپنے کپڑوں پر شرمندگی بھی ہوتی تھی۔ وہی پرانے نیلے آتشی رنگ کے کپڑے۔ ہانیہ نے کئی بار میرے کپڑوں پر بات کی مگر چپ رہ گئی۔ پھر ایک دن میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جب بہت اچانک بڑی بھابھی نے بہت سارے کپڑے میرے سامنے لاکر رکھ دیے۔

"ہانیہ کے پرانے کپڑے ہیں۔ اگر تم پہننا چاہو۔"

میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

سارے کپڑے بالکل نئے جیسے تھے۔ مگر پھر بھی میں کوئی بھیک منگی تو نہیں تھی۔ نہ ہی میری آنکھوں نے کبھی ہانیہ کے کپڑوں کو ایسے للچائی نظروں سے دیکھا تھا۔ پھر بھابھی نے آسمان سے اٹھا کر مجھے نیچے کیوں پٹخ دیا تھا۔

ہانیہ کا چہرہ مجھ سے بھی زیادہ فق ہوگیا تھا۔ کتنی دیر تک وہ اپنے کمرے میں رکھے گل دان کو دیکھتی رہی۔ پھر یک دم تیزی سے اٹھی۔ وہ غصے میں تھی۔ میں اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ وہ اپنے ابا جان کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ میری دوست ہے ابا جان! آپ جانتے ہیں نا' دوست کا کیا درجہ ہوتا ہے۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی عام مسلمان کے لیے بھی یہ حکم دیا ہے۔ اگر مقدور ہو کچھ دینا تو وہ دو جو تم خود کھاتے ہو' وہ پہناؤ جو خود پہنتے ہو مگر بھابھی نے میری اترن کیوں جیا کے سامنے رکھی۔ انہوں نے جیا کے لیے سوچا۔ مجھے اچھا لگا لیکن کاش وہ جیا کے لیے میری نظر اور میرے دل سے سوچتیں۔"

بابا نے اسے اپنے قریب بلایا اور والٹ نکالا۔

"شازیہ کے رویہ کی میں آپ سے معافی مانگتا ہوں ہانی! مگر آپ کی سوچ جان کر مجھے ازحد خوشی ہوئی۔"

انہوں نے اس کی ٹھوڑی اٹھائی اور مسکرا کے بولے۔

"اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو کبھی آپ کو پتا بھی نہیں چلتا۔ آپ جیا کے لیے کتنی حساس اور کتنی کیئرنگ ہیں۔ نہ ہی آپ غلط کو غلط کہتی میرے سامنے آتیں۔ زندگی ان ہی چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہمیں بڑی بڑی باتیں سکھاتی ہے۔"

ہانیہ مسکرانے لگی تھی۔ میں پلٹنے لگی تھی۔ جب اس کے ابا نے والٹ نکالا اور ہزار ہزار کے پانچ نوٹ ہانیہ کی طرف بڑھا دیے۔ "آپ جو چاہیں اپنی دوست کے لیے اپنی مرضی سے خرید لیجیے گا۔ ان کپڑوں کو رہنے دیں وہ میں آپ کی امی کو کہوں گا ماسی کو دے دیں۔ ان کی بیٹی آپ کے ہی برابر ہے۔"

ہانیہ باہر آگئی۔ مجھے دیکھا اور میرے گلے لگ گئی۔ اس دن اس نے میرے لیے بہت شاپنگ کی۔ کپڑے اپنے ہی ٹیلر کو دیے۔

میرے اندر ایک دم سے اپنی ذات کی عزت کا احساس پارے کی طرح دوڑنے لگا۔ اس دن ہم دونوں نے کچن میں مل کر شام کا کھانا بنایا۔ مگر میں اس دن کھانا کھائے بغیر اٹھ گئی۔ ماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔ انہیں اسپتال میں داخل کروانا پڑا۔ میں ماں کے ساتھ تھی مگر اس دن میں نے عزت نفس کو پہلی بار اپنے اندر آنکھیں مل کر جاگتے دیکھا۔ میں نے اپنی زندگی کے لیے ہانیہ جیسا نہیں' لیکن ایک ایسے جیون ساتھی کا خواب دیکھا' جو مجھے باعزت زندگی دے سکے بھلے ہم بہت دولت مند نہ ہوں' لیکن معاشرے میں اتنے بھی بے وقعت نہ ہوں کہ کوئی بھی چاہے ہمیں ٹھوکر مار کر چلا جائے۔ ہماری بے عزتی کرنا اپنی شان سمجھے اور جب میں ان ہی معاملات میں الجھی ہوئی تھی۔۔۔

نادر میری زندگی میں آیا۔ مزدور اور محنت کش انسان تھا۔ مجھے یہی لگا تھا کہ دو وقت کی روٹی عزت سے کھلا سکے گا مگر دو سے چار بار کی بات چیت سے مجھے اندازہ ہوگیا۔ وہ گھر بسانے کا کوئی خیال نہیں رکھتا

شاید میں اندر کی گھٹن اور تنہائی سے اس چور راستے کو قبول بھی کر لیتی لیکن ابا کی بات سن کر یکدم میرے دل کو کچھ ہوا۔ مجھے لگا میرے بابا' ہانیہ ابا کے روپ میں میرے سامنے بیٹھے ہیں اور ایک ہی بات کہہ رہے ہیں۔

"زمانے کو خود پر کبھی ہنسنے نہ دینا' لوگ ہنس کر چپ ہو جاتے ہیں' بے عزتی کے اس واقعہ کو شاید بھول بھی جاتے ہیں۔ لیکن یہ ہنسی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسان کا اعتماد' امید' بھروسا چرا کے لے جاتی ہے۔ مت چلنا ایسی راہ جس پر چل کر لوگ تیرے مرے ہوئے باپ کی قبر کی طرف منہ کر کے طعنے دیں کہ یہ ہے تیری بیٹی' ایسی ہوتی ہے بیٹی۔ میں گھر آ گئی لیکن۔۔۔

اب میں اکیلی بیٹھی ہوں اور میری قسمت کا فیصلہ ہو چکا۔ دس دن بعد زندگی پتا نہیں کیسے اور کس پیرائے میں گزرے گی۔ میرے لیے زندگی صرف ایک دھند ہے۔ ایک گہری عمیق دھند۔

☼ ☼ ☼

"ماں! ہر اتوار کو جب میں سوچتا ہوں پورے ہفتے کی نیند پوری کروں گا۔ یہ نائٹ میرز کہاں سے گھر میں داخل ہو جاتے ہیں۔"

وہ برا سا منہ بنا کر سیب کھا رہا تھا۔ ٹی وی آن تھا۔ وہ ابھی تک سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آنکھوں میں نیند کا خمار ابھی تک باقی تھا۔ تب ہی اس نے امریکن کچن میں دوپہر کے کھانے کے لیے کھانا بناتی ماں کو مخاطب کیا۔

وہ صرف مسکرانے لگیں۔ نوڈلز کو انہوں نے ابھی ابھی ابلتے پانی میں ڈالا تھا۔ اس لیے ان کی توجہ اسی پر تھی۔

"ماں! مجھے کھانا کب ملے گا؟" پہلے جواب کا انتظار کیے بغیر دوسرا سوال کیا۔ اس کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ وہ رات کو دوستوں میں سٹرڈے نائٹ منا کر آیا تھا اور اب دوپہر کے دو بج رہے تھے۔

"کیا کھاؤ گے۔۔۔ بنا دیتی ہوں۔"

وہ کرنٹ لگنے کی کیفیت میں یکدم مڑا تھا۔ "کیا کھاؤ گے بنا دیتی ہوں۔۔۔ مطلب آپ نے ابھی تک کھانا بنانا شروع نہیں کیا۔"

"دراصل ہانیہ اور بلال چاہتے تھے کہ دوپہر کا کھانا ہلکا پھلکا ہو' صبح پراٹھے کھائے تھے تو ابھی میں صرف نوڈلز ود چکن بنا رہی تھی۔"

"مجھے نہیں کھانے یہ بدیسی کھانے اور یہ ہانیہ کون ہوتی ہے۔ ہمارے گھر کا مینیو سیٹ کرنے والی۔"

وہ ایک دم سے چڑ گیا تھا۔ اسے ڈکٹیٹ کیے جانا بالکل پسند نہیں تھا۔ شروع سے اپنی مرضی کرتا آیا تھا۔ جو چاہتا تھا قسمت سمیٹ کر اس کے سامنے لا رکھتی تھی۔ پھر نہ کہنے کا کیا جواز۔ آخر اتنی بڑی کمپنی چلا رہا تھا۔ اپنے بابا کا بایاں ہاتھ تھا۔ گھر میں اس کے حکم چلنے کے لیے یہ بھی کافی تھا کہ وہ نعمان غوری کی پہلوٹھی کی اولاد تھا اور نعمان غوری کی آنکھوں کا تارا تھا۔

"ماں! کھانا بنا کہ نہیں۔ ہم دونوں ٹینس کھیل کھیل کے تھک چکے ہیں۔"

بلال اندر آیا۔ سفیان کو اس حلیے میں دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے سوال پوچھا۔ وہ نظر انداز کر گیا تو وہ اس کے پاس صوفے پر آ کر گر گیا۔

"کیوں برو! اتنا برا حلیہ' یہ پرانی فلموں کے غمگین ہیرو کیوں بنے ہوئے ہو؟"

"پلیز ڈونٹ بگ می' آئی ایم گڈ اینز۔"

ہانیہ جو فریج سے بوتل نکال کر پانی گلاس میں ڈال رہی تھی۔ یکدم اسے اچھو لگ گیا تھا۔

سفیان نے جلتی نظر سے ہانیہ کو دیکھا۔ "کیا مطلب ہوا اس ہنسنے کا؟"

ہانیہ نے سنبھل کے اسے دیکھا اور اب تک کی چند ملاقاتوں میں پہلی بار اسے غور سے دیکھا۔ چھ فٹ سے نکلتا قد' کسرتی جسم' بھری خمار آلود آنکھیں' سنہری گندمی رنگت وہ بلاشبہ ایک بھرپور مرد تھا۔ جس پر کوئی بھی لڑکی اپنا دل ہار سکتی تھی۔

"گم ہو گئیں۔۔۔ آپ بھی گم ہو گئیں' میرا بھائی؟"

اتنا خوب صورت' لڑکیاں ان کا حسن دیکھ کر ایسے ہی گم ہو جاتی ہیں۔"

"واٹ نان سینس۔" وہ غصے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اور کچن میں کام کرتی ماں گھبرا گئیں۔ "اب یہ کھانا بھی نہیں کھائے گا۔ ہانیہ تمہیں اس طرح ہنسنے کی کیا ضرورت تھی؟"

ہانیہ یکدم شرمندہ ہو گئی۔ "سوری آنٹی! وہ۔۔۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ بالکل میر لگ رہے تھے۔" وہ پھر ہنسی تو دبا گئی۔

"ماں! بول دیں اپنی دوست کی بیٹی کو۔۔۔ مجھ پر طنز کرنا چھوڑ دے۔ وگرنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔"

"آپ سے برا اب بھی کوئی نہیں ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑا کر باہر گارڈن میں چلی گئی۔ سفیان شاور لے کر ابھی باہر آیا تھا۔ تولیہ سے بال خشک کرتے ہوئے وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اس نے ہانیہ کو گلابوں کے تختے کے پاس دیکھا۔

"یہ کچھ کھسکی ہوئی ہے شاید؟"

"جی نہیں۔ ہانیہ آپی بہت اچھی ہیں۔" وہ تیزی سے مڑا۔ اس نے بظاہر خود سے کہا تھا مگر تیز آواز میں۔ غلط یہ ہوا کہ بلال اسی وقت آ گیا تھا۔

"بہت زیادہ چمچے نہیں بن گئے ہو ہانیہ کے' کتنے پیسے دیتی ہے اپنی تعریفیں کرنے کے۔"

"ہانیہ آپی آل ریڈی پرفیکٹ ہیں۔ اس لیے مجھے ان کی مصنوعی تعریف نہیں کرنی پڑتی۔"

"اچھا۔۔۔ مگر تمہاری ہانیہ آپی ہی کہتی ہیں' کوئی انسان کبھی پرفیکٹ نہیں ہوتا۔" پچھلے ہفتے کا معرکہ دہرانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بس منہ سے پھسل گیا۔

"اس دن آپ جس طرح ملازم پر الٹ پڑے تھے اسے زدوکوب کیا تھا۔ اس لحاظ سے ہانیہ آپی کا کہنا غلط نہیں تھا کہ کوئی انسان پرفیکٹ نہیں ہوتا بھول چوک کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔"

"بھول چوک۔۔۔ میرے لیپ ٹاپ پر اس خبیث نے جوس چھلکا دیا تھا۔ ایک سیکنڈ میں ساٹھ' ستر ہزار برباد کر دیے' یہ کوئی چھوٹی بات ہے۔" پرانی بات سوچ کر اسے نئے سرے سے غصہ آ گیا تھا۔

"آپ نے دوسرے ہفتے ہی نیا لیپ ٹاپ لے لیا تھا نا۔ مطلب ہم اسے افورڈ کر سکتے ہیں۔ جو چیز ہم افورڈ کر سکتے ہیں' یہ اللہ کا کرم ہے نا' جب وہ اللہ ہم پر اتنا رحم اور اتنا کرم کرتا ہے تو ہمیں بھی اس کے بندوں پر رحم کرنا چاہیے۔"

"صحبت ٹھیک کر لو اپنی' ورنہ یہ مدر ٹریسا تمہیں عبدالستار ایدھی بنا کر رکھ دے گی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں' میں نہ بدلنے کی ضد نہیں کرتا اور ہمیشہ ہونے والے حادثے پر سوچتا ہوں کہ اس کی وجہ سے ضرور میری زندگی میں کوئی بہتر تبدیلی پیدا ہو گی۔ بھلے وہ تبدیلی ہم پر ظاہر ہو یا نہ ہو یا کچھ عرصے بعد ظاہر ہو۔ کیونکہ ہانیہ آپی کہتی ہیں اللہ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔"

"یہ تیری ہانیہ آپی طالبان میں سے تو نہیں' اتنے کھلے فتوے۔۔۔ کسی دن اللہ اکبر کہہ کر پھٹ مت جانا۔"

بلال ہنس پڑا۔ "یہ آپ سب اللہ کی طرف رجوع کرنے والوں سے ایک دم ڈر کیوں جاتے ہیں۔ رہا طالبانائزیشن۔۔۔ تو میرا ماننا ہے اور اس میں دو رائے نہیں کہ واقعی اللہ کو ماننے والا کبھی اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں کر سکتا اور یہ اللہ ہی کا حکم ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان' مال' عزت سب کی حرمت لازم ہے۔ وہ مسلمان ہی نہیں' اگر اس کے ہاتھ' زبان سے دوسرا مسلمان محفوظ نہیں۔"

سفیان مسکراتے ہوئے اسے دیکھنے لگا۔ "ہانیہ بی بی اپنی فورس بنا رہی ہیں۔ کوئی بہت بڑا دھماکا تو نہیں ہونے والا میری زندگی میں۔"

اس نے ویسے ہی ایک بات کہہ دی تھی۔ مگر ایک ماہ بعد وہ حیران رہ گیا۔ جب بابا نے اس کے سامنے پروپوزل رکھ دیا۔

"ہانیہ کو ہم نے تمہارے لیے پسند کر لیا ہے۔"

"میری رائے کی کوئی اہمیت ہے کیا؟" وہ یکدم فائل پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔ "تمہاری ماں کہہ رہی تھیں کہ تم ہانیہ میں دلچسپی لے رہے ہو اگر ہم یہ فیصلہ کریں تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"پتا نہیں ماں کو یہ سارے منظر کون سی عینک لگا کر نظر آئے۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔ شرٹ کی آستین فولڈ کرنے لگا۔ یہ اس کے ذہنی دباؤ کی پہلی نشانی تھی۔ اس طرح کی حرکت سے وہ اپنا غصہ اور اپنی پریشانی کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کر کے خود کو بات کرنے کے قابل بناتا تھا۔ وہ اس کے باپ تھے اور جانتے تھے اس کی عادتوں کو اس لیے پرسکون بیٹھے تھے۔

"بابا۔ اس نے بات کرنے کے لیے پر تولے اور اب وہ غیر جانب دار رائے دینے والا تھا۔ نعمان غوری اس کے اس انداز سے بھی واقف تھے۔ اس لیے ہمہ تن گوش تھے۔

"ہم جب اپنا جیون ساتھی چنتے ہیں تو سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں کیا ڈفرنس ہے۔ تعلیمی معیار اور رویے کا تقابلی جائزہ لیتے ہیں کہ یہ ہمارے قدم سے قدم ملا کر چل سکے گا کہ نہیں اور میں نے ہانیہ میں ایسی کوئی بات نہیں دیکھی۔ اگر میں خوب صورتی کے معیار کو نچلے درجے پر لے آؤں تو بھی وہ کسی طور میرے ساتھ میچ نہیں کرتی۔ آپ پلیز اپنی دوستی کو مضبوط کرنے کے لیے کسی گھسی پٹی پرانی کہانی کی طرح مجھے قربان مت کریں اور دوسری بات ...... میں اپنا جیون ساتھی چن چکا ہوں۔ رائنہ مسرور، آپ مسرور بیگ سے تو اچھی طرح واقف ہیں۔"

بابا کو حیرت ہوئی۔ وہ آج تک اسے ایک ذہین اور سمجھ دار انسان سمجھتے تھے۔ مگر اب وہ اپنا خیال اس کے حوالے سے بدلنے جا رہے تھے۔

"زندگی میں، میں نے آج تک کسی کو اتنا بے وقوفانہ فیصلہ کرتے نہیں دیکھا سفیان! آسان زندگی کو مشکل کی طرف لے جا رہے ہو تم اس فیصلے سے۔"

"جو بھی ہو بابا! میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ میں اس سے وعدہ کر چکا ہوں۔" وہ کہہ کر رکا نہیں۔ ان کے چیمبر سے نکل دیا۔

اور نعمان غوری سوچ رہے تھے کہ اب اس معاملے کو کیسے سدھاریں۔ یہی پریشانی انہوں نے بیوی سے شیئر کی تھی اور دوسرے دن وہ سر ہلا تا کھڑا تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ کرلیں اپنی مرضی کا فیصلہ۔ میں دستبردار ہو جاتا ہوں۔"

"کیا کہہ کر منایا تم نے؟" وہ حیرانی سے پوچھ رہے تھے رات میں۔ بیوی مسکراتے بولیں۔

وہی پرانی فلموں والی ایموشنل بلیک میلنگ، مگر ایک غلطی ہو گئی۔"

"کیا۔" وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ان کی بیگم سے غلطی ہونے کا مطلب ہے کوئی سنجیدہ حماقت۔

"وہ تھوڑا سا پسیجا تھا پوری طرح نہیں مانا تھا تو میں نے کہا، بابا کی عزت کا مسئلہ ہے۔ ایک شادی ان کی مرضی سے کرلو۔ دوسری شادی اپنی مرضی سے کرلینا۔"

"توبہ! یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ اس معصوم لڑکی کا کیا بنے گا؟" انہوں نے چائے تپائی پر رکھ دی۔ وہ واقعی پریشان ہو گئے تھے۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔ میں جانتی ہوں۔ کس حد تک جائے گا۔ ہانیہ اتنی لونگ اتنی کیئرنگ ہے۔ وہ دنوں میں اس کا گرویدہ ہو کر رائنہ کو بھول جائے گا۔ دوسری شادی کرنا معاشی طور پر مشکل نہ بھی ہو تو جذباتی طور پر، معاشرتی طور پر مشکل ہو جاتی ہے۔ نہ بھی ہو تو محسوس ضرور ہونے لگتی ہے۔ دو چار بچے ہو گئے تو رائنہ مکمل آؤٹ ہو جائے گی۔ آپ یقین رکھیں اللہ پر۔"

انہوں نے سر ہلایا اور یوں ایک شام ان دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔

رخصتی ڈگری کے بعد ہونا طے پائی تھی۔ نکاح کی تقریب میں سارے لوگ موجود تھے۔ رائنہ بہت تیز نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔ ہانیہ اپنے ابا اور اماں جو او اور جیا کے ساتھ مگن تھی۔ جیا کی لے کر آئی تھی۔ مگر وہ پھر بھی ضد کر کے آگئی تھی۔ ہانیہ اسے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ اس کا شوہر لیے رہا تھا۔ مگر بہرحال یہ تقریب اختتام پذیر ہو گئی تھی۔

ابا نے اسلام آباد میں ایک گھر لے لیا تھا۔ کیونکہ تعلیم مکمل ہونے کے بعد کافی عرصے تک اسے یہیں رہنا تھا اور نکاح کے بعد وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ وہاں رہے اور گھر میں باقی لوگ باتیں بنائیں کیونکہ اتنا اچھا جیون ساتھی مل جانے پر سب ہی منہ میں انگلیاں دبائے اور زبان پر دھار لگائے بیٹھے تھے۔

"کہنے کی بات ہے کہ ابا نے رشتہ طے کیا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے ہانیہ جیسی لڑکی پھنجلی بیٹھے۔ ضرور محبت کا چکر ہے اور مرد کتنا ہی کائیاں ہو محبت کے معاملے میں مار کھا ہی جاتا ہے، بیٹھے بٹھائے کروڑ پتی کی بیوی بن گئی ہے۔"

ابا یہ سب رائے سن چکے تھے لیکن انہوں نے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

گھر ملنا آسان کام نہیں تھا لیکن نعمان غوری کی سپورٹ اور ان کی کوشش کام آئی تھی۔ کرائے پر گھر لیا تھا۔ گو بہت زیادہ فرنشڈ نہیں تھا مگر رہنے کے حوالے سے بہت اچھی جگہ تھی۔ بلکہ ہانیہ کی تعلیم کے حوالے سے بہت سود مند رہی۔ ابا اماں کے ساتھ یہیں شفٹ ہو گئے تھے۔ کوئی ملازمت تو تھی نہیں۔ اسٹیٹ ایجنسی کا کام تو کسی بھی جگہ شروع کیا جا سکتا تھا۔

"ابا! آپ میرے لیے کتنا کچھ کر رہے ہیں۔ میری آرزو ہے میں آپ کو کچھ حد تک واپس بھی لوٹاؤں۔ شادی کے مقابلے میں جاب میں انٹرسٹ رکھتی ہوں۔ آپ کا مضبوط بازو بن سکوں۔"

وہ مسکرانے لگے۔ کتاب اٹھا کر رکھی۔ ہاتھ کے اشارے سے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور نرمی سے بولے۔ "آپ کو لگتا ہے ماں، باپ جو اولاد کو دیتے ہیں، وہ اولاد انہیں واپس لوٹا سکتی ہے۔ وہی سب کچھ جو ماں باپ بغیر کسی طمع اور لالچ کے انہیں دے چکے ہوں؟" وہ خاموش رہی۔

"وقت، جوانی، امنگیں، خواب، اپنی مرضی کی زندگی، اس میں سے اولاد ایک بھی چیز نہیں لوٹا سکتی۔ لیکن ہر ماں، باپ اپنی اولاد کی اسی طرح پرورش کرتے ہیں۔ کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی اولاد کو گرم ہوا کا تھپیڑا بھی نہ لگے اور جو ماں، باپ کم مائیگی کی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے۔ سوچتے تو وہ بھی اپنی اولاد کے لیے ایسا ہی ہیں۔ والدین اپنی اولاد کے لیے جو اچھا سوچنے میں ایک لمحہ لگاتے ہیں۔ اولاد اس ایک لمحہ کا قرض بھی نہیں چکا سکتی ہے۔"

" انہوں نے ہانیہ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور جذب سے بولے۔ میں نے آپ کے لیے جو کچھ کیا۔ یہ وہ سب نہیں ہے جو میں آپ کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ مقدور بھر کوشش ہے۔ مگر اس لیے نہیں کہ آپ نوکری کرو اور مجھے ریٹرن کرو۔ بلکہ میں نے یہ اس لیے کیا کہ میرے سوہنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی فرمان ہے۔ اپنی بیٹیوں کو اچھی تعلیم دو، بیٹوں اور بیٹیوں میں کوئی فرق نہ رکھو۔ میں تو بس چاہتا ہوں اپنے سوہنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سامنے جاؤں تو کوئی تو کوئی زاد راہ ہو میرے پاس۔ ان کی سنت کے لیے ہی بیٹیوں سے پیار کرنا کوئی سیکھ جائے۔ ایک سنت زندہ رکھنے کا اتنا اجر و ثواب ہے کہ دامن چھوٹا پڑ جائے، پر اجر نہ سمیٹے۔"

وہ بس ابا کو دیکھتی رہی۔ کتنی پریشانیوں سے گزرے ہیں وہ اس کے لیے۔ لیکن آج بھی ان کے دل میں اس کے لیے وہی ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ وہ خاموشی سے ان کا ہاتھ چوم کر اپنے کمرے میں اٹھ آئی۔

★ ★ ★

یہ اس کا آخری سمسٹر تھا۔ جب وہ رج کے سونے کا خیال کر کے لیٹی تھی اور اماں نے اسے ہڑبڑا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"سفیان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔"

وہ سکتے کی کیفیت میں بس دیکھتی رہ گئی۔ فوراً اسپتال پہنچے۔ ایکسیڈنٹ بہت شدید تھا۔ سب کی

حالت غیر تھی۔ خدا خدا کر کے چھ گھنٹے بعد آپریشن تھیٹر کھلا۔ نیورو سرجن اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ لیکن پھر بھی بہت زیادہ پر امید نہیں تھا۔ گاڑی نے زبردست ہٹ کیا تھا۔ جب وہ رائنہ سے مل کر باہر اپنی گاڑی میں بیٹھنے والا تھا۔

ہانیہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ اس کی حالت تشویش ناک تھی مگر اسے بس صرف ایک جملہ سنائی دے رہا تھا۔ "اسے دوسری گاڑی نے ہٹ کیا جب وہ رائنہ سے مل کر اپنی گاڑی میں بیٹھنے والا تھا۔"

وہ رائنہ کے گھر کیوں گیا تھا۔ سفیان غوری پر صرف اس کا حق تھا۔ پھر وہ رائنہ سے کس حق سے ملنے گیا۔ اس سے نکاح کے بعد جب وہ صرف اس کی امانت تھی تو وہ ہانیہ رفیق الزماں کی امانت میں خیانت کیوں کر رہا تھا۔

ابا نے اس کے اندر کی تبدیلی کو نوٹ کر لیا تھا۔ "دعا کرو وہ پورا کا پورا سفیان تمہیں واپس پلٹائے۔"

وہ اس وقت اس قدر شاکڈ تھی کہ اس نے سوچے سمجھے بغیر ہی دعا کی تھی۔ مگر بعد میں سوچا ابا نے اس کی محبت کے متعلق اتنی انہونی دعا کیوں بتائی تھی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے ابا سے پوچھ بھی لیا۔ وہ بس مسکرائے گئے۔ پھر آہستگی سے بولے

"جب بھی کوئی حادثہ ہو اپنے اوسان بحال رکھو اور سوچو اور کیا' کیا برا تھا' جو اس وقت تمہارے ساتھ ہو سکتا تھا۔ تمہیں خود بخود وہ تکلیف چھوٹی لگنے لگے گی۔ کوئی بھی واقعہ یا حادثہ رب العزت کی حکمت سے خالی نہیں۔ کچھ چیزوں کے رزلٹ ہمیں "فوراً" مل جاتے ہیں۔ کچھ کے کچھ عرصے بعد اور دوسری بات بات اشفاق صاحب کہتے ہیں۔ کوئی بھی دکھ ہو' تکلیف ہو' صرف ایک واقعہ سمجھو' پوری زندگی نہیں۔ وہ جانتا ہے۔ ہم نہیں جانتے تب ہی شکوے کرتے ہیں۔"

وہ چپ رہ گئی اور پھر ایک ہفتے بعد مختلف ٹیسٹوں سے پتا چلا سفیان کی ریڑھ کی ہڈی میں گڑبڑ ہو گئی ہے۔ جو آپریشن کے باوجود آہستہ آہستہ ہی ٹھیک ہو پائے گی۔ فزیو تھراپی سمیت بہت سارے بکھیڑے تھے۔ وہ بمشکل اٹھ کے بیٹھ پاتا تھا۔

"میں اب چل نہیں سکتا۔" سفیان غوری نے کھڑکی سے طلوع ہوتے سورج کو دیکھ کر بر ملا خود کو مسترد کر دیا اور تب ہی وہ لڑکی کمرے میں داخل ہوئی تھی جو محبت کی طاقت پر یقین رکھتی تھی۔

"دنیا میں ایسا کوئی کام نہیں' جو سفیان غوری نہیں کر سکتا۔" یہ پہلا مربوط جملہ تھا' جو اس نے ادا کیا تھا۔

سفیان غوری نے اسے طنز سے دیکھا تھا۔ "شاید تم اس طرح کے کریمی جملے اس لیے بول سکتی ہو کہ میں بستر پر اپاہج لیٹا ہوں اور تم زندگی سے بھرپور ہو کر میرے اور سورج کے درمیان آن کھڑی ہوئی ہو۔"

وہ مسکرائی تھی۔ "میں سورج کے درمیان نہیں کھڑی اس کی کرنوں کے سامنے موجود ہوں۔ اس لیے کہ آپ سورج کو دیکھیں تو شاید مجھ پر بھی نظر کر دیں۔"

وہ عزت نفس کو وقتی طور پر سلا کر گئی تھی کیونکہ سامنے بیٹھا شخص مایوسی کے اس مقام پر تھا کہ اس سے جھگڑا کر کے اسے نہیں جیتا جا سکتا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔" وہ لال انگارہ آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔

"مگر میں آپ کے ساتھ ہی رہنا چاہوں گی۔"

"جھوٹ مت بولو' کوئی بھی امنگوں سے بھری لڑکی ایک اپاہج مرد کے ساتھ کبھی جینا نہیں چاہتی۔"

"شاید ایسا بھی ہو لیکن آپ میرے شوہر ہیں اور مجھے آپ کے دکھ سکھ شیئر کر کے ہی اپنی زندگی کو خوشیوں امنگوں سے بھرپور بنانا ہے۔"

"ترس۔۔۔ ترس مت کھاؤ مجھ پر۔" اس بار اس نے گلاس زمین پر پھینک کر توڑ ڈالا۔ ہانیہ جانتی تھی' وہ اندر سے اس گلاس کے مانند ہی ریزہ ریزہ ہو چکا ہے۔ پورا ایک ماہ ہو گیا تھا مگر رائنہ نے نہ اسے فون کیا' نہ ملنے آئی تھی۔ حادثے کے بعد جو وہ اسے ایمرجنسی میں لے کر آئی تھی' سفیان کی ڈوبتی آنکھوں نے اس کے بعد اس کا عکس نہیں دیکھا تھا۔

ہانیہ سادہ سے طریقے سے رخصت کر دی گئی تھی۔ گھر کے لوگ شریک تھے اور ثوبیہ اس کی دن رات بلکہ بعض تفتیں دیکھ دیکھ کے عش عش کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہیں رکھ سکی تھی وہ اپنی بیوی ہونے کی ذمہ داری بخوبی نبھا رہی تھی۔

کبھی کبھی تھک جاتی تو نماز میں گلے شکوؤں پر اتر آتی لیکن ابا یاد آتے تو پھر سے حوصلہ کر کے سفیان کے پاس چلی جاتی۔

سفیان اگر نارمل حالت میں ہوتا تو اسے تیسرے درجے کے شہری کی طرح شاید قبول کر لیتا لیکن یہاں وہ اس کی چھتری کی طرح ہو گئی تھی اور اس جیسا تنک چڑھا شخص یہ بات قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اس کا محتاج ہو چکا ہے' اس لیے وہ اس کی ہر کوشش کو در خور اعتنا سمجھتا تھا۔ اسے بستر پر لیٹا لیٹا بھی گھن چکر بنائے رکھتا مگر وہ ان باتوں کی عادی ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

جیا کی بیٹی چھ سال کی ہو گئی تھی۔ مگر اس کی ضدی عادت کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھی۔ اس کا شوہر غریب مزدور تھا' فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک کمرے کے گھر میں رہتے تھے۔ بمشکل گزارہ ہوتا تھا مگر وہ بچی تھی اس کی فرمائشوں کی لسٹ بہت لمبی ہوتی تھی۔ ہانیہ کی طرف سے ملنے والے تحائف نے اس کی عادتیں اور بھی بگاڑ دی تھیں۔ وہ اکثر ہانیہ سے اپنی بیٹی کی شکایتیں کرتی رہتی تھی۔

"وہ سمجھتی ہے میں اس سے محبت نہیں کرتی۔ میں اس کا خیال نہیں رکھتی۔" ہانیہ اسے دیکھتی رہی پھر بے ساختہ اس نے کہا۔

"تو پھر تو اس پر سختی کر تاکہ اسے پتا چل جائے کہ تو اس سے کتنی محبت کرتی ہے۔"

"محبت ہی تو کرتی ہوں اس سے۔ کنواتی ہوں۔ جہاں جہاں اس کا خیال رکھا مگر وہ مانتی نہیں' کہتی ہے یہ تو سب کرتے ہیں۔ میں اسے اپنی محبت جتا جتا کر بھی تھک گئی ہوں۔"

اس بار ہانیہ آئی تو وہ اس کے پاس ہی آ گئی تھی ہانیہ اور ابا کو کچھ پراپرٹی کے کاغذات ایک ساتھ سائن کرنے تھے۔ بابا نے اپنی زندگی میں ہی جائیداد کی تقسیم کر دی تاکہ ان کے گھر میں مزید سیاسی داؤ پیچ نہ کھیلے جائیں۔ واحد اپنا گھر تھا جو انہوں نے اپنے استعمال میں رکھا تھا' ہانیہ نے اس وقت ٹی وی آن کر رکھا تھا۔ جیا بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی' اس کے چہرے پر حالات نے ایک سخت لکیر کھینچ دی تھی۔ یکدم "گرفتاری" شو شروع ہو گیا' اس میں لوگ گرفتار ہوتے تھے مختلف جرائم میں۔ ایک عورت کھڑی تھی بہت غریب سی' بے چاری سی۔

"گھر کے حالات ٹھیک نہیں تھے۔ میرے شوہر نے زیادہ پیسے کمانے کے لیے یہ پلان بنایا۔ ہم لوگوں کو مختلف جگہوں پر بلاتے اور میرا شوہر اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ مل کر انہیں لوٹ لیتا۔ میں مانتی ہوں میں مجرم ہوں۔ مجھے سزا ملنی چاہیے۔ مگر آپ میرے شوہر کو بھی تو گرفتار کریں' وہ تو ماسٹر مائنڈ ہے۔ اس نے ساری دنیا کی طرح مجھے بھی لوٹ لیا میں اس سے کم از کم اس چیز کی توقع نہیں رکھتی تھی۔"

جیا اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ "ہم میں سے ننانوے فیصد لوگ ساری توقعات انسانوں سے باندھ لیتے ہیں۔ اور انسان کی مٹی میں نہ وفا ہے نہ خیر۔ جو اچھا ہوتا ہے ہماری زندگی میں اسے اپنی ذہانت اور محنت تصور کرتے ہیں اور جو غلط ہو' اس کا سارا بوجھ دوسرے پر ڈال دیتے ہیں' لیکن سوچنے کی یہ ضرورت ہے کیا واقعی وہ بہت بری زندگی جی رہی تھی' ایک کمرے کا سہی اس کا گھر تھا وہ تین وقت کھانا کھاتے تھے۔ اس کی ایک بیٹی تھی اور اس کا شوہر اس کی عزت کے لیے جان دے بھی سکتا تھا جان لے بھی سکتا تھا' تو کیا وہ واقعی ایک تکلیف دہ زندگی جی رہی تھی' کبھی خوش ہو کر یہ نہیں کہتے کہ ہمارا ایک عضو ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ہمیں اللہ نے مکمل بنایا ہے مگر دکھ بیماری پر چیخ پڑتے ہیں جبکہ سچ یہ ہے کہ دنیا میں زندگی سمیت ہر چیز فانی ہے۔"

ہانیہ نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ "اسے اسکول میں داخل کروانا ہے۔"

جیا نے مسکرا کے دل میں کہا۔ "ہاں ایک شکریہ بھی لازم ہے کہ اس کا شوہر بیٹی کو پڑھانے کے خلاف نہیں۔ تعلیم کے لیے اس کے اندر بھی وہی جنون ہے جو خود اس میں کبھی کبھی اپنی تعلیمی کم مائیگی کی وجہ سے زور مارتا ہے۔"

"ہاں جلد اسے اسکول میں داخل کروں گی۔"

"اخراجات کی فکر مت کرنا۔ جتنا پڑھنا چاہتی ہے پڑھنے دینا۔"

اس نے دل کو مسکراتے دیکھا۔ "ایک شکر تو یہ بھی بنتا ہے کہ اس کی اتنی مخلص دوست ہے پوری دنیا میں بھلے ایک ہی سہی مگر ہے۔" اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی اور وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"واپس کب جاؤ گی؟" اس نے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کل صبح کی ٹرین سے۔"

"جہاز سے کیوں نہیں۔" اس نے ایک سوال کیا۔

"بس ابا کو ٹرین کا سفر بہت پسند ہے۔" وہ سرہلا کر الوداعی مل کر اپنی بیٹی کے ساتھ اپنے گھر کی سمت چل پڑی۔



میں سفیان غوری۔ مجھ جیسا مغرور کوئی شخص نہیں تھا۔ زندگی میں میں نے جو کیا اپنی مرضی سے کیا' لیکن پھر ایک دن مجھے پتا چلا' درحقیقت زندگی میں سب کچھ وہ نہیں ہوتا جو ہمارے دل کی مرضی ہوتی ہے بلکہ وہ ہی ہوتا ہے جو قدرت چاہتی ہے۔ وہ جب جہاں جو چاہے بدل دیتا ہے اور ہم انسان جب اپنی من مرضی کا بدلاؤ دیکھتے ہیں تو خوش ہو جاتے ہیں ہم نے یہ مشکل معرکہ مار لیا اور جہاں ایک دم سے خیالات کی بساط لپیٹ دی جاتی ہے وہاں ہم چیخنے لگتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ہی یہ ظلم کیوں ہوا۔

میں رائنہ کو بچپن سے جانتا تھا' وہ میری کہی ان کہی ہر بات سمجھتی تھی۔ اس لیے میں نے زندگی میں ایک پلان بنایا کہ گھر بسانے کا جب بھی موقع ملا تو رائنہ سے ہی اپنا تعلق جوڑوں گا' لیکن زندگی میں پہلی بار ٹھوکر اس وقت لگی جب اچانک ہانیہ میری زندگی میں داخل ہوئی۔ سانولے رنگ کی عام نقوش والی ایک عام سی لڑکی۔ ایسی لڑکیاں گاڑی کے اندر بیٹھے بیٹھے میں نے کئی بار دیکھیں اور ہمیشہ سوچا ان لڑکیوں سے کون شادی کرتا ہو گا۔ کوئی چارم' کوئی خوب صورتی نہیں۔ میں خوب صورتی کا عاشق تھا' اس لیے ہانیہ سے میں کبھی متاثر نہیں ہوا' وہ اتوار کے اتوار ہمارے گھر آتی۔ پورا دن گھر میں اودھم مچا کر رکھتی۔ بلال اس کا معتقد تھا مگر میں اس سے بھاگتا تھا کیونکہ مجھے عام سی چیزیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔

پھر پتا نہیں کیا ہوا' وہ دلہن بنا کر میرے برابر میں بٹھا دی گئی۔ نکاح کے بعد ایک ہی جملہ میری بے بسی کا طواف کرتا رہا۔

"ایسی لڑکیوں سے کون شادی کرتا ہے۔"

اور دوسرے دن میرے کمرے کی سائیڈ ٹیبل پر نکاح کی تصویر فریم کروا کر رکھوا دی گئی تاکہ میں خود کو ہر لمحے جواب دے سکوں کہ ایسی لڑکیوں سے کون شادی کرتا ہے۔ میں مجبور ہونے والے لوگوں میں سے نہیں تھا لیکن بس میں اپنے گھر میں بدمزگی' انتشار نہیں چاہتا تھا' اس لیے میں نے یہ نکاح کر لیا تھا۔ میرا خیال تھا میں نکاح کے بعد اسے اتنا تنگ کروں گا کہ وہ خود ہی مجھے چھوڑ جائے گی اور یہ مڈل کلاس لوگ۔ ان کے اندر عزت نفس بہت ہوتی ہے۔ میرا ہدف اس کی عزت نفس اور انا کو ہی دھکا لگاتے رہنا تھا' تاکہ وہ جان سکے وہ میرے ساتھ کہیں بھی میچ نہیں کرتی۔

میرا خیال تھا میں نکاح کے بعد رخصتی کو تھوڑا لمبا لے جاؤں گا تاکہ مجھے زیادہ وقت مل جائے اور یہ لڑکی خود میرا پیچھا چھوڑ دے' رائنہ میری اس پلاننگ کا حصہ تھی۔ وہ اور میں اکثر اسے احساس کمتری کا شکار کرتے رہتے مگر وہ پتا نہیں کس مٹی کی بنی تھی' ہمیشہ خندہ پیشانی سے ہم دونوں سے ملتی۔

رائنہ کا خیال تھا مڈل کلاس لوگ نکاح کے بعد رخصتی کے لیے فوراً" زور دیتے ہیں۔ بیٹیاں ان کے لیے عذاب کی طرح ہوتی ہیں جن کو وہ جلد سے جلد اپنے سر سے اتار کر پھینک دینا چاہتے ہیں مگر ہانیہ کے گھر والوں کے رویے سے کبھی نہیں لگا کہ وہ ان کے لیے عذاب کی طرح ہے۔

رائنہ اور میں اب بھی اپنی شادی شدہ زندگی کی پلاننگ اسی شدومد سے کر رہے تھے کہ ایک دم سے زندگی نے مجھے اوپر والے خانے سے اٹھا کر نیچے رکھ دیا۔ میرا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ اسپائنل کورڈ میں نقصان کی وجہ سے میں اپنا آدھا جسم ہلا بھی نہیں پا رہا تھا۔ میں سفیان غوری جس کے ایک اشارے پر ہر کام ہو جاتا تھا' وہ ایک محتاج انسان بن گیا تھا اور وہی لڑکی اس کی مسیحائی کھڑی تھی۔ جس سے وہ دور بھاگتا تھا۔ مجھے رائنہ کا انتظار تھا۔ ہم باہر جا کر اسپائنل کورڈ کا آپریشن کروالیں گے۔ میں پھر سے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا اور اسی طرح کی بہت سی باتیں۔۔۔ مگر میری بند ہوتی آنکھیں' جو وعدہ اپنے آپ سے کرتیں دوسری صبح وہ وعدہ میرے یقین کی طرح ٹوٹا بکھرا پڑا ہوتا۔

رائنہ نہ آتی تھی' نہ فون کرتی تھی۔ مجھے لگتا تھا' مجھے ہانیہ نے ہائی جیک کر لیا ہے۔ سب سمجھتے تھے۔ ہانیہ جیسا میرا خیال رکھتی ہے' کوئی اور نہیں رکھ سکتا اور یہی بات مجھے اور چڑا دیتی۔ ہانیہ کیا جانے کہ میں سفیان غوری زندگی سے کیا چاہتا ہوں' کیسی زندگی جینا چاہتا ہوں اور کس کے ساتھ۔۔۔ مگر میں غلط تھا۔

وہ جانتی تھی میں کیا چاہتا ہوں۔ ایک دن آنکھ کھلی تو رائنہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔

"میں نہیں دیکھ سکتی تمہیں اس حالت میں۔۔۔"

"میرا ساتھ دو گی؟" میں نے پتا نہیں کیوں یہ سوال کیا۔

"تم خود سوچو' اس حالت میں میں تمہارا ساتھ کیسے دے سکتی ہوں۔ ماما پہلے ہی ہمارے رشتے کے خلاف تھیں۔ اب تو انہیں اور سولڈ ریزن مل گیا ہے۔"

"تو تم مجھے چھوڑ دو گی؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تمہیں چھوڑ نہیں رہی۔ ہمیشہ تم سے محبت کرتی رہوں گی لیکن بس تم سے شادی نہیں کر سکتی۔"

میں ہنس پڑا۔ میرا قہقہہ بہت بلند تھا۔ ہانیہ گھبرا کر کمرے میں داخل ہوئی۔ میں سنجیدہ تھا۔ رائنہ جا چکی تھی۔ اس نے میری طرف دوائیں بڑھائیں اور میں نے کہا۔

"تمہیں پتا ہے وہ ساری زندگی مجھ سے محبت کرتی رہے گی مگر مجھ سے شادی نہیں کرے گی۔"

ہانیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور میں چاہتا بھی یہی تھا کہ وہ روئے۔ وہ اس اذیت کو محسوس کرے جو رائنہ کے انکار سے میں نے محسوس کی ہے۔ میں بیڈ پر لیٹا تھا لیکن اس کی عزت نفس کو آج بھی ٹھوکر پر رکھا ہوا تھا۔ میں اذیت پسند ہو گیا تھا۔ میں اس کی محبت کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتا مگر وہ بھی چالاک ہو گئی تھی۔ وہ جان گئی تھی میں ہر اس کام کو مسترد کر دیتا ہوں جس کو کرنے کے لیے وہ مجھے مشورہ دیتی ہے' سو وہ دوسرے طریقے سے مجھ سے ہر وہ کام کروا لیتی تھی' جو عام حالت میں میں کبھی نہیں کر پاتا تھا۔ وہ مجھ جیسے ڈیل ڈول کے شخص کو وہیل چیئر پر بٹھا کر باغ میں لے جانے لگی تھی' وہ بظاہر ہواؤں سے مخاطب رہتی مگر اس کے لفظوں کی تاثیر میرے اندر اترتی رہتی۔ پھر ان ہی دنوں بلال کو نئی نئی پینٹنگ کا شوق چرایا۔ میں وہیں گارڈن میں موجود تھا۔ بلال مسلسل غلط اسٹروک لگا رہا تھا مگر میں نے ضد باندھ لی تھی کہ میں اس کی کوئی مدد نہیں کروں گا۔

لیکن پانچواں دن تھا جب وہ میری وہیل چیئر کو دھکیل کر کینوس کے قریب لے گیا۔

"بتائیں نا بھیا! اس تصویر کو کیسے ٹھیک کیا جا سکتا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم؟" میں نے کندھے اچکائے اور خود کو اس منظر سے غائب کر لیا اور تب ہی وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

"سفیان کو کیا معلوم پینٹنگ کیا ہوتی ہے۔ ان سے تو مارکیٹ کا اتار چڑھاؤ اور بزنس اپ ڈیٹس لو۔ تم بھی نا بلال ... غلط دروازہ کھٹکھٹا رہے ہو۔" اتنا کھلا طنز میرے اندر پارہ سا دوڑنے لگا۔

"بھابھی! آپ کو نہیں پتا پاپا کے بزنس میں شامل ہونے سے پہلے بھیا بہت اچھی پینٹنگ کرتے رہے ہیں۔ سولو ایگزیبیشن گروپ ایگزیبیشن اتنی تصویریں بنائیں اتنے بڑے بڑے بین الاقوامی میگزین بھیا کا انٹرویو لینے آیا کرتے تھے۔ آپ جان ہی نہیں سکتیں بھیا کس قدر لائم لائٹ بے بی ہوا کرتے تھے۔"

وہ کچھ کہنے کے بجائے پھر ہنس پڑی۔ بے اعتباری والی ہنسی۔ جیسے بلال جھوٹ بول رہا ہے۔ مجھے ایک دم غصہ آگیا اور میں بلال کی تصویر ٹھیک کرنے لگا اور آدھے گھنٹے بعد جب اس ہیجانی کیفیت سے نکلا تو حیران رہ گیا میرے اندر ایک پینٹر آج بھی زندہ تھا میں تو سمجھتا تھا اب میں زندگی میں شاید ہی کوئی کام کر سکوں گا۔

یہ بالکل ایسا ہے جیسے پہلی طلاق دے کر رجوع کرنے کا روزن کھلا رہ گیا ہو۔ میں اب بلال کی مدد سے اپنے اسٹوڈیو میں جانے لگا تھا نئے سرے سے رنگوں کی دنیا بس گئی تھی اور بیس دن بعد بلال کے ہاتھ میں ایک انویٹیشن دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔

"یہ یقیناً تمہاری کارستانی ہے۔"

"نہیں تو بھیا! یہ سب بھابھی کی محنت ہے۔ وہ ہی کہتی تھیں مصور کے اندر کا مصور کبھی نہیں مر سکتا۔ رنگ ایک بار کسی کا دامن پکڑ لیں تو کبھی ساتھ نہیں چھوڑتے کھویا ہوا مصور آخر کار دوبارہ پرانے نشانات پر پیر دھرتا واپس خود کو دریافت کر ہی لیتا ہے۔"

وہ میرے بالکل سامنے کھڑی تھی۔ مجھے غصہ نہیں آرہا تھا۔ مجھے اس کا طریقۂ واردات سمجھ میں آگیا۔

وہ شکل سے چالاک نہیں لگتی تھی مگر بہت شاطر لڑکی تھی۔

میں اس وقت اسٹوڈیو میں تھا جب وہ اندر آئی۔ میں اپنی پینٹنگ کے سامنے بیٹھا تھا ایک کھڑکی تھی۔ اس کے دونوں پٹ کھلے تھے مگر کھڑکی کے سامنے دیوار چنی گئی تھی۔ یہ سب سے بہترین اظہار تھا میرے اندر کے دکھ کا۔

"اگر اس تصویر میں دیوار کی ایک اینٹ نکال دی جائے تو تصویر زیادہ پاور فل بن سکتی ہے۔"

"تم ہوتی کون ہو مجھے مشورہ دینے والی؟" میں نے اس سے سوال کیا۔ وہ مسکرائی۔ "ایک اینٹ جسے اس دیوار میں سے آپ اگر نکال دیں تو تصویر کا تاثر ایک دم سے مکمل ناامیدی سے امید میں بدل سکتا ہے۔"

"اگر تم وہ اینٹ ہو تو میں تمہیں اپنی زندگی کی دیوار سے نکال کر باہر پھینک دینا چاہتا ہوں۔"

اس کی استقامت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ "اگر اس سے آپ کے اندر زندگی کا کوئی روزن کھل سکتا ہے تو میں کہوں گی آپ ایسا ضرور کریں۔"

میرا خیال تھا وہ میری منت کرے گی ہمیشہ کی طرح لیکن اب اس کا رویہ بدلتا جا رہا تھا۔ اس کی انا جگہ جگہ مجھ سے ٹکرانے لگی تھی۔ مجھے حیرت تھی مگر اس دن یہ حیرت بھی دور ہو گئی۔ میں بلال سے بزنس کے حوالے سے بات کرنے آیا تھا اور وہ اس کے کمرے میں تھی۔

"آپ کا رویہ ان سے کیوں بدل رہا ہے۔ پہلے تو آپ کھانے اور دوائی کے لیے کسی بھی حد تک جا کر منت کر کے کھلایا کرتی تھیں پھر اب ایسا کیا ہوا۔"

اس کی مدھم مگر صاف آواز میرے اندر گونج رہی تھی۔

"پہلے وہ مکمل طور پر ہارے ہوئے انسان تھے اور ہارے ہوئے انسان سے میں جنگ لڑتی بھی تو اسے جیت نہیں سکتی تھی کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کا اعتماد گنوایا تھا اپنی محبت کھو دی تھی۔ اس وقت دلجوئی ضروری تھی۔ دلجوئی سے ہی ان کے دل کی ان کی روح کی سرجری کی جا سکتی تھی سو میں نے ایسا ہی کیا لیکن اب وہ نارمل زندگی کی طرف واپس آرہے ہیں اس لیے میں نہیں چاہتی اپنی اس مجبوری سے ان

کے اندر کوئی بہت بڑا احساس کمتری کا دروازہ کھلے۔ اس لیے میں تمکنت سے بات کرتی ہوں کہ وہ جواباً "اس سے بھی زیادہ اپنی ذات کا دفاع کریں۔ انہیں احساس رہے کہ وہ اس حالت میں بھی مجبور نہیں۔ وہ جو چاہیں کر سکتے ہیں' اور یہ بہت اہم ہے کہ وہ اس بات کو رئیلائز کریں کہ دنیا میں کچھ بھی ایسا نہیں جو وہ نہ کر سکتے ہوں۔"

میں واپس پلٹ آیا تھا۔ جو بات وہ مجھ سے چھپانا چاہتی تھی' میں بھی اسے افشا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس دن مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں اس لڑکی کا اسیر ہوتا چلا گیا ہوں۔ اس نے مجھے کھلا آزاد چھوڑ دیا تھا مگر اپنی محبت کا نامحسوس حصار میرے گرد باندھ دیا تھا اور میں نے تسلیم کیا۔

واقعات کبھی بھی صرف نیگیٹویٹی نہیں لاتے۔ وہ ہماری زندگی میں مثبت رجحان بھی پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ہم زمین آسمان ایک کر کے رونے میں اتنے مگن ہوتے ہیں کہ اس پوزیٹویٹی کو بھی ضائع کر جاتے ہیں۔ جیسے اس مجبوری کے دنوں میں مجھے کتابیں پڑھنے کا موقع ملا تو میں سمجھ پایا کہ زندگی کے بعد کی جو زندگی ہے اس کو سنوارنے کا عمل ہمیں اسی زندگی میں شروع کرنا پڑتا ہے۔

میں جو بزنس کی وجہ سے اپنی پینٹنگ کو بالکل بھلا چکا تھا' اب پھر سے رنگوں سے کھیل رہا تھا' اور اس مجبوری کے دنوں میں ہی مجھے پتا چلا تھا۔ حقیقت میں محبت کیا ہوتی ہے۔ میں جسے محبت سمجھ کر ڈیفائن کرتا آیا تھا۔ وہ تو صرف وقت گزاری تھی' اصل محبت تو کچھ اور ہی چیز ہوتی ہے' ہانیہ نے بتایا کہ محبت کا مطلب ذمہ داری اور مشکلات سے لڑنے اور جیت جانے کا دوسرا نام ہے۔ محتاجی کے ان دنوں نے ہی مجھے سکھایا کہ ہم کچھ بھی نہیں ہیں' سب کچھ وہ ذات باری ہے جسے جہاں سے اٹھا کر جہاں لے جا کر کھڑا کر دے اور کہے کہ اپنا کردار ادا کرو تو ہم کو وہ کردار نبھانا پڑتا ہے۔ دعائیں کیا ہوتی ہیں۔ تب ہی سمجھا تھا۔ اور ایک بیٹی کیا ہوتی ہے... ماں اور بابا کے جملوں میں اس کی تعریف سن سن کر جاتا تھا۔

"مجھے بھی بیٹی چاہیے۔" میں نے دل سے دعا کی۔ حالانکہ یہ دعا صدا بہ صحرا کی طرح تھی مگر یہ دعا میرے دل میں پیدا ہوئی تو اس دعا کا سرا کہیں نہ کہیں اس رب کے ہاتھوں میں ہی تھا۔

میں سو رہا تھا' جب بلال کی آواز نے مجھے جگایا۔ وہ بہت خوش لگ رہا تھا۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیوں خوش ہے۔ تب ہی وہ میری میڈیکل فائل میرے سامنے لہرا کر بولا۔ چار سال بعد... پورے چار سال بعد بھیا! ایک ڈاکٹر آخر مل ہی گیا' جو کہتا ہے آپ کی اسپائنل کورڈ کا ایک چھوٹا سا آپریشن اور ہو گا اور آپ پھر سے چل پھر سکتے ہیں۔"

میں جو انکار اور ناامیدی سن سن کر تھک گیا تھا یکدم خوشی و حیرت میں آ گیا۔

دو ہفتے بعد ہم یو کے میں تھے۔ اس آپریشن میں کچھ بھی ہو سکتا تھا مگر میں ابھی تک اس سے اعتراف محبت نہیں کر سکا تھا۔

میں سوچتا اور لفظوں کے موزوں انتخاب میں ہار جاتا اور پھر جب میں آپریشن تھیٹر لے جایا جا رہا تھا میرے منہ سے نکلا۔

"ہانیہ! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"

ہانیہ نے میرے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ "مگر میں آپ کے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔" کتنی غیر مشروط محبت تھی اس کی... میں مسکرایا اور میں نے سوچ لیا اگر آپریشن تھیٹر سے زندہ واپس لایا گیا تو میری پوری کی پوری زندگی صرف اس لڑکی کے نام ہو گی جس سے لڑ لڑ کر میں تھک چکا تھا اور وہ مجھ سے ہار ہار کر مجھے خاموشی سے جیت چکی تھی۔



اس کے ہاتھ میں ابا کی دونوں ڈائریاں تھیں۔ ایک ڈائری پڑھ کر وہ رو چکی تھی اور اب دوسری ڈائری پڑھ کر مسکرا رہی تھی۔

"میں اپنی بیٹی سے اس لیے محبت کرتا ہوں کیوں کہ مجھے اپنے سوہنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع عزیز ہے۔ میری بیٹی میرا فخر' میرا غرور ہے۔ ہر باپ کے لیے بیٹی اتنا ہی حساس معاملہ ہوتا ہے۔ زمانے کی آنکھوں میں ڈال کر چلنے کے لیے بیٹی کا اعتبار کرنا پڑتا ہے اور بیٹی بھی اس اعتبار اور بھروسے کو اپنے آپ سے زیادہ سنبھال کر رکھے تو زندگی اس کو اس محبت کا اجر ضرور دیتی ہے۔"

اس نے صفحہ پلٹا' لکھا تھا۔

"کسی دانا کا قول ہے۔ "صبر سے رحمت کا انتظار کرو جو چیز تمہارے لیے ہے' وہ صرف تمہارے لیے ہی ہے۔ بس دیر سے آنا کسی حکمت کی وجہ سے ہوتا ہے اور اس کی حکمت بے شک تمہاری سمجھ سے بالاتر ہے۔"

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

اس نے گنگنانا شروع کر دیا کیونکہ پورٹیکو میں گاڑی کے رکنے کی آواز آ گئی تھی۔ پورٹیکو' لابی' کوریڈور اور پھر سیڑھیاں... ایک دو تین چار پانچ اور پانچ منٹ بعد دروازے کا لاک گھوما تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ان کی بیٹی اپنے باپ کی گود میں تھی اور بہت خوش تھی۔ عائشہ کو اس نے اس کی گود میں ڈال دیا تھا۔

"تمہاری بیٹی نین نقش میں ہی نہیں' مزاج میں بھی مجھ پر چلی گئی ہے۔" سفیان غوری ہراساں تھا۔ "تمہیں بہت مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔"

وہ مسکرائی تھی۔ "میرے پاس نسخۂ کیمیا ہے۔ مجھے پتا ہے۔ مجھے کوئی مشکل نہیں پڑنے والی۔" اس نے دراز میں سب سے پہلے خانے میں رکھے قرآن پاک کو دیکھا۔

سفیان غوری نے اس کے ہاتھ سے ڈائریاں چھین لیں۔ وہ پڑھتا جاتا اور ہنستا جاتا۔ "تمہارے ابا تو بڑے چالاک ہیں' ڈپٹی نذیر احمد کی طرح اتنا بڑا پلندہ دیا تھا مجھ بے چارے کو قابو کرنے کے لیے۔"

وہ ہنس کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ گارڈن میں اس کی بیٹی اور جیا کی بیٹی ایک ساتھ کھیل رہی تھیں۔ بیٹیاں سانجھی ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر لوگ یہ نہیں مانتے۔

سفیان غوری نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"میری خوش نصیبی ہو تم۔"

اس نے آج بھی محبت کا ذکر نہیں کیا تھا' کیونکہ وہ جانتا تھا محبت کا ذکر نہ بھی کیا جائے تب بھی محبت اس کی ذات کا سب سے بڑا حوالہ رہتی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اس لڑکی سے مل کر ہی تو جانا تھا کہ ہار کر جیتنا مشکل ضرور ہے مگر دریا ہے۔ رشتوں کی ڈور کو مضبوطی سے باندھے رکھنے کے لیے۔

ہانیہ نے پوری طرح اسے آزادی دی تھی کہ وہ من مانی کر سکے۔ سفیان غوری کی آنکھیں لو دے کر جل اٹھی تھیں۔ جو عکس اس کے دل میں تھا وہی عکس اس کی بانہوں میں سمٹا ہوا تھا۔ وہ خوش نصیب تھا... واقعی خوش نصیب کہ زندگی نے اسے ایک موقع دیا بدلنے کا اور وہ واقعی بدل بھی گیا۔

اگر اس دن ہانیہ یہ نہ کہتی۔ "اس پر سختی کرو تاکہ اسے پتا چلے کہ تم اس کا کتنا خیال رکھتی ہو تو شاید میں کبھی نہ جان سکتی' وہ مجھ پر کتنا مہربان ہے۔ میں بے معنی باتوں پر خود کو ہلکان کرتی' مظلومیت کی چادر میں لپیٹ کر زندگی سے دور ہوتی جا رہی تھی اور آج جب سے میں نے چھوٹی بڑی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کرنا سیکھا ہے۔ تب سے مجھے اپنی زندگی ناپسندیدہ نہیں لگتی۔ ہم بڑی بڑی خوشیوں کا انتظار کرتے ہیں اور اپنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنی زندگی سے نکال باہر کر دیتے ہیں۔

مگر اب زندگی کو ترتیب دینے کا ہنر آنے لگا تھا اور میں اس راستے پر چلتے چلے جانا چاہتی تھی۔

جیا نے مسکرا کے کھیلتی بچیوں کو دیکھا اور کچن کی سمت بڑھ گئی۔ وہ یہاں انیکسی میں رہتی تھی۔ اس کا شوہر پہلے سے بہتر کمانے لگا تھا اور ہانیہ کے ساتھ مل کر گھر سنبھال رہی تھی۔ ہانیہ نے اسے کیئر ٹیکر کے طور پر رکھ لیا تھا۔ وہ ہانیہ کے ساتھ پھر سے پڑھنے لگی تھی کیونکہ وہ جان گئی تھی' علم سیکھنے سے ہی وہ زندگی کو سمجھ سکتی تھی۔

☆

آمنہ ریاض

ماہِ تمام

باقر لودھی اپنے منجھلے بیٹے تقی کی غیر ذمہ دارانہ طبیعت سے سخت نالاں ہیں اور اسے ہر وقت ہڈ حرامی کے طعنے دیتے رہتے ہیں۔ تقی کو شوبز میں کام کرنے کا شوق ہے جبکہ لودھی صاحب اس کام کے سخت مخالف ہیں۔ دونوں باپ بیٹے میں اکثر جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ رضی اور جری سے البتہ باقر صاحب کو کوئی شکایت نہیں۔

شفا کو عمیر نے والدین کے بعد باپ بن کر پالا ہے۔ وہ عمیر کی بے حد لاڈلی ہے مگر عمیر کی بیوی ساحر کو اس سے شدید جلن ہے۔ وہ عمیر سے جھوٹ بول کر اسے شفا سے بدظن کرنے کی کوششیں کرتی رہتی ہے۔ عمیر کو اپنی بیوی پر پورا یقین ہے۔

ساحر اور عمیر کی شادی کے ابتدائی دنوں میں شفا ساحر سے بہت بدتمیزی کیا کرتی تھی۔ وہ اسے ہر وقت عمیر کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرتی اور جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر اسے عمیر سے ڈانٹ پڑوا دیتی۔ رات کے کھانے پر پاستا نہ بنانے پر اس نے ساحر سے بدلہ لینے کا ارادہ کیا اور سیڑھیوں سے حادثاتی طور پر گر جانے کا الزام ساحر پر لگا دیا کہ ساحر نے اسے دھکا دیا ہے۔ اس بات پر عمیر، ساحر کو دو تھپڑ مار دیتے ہیں۔ ساحر کو بہت دکھ ہوا ہے۔ شفا خود بھی گنگ ہو جاتی ہے۔

تقی کے گہرے دوست سمیر کے ابا اپنی پسند سے اس کی منگنی کر دیتے ہیں۔

شفا عمیر کو ساری بات بتا کر ان سے اور ساحر سے اپنی پچھلی تمام باتوں پر معافی مانگ لیتی ہے۔ عمیر اسے معاف کر دیتے ہیں مگر ساحر، شفا سے بیر باندھ لیتی ہے اور غلط بیانی کر کے دونوں بہن بھائی میں غلط فہمیاں پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی طرح وہ عمیر کے منع کرنے کے باوجود جھوٹ بول کر شفا کو کالج ٹرپ پر بھجوا دیتی ہے۔



کاسٹنگ ڈائریکٹر جاثم تقی کو اپنے ڈرامے میں لیڈنگ رول کی آفر کرتا ہے۔ تقی اپنے ابا کی وجہ سے تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔

تقی اور سمیر بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ مری جاتے ہیں اور اسی ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرتے ہیں، جہاں شفا کا گروپ ٹھہرا ہوتا ہے۔ وہاں سمیر کو ثمر پر اپنی منگیتر کا گمان ہوتا ہے۔ ٹرپ کے دوران دونوں گروپوں کے درمیان ہلکے پھلکے ٹاکرے ہوتے رہتے ہیں۔ اور باقاعدہ منگنی پر دونوں کو پتا چلتا ہے کہ وہ واقعی ثمر ہے۔ وہ دونوں منگنی تو کر لیتے ہیں مگر سخت غصے میں ہوتے ہیں۔ منگنی کے بعد سمیر ٹرپ کے دوران مذاق میں کہی شفا کی بات کہ "ثمر کا نکاح ہو چکا ہے" اپنی ماں کو بتا کر منگنی توڑ دیتا ہے۔ ثمر کے والد شکیل صاحب سمیر کے والد سے سخت ناراض ہو جاتے ہیں۔ ثمر کی والدہ یہ جان کر کہ ثمر کے نکاح کی افواہ شفا نے اڑائی ہے۔ وہ شفا سے خفا ہو جاتی ہیں۔ ساہر انہیں مزید بھڑکاتی ہے۔ ساہر اور عمیر تقی سے مل کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ مہک، تقی کا پورٹ فولیو بنوا لیتی ہے۔ تقی کو آفرز آنے لگتی ہیں۔ وہ ایک دو کمرشلز میں کام کر لیتا ہے۔ رضی کی بدولت مہک کے والد سے باقر لودھی کی ملاقات ہوتی ہے اور وہ تقی کے لیے مہک کو پسند کر لیتے ہیں۔ جری کے میڈیکل میں ایڈمیشن ہونے کی خوشی میں باقر لودھی ایک چھوٹی سی تقریب کرتے ہیں۔ انہیں تقی کے شوبز جوائن کرنے کی خبر مل جاتی ہے۔ وہ بھری محفل میں اسے سخت بے عزت کرتے ہیں اور چھڑی سے مہمانوں کے سامنے خوب پٹائی لگاتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں۔

ساتویں قسط

آسمان تاریک تو تھا، لیکن شہر کی جلتی ہوئی روشنیوں نے اس کے جوبن کو ماند نہ ہونے دیا تھا۔ وہ کہیں رکا، کہیں چلا اور کہیں تھک کر بیٹھ گیا۔ کبھی سر اٹھا کر خود پر جھکے آسمان کو دیکھتا اور آنکھیں رگڑ رگڑ کر بے بسی سے اپنے بال مٹھیوں میں جکڑ لیتا۔ مایوسی تھی کہ رگ جاں کو کاٹتی تھی۔ ایک وحشت تھی جو سر میں سمائی تھی۔

اسے ہمیشہ یہی لگا کہ ابا اسے ناپسند کرتے ہیں لیکن دراصل وہ نفرت کرتے ہیں۔۔۔ یہ اس نے آج جانا تھا۔ بھری محفل، جانے انجانے کتنے احباب۔ ذرا سی بات پر باپ بیٹے کو اس طرح پیٹ سکتا ہے، یہ آج ہی سنا تھا، آج ہی دیکھا تھا۔

وہ بھی گھر سے نکل آیا۔ ماں کی التجائیں بھائی کی لجاجت نہ سنی۔ بس چل پڑا۔ پتا نہیں کہاں کہاں کی خاک چھانی۔ دل تھا کہ پھر بھی تڑپنے سے باز نہ آیا۔ کہتا تھا مر جاؤ۔ اتنی تذلیل سہہ کر زندہ رہو گے تو لعنت ہے ایسی زندگی پر۔

کچھ وہ خرد سے لڑتا جھگڑتا چل رہا تھا، کچھ سامنے والا بھی جلدی میں تھا۔ دوسری طرف سے آتی گاڑی اس زور سے اس سے ٹکرائی کہ وہ ضرب کھائی گیند کی طرح ہوا میں اچھلا اور دور جا گرا۔

آوازیں اس کے گرد مکھیوں کی بھنبھناہٹوں کی طرح جمع ہو رہی تھیں۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس کے ذہن نے جو چہرہ دکھایا، وہ اس کی ماں کا تھا اور آنکھوں نے خود پر جھکے ہوئے جس چہرے کو دیکھا وہ عمیر کا تھا۔



"ابا نے مجھے مارا اور دھکے مار کر گھر سے نکال دیا۔ آپ مجھے کیوں لے آئے عمیر بھائی! وہیں سڑک کے کنارے پڑا رہنے دیتے۔ مر جاتا تو ابا کو سکون آ جاتا۔"

تقی روٹھے بچے کی طرح بول رہا تھا۔ وہ انتہا درجہ کی قنوطیت کا شکار تھا۔ ماتھے کے گرد پٹی بندھی تھی۔ ابا کی مار کے نشان چہرے پر تھے۔ گاڑی کی ٹکر سے صرف سر پھٹا۔ اندرونی چوٹیں بھی تھیں لیکن شکر ہے وہ شدید نہیں تھیں۔ ڈاکٹر نے کہا تھا، تین چار دن کے بیڈ ریسٹ سے مکمل صحت یاب ہو جائے گا۔ گو کہ وہ راضی نہیں تھا، لیکن عمیر زبردستی گھر لے آئے۔

اب وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ بیڈ پر لیٹنے کو بھی راضی نہیں۔ ایک ہی ضد تھی کہ اسے جانے دیا جائے۔ اس پر ساہر کے احمقانہ سوال۔

"مجھے تو یقین نہیں آ رہا تقی! کیا واقعی ابا نے تمہیں مارا ہے۔" وہ رنج اور بے یقینی سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد پوچھتی۔ اب کے تقی چڑ گیا اور سنجیدگی سے بولا۔

"نہیں۔۔۔ انہوں نے مجھے مارا نہیں۔ ان کی چھڑی اچانک اڑتی ہوئی آئی اور خود بخود مجھ پر برسنے لگی۔ اس چھڑی نے مجھے اتنا مارا کہ میں اٹھنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ پھر ابا مجھے بصد احترام گیٹ سے باہر چھوڑ گئے اور انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ وہ اپنے چھوٹے سے گھر کو اس قابل نہیں سمجھتے کہ مجھ جیسے عظیم اداکار کو وہاں رہنے دیں، اس لیے میں ان پر احسان کروں اور خود ہی چلا جاؤں۔"

ساہر کا منہ کھل گیا۔ "کیا واقعی؟"

"ساہر! اب بس کر دو۔ تقی بے چارے کو آرام کی ضرورت ہے۔ تم مسلسل اس کا دماغ کھا رہی ہو۔" عمیر نے سنجیدگی سے کہا۔ "جاؤ اس کے لیے کچھ کھانے کا بندوبست کرو۔"

"نہیں عمیر بھائی! مجھے کچھ نہیں کھانا۔ آپ مجھے جانے دیں۔"

"تم بولنا تو بند کرو یار! جتنا خاموش رہو گے اور تھکے گے اتنی جلدی یہ زخم ٹھیک ہو گا۔" عمیر نے محبت سے اسے ڈپٹا۔

"عمیر ٹھیک کہہ رہے ہیں، تمہیں آرام کی ضرورت ہے، سو آرام کرو۔ ویسے بھی اب جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ میں تمہیں کہیں جانے نہیں دوں گی۔" ساہر نے کہا۔

"میں ساہر! تم لوگوں کا شکریہ کہ مجھے لے آئے، بے یار و مددگار سڑک پر پڑا نہیں رہنے دیا، لیکن یہاں رہنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ میں اپنا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔"

"اچھا ذرا ہم بھی تو سنیں، وہ کون سا بندوبست ہو گا۔" ساہر نے جل کر کہا تھا۔ "سمیر کا تو تم خود بتا چکے ہو کہ اس کے ابا بھی خفا ہیں، اس لیے اس کے یہاں جا کر رہنا تو ممکن نہیں اور میرا نہیں خیال کہ کوئی اور اتنا گہرا دوست ہو گا جس کے گھر تم ٹھہر سکو، پھر دو تین ایڈز کر کے ابھی تم اتنے امیر تو ہوئے نہیں کہ کسی ہوٹل میں ہی کئی دن اسٹے کر سکو۔۔۔ پھر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

اتنی صاف بات پر تقی شرمندہ سا ہو گیا۔

"بہن کے گھر بھائی کتنا ہوتا ہے۔۔۔ یہ سنا ہے کبھی۔" اس نے برجستگی سے کہا۔ عمیر کا قہقہہ زبردست تھا۔

"ایک بات طے ہے تقی! تم ہر حال میں باتیں دلچسپ کرتے ہو لیکن اس کامپلیمنٹ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم یہاں سے جانے کی باتیں کرو۔ رہنا تو تمہیں یہیں پڑے گا۔" عمیر کا دھونس بھرا رویہ۔ تقی کی مزاحمت دم توڑنے لگی۔

"سوچ لیں عمیر بھائی! مہمان تین دن کا ہوتا ہے میرا کوئی پتا نہیں، مستقل ٹھکانا کب ہاتھ لگے۔ پھر نہ نوکری ہے، جیب سے بھی میں بالکل کنگلا ہوں۔ ایسا نہ ہو، آپ کو جان کا عذاب لگنے لگوں۔" اس نے صاف گوئی سے کہا۔

"تم صرف دلچسپ باتیں نہیں کرتے۔ کبھی بونگیاں بھی مارتے ہو۔ جب ہم کہہ رہے ہیں یہاں رہو تو رہو۔ میری نہ سہی، یہ تو دیکھو تمہاری بہن کی بھی یہی خواہش ہے۔"

"ایسے مجھے مناسب نہیں لگ رہا۔"

"بھئی، تم تو ضدی بھی بے حد ہو۔" عمیر کا انداز کچھ بے تکلف، کچھ استحقاق بھرا تھا۔

"اچھا ایسا کرنا جب برسر روزگار ہو جاؤ تو کرایہ ادا کر دینا۔۔۔ کیا کہتے ہو؟"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" تقی نے سوچ کر سر ہلایا۔ اس دوران سماہر خاموش ہی رہی، لیکن اس جملہ پر فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اب بس کوئی بحث نہیں ہوگی۔ میں تمہارے لیے یخنی بنا کر لاتی ہوں اور پلیز تم لیٹ جاؤ۔"



"عمیر! میں آپ سے تقی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہی تھی۔" بہت سوچنے کے بعد سماہر نے رات گئے جھجکتے ہوئے یہ موضوع چھیڑا تھا۔ عمیر سونے کے لیے لیٹ رہے تھے، انہوں نے گردن موڑ کر عادل کو تھپکتی سماہر کو دیکھا۔

"کہو۔"

"میں کافی دیر سے آپ سے بات کرنا چاہ رہی تھی لیکن۔۔۔ دراصل میں کیفیوژ تھی، سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیسے بات شروع کروں۔"

"سماہر! جو بھی بات ہے، اسے ٹو دا پوائنٹ کرو۔ اتنی لمبی چوڑی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت ہے اور ویسے بھی شادی کے اتنے سال ایک ساتھ گزار کر اتنا تو تمہیں پتا چل جانا چاہیے کہ میرے سامنے کون سی بات کرتے ہوئے تمہیں جھجکنا چاہیے اور کون سی نہیں۔" ان کا انداز ہمیشہ ایسا ہی دو ٹوک ہوتا تھا۔

"ویسے تم نہ بھی کہو تو مجھے آئیڈیا ہے کہ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو۔۔۔ یہی نا کہ تمہارا بھائی چند دن رکے گا پھر چلا جائے گا وغیرہ وغیرہ۔"

"نہیں۔۔۔" سماہر کا منہ ہی کھل گیا۔ "آپ کو کیسے پتا چلا؟"

عمیر اس کی بات پر خفیف سا ہنس دیے۔

"تمہیں جاننے کا دعوا ایسے ہی نہیں کرتا میں۔ خیر اس معاملے میں تم بے فکر رہو، تقی کا جب تک کوئی مناسب بندوبست نہیں ہو جاتا، وہ یہاں رہ سکتا۔ مجھے اس کے رہنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"آپ کو اعتراض نہیں ہوگا، میں جانتی ہوں لیکن میں سوچ رہی تھی، شفا کی وجہ سے آپ کچھ ان سیکیورٹی فیل نہ کریں اور پھر اگر شفا نے اعتراض کیا تو۔۔۔"

"میں تمہیں ایک بات بتاؤں سماہر! تم کتنی بھی بڑی ہو جاؤ، کچھ باتیں تم ہمیشہ احمقانہ کرتی رہو گی۔" عمیر نے کسی قدر سنجیدگی سے کہا تھا۔ "شفا کیوں اعتراض کرے گی جبکہ تقی کو یہاں ٹھہرانے کا فیصلہ میرا ہے۔ بے شک وہ تمہارا بھائی ہے لیکن کوئی رشتہ اس کا مجھ سے بھی ہے، پھر میں مانتا ہوں شفا تمہارے معاملے میں کچھ اور طرح کے خیالات رکھتی ہے لیکن ایک بات طے ہے، مہمان نوازی ہمارے خون میں شامل ہے۔ وہ کبھی اعتراض نہیں کرے گی۔ اور جہاں تک بات رہی ان سیکیورٹی کی تو میں تقی کو جانوں یا نہ جانوں، اپنی بہن کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہیں کرے گی جس سے اس کی عزت پر حرف آئے۔ تم برائے مہربانی اپنی چھوٹی سی عقل پر کم ہی زور دیا کرو۔ جب بھی کرو گی نرالی بات ہی کرو گی۔" وہ اس کی بات پر اچھا خاصا برا مان گئے تھے۔

"سوری عمیر! آپ میری بات کو بہت غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں آپ کو ہرٹ کرنا ہرگز نہیں چاہتی تھی لیکن۔۔۔"

"بس کرو۔ مجھے نیند آرہی ہے۔" عمیر نے بات ختم کرکے آنکھوں پر بازو رکھ لیا تھا۔ ان کا لہجہ خاصا نرم تھا، سو سماہر مطمئن ہو گئی۔



تقی اور شفا کی ملاقات اگلے دن تو نہیں ہو سکی۔ تقی کو ڈاکٹر نے مکمل بیڈ ریسٹ کی ہدایت کی تھی اور سماہر ڈاکٹر کی ہدایت پر پوری طرح عمل کروا رہی تھی گو کہ تقی ایک دن ہی بیڈ پر گزار کر اکتا گیا تھا۔ امی کہتی تھیں، اس کے خون میں کوئی ایسا عنصر شامل ہے کہ وہ زیادہ دیر ایک جگہ ٹک کر بیٹھ ہی نہیں سکتا اور یہ سچ ہی تھا۔ اسے بے چینی ہونے لگتی تھی لیکن اس بار اکتانے کے باوجود وہ کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ ایک تو یہ کہ ابا کے اس حالیہ رویے نے اسے اچھا خاصا مایوس کر دیا تھا۔ دوسرے گھر بھی پرایا تھا۔ تیسری سب سے بڑی وجہ اندرونی چوٹیں اپنا اثر بھی دکھانے لگی تھیں، لہٰذا سماہر اور عمیر بھائی کی باتوں پر عمل کر رہا تھا۔

شفا کو عمیر اور سماہر دونوں کی زبانی سماہر کے بھائی کے ایکسیڈنٹ اور آمد کے متعلق پتا چل گیا تھا۔ اسے کسی کی آمد پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا بلکہ اسے تو خوشی تھی کہ سماہر کے گھر سے کوئی رہنے کے لیے آیا ہے۔ آج کل وہ اپنی پڑھائی پر دھیان دے رہی تھی۔ پچھلا سمسٹر اس نے ذرا کم گریڈز کے ساتھ پاس کیا تھا، اس بار وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ ثمر لوگوں نے جب سے گھر تبدیل کیا تھا، اس سے ملاقات نہ ہو پائی تھی۔ کالج میں امتحان قریب ہونے کی وجہ سے حاضری کافی کم ہو گئی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کالج جاتی تو ثمر چھٹی پر ہوتی۔ یا ثمر جاتی تو وہ نہ آپاتی۔

وہ اس سے ملاقات نہ ہو پانے کے سلسلے کو محض اتفاق سمجھ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ ثمر کی امی نے ثمر کو شفا سے رابطہ رکھنے سے سختی سے منع کر رکھا ہے۔

"اتنا بڑا جھوٹ بول کر شفا نے تمہارا رشتہ تڑوا دیا اور تم ابھی بھی اس سے دوستی رکھنا چاہتی ہو۔ آفرین ہے بھئی تم پہ۔" ثمر کی امی نے ایک ہی جملے سے شفا کے حق میں دیے تمام دلائل پر پانی پھیر دیا تھا۔

"امی! ایک بات تو طے ہے، شفا جھوٹ نہیں بولتی۔ سمیر سے شادی تو میں نے تب بھی نہیں کرنی تھی۔ اگر اس کے جھوٹ کی وجہ سے ہی رشتہ ختم ہوا ہے تو یہ تو ایک طرح سے اچھا ہی ہوا نا۔"

"مجھے بے تکے دلائل مت دو، میں نے کہہ دیا، سو کہہ دیا۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے شفا نے ایسی کوئی بات نہ کی ہو۔" اس نے پھر رسان سے کہا۔

"تمہارے خیال میں سماہر نے جھوٹ بولا ہے؟ وہ ایسا کیوں کرے گی؟"

"آپ سمجھ لیں، انہیں جھوٹ بولنے کی عادت ہے۔"

"شفا کو جسٹی فائی کرنے کے لیے سماہر کو جھوٹا مت کہو۔۔۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ اچھی طرح جانتی ہوں، کون سچا ہے، کون جھوٹا ہے۔"

ثمر کے پاس انہیں قائل کرنے کے لیے سو دلائل تھے لیکن انہوں نے اس کی منگنی ٹوٹنے کا بہت اثر لیا تھا اور چونکہ زخم ابھی نیا نیا تھا۔ اس لیے وہ جانتی تھی بھرنے میں بھی وقت لگائے گا، سو وہ بھی صحیح وقت کا انتظار کرنے لگی۔ یوں بھی آج کل وہ بہت مصروف تھی۔ امتحان سے فارغ ہوتے ہی انٹرن شپ کے لیے ایک مناسب ادارہ تلاش کرنا بھی ایک وقت تھی اور آج کل وہ ان ہی معاملات میں الجھی ہوئی تھی۔



تقی پانی پینے اٹھا تھا۔ سماہر رکھنا بھول گئی تھی۔ وہ اندازے سے کچن کی طرف آگیا۔ لیکن اندر سے آتی مبہم سی آواز نے اس کے قدم روک لیے تھے۔ اس نے کان لگا کر سننا چاہا لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آیا تب اس نے ذرا سا اندر جھانکا۔ ایک لڑکی فون پر بات کر رہی تھی غالباً" یہ سماہر کی نند تھی جس کا ذکر امی نے بھی کیا تھا۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی لگ رہی تھی۔ تقی کو یوں کھڑے ہونا مناسب نہیں لگا تو واپس آگیا لیکن لیٹتے کے ساتھ ہی اسے خیال آیا تھا کہ وہ اس لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہے۔ فوری طور پر اسے یاد نہیں آیا، وہ اسے کہاں دیکھ چکا ہے، یہی سوچتے ہوئے وہ سو گیا۔

اگلی صبح وہ ضد کر کے ناشتے کے لیے ڈائننگ ٹیبل پر آگیا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا، تم یوں ٹرے سجا سجا کر میرے لیے لاؤ۔ میں بھی وہیں عمیر بھائی کے ساتھ ناشتا کر لوں گا۔" تقی نے سماہر سے کہا اور باہر آکر عمیر سے باتیں کرنے لگا۔ عمیر آفس کے لیے نکل رہے تھے کہ شفا کچن سے نکلی۔ اس کے ہاتھوں میں دھلے ہوئے شیشے کے برتنوں کی ٹوکری تھی۔

"آؤ شفا! یہ تقی ہے ساہر کا تایا زاد بھائی اور تقی! یہ میری چھوٹی بہن ہے شفا۔" جوں ہی ان دونوں کی نظر ایک دوسرے پر پڑی، شفا بے دھیانی میں تھی، اس کے ہاتھ سے ٹوکری چھوٹ گئی اور سارے برتن اس کے پیروں میں گر کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔ ایک دھماکا ہوا اور پھر سناٹا چھا گیا۔

"اوہو شفا! تم فوراً" سائیڈ پر ہو جاؤ، کہیں تمہیں کانچ لگ نہ جائے۔" ساہر نے فکر مندی سے کہا۔ "میں زرینہ سے کہتی ہوں آ کر یہ سب سمیٹ لے گی۔"

"میں تو نکل رہا ہوں بھئی۔ اچھا تقی! شام کو ملاقات ہوگی۔" عمیر کو جاتے جاتے کچھ یاد آیا۔ "ساہر! میں گاڑی اسٹارٹ کر رہا ہوں، تم بیڈ روم سے میرا لیپ ٹاپ تو لے آؤ۔"

وہ دونوں آگے پیچھے باہر نکل گئے تب شفا نے سہولت سے اسے گھورا۔

"تم جیسا بدتمیز لڑکا ساہر بھابھی کا بھائی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس بات پر یقین نہیں آرہا۔"

اس قدر بے تکلفی کا مظاہرہ کہ پہلی ہی ملاقات میں طنز جڑ دیا۔ ابھی وہ اس بات پر پوری طرح حیران بھی نہیں ہو پایا تھا کہ شفا کی آواز سنتے ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔

"اوہ۔ مری ریسٹ ہاؤس... میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ تمہاری شکل مجھے جانی پہچانی کیوں لگ رہی ہے۔" تقی نے ہتھیلی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں تو تمہیں پہلی نظر میں ہی پہچان گئی۔" شفا نے جل کر کہا۔

"تو اس میں تمہاری یادداشت کا تو کوئی کمال نہیں ہے۔ میری پرسنالٹی ہی ایسی شاندار ہے کہ جو ایک بار مل لے پھر وہ بھول ہی نہیں پاتا۔" تقی نے اترا کر کہا اور اس طرح سے بولتا وہ شفا کو پچھلی بار سے زیادہ برا لگا تھا۔

"تم سے ملاقات ہوئی تھی کوئی نہ کوئی الٹا کام تو ہونا ہی تھا۔" اس نے بے چارگی سے ٹوٹے برتنوں کو دیکھا۔

"نہیں نہیں... اپنی فیلنگز چھپانے کے لیے تمہیں جھوٹ بولنے کی ہرگز بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایں... " وہ سمجھی نہیں۔ "کیا مطلب؟"

"سیدھی سی بات ہے مجھے دیکھ کر تمہیں اتنی خوشی ہوئی کہ خوشی سے تمہارے ہاتھ کانپنے لگے اور ٹوکری چھوٹ گئی۔" اس نے مزے سے کہا۔

"بہت ہی اوور کانفیڈنٹ ہو۔" وہ چڑ کر کہتی واپس جانے کے لیے مڑی تب ہی تقی نے اسے پکار لیا۔

"اچھا سنو۔ وہاں مری میں جو کچھ ہوا، وہ محض اتفاق تھا اور چھوٹا سا مذاق۔ میں پہلے ہی اس کے لیے ایکسکیوز کر چکا ہوں۔ تو پلیز تم عمیر بھائی یا ساہر سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔" اس نے سنجیدگی سے اور قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہ کروں۔" شفا نے ترنت کہا۔ "میں تو انہیں ضرور بتاؤں گی۔ آخر انہیں بھی پتا تو چلے کیسے فضول انسان کو انہوں نے اپنے گھر میں رکھ لیا ہے۔" اس کا لہجہ اچھا خاصا بے مروت تھا۔ تقی کے تلووں لگی سر پہ بجھی۔ وہاں مری میں شفا کے خیالات سن کر وہ اسے کچھ "عقل والی" لگی تھی۔ ابھی اس ایک جملے سے۔ سارا اثر زائل ہو گیا۔

"مرضی ہے تمہاری۔ ورنہ اس میں بھی تمہارا ہی فائدہ تھا۔" وہ بھی اکڑ کر بولا۔ "میں تو یہاں بطور پے انگ گیسٹ رکا ہوا ہوں۔ جاتے جاتے سارے ڈیوز کلیئر کر کے جاؤں گا لیکن ساتھ ہی میں انہیں یہ بھی بتاؤں گا کہ تم رات کو چھپ چھپ کر فون پر کسی سے باتیں کرتی ہو۔"

شفا کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا، وہ سرعت سے پلٹی۔

تقی اطمینان سے بیٹھا پیر جھلا رہا تھا اور بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ شفا جو کوئی جھوٹ بولنے کے لیے پر تول ہی رہی تھی اس کی ایسی جانچتی نظروں سے خائف ہو گئی۔

"نہیں۔۔۔ میں روز بات نہیں کرتی۔ کل تو میں اسے ڈانٹ رہی تھی۔" وہ منٹوں میں پہلی پڑ گئی۔

"اوہ پلیز! اب میری منتیں مت شروع کر دینا۔ میں تو یہ بات عمیر بھائی کو ضرور بتانے والا ہوں۔" وہ اسے بالکل بچوں کی طرح چڑانے لگا تھا اور شفا کا بس نہ چلا کہ ابھی رو دے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، تقی کو اس کی شکل دیکھ کر ترس آگیا اور سچ بات ہے ہنسی بھی۔ وہ کس قدر بے وقوف تھی، ورنہ کیا مشکل تھا کہ ایک منٹ میں تقی کو رد کر دیتی۔ گو کہ وہ محض اسے چڑا رہا تھا، اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ عمیر بھائی یا ساہر کو بتائے کیونکہ عمیر بھائی تقی کی بات پر اپنی بہن کی بات سے زیادہ یقین تو نہ کرتے نا۔

"توئے زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے تو کچھ سنا ہی نہیں تھا۔ بس ڈرا رہا تھا۔"

شفا کی پانی بھری آنکھوں میں غصہ اتر آیا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے تقی کو گھورا اور پلٹ کر جانے لگی۔

"لیکن یاد رکھنا! تم نے اس بات کا ذکر کیا تو میں اپنی طرف سے کوئی بات بنا کر تمہارے بھائی کو بتا دوں گا۔"

اس نے دھمکانا مناسب سمجھا۔ لڑکیوں کی الٹی کھوپڑی کا کیا پتا، کس وقت گھوم جائے۔

"شکل سے ہی پھاپھا کٹنی لگتے ہو۔" وہ پھاڑ کھانے کو دوڑی۔

اس طعنے سے اگر زنانہ پن نکال دیا جاتا تو شاید تقی کو اتنا اعتراض نہ ہوتا۔ اس نے نخوت سے سر جھٹک دیا۔



سمیر ساہر کی اجازت سے اس سے ملنے آیا تھا۔

"تم ایٹ لیسٹ آنٹی کو تو بتا دو کہ تم کہاں ٹھہرے ہوئے ہو۔ سب لوگ بہت پریشان ہیں تمہارے لیے۔" وہ فکر مندی سے تقی کو دیکھ رہا تھا۔

"ہاں امی کو فون کروں گا میں۔"

"میں نے تجھے سمجھایا تھا تقی! ابا کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کرنا۔۔۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے صحیح کیا، لیکن جس طرح کا ان کا مزاج ہے، ان کا ری ایکشن یہی ہونا تھا۔" سمیر نے کہا۔

تقی سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے کچھ نہ کہا نہ سر اٹھایا۔

"سمیر! مجھے نوکری چاہیے۔" چند منٹ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔

"ہاں اچھا یاد دلایا۔" سمیر نے کہا۔ "ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں فائنانس کی کچھ ویکنسیز نکلی ہیں۔ میں نے تمہاری سی وی فارورڈ کر دی تھی۔ دو روز بعد انٹرویو ہے۔ تمہاری طبیعت اجازت دے تو چلے جانا۔ اس کمپنی کا سی ای او ابو کا پرانا جاننے والا ہے۔ میں ابو سے کہوں گا، وہ اس سے بات کرلیں گے۔"

تقی نے سر ہلا دیا۔

"تمہارے ابو کی ناراضی ختم ہوئی؟"

سمیر نے بچوں کی طرح منہ لٹکا کر نفی میں سر ہلا دیا۔

"میرا خیال ہے "ابووں" کے ناراض ہونے کا سیزن چل رہا ہے۔" تقی نے خفیف سا ہنس کر کہا۔

"غلطی میری ہے یار! میں نے اس معاملے کو بہت خراب طریقے سے ہینڈل کیا۔ سب ٹھیک کرنے کے چکروں میں میں اسے خراب کرتا چلا گیا۔ اگر وہ لڑکی شادی شدہ تھی یا طلاق یافتہ یا کچھ بھی۔۔۔ تو کسی نہ کسی طرح بات کھل ہی جاتی، مجھے کیا ضرورت تھی اماں کے کان بھرنے کی اور اماں نے بھی ایک فساد کھڑا کر دیا۔ ابو تو بہت شرمندہ ہیں، لیکن شکیل انکل ان کی کوئی بھی بات سننے پر راضی نہیں ہیں۔ وہ کہتے ہیں، کان میں بات پڑ جانا ایک الگ بات ہے، لیکن اماں نے بغیر تصدیق کیے ثمر پر کیچڑ اچھالی ہے۔ اماں شروع سے اس رشتے کے خلاف تھیں، رہی سہی کسر میری بکواس نے پوری کر دی۔ پتا نہیں کتنے سخت لفظوں میں بات کی انہوں نے کہ شکیل انکل کچھ سن ہی نہیں رہے۔"

"تو اس میں اتنا منہ لٹکانے کی کیا بات ہے۔" تقی نے کہا۔ "تمہارا طریقہ غلط سہی لیکن چاہتے تو تم یہی تھے نا کہ ثمر سے رشتہ نہ ہو۔"

"چاہتا تو یہی تھا۔" وہ متذبذب ہوا۔

"تقی! اتنا کچھ ہونے کے باوجود مجھے لگتا ہے ثمر میرے دل سے نکلی نہیں۔ شاید مجھے سچ مچ محبت ہو گئی ہے۔ میں اکثر اس کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ یہ دیکھو، میں نے اس کی تصویریں بھی ڈویلپ کروا کے رکھی ہیں۔ گھر میں کسی کو نہیں پتا۔ پتا چلا تو میری بڑی کلاس ہوگی۔" وہ سر جھکائے خفا خفا سا بول رہا تھا۔ ساتھ ہی جیب سے نکال کر ایک لفافہ بھی اس کے سامنے رکھ دیا۔

تقی نے تصویریں نکال کر دیکھیں۔ کچھ ثمر کے کلوز اپس تھے۔ ایک تصویر میں اس کا ہاتھ سمیر کے ہاتھ میں تھا اور وہ اسے غصے سے گھور رہی تھی اور سمیر کی آنکھیں تعجب سے بھری اسی کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ ایک تصویر میں وہ دونوں خفیف سا جھک کر کوئی بات کر رہے تھے اور لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ دونوں کے درمیان کوئی چپقلش ہے۔ یہ سب سے اچھی تصویر تھی۔

"یہ؟" تقی نے تصویر اسے دکھائی۔ سمیر نے ایک نظر تصویر پر ڈالی۔

"ثمر کہہ رہی تھی مر جاؤں گی لیکن تم سے شادی نہیں کروں گی۔ میں نے بھی کہہ دیا، فکر نہ کرو، تم سے شادی کر کے مجھے بھی اپنی زندگی برباد کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں۔ غلط کہہ گیا۔ ثمر کے بغیر جو گزاروں گا وہ سب کچھ ہوگی، لیکن زندگی نہیں۔" وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا تھا۔

"سمیر! سوری یار! میں کچھ نہیں کر سکتا تیرے لیے۔ میں تو خود ایسا الجھا ہوں کہ پتا نہیں اپنے لیے بھی کچھ کر سکوں گا یا نہیں۔" سمیر نے مایوسی سے سر ہلایا اور تصویریں سمیٹ کر لفافے میں ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"چلتا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا، فون پر انٹرویو کی ٹائمنگ بتا دوں گا۔"

"یار! معاف کرنا دروازے تک چھوڑنے نہیں آسکتا۔ تو خود ہی دروازے سے نکل کر دائیں طرف مڑنا اور پھر ناک کی سیدھ میں چلے جانا۔۔۔ عین سامنے گیٹ نظر آجائے گا۔"

"رہنمائی کا شکریہ لیکن اطلاع کے لیے عرض ہے ساہر باجی مجھے لائی بھی اسی راستے سے تھیں۔ کوئی ایسی بھول بھلیاں تو ہیں نہیں کہ میں راستہ ہی بھول جاؤں۔"

وہ تقی سے ہاتھ ملاتا بلکہ گلے ملتا باہر نکل گیا۔ تقی نے احتیاط سے مڑ کر تکیہ سیدھا کیا، ابھی لیٹ بھی نہیں پایا تھا کہ سمیر بعجلت دوبارہ اندر آیا۔

"تقی! میں نے ابھی اس لڑکی کو دیکھا ہے۔" اس کے انداز میں دبا دبا سا جوش تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں کوئی پانچ سو لڑکیاں تو دیکھی ہوں گی۔ اتنی ایکسائٹمنٹ تو مہک کو دیکھ کر بھی نہیں ہوئی تھی جتنی تجھے ہو رہی ہے۔" تقی حسب عادت بولا۔

"یار! کوئی عام لڑکی نہیں۔ وہ ثمر کی دوست۔۔۔ جس نے تمہیں بتایا تھا ثمر شادی شدہ ہے۔"

"ارے ہاں۔۔۔" اسے یاد آیا۔ "یہ ثمر کی سہیلی بھی تو ہے۔ ساہر کی نند ہے، عمیر بھائی کی بہن۔"

"تیری دوستی ہے اس سے؟ اس سے پوچھو کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اس نے ثمر کے بارے میں غلط بیانی کی تھی یا سچ کہا تھا۔" وہ بہت پرجوش ہو رہا تھا۔

"لیکن اس سے ہوگا کیا؟" تقی نے پوچھا۔

"وہ بعد کی بات ہے کہ کچھ ہوگا یا نہیں۔ ایٹ لیسٹ پتا تو چلے کہ اصل بات کیا ہے۔"

"اچھا۔۔۔" تقی نے پرسوچ انداز میں اس ایک لفظ پر زور دیا۔ "ایک بات بتاؤں یہ لڑکی تھوڑی سی بونگی ہے۔ اب خدا معلوم اس نے کیوں ایسا کہا ہو۔ میں وعدہ تو نہیں کرتا لیکن پوچھ لوں گا۔ محترمہ تنک چڑھی بھی بہت ہیں، کیا پتا جواب دیں یا نہیں، لیکن خیر۔۔۔" اس نے اچھی خاصی تسلی دے کر اسے رخصت کر دیا۔



سمیر کو تسلی دیتے ہوئے وہ نہیں جانتا تھا عنقریب

سمیر سے زیادہ خود اسے تسلی کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

ابا غصے کے تیز ہیں، وہ جانتا تھا۔ اس سے پرخاش رکھتے ہیں، جانتا تھا۔ بلا کے ضدی واقع ہوئے ہیں، یہ بھی جانتا تھا۔۔۔ لیکن اپنی ضد میں اتنا آگے تک جاسکتے ہیں، یہ ہرگز نہیں جانتا تھا۔

انہوں نے مہک کے ڈیڈی سے تقی کے بارے میں اپنے خیالات کا کھلم کھلا اظہار کیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ اسے نالائق اور ناہنجار قرار دے کر اس کا رشتہ مہک سے طے کرنا اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ٹھہرائی تھی بلکہ ان سے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ”میں تقی کو گھر سے نکال چکا ہوں۔ اتنا کچھ جاننے کے باوجود اگر آپ اپنی بیٹی کی شادی اس سے کرنا چاہتے ہیں تو ہر چیز کے لیے ذمہ دار آپ خود ہی ہوں گے۔ کل کو تقی کی کسی نالائقی کی شکایت لے کر میرے پاس مت آیئے گا۔“

مہک نے اسے فون کرکے بتایا۔

”میں نے ڈیڈی کو تمہارے ابا کے بارے میں پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ وہ ذرا سخت مزاج کے ہیں، لیکن سخت مزاجی اور چیز ہوتی ہے۔ اپنے ہی بیٹے کے خلاف الٹی سیدھی باتیں کرنا اور بات۔۔۔ معاف کرنا تقی! لیکن جس طرح وہ ہمارے گھر آکر تمہارے خلاف بول کر گئے ہیں، وہ مجھے سخت مزاج کم اور سنکی زیادہ لگے ہیں۔“ مہک کی آواز اور لہجہ دھیما تھا۔

”تم ذرا اپنے لفظوں پر دھیان دو تو اچھا ہوگا۔“ تقی نے تیز لہجے میں کہا۔ پھر وہ خاموش ہوگیا۔ ابا کی اس حرکت کے انکشاف نے اس کی ذہنی حالت کو عجیب سا کردیا۔ دماغ میں خون کی گردش کے ساتھ جیسے چیونٹیاں چلنے لگی تھیں۔

”ڈیڈی تمہاری طرف سے فکرمند ہوگئے ہیں۔“ بہت دیر بعد مہک نے کہا۔ ”ان کا خیال ہے، کوئی باپ کتنا بھی سخت مزاج کیوں نہ ہو لیکن بیٹے کی گارنٹی باپ سے زیادہ کوئی نہیں دے سکتا۔ اگر باقر لودھی صاحب تقی کے بارے میں کچھ کہہ رہے ہیں تو ہمیں اسے اگنور نہیں کرنا چاہیے۔ وہ تمہیں فون کریں گے ممکن ہے ملنے ہی آجائیں۔ انہیں اپنی باتوں سے مطمئن کردینا تقی۔۔۔ تقی! میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔“

اس کی آواز میں جو التجا تھی، اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ تقی نے بوجھل دل کے ساتھ فون بند کردیا۔

”کیا ہوا؟“ ساہر نے پوچھا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھی تھی اور گفتگو کا یک طرفہ حصہ اس نے بھی سنا تھا۔

تقی کا دل بہت بوجھل ہو رہا تھا۔ اس نے ساری بات کہہ سنائی۔ وہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”ابا کو کیا ہوگیا ہے۔ کس بات کی دشمنی نکال رہے ہیں وہ۔“

تقی خاموش رہا۔ اسے تو خود نہیں پتا تھا، کس بات کی دشمنی نکال رہے ہیں وہ۔

”اچھا تم فکرمند مت ہو۔ مہک کے ڈیڈی کا فون آئے تو انہیں انوائٹ کرلینا۔ میں عمیر سے کہوں گی وہ خود ان سے بات کریں گے۔ مجھے یقین ہے مہک کے ڈیڈی عمیر کی بات سمجھ لیں گے۔“ ساہر نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

تقی اس بار بھی خاموش رہا۔ جب انسان انتہا درجہ کی مایوسی کا شکار ہوتا ہے تو ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب اس کا دل اور دماغ بالکل خالی ہوجاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حال ہو رہا تھا۔



دو روز بعد اس کی حالت کافی بہتر ہوگئی۔ بغیر سہارے کے چل پھر سکتا تھا۔ (ہاں دل اور دماغ کی حالت ویسے کی ویسے ہی تھی۔)

انٹرویو کے لیے چلا گیا۔ سفارشی تھا نظرانداز نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن اب ایسا بھی خالی برتن نہیں تھا کہ صرف سفارش کی بنیاد پر رکھ لیا جاتا۔ تیس منٹ کا انٹرویو ہوا اور اپائنٹمنٹ لیٹر ہاتھ میں لے کر واپس آیا۔ ستائیس ہزار بنیادی سیلری، ساتھ میں الاؤنسز اتنے پرکشش تھے کہ لطف آگیا۔ یہاں ترقی کے مواقع بھی زیادہ تھے۔ اس نے خوشی خوشی جوائننگ لیٹر سائن کرلیا۔ اب اپنی شوٹنگز کے ٹف شیڈول کو اس نوکری کے ساتھ سیٹ کرنا تھا، وہ بھی ہو ہی جاتا۔

گھر پہنچا تو پتا چلا مہک کے ڈیڈی آئے بیٹھے تھے۔ عمیر اور ساہر نے ان کی تشفی کروائی۔ تقی کی طرف سے ہر طرح کی گارنٹی دی لیکن وہ بیٹی کے باپ تھے جاتے جاتے بھی ایسا لگا ان کے دل میں کوئی گرہ ابھی باقی ہے لیکن یہ صرف اندازہ ہی تھا، وہ جاتے ہوئے تقی سے اچھی طرح مل کر رخصت ہوئے تھے۔ نوکری ملنے پر مبارک بھی دی۔ جانے کے بعد مہک نے بھی فون پر اسے تسلی دی۔

”ڈیڈی خاصے مطمئن ہوئے ہیں لیکن اب تمہارے اوپر چیک ضرور رکھیں گے۔“ وہ خوش تو تھی لیکن اس نے کہا۔

”نہیں رکھنا بھی چاہیے کیونکہ میں اشتہاری جو ہوں۔ مقامی تھانے میں میری اتنی بڑی تصویر جو لگی ہوئی ہے۔“ اس نے جل کر فون ہی بند کردیا۔

لیکن آج کا دن ایک اچھا اور اطمینان بخش دن تھا۔ اسے نوکری ملنے کی خوشی میں ساہر نے اسپیشل کھانا بنایا تھا۔ تقی نے روز کی طرح کمرے میں کھانا کھانے کے بجائے ڈائننگ ٹیبل پر سب کے ساتھ بیٹھ کر کھایا۔ شفا نے بھوک نہ ہونے کا کہہ کر میز پر آنے سے انکار کردیا تھا۔



بظاہر سب کچھ ٹھیک ہونے لگا۔ اس کی نوکری، شوبز کا شوق۔ ایک بڑے بجٹ کے ڈرامے میں بطور سائیڈ ایکٹر بھی کاسٹ کرلیا گیا۔ دو چار کمرشلز اور اتنی ہی تعداد میں میوزک ویڈیوز۔

آفرز بڑھ رہی تھیں، لیکن اس نے کم ہی کام ہاتھ میں لینے کو ترجیح دی۔ گھر فون کرکے امی سے بات بھی کی۔ سب جانتے تھے وہ ساہر کے یہاں رہ رہا ہے۔ شاید اندر ہی اندر ابا بھی واقف ہوں لیکن جری نے جتایا وہ حد سے زیادہ خاموش رہنے لگے تھے۔ پہلے دن کے تیئس گھنٹے غصے میں گزارتے تھے اب دورانیہ بڑھ کر ساڑھے تیئس گھنٹے ہوگیا تھا۔

تقی نے خود کو باور کروایا کہ اسے ابا کی پروا نہیں ہے۔

”اگلا کمرشل سائن کرتے ہوئے میں ایڈوانس پے منٹ لینے والا ہوں۔ کرائے کے کسی اچھے اپارٹمنٹ کی ٹوکن منی تو ہوجائے گی پھر میں آپ کو اپنے ساتھ لے آؤں گا۔“ وہ فون پر امی سے کہتا۔ امی گہری سانس بھر کر رہ جاتیں۔ بھلا یہ کسی دور میں ہوا ہے کہ شوہر زندہ سلامت ہو اور عورت اس کے گھر کو لات مار کر بیٹے کے گھر جاکر رہے لیکن تقی ابھی غصے میں تھا، اسے یہ بات سمجھائی نہیں جاسکتی تھی۔

وہ اچھے بچوں کی طرح آفس جاتا۔ کوشش کرتا شوٹنگ کی وجہ سے رات کو لیٹ نہ ہو۔ ایسا ہوتا تو کہیں باہر ہی رہ لیتا۔ بہن پر بوجھ نہ ہو، اس لیے اکثر کھانا بھی باہر ہی کھالیتا، پھر عمیر نے سمجھایا۔

”پیسہ بچاؤ۔۔۔ آنے والے دنوں میں تمہیں اس کی ضرورت پڑے گی۔“ بات معقول تھی۔ اس کی سمجھ میں آگئی۔ اب نہ باہر رہتا نہ کھانا کھاتا۔ ہاں ایک معقول رقم زبردستی اس نے ساہر کے ہاتھ پر رکھ دی تھی۔

ایک روز لیٹ واپس آیا تو شفا نے دروازہ کھولا۔ اسے شرمندگی ہوئی۔ اگلے روز پھر یہی ہوا۔

”کوئی تمہارا نوکر نہیں ہے کہ اتنی دیر تک انتظار میں جاگے اور نہ ہی یہ کوئی ہوٹل ہے کہ جب دل چاہا چلے گئے جب دل چاہا آگئے۔ شریف لوگوں کی طرح ٹھیک وقت پر گھر آیا کرو۔“ شفا نے اسے کھڑے کھڑے ڈانٹ دیا۔ چھ فٹ کے تقی کی ہتک ہوگئی لیکن اسی وقت شفا کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔ شفا کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے سٹپٹا کر کال کاٹ دی۔

”تو اس لیے جاگ رہی تھیں تم۔ میرے سر پہ مفت کا احسان۔۔۔ ہنہ۔۔۔“

وہ کہہ کر آگیا اور کمرے میں آکر خوب ہنسا۔ اس لڑکی میں کچھ ایسا تھا کہ اسے چڑا کر مزہ آتا تھا۔

اگلی صبح اس نے سماہر سے کہا کہ اگلی بار دروازہ خود کھولے۔

"شفا راتوں کو پڑھتی ہے تو اس نے خود کہا تھا' دروازہ کھول دے گی۔" سماہر نے بتایا لیکن تقی دل میں بہن کے سیدھے پن پر ہنسا۔ وہ جانتی ہی نہیں تھی کہ شفا راتوں کو فون سننے کے لیے جاگتی ہے۔ خیر اسے کیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

کچھ روز بعد وہ رات کو پھر پانی پینے کے لیے اٹھا تو شفا فون ہاتھ میں پکڑے رو رہی تھی۔

"ان آنسوؤں کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے آہستگی سے کہا اس کی آواز نیند سے بوجھل تھی۔

"میں نے اپنی زندگی میں پانچ چھ بڑے دھانسو قسم کے عشق کیے ہیں اور ہر عشق میں ناکام ہو کر میں اسی طرح رویا کرتا تھا جس طرح اس وقت تم رو رہی ہو لیکن میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں جو تعلق زندگی کا آزار بن جائے اسے ختم ہی کر دینا چاہیے۔۔۔ تم بھی یہی کرو اور یہ مشورہ مفت ہے اس کے لیے شکریہ مت کہنا۔" کمال ادائے بے نیازی سے حلق میں پانی کی دھار انڈیلتے ہوئے فرمایا گیا۔

"اپنے مفت کے مشورے سنبھال کر رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔" اس نے تقی کو گھورا اور تن فن کرتی باہر نکل گئی۔ پیچھے تقی حیران۔

"ایک مشورہ ہی دیا تھا' اس میں اتنا برا ماننے کی کیا بات ہے۔" اس نے منہ بنا کر سوچا پھر فریج میں کوئی کھانے کی چیز تلاش کرنے لگا۔



سمیر کے آفس میں کچھ لوگ انٹرن شپ کے لیے آئے۔ ان میں ایک ثمر بھی تھی گو کہ ان دونوں کا آمنا سامنا نہیں ہوتا تھا لیکن ٹاکرا ہوتا ہی رہتا۔ ثمر نے سوچا اسے کسی اور ادارے میں چلے جانا چاہیے لیکن وہ کیوں جاتی۔ اس طرح راستہ بدل کر چلنے کا مطلب تو یہ ہوتا کہ وہ ڈر گئی یا گھبرا گئی اور ڈرتی تھی اس کی جوتی۔

وہ ڈٹ گئی۔ بار بار دونوں کا سامنا ہوتا۔ کبھی لفٹ میں کبھی پارکنگ میں۔ کبھی کینٹین میں تو کبھی آڈٹ روم میں۔

سمیر تو اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا۔ دیکھتی ثمر بھی نہیں تھی بس گھورتی تھی جیسے نظروں سے ہی قتل کر دینا چاہتی ہو۔ سمیر کے دل میں شرمساری تھی اس نے ہمت کر کے بات بھی کرنا چاہی تو ثمر نے ایسا منہ توڑ جواب دیا کہ وہ گال ہی سہلاتا رہا۔ پھر جب برداشت سے باہر ہوا تو تقی سے رجوع کرنے کا سوچا۔ وہ استادوں کا استاد تھا۔ سارے شیطانی ٹوٹکے اسی کے دماغ سے نکلتے تھے۔

پھر ایک اور بات بھی تھی' جو وہ اسے بتانا چاہتا تھا لیکن تقی کے پاس اب اتنا ٹائم ہی نہیں ہوتا تھا کہ سکون سے بیٹھ کر سن لے اور ویسے بھی لودھی صاحب کے گھر کا اور حساب تھا' جب دل چاہا منہ اٹھا کر پہنچ گئے۔ یہ بہن کا گھر تھا' احتیاط لازم تھی۔ سو اس نے فون پر کہہ سنایا۔

"شفا کی تصویر روحیل کے موبائل فون میں کیا کر رہی تھی؟" تقی تو سن کر حیران رہ گیا اور سوال داغ دیا جو کہ بڑا ہی بونگا تھا اور سمیر حسب توقع چڑ بھی گیا۔

"اب مجھے یہ تو نہیں پتا کہ کیا کر رہی تھی۔ مجھے صرف یہ پتا ہے کہ روحیل نے مجھے اس کی تصویر دکھائی تھی۔ وہ کچھ غلط قسم کی باتیں بھی کر رہا تھا۔ وہ جس ماحول میں رہا ہے وہاں ایسی باتیں بری نہیں ہوں گی لیکن مجھے لگیں۔ یوز کر کے چھوڑ دے گا۔ اس کے نزدیک تو عورت اور ریلی میں زیادہ فرق ہی نہیں ہے۔ تم اس لڑکی کے لیے کچھ کرو تقی!"

"لے۔۔۔ میں کیا کروں؟ ان لڑکیوں کو جب اپنی عزت کی پروا نہیں ہوتی تو کوئی کیوں ان کی عزت کرے۔" اس نے صاف ہی کہہ دیا۔

"اچھا اس کے لیے نہیں کر سکتے تو میرے لیے

کرو۔" اس نے اصل مدعا بیان کیا۔

"تمہاری عزت کو بھی کسی سے خطرہ ہے؟"

"نہیں عزت کو نہیں، محبت کو خطرہ ہے اور خطرہ بھی اسی سے ہے، جس کے نام پر دل دھڑکتا ہے۔"

"معاف کرو، اس معاملے میں تو اب میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے وہ تباہی مچائی ہے کہ بس۔" تقی نے صاف ہی کہہ دیا۔

"تقی..." وہ بس رو دینے کو تھا۔

"اچھا ایسا کرو اپنے ابو سے بات کرو۔ ان کو ساری بات بتا دو۔"

"تاکہ میرا بھی وہی حشر ہو جو تمہارا ہوا ہے۔"

"فٹے منہ... اب کوئی مشورہ مانگنا مجھ سے۔" تقی نے آگ بگولہ ہو کر فون ہی بند کر دیا۔

ساری رات میں اس نے کئی بار شفا کے بارے میں سوچا۔ شکل سے معصوم لگتی تھی، تب ہی روحیل جیسے بندے کے چکرے میں آ گئی۔ اس نے ساری رات سوچا اور صبح سماہر کو انتہائی مناسب لفظوں میں بتا دیا۔

"میں اس سارے جھمیلے میں پڑنا نہیں چاہتا لیکن عمیر بھائی کے اتنے احسانات ہیں میرے سر پر کہ میں خود کو انوالو کرنے سے روک نہیں سکا۔ جو بات تھی میں نے تمہیں بتا دی۔ اب تم جیسے مناسب سمجھو ان کو بتا دو۔ اچھا ہے وہ اپنی بہن کو سمجھائیں۔"

"تم اس سارے چکر سے دور ہی رہو تو اچھا ہو گا۔" سماہر نے سنجیدگی سے کہا۔

"جو بات تم مجھے اب بتا رہے ہو۔ وہ میں پہلے سے ہی جانتی ہوں لیکن شفا ایسی لڑکی نہیں ہے، جو کسی کی بات سمجھ لے۔ الٹا وہ ایک قیامت اٹھا دے گی۔ تم میں بڑے آرام سے گھسیٹے جائیں گے اور میں عمیر کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں چاہتی۔"

"لیکن سماہر!" تقی نے کہنا چاہا۔

"بس رہنے بھی دو۔ دوبارہ کبھی روتی ہوئی نظر آئے تو تسلی دینے مت کھڑے ہو جانا۔ ایسی لڑکی کا کیا بھروسا... کل کو پتا چلے تم پر ہی ڈورے ڈال رہی ہے۔" وہ شفا کے معاملے میں حد سے زیادہ بدگمان ہو چکی تھی، اس نے ثابت کیا۔

تقی کے دل میں سوال تھے لیکن سماہر کی تنبیہہ نے سوالوں کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے سوچا، وہ واقعی اس معاملے سے دور رہے گا۔ پرائی آگ میں کود کر خود کو بھی جھلسانے کا کیا فائدہ۔ لیکن آنے والے دنوں میں اس نے کئی بار شفا کو بات کرتے دیکھا تھا۔ دوسری جانب سماہر بھی وقتاً "فوقتاً" شفا سے متعلق کچھ نہ کچھ اس کے کان میں ڈالتی رہتی تھی۔ وہ چپ چاپ سن لیتا۔ اسے کیا ضرورت تھی کہ شفا کے کردار کو جانچتا یا اس کے بارے میں کوئی اندازے لگاتا۔ ہاں لیکن سماہر کی باتیں کبھی کبھار اسے عجیب لگتیں۔ بظاہر ٹھیک لگتی باتوں کو بھی وہ کچھ اس طرح اسے بتاتی کہ وہ قابل اعتراض لگنے لگتیں جبکہ محض ایک فون والی بات کو چھوڑ کر اس نے شفا میں ایسی کوئی بات نوٹ نہیں کی تھی، جو اسے ضدی، ہٹ دھرم یا بے راہ رو ثابت کرتیں۔

کہیں نہ کہیں تو کوئی ایسی بات تھی، جو سماہر کے منہ سے شفا کی برائی سن کر اسے محسوس ہوتی تھی۔ لیکن وہ کیا بات تھی؟ اس کا فیصلہ تب ممکن ہوتا جب وہ اس پر دھیان دیتا۔ اس کے نزدیک یہ زندگی کا ایک عام سا معاملہ تھا اور سب سے بڑی بات خود اس کا تو معاملہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے اس نے آنکھیں ہی بند کر لیں۔ کان بند کرنا مشکل تھا کہ سماہر کو شفا کے خلاف بولنے کا بہت ہی شوق تھا۔

"او بس کرو بھئی۔ یقین مانو سماہر! عورت سب سے زیادہ ذکر اپنے بچوں کا کرتی ہے، لیکن تمہارے منہ سے میں نے اتنا ذکر تمہارے بچوں کا نہیں سنا جتنا اس شفا کا سن چکا ہوں اور ایک بات میری دھیان سے سن لو۔ میرا تمہاری نند پر عاشق ہونے کا کوئی پلان نہیں ہے۔ اس لیے تم بار بار یہ بتا کر "وہ کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی" مجھے اس سے متنفر کرنے کی کوششیں بند کر دو۔ اس برین واشنگ کا کوئی فائدہ نہیں ہونا۔"

سماہر خفیف سی ہو گئی۔ وہ بدتمیزی کی حد تک صاف گو تھا۔ وہ جانتی تھی۔ لیکن بات یوں منہ پر ہی مار دے گا اس کا اندازہ نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے، جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا۔ اب تم ہی آ کر معافی مانگ لو۔" فون پر بات کرتے ہوئے امی نے لجاجت سے کہا۔ ان کی بات سن کر تقی کو سخت صدمہ پہنچا۔

"آپ بھی یہی چاہتی ہیں کہ میں معافی مانگوں؟ کل رضی سے بات ہوئی۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا۔ آپ بھی یہی کہہ رہی ہیں۔ کم سے کم آپ لوگ مجھے یہ تو بتائیں۔ میں نے کیا کیا ہے؟ کسی کا قتل کر کے بھاگ آیا تھا۔ ہیروئن اسمگل کرتے ہوئے پکڑا گیا تھا، جو ابا نے اتنی بری طرح مارا۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے۔ ان کے منہ سے خود کو نالائق، ناہنجار ہی سن رہا ہوں۔ وہ یہ بات برملا سب کے سامنے بھی کہا کرتے تھے، لیکن سب کے سامنے مجھے مار کر انہوں نے ثابت کر دیا۔ ان کے دل میں میرے لیے کتنی نفرت ہے۔"

"نفرت نہ کہو تقی! بس وقتی غصہ..." امی نے تڑپ کر کہنا چاہا، اس نے ٹوک دیا۔

"بس کریں امی! اب تو پردے ڈالنا چھوڑ ہی دیں۔" وہ حد سے زیادہ دل برداشتہ تھا۔

"حکم عدولی کو ابا گناہ ٹھہرائیں تو ٹھہرائیں اپنی پسند کا پروفیشن جوائن کرنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ شوبز کے ساتھ ابا کو میں قبول نہیں ہوں اور میں شوبز کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اگر ابا مجھے گھر سے نکال کر خوش ہیں تو ایسے ہی سہی۔ میں اپنے گھر کا بندوبست کر لوں گا اور آپ کو بھی ساتھ لے آؤں گا۔" اس نے اپنے ارادے کا اعادہ کیا۔

"لیکن ابھی تو آپ آ کر مجھ سے مل جائیں۔ بہت مس کر رہا ہوں میں آپ کو۔" پھر کچھ خیال آنے پر بولا۔ "اسی بہانے سماہر سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ ایک منٹ! کہیں آپ عمیر بھائی کی وجہ سے تو نہیں جھجک رہیں؟ یقین کریں امی! وہ بہت اچھے ہیں، آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔"

"ظاہر ہے تھوڑی جھجک تو مجھے اس کی وجہ سے بھی ہے۔ داماد ہے ہمارا، لیکن کبھی دامادوں والا سلوک کیا نہیں۔ لیکن خیر تمہاری چچی بھی اس کی بہت تعریف کرتی ہیں۔ میں سنتی ہوں تو سینے میں ٹھنڈ سی پڑ جاتی ہے کہ اس نے ہماری سماہر کو خوش رکھا ہوا ہے۔"

"پھر آپ کب آئیں گی؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔

"میں وعدہ نہیں کرتی، لیکن آنے کی کوشش کروں گی۔ اپنے ابا کو جانتے ہو نا۔" امی نے بے چارگی سے کہا تھا۔ تقی کی آس ٹوٹ گئی۔ اس نے کچھ اور باتیں کر کے فون بند کر دیا۔ ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا۔ اسے گھر سے نکلے ہوئے اور امی کے بغیر وہ سب سے زیادہ اداس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

امی نے فون بند ہوتے ہی رضی کو پکڑا دیا۔ رضی نے دیکھا۔ ان کا چہرہ ضبط سے سرخ اور آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ چپک کر ان سے بیٹھ گیا۔

"کیوں روتی ہیں؟ میں نہیں ہوں آپ کا بیٹا۔" لاڈ سے کہا۔

"میں نے ڈیڑھ ماہ سے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ میں کہتی نہیں ہوں، لیکن سچ تو یہ ہے کہ میرا تقی کے بغیر بالکل دل نہیں لگتا۔" وہ منہ پر دوپٹا رکھ کر ہچکوں ہچکوں رونے لگیں۔ رضی نے انہیں رو لینے دیا کہ ایک ہی بار دل کا غبار نکال لیں۔ پھر جب وہ کافی دیر رو چکیں تو اس نے ان کے کندھوں کے گرد بازو پھیلا لیا۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ تقی کا غصہ اتر جائے گا تو وہ خود ہی واپس آ جائے گا۔"

"اس بار نہیں آئے گا۔ میرا دل کہہ رہا ہے۔" انہوں نے بے چارگی سے کہا۔

"ایسا سلوک تو کسی بچے کے ساتھ کرو، وہ بھی برا

مان جاتا ہے۔ تقی تو پھر جوان ہو گیا ہے۔"
"تو پھر اس سے کہو آئے اور مجھے قتل کر دے۔"
عقب سے ابھرتی لودھی صاحب کی آواز ان دونوں کو دہلا گئی تھی۔ وہ کب آکر پیچھے کھڑے ہوئے اور ان کی باتیں سنتے رہے۔ ان کو پتا ہی نہیں چلا۔
"جب میں نے منع کیا تھا۔ کوئی اس نالائق سے رابطہ نہیں رکھے گا تو تم نے اس سے بات کیوں کی۔"
"آپ کے سینے میں تو پتھر لگا ہے۔ لیکن میں ماں ہوں، کب تک اس سے دور رہ سکتی ہوں۔ ابھی بھی صرف آپ کی وجہ سے فون پر بات کی، ورنہ خواہش تو یہی ہے کہ اس سے جا کر ملوں۔" امی نے دبی آواز میں خاصی خفگی سے کہہ دیا۔
"جس کا دل چاہے اس سے جا کر ملے، لیکن یہ یاد رکھے پھر اس کا مجھ سے ہر رشتہ ختم ہو جائے گا۔۔۔ یا۔۔۔ یا میں خودکشی کر لوں گا۔" ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔
"ابا! یہ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں آپ؟"
رضی نے دہل کر کہا۔ امی تو کچھ بولنے کے قابل ہی نہ رہی تھیں۔
"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اب فیصلہ بھی تم لوگوں کے ہاتھ ہے۔ چاہے تو اسے چھوڑ دو یا مجھے۔" وہ زور سے پاؤں پٹختے ہوئے چلے گئے۔ امی کے پاس کوئی اور راستہ نہ تھا۔ وہ پھر سے رونے لگیں۔

☼ ☼ ☼

سماہر اس بار کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے پتنگ کو ہوا کے سپرد کرنے کے باوجود اس پر پوری نظر رکھی ہوئی تھی۔
روحیل اور شفا کو قریب آنے کا موقع اس نے خود فراہم کیا تھا۔ یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ مواقعوں کی راہ اس نے خود ہموار کی تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ان دونوں کی طرف سے وہ چوک جاتی۔
"تمہارا دماغ خراب ہے جو یہ سوچ رہی ہو کہ شفا مجھ سے ملنے پر آمادہ ہو گی۔۔۔ وہ تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتی، ملاقات خاک کرے گی۔" روحیل شفا کے طرزِ عمل سے کچھ زیادہ ہی جلا ہوا تھا۔
سماہر اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔
"تم سے بات نہیں کرتی؟ لیکن وہ تو رات کو اکثر فون پر بات کر رہی ہوتی ہے۔"
"میں نے کئی بار اسے کال کی ہے۔ وہ بات نہیں کرتی، میں زبردستی کرتا ہوں۔ وہ دراصل خود کو کوئی اونچی چیز سمجھتی ہے۔ چند روز بعد ہی اس نے کہا۔ وہ اس طرح کی دوستی کو ٹھیک نہیں سمجھتی، اس لیے دوبارہ مجھ سے بات بھی نہیں کرے گی۔۔۔ بلڈی بچ۔۔۔ اس نے مجھے انکار کیا۔۔۔ روحیل حیات کو۔" اس کا غصے سے برا حال تھا۔ "وہ سمجھتی کیا ہے خود کو، اس جیسی کئی میرے آگے پیچھے پھرتی ہیں۔"
"روحیل! تم اتنا غصہ مت کرو۔" سماہر نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔ وہ جذباتی آدمی تھا۔ غصے میں کچھ کر بیٹھتا تو نقصان میں سماہر کا بھی حصہ رکھتا۔ سماہر نے اس سے پہلے خود دوستی کی تھی۔ پھر اسے شفا سے دوستی پر آمادہ کیا تھا اور مرد کی دوستی نقصان دہ ہو سکتی ہے، وہ اس بات سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کے باوجود دوستی، دوستی کے اس کھیل میں تکلف کی کچھ دیواریں اسے بھی گرانا پڑی تھیں۔ غیر مرد فائدہ پہنچانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کی پہلی ترجیح فائدہ اٹھانے کی ہوتی ہے۔ وہ اپنی ترجیحات کو ہمیشہ پہلے نمبر پر رکھتا ہے۔
"کیسے غصہ نہ کروں۔ اس نے میری بہت انسلٹ کی ہے اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ تم نے مجھے اس سے دوستی کرنے کے لیے کہا تھا۔ ورنہ وہ تو میرے پاسنگ بھی نہیں ہے۔ ڈھیٹ اتنی ہے کہ میں نے اسے بتایا، میرے پاس اس کی تصویریں بھی ہیں جنہیں واپس لینے کے لیے اسے مجھ سے ملنے آنا ہو گا۔ مگر وہ اپنی ضد کی اتنی پکی ہے کہ مجال ہے، جو میری بات مان رہی ہو۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی لڑکیوں پر جن میں اتنی اکڑ ہو۔"
"روحیل! میری بات سنو۔"
"اب تم میری بات سنو۔ تم نے شفا کی جو تصویریں مجھے دی تھیں۔ میں انہیں اپنی تصویروں کے ساتھ فوٹو شاپ کر کے تمہارے شوہر کو فارورڈ کر رہا ہوں۔"
سماہر کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔ چند لمحے سوچا، پھر اس نے کہا۔
"میں نے تمہیں شفا کی جو تصویریں دی تھیں، تمہارا جو دل چاہے ان کے ساتھ کرو، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ تم شفا کا حشر خراب کرتے ہو یا اس کی تصویروں کا۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں، وہ دوبارہ کبھی میرے سامنے کھڑی نہ ہو سکے۔ عمیر کی نظروں میں اتنی خوار ہو جائے کہ دوبارہ کبھی مجھ سے نظر ملا کر بات کرنے کی ہمت ہی نہ کرے۔"
اس نے زہریلے لہجے میں کہا تھا اور ایسا کہتے ہوئے اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ تقی پیچھے کھڑا اس کی باتیں سن رہا ہو گا۔

☼ ☼ ☼

تقی نے سماہر کو بات کرتے ہوئے پلٹتے دیکھا۔ تقی پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔
"روحیل! میں تم سے بعد میں بات کرتی ہوں۔"
اس نے آہستہ آواز میں کہہ کر فون بند کر دیا۔
"او تقی! تم کب آئے؟ گیٹ کس نے کھولا؟ مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔ اچھا اب آگئے ہو تو کچھ دیر بعد ہادیہ کو جھولوں پر لے جانا۔ بہت دیر سے تمہارا پوچھ رہی ہے۔ کچھ کھاؤ گے؟ تم کھڑے کیوں ہو، بیٹھ جاؤ نا۔ میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔" جملوں کی بنت، اس کی گھبراہٹ اور وہاں سے غائب ہو جانے کی خواہش جیسے سب کچھ اس کے چہرے پر لکھا تھا۔
"روحیل حیات۔۔۔ وشمہ حیات کا بھائی۔۔۔ اور سمیر کا کزن۔۔۔ روحیل۔" سماہر کو بغور دیکھتے ہوئے خود کلامی کے انداز میں بولتا وہ جیسے کڑی سے کڑی ملا رہا تھا۔
"ہچ۔۔۔ چائے کے ساتھ کچھ کھاؤ گے؟" وہ جلد از جلد اس کے سامنے سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ کیونکہ تقی کی کھوجتی نظروں سے اسے سخت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔
"یہ کیا بات ہو رہی تھی؟ تم نے شفا کی تصویریں روحیل کو دی ہیں؟"
"یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے تقی! تم اس سے دور رہو۔" گھبراہٹ اور اپنی چوری پکڑے جانے کا خیال ایک ساتھ اس پر وارد ہوا تھا، وہ خود کو نرم رویہ اپنانے پر مجبور نہیں کر سکی۔
"ہاں۔ یہ میرا معاملہ نہیں ہے۔ لیکن تم میری بہن ہو اور تمہارا ہر معاملہ ان ڈائریکٹلی میرا بھی ہے اور میں اپنی بہن کو کھائی میں چھلانگ لگاتے نہیں دیکھ سکتا۔" تقی نے اس سے زیادہ تیز اور سخت لہجے میں کہا تھا۔ بے شک وہ اس سے عمر میں کچھ چھوٹا تھا، لیکن بھائی چھوٹے یا بڑے نہیں ہوتے، وہ صرف بھائی ہوتے ہیں، ان کا ایک رعب دبدبہ ہوتا ہے۔
"تقی! بے وجہ بات کو مت بڑھاؤ۔" سماہر نے تحمل لیکن لاتعلقی سے کہا تھا۔ "میرا خیال تھا، تمہیں تھوڑے مینرز آتے ہوں گے۔ اتنا تو پتا ہو گا کہ چھپ کر کسی کی باتیں نہیں سننا چاہئیں۔ لیکن اب کچھ سن ہی

چکے ہو تو خود کو تھوڑا تو تہذیب یافتہ ثابت کرو اور انکوائری مت کرو‘ یہ میرا معاملہ ہے اور اپنے معاملات کو میں اکیلی زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال سکتی ہوں۔"

"تمہارے ڈائیلاگز پورے ہوگئے۔ اب چپ چاپ یہاں بیٹھو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔" تقی نے جیسے اس کی کسی بات کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

"میں تمہاری ہر بات کا جواب دے چکی ہوں۔ اب میرا دماغ مت کھاؤ۔" وہ ایک بار پھر وہاں سے جانے لگی۔

"اگر تم مجھے کچھ نہیں بتاؤگی تو میں عمیر بھائی کو بتادوں گا کہ میں نے تمہیں یہ ساری بات کرتے سنا ہے۔ تم سوچ لو‘ پھر تمہارا کیا حشر ہوگا۔" ساہر ہکا بکا رہ گئی۔

"میں انکار کردوں گی۔ عمیر کبھی تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

"وہ یقین کریں گے۔ جب تمہارا اپنا بھائی ایسی بات کہے گا تو وہ ضرور یقین کریں گے اور جو تم کرنے جارہی ہو‘ اس کے بعد عمیر بھائی کو یقین ہوجائے گا کہ تم سے محبت ان کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔" اس نے سرعت سے کہا تھا۔

"تمہیں ہوا کیا ہے ساہر! تم شفا کا مت سوچو‘ عمیر بھائی کا تو سوچو۔ ابھی کتنے یقین سے تم نے کہا کہ عمیر بھائی میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ ذرا سوچو‘ جب انہیں پتا چلے گا کہ ان کی بہن کی زندگی اس عورت نے برباد کی جس سے وہ اتنی محبت کرتے ہیں تو ان پر کیا گزرے گی۔ مجھے نہیں پتا‘ تم ایسا کیوں کررہی ہو۔ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ جب کسی سے بدلہ لیا جاتا ہے تو ایک انسان سے نہیں لیا جاتا۔ اس بدلے کی آگ اردگرد والوں کو بھی جلادیتی ہے۔"

"مجھے یہ کتابی باتیں مت سناؤ تقی! شفا کی وجہ سے میں جس ذہنی عذاب سے گزری ہوں‘ اسے صرف میں جانتی ہوں۔" ساہر نے ہسٹیریک ہوکر کہا تھا۔ "میری زندگی کا سب سے خوب صورت وقت وہ کھاگئی‘ صرف اس کی وجہ سے عمیر کی نظروں میں میں نے نفرت دیکھی۔ تمہیں پتا ہے‘ جس سے آپ محبت کریں‘ اس کی نفرت سہنا کیسا ہوتا ہے؟"

"میں مانتا ہوں‘ تم نے یہ سب مجھے کئی بار بتایا ہے‘ لیکن یہ سب چھوٹی باتیں ہیں‘ انہیں بھلایا جاسکتا ہے۔ اب تو تمہاری زندگی پرسکون ہے۔ ایک گھر ہے۔ پیارے پیارے بچے ہیں۔ جان نچھاور کرنے والا شوہر ہے۔" وہ اسے وہ سب چیزیں گنوا رہا تھا۔ جن کے لیے ایک انسان اور سب سے بڑھ کر ایک عورت سمجھوتا کرسکتی ہے۔

"وہ چھوٹی باتیں نہیں تھیں تقی! تم صرف دور بیٹھ کر تبصرہ کرنے والوں میں سے ہو‘ تم اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ میں کتنے ذہنی کرب سے گزرتی رہی ہوں۔"

"پرانی باتیں یاد کرکے کب تک اپنا دل جلاتی رہوگی؟ تمہیں پتا ہے تم نے اپنے دل اور دماغ میں ایک بھٹی بنا رکھی ہے۔ جیسے ہی اس بھٹی کی آگ ذرا مدھم پڑنے لگتی ہے۔ تم پرانی باتیں یاد کرکے اس آگ کو تیز کردیتی ہو۔ مجھے ڈر ہے تو صرف اتنا کہ یہ آگ تمہارا اپنا آپ نہ جلادے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ کم از کم اس بار ایسا کچھ نہیں ہونے دوں گی میں جو میری پلاننگ خراب کردے۔ میں نے کئی کوششیں کیں۔ ہر بار کسی نہ کسی طرح شفا بچ نکلتی ہے۔ لیکن اس بار نہیں۔ اس بار میں اسے عمیر کے سامنے خوار کرکے رہوں گی۔"

"ساہر! پاگل پن کی باتیں مت کرو۔ ورنہ تم نقصان اٹھاؤگی۔ زندگی حالت جنگ میں گزاروگی تو آخر میں جیتنے کے باوجود نقصان تو اٹھانا ہی پڑے گا۔ کبھی دیکھا ہے‘ کسی فوج نے فتح حاصل کی ہو اور اس کا ایک فوجی بھی نہ مارا گیا ہو۔"

"میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی‘ میں نے پہلے بھی کہا‘ یہ میرا معاملہ ہے‘ اسے میں سنبھال

لوں گی۔" اس نے خاصے مغرور لہجے میں کہا تھا۔

"یہ مت کرو ساہر!" تقی نے رسان سے کہا تھا۔ "جو تم کرنے والی ہو اس کا خیال دل سے نکال دو۔ شفا کو برباد کرنے کے شوق میں تم خود کو برباد کرلوگی۔ اپنے پیر زخمی کرکے کیا کروگی۔ پھر ایسا ہوگا کہ کوئی تمہیں سہارا دے کر چلانے والا بھی نہیں رہے گا۔"

"بے فکر رہو۔ میں سہارے کی آس میں تمہارے پاس نہیں آؤں گی۔" اس نے سالقہ انداز میں کہا تھا۔ تقی کے دل کو بری طرح ٹھیس لگی۔

"تمہیں لگتا ہے میں تمہیں اس لیے سمجھا رہا ہوں؟"

"جس لیے بھی سمجھا رہے ہو‘ لیکن اس معاملے سے دور رہو تو اچھا ہوگا۔" اس نے بات ختم کی اور کمرے سے نکل گئی۔ وہ چلی گئی تھی۔ لیکن جاتے جاتے تقی کے پاس سوچنے کے لیے بہت کچھ چھوڑ گئی تھی۔



اگلی صبح وہ کچن میں آئی تو تقی کچن ٹیبل پر بیٹھا جلدی جلدی چائے پی رہا تھا۔

"آہستہ پیو۔ حلق میں پھندا لگ جائے گا۔" وہ برنر کے پاس آکر اس کے لیے ناشتا بنانے لگی۔

"اتنی کیا جلدی ہے‘ میں ناشتا بنا رہی ہوں تمہارے لیے۔" تقی پر اثر نہ ہوتا دیکھ کر اس نے کہا۔

"میرے لیے مت بناؤ‘ میں چائے پی چکا ہوں۔" اس نے کہا اور واش بیسن کے پاس آکر اپنا مگ دھونے لگا۔ اس کے انداز سے پچھلی شام کی بحث کی ناراضی جھلکتی تھی۔

"چھوڑ دو میں کرلوں گی۔" اس نے کہا۔ تقی نے اس کی بات نہیں سنی۔

"اچھا شام کو تمہارے لیے کیا بناؤں؟" اس نے جلدی سے بات برائے بات پوچھا۔

"کچھ مت بنانا‘ میں باہر سے کھاؤں گا۔ میں جتنے بھی دن یہاں ہوں کھانا باہر سے ہی کھاؤں گا۔ اپنے کاموں کے لیے میں تمہیں زحمت نہیں دینا چاہتا اور ہاں‘ آج ہی میں آفس میں کسی اپارٹمنٹ کے لیے درخواست دے رہا ہوں۔ جلد ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔" وہ مگ جھاڑ کر ریک میں رکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن کیوں؟" ساہر نے حیران ہوکر پوچھا۔

"کیونکہ میں تمہیں اپنی زندگی برباد کرتے نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے کہا۔

"تقی! میری زندگی کو کچھ نہیں ہوگا۔" اس نے تحمل سے کہا۔ بھائی سے جھگڑا اسے منظور نہیں تھا۔

"کل کچھ باتیں سمجھائی تھیں تمہیں۔ میرا خیال تھا‘ تم نے کچھ تو سمجھا ہی ہوگا۔ لیکن کچھ لوگوں کو سنبھلنے کے لیے ٹھوکر کی ضرورت ہوتی ہے اور تم ان میں سے ایک ہو۔ میں یہاں سے جاؤں گا تو عمیر بھائی کو حقیقت بتا کر جاؤں گا۔"

"پھر میری مری ہوئی شکل دیکھنا۔" ساہر نے تیز لہجے میں کہا تھا۔ تقی نے مڑ کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کچن سے باہر نکل گیا۔

ساہر رات بھر خود کو تقی سے مصالحت پر آمادہ کرتی رہی تھی اور صبح سویرے اس کی غلط فہمی دھری کی دھری رہ گئی تھی کہ وہ اسے قائل کرلے گی۔ تقی خر دماغ تھا۔ اب اس معاملے کو لے کر اس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ کیا کر بیٹھتا۔ ساہر کو جو بھی کرنا تھا‘ جلدی کرنا تھا اور وہ فیصلہ کرچکی تھی۔ اس معاملے کو کیسے سنبھالنا ہے۔ روحیل نہ سہی کوئی اور سہی۔ اس کا مقصد تو شفا کی بربادی تھا۔ مہرہ کوئی بھی بنتا‘ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عنیزہ سیّد

جو رکے تو کوہ گراں تھے ہم

ماہ نور اپنے چاچا سردار خان کے گاؤں گئی تو وہاں بندر کا تماشا دیکھ کر اس کے دل میں یہ فن سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے بندر کا تماشا دکھانے والے شخص سے اس خواہش کا اظہار کیا، لیکن اس کے کزنز اسے زبردستی وہاں سے لے گئے۔ وہ کئی دن تک بندر والے کے بارے میں سوچتی رہی۔ اسے بندر والے کی شخصیت میں عجیب کشش محسوس ہوئی تھی وہ اس کے دوبارہ آنے کا انتظار کرنے لگی۔

سعد بلال کو فنون لطیفہ اور دیگر فنون سے گہرا شغف ہے تاہم اس کے والد کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ ان کے خیال میں بلال کو یہ دلچسپی اپنی ماں سے ورثے میں ملی ہے، کیونکہ وہ ایک گلوکارہ تھیں۔ بلال کی خواہش ہے کہ سعد سنجیدگی سے کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹائے۔

سارہ خان سرکس میں کرتب دکھایا کرتی تھی۔ ایک حادثے میں وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئی۔ سعد اس کا بہت خیال رکھتا ہے، کیونکہ وہ سعد کو بہت عزیز ہے۔

ماہ نور گاؤں میں بابے منگو کے میلے میں گئی تو اسے وہاں ایک لوک فنکار کی آواز نے مسحور کر دیا۔ وہ اس سے ملنے گئی تو اسے لگا جیسے وہ فنکار وہی بندر والا ہو۔ اس نے بھی ماہ نور کو شناسا نظروں سے دیکھا۔

خدیجہ اور فاطمہ، ماہ نور کی خالہ ہیں۔ ماہ نور ان سے ملنے گئی تو وہ دونوں "شہناز" نامی ایک رشتے دار خاتون کو یاد کر رہی تھیں، جس نے گلوکاری کے شوق میں گھر والوں سے بغاوت کی تھی۔ اور پھر شادی کے بعد اس کے قتل کی خبر ہی ملی تھی۔
سعد کی نیٹ پر اپنی بہن نادیہ سے بات ہوئی جو پڑھائی کے سلسلے میں بیرون ملک مقیم ہے۔

بیسویں قسط



"اللہ اللہ بھائی کے۔۔۔ کان کاٹوں نائی کے۔"
"ہاہا۔۔۔ بھئی! بچے کو بہلاتے بہلاتے نائی کے کان کیوں کاٹنے لگیں؟"
"نائی کم بخت نے ہی تو سر کے بال اتارتے اتارتے لگتا ہے زخم لگا دیا ہے ہمارے شہزادے کو' جب ہی روئے چلا جا رہا ہے۔"
"نہیں۔۔۔ جب سے تم نے اسے گود میں لیا ہے' تب سے روئے چلا جا رہا ہے۔"
"پھر تو نائی کے نہیں' میراثی کے کان کٹنے چاہئیں۔"
"اڑالو۔۔۔ اڑالو مذاق' تم دونوں میراثیوں کا۔ ایک دن دیکھنا! یہ میراثی ہی ہوں گے تمہاری طرف بڑھتے وار اپنے سینے پر لینے والے۔"
"سن لو۔۔۔ بہادری اور وفاداری کے دعوے کر رہی ہیں محترمہ۔"
"اس کی باتیں رہنے دیں۔ اسے اپنے علاوہ ساری دنیا کم بخت ہی لگتی ہے۔ ہر وقت مولوانوں کے بے چارے لمڈے کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ وہ کم بخت' نائی کم بخت' دکان والے کم بخت' مہترانی کم بخت۔۔۔ اللہ جانے کوئی بلند بخت بھی ہے اس کے نزدیک کہ نہیں۔"
"ہے کیوں نہیں بلند بخت۔۔۔ ہمارا یہ شہزادہ ہے نا بلند بخت۔۔۔ اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ اس کی شان اونچی کرے۔"
"جس دن سے ہوا ہے' اٹھائے اٹھائے پھرتی رہتی ہو۔ اسے گود کی عادت ہو گئی نا تو بستر پر ڈالنا دشوار ہو جائے گا۔"
"اچھا۔۔۔ ابھی تو اسے مجھے دے دو۔ میں دو گھڑی اٹھا لوں گود میں۔ پھر میرے جانے کا ٹائم ہو جائے گا۔"
"یہ لیں بھئی! عجیب والد پائے ہیں ہمارے شہزادے نے۔۔۔ بے چارہ' جس وقت دنیا میں آیا' اس وقت بھی موجود نہیں تھے۔ اس کے کان میں اذان دینے کی سعادت بھی اس حبشی پہلوان سراج سرفراز کو ہی ملنی تھی۔"
"ابا موجود ہوتے۔۔۔ ضرور موجود ہوتے' تم ہی نے بھگایا تھا اسی شام طیفے لاٹر کی سناؤنیاں سنا کر۔"
"ہاں تو ٹھیک ہی کیا تھا نا۔ خود اپنی آنکھوں سے اسے ننگا خنجر لیے بڑھکیں مارتے سنا تھا۔"
"انہیں گیا پھر وہ کسی کی گردن کاٹنے۔۔۔ تم خوامخواہ ہی میرے معصوم شوہر کو یہاں سے بھگانے کے چکر میں رہتی ہو۔"
"احتیاط لازم ہے بیگم صاحبہ! اور آپ سنئے تو ملیے ابا جان۔۔۔ صرف باتوں پر نہ ٹرخائیے' روکڑا نکالیے روکڑا۔۔۔ میں بوندی کے لڈو منگواؤں شیریں محل سے۔۔۔ منہ تو میٹھا کرائیے۔ کنگن کی بات بعد میں کروں گی۔"
"ہاں' ہاں جتنے چاہے لڈو کھاؤ' یہ لو پیسے۔۔۔ اب بھلا بتاؤ' لڈو منگوانے کے لیے سراج سرفراز کے سوا کوئی دوسرا ہے تمہارے پاس؟"
"اتنا بھی نہیں کرے گا؟ صبح سے شام پڑا بس چارپائی ہی توڑے گا کیا؟ چلیں جی ——— میں چلی لڈو منگوانے۔۔۔ تم دونوں میاں' بی بی اخلاص کی باتیں کر لو چند گھڑیاں۔۔۔ اور میرا شہزادہ مجھے دے دو۔" اس نے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھائے۔
"ارے یہ کیا ہوا۔۔۔ یہ کیسی آواز ہے؟"
"لگتا ہے' صحن میں کوئی کودا ہے۔"
"ٹھہرو! تم دونوں ادھر ہی بیٹھے رہو۔ میں دیکھتی ہوں۔ کوئی ضرورت نہیں ہلنے کی۔ ارے۔۔۔ ہائے میرے ربا! یہ تو طیفا لاٹر ہے۔ بیچ بیچ صحن میں کود آیا۔ جلدی کرو۔ میرے بھائی! یہ پچھلی ڈیوڑھی میں مائی سکینہ کے گھر کا

دروازہ کھلتا ہے۔ کچھ نہ سوچو' کچھ نہ بولو' بس نکل چلو ادھر سے۔"
"اوفوہ! جلدی کرو جلدی۔ جوتے ہاتھ میں پکڑ لو' نکلو بس جلدی سے۔"
"شکر ہے مان گیا۔ ضد نہیں کی' نکل گیا' پر۔۔۔ آف۔۔۔ چھوڑو مجھے۔۔۔ آہ! میری گردن کا ہے کو وار ہے ہو۔۔۔ ہائے' میری جان نکل گئی۔"
چیخیں۔۔۔ شور۔۔۔ گرنے کی آوازیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سڑک سے بنی اس جھونپڑی کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ دوسری مرتبہ یہاں آئی تھی۔ پہلی بار جب وہ آئی تھی تو اس جھونپڑی اور جھونپڑی والے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی بس اپنے ہمراہی کے ساتھ چلی آئی تھی۔ جھونپڑی والے کی باتوں سے اس کا ذہن الجھ گیا تھا۔ مجال ہے جو ایک بات بھی پلے پڑی ہو۔ یہاں سے واپس جانے کے بعد اس نے کبھی ان باتوں کو یاد کیا نہ ان پر غور کیا' کیونکہ یہاں سے واپسی کا راستہ دل فریب تھا' خوابوں' خواہشوں' تمنا اور چاہ کا راستہ۔ وہ اس راستے کی دل فریب اور حیران کن منظروں میں کھو کر رہ گئی تھی۔ جب ہی تو اس دوران اسے جھونپڑی یاد آئی نہ جھونپڑی والا' اب راستے کی اندھی گلی میں گم ہوئی تو اس سے باہر نکلنے کی سعی میں اسے ایک خیال اس جھونپڑی اور جھونپڑی والے کا بھی آیا تھا۔
"کیا پتا روٹی کا کوئی ٹکڑا' راستے کی نشان دہی کے لیے اس جھونپڑی کے باہر یا اندر پڑا ملے' جس کو حاصل کرنے کے بعد اندھی گلی سے چھٹکارا ممکن ہو جائے۔"
اس نے سوچا تھا۔ جب ہی ابراہیم کے ساتھ یہاں تک پہنچ گئی تھی۔
"وہ لڑکا نظر نہیں آ رہا جو آگ کے الاؤ پر دیگچہ رکھے کاڑھا بنا رہا ہوتا تھا' پیالہ نہ پینے پر گالیاں اور کوسنے سناتا تھا۔"
ابراہیم نے آگ پر الٹا توا رکھے ایک وقت میں کئی روٹیاں بناتے لڑکے سے پوچھا۔ لڑکا شکل سے سنجیدہ اور کم گو نظر آتا تھا۔
"یہ فقیر کا ڈیرہ ہے باؤ صاحب! یہاں بالکے آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہاں آنے والوں کو لنگر سے غرض ہونی چاہیے لنگر پکانے والے سے نہیں۔" اس نے پرات سے پیڑا اٹھاتے ہوئے بردباری سے جواب دیا۔
"اچھا جی!" ابراہیم استہزائیہ انداز میں ہنسا تھا۔ "یہ کیسا لنگر ہے' جس میں کاڑھا پینے کو ملتا ہے اور اب یہ خالی روٹیاں۔"
"کاڑھا اور شربت تبرک ہیں باؤ جی' مذاق مت اڑائیں ان کا' جن کو فیض نہیں ملنا ہوتا وہ پا کر بھی محروم رہ جاتے ہیں' کٹورا ہاتھ میں پکڑا ہوتا ہے لیکن لبوں تک نہیں جا پاتا۔ لڑکے نے توے پر پڑی روٹیوں کو ہاتھ میں پکڑے کپڑے سے دباتے ہوئے تیزی سی گھمایا اور دو تین روٹیاں ایک ساتھ اتار کر قریب رکھی بڑی سی چنگیر میں رکھ دیں۔
"ہوں" ابراہیم نے اسی استہزائیہ انداز میں اس لڑکے کو دیکھتے ہوئے سر ہلا دیا۔ "میں نے دو گھونٹ پیے تھے کاڑھے کے اور وہ جو میرے ساتھ تھا' وہ آدھا کٹورا پی گیا تھا' فیض! مجھے ملا نہ اسے' تھوڑا نہ زیادہ۔"
"سچ کہہ رہے ہیں آپ' جب ہی آج پھر یہاں موجود ہیں۔" لڑکے نے رسان سے کہا اور مزید روٹیاں بنانے میں مشغول ہو گیا۔
"میرا خیال ہے' ہم جس کام کے لیے آئے ہیں' وہ کر لیں۔" ماہ نور نے ابراہیم کو یاد دلایا۔ ابراہیم اور اس لڑکے

کی گفتگو کے دوران وہ کئی پرانے منظروں کو یاد کرنے میں مصروف تھی۔ اس وقت اور اس وقت کا درمیانی وقت کیا تھا ایک کیفیت "گومگو" امید وبیم' انتظار اور پھر کچھ کھودینے اور ہمیشہ کے لیے کھودینے کا احساس۔" اس نے سوچا تھا۔ کبھی کبھی ایک وقت اور دوسرے وقت کے درمیانی عرصہ میں کیسے کیسے شادیانے بجتے اور کیا کیا قیامتیں گزر جاتی ہیں وہ سوچ رہی تھی۔

"اوئے تم کس کے لیے روٹیوں کا یہ ڈھیر پکا رہے ہو؟" ابراہیم نے اس کی بات ان سنی کرتے ہوئے کہا "اس ویرانے میں کون آئے گا خالی روٹیوں کا لنگر کھانے' آوارہ کتوں' بھیڑیوں اور ہوا میں اڑتی اندھی چمگادڑوں کے سوا کون آتا ہوگا یہاں یہ روٹیاں کھانے۔"

"بڑے کوتاہ نظر ہو صاحب آپ!" لڑکا زیر لب مسکرا کر بولا۔ "یہاں تو ایک روٹی کا چوتھائی حصہ لینے کو بھی ترستے ہیں لوگ۔"

ابراہیم نے مسکرا کر ماہ نور کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ اس لڑکے کی ہوائی باتیں سنیں تم نے۔

ماہ نور کو اس وقت اس لڑکے کی باتوں میں کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی نہ ہی اس کے دعووں میں وہ جلد سے جلد سرکی کی جھونپڑی میں بیٹھے اس فقیر سے ملنا چاہتی تھی۔



"ٹھیک ہے' یہ کوئی بری علامت نہیں ہے' لیکن اس قدم کے اٹھانے کی کوئی منطق مجھے بھی تو سمجھاؤ لڑکی۔" ڈاکٹر رضا حسین نے قرمزی جلد والی کتاب کی جلد پر سنہری الفاظ میں چھپے عنوان پر انگلیاں پھیرتے ہوئے نادیہ سے پوچھا۔

"یہ۔" نادیہ نے اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر اس اسکارف کی طرف اشارہ کیا جس نے اس کے سر کو ڈھک رکھا تھا۔ "منطق تو اس کی کوئی نہیں ہے' صرف میرے ذہن کی سوچی ایک ترکیب ہے۔"

"کیسی ترکیب؟" رضا حسین نے دائیں آنکھ کی ابرو اپنی جگہ سے تھوڑا اوپر چڑھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہ کسی نئے راستے کی طرف اٹھتا پہلا قدم ہے یا تم سمجھتی ہو کہ ایک عالمگیر مذہب کی سچی پیروکار بننے کے لیے سب سے پہلے اپنا سر اور جسم ڈھانکنا ضروری ہے' یقین۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ خود کو یقین دلانے اور اس یقین کو ایمان میں ڈھالنے کا درجہ ثانوی ہے۔"

"نہیں۔ میں ایسا کچھ نہیں سمجھتی۔" نادیہ نے سر ہلایا۔ "ابھی تک میں جس اسٹیج پر پہنچی ہوں وہ یہ ہے کہ ایک اللہ ہے' ایک ایسی غیر مرئی ہستی جس کے پاس سب طاقت ہے' سب کنٹرول ہے' وہ ایک ایسی طاقت ہے جس کے ہونے سے انکار میرے لیے ممکن نہیں اور یہ کہ۔" اس نے مناسب الفاظ کا انتخاب کرنے کے لیے توقف کیا۔

"اور یہ کہ وہ جو ایک غیر مرئی طاقت ہے اور وہ "یقینا" ہے' اس کا پیغام مجھے اس کے پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا۔ اس پوری کائنات میں کیا کچھ موجود ہے' اس کائنات کو وجود میں لانے کا سبب کیا تھا اس کی ضرورت کیوں پیش آئی' اس میں موجود سب چیزوں کا نظام کیسے چلتا ہے اور کون چلاتا ہے اس کا علم بھی مجھے اسی ہستی نے دیا مجھے انسان ہونے کی حیثیت سے اس دنیا میں کیسے کب کہاں کیا کرنا ہے۔ کیا کرنا چاہیے۔ اس کا سبق بھی مجھے اسی ہستی نے پڑھایا جو خود اس کائنات کی تخلیق کا سبب تھی' جس کے لیے یہ کائنات وجود میں آئی۔"

"بہت خوب!" ڈاکٹر رضا حسین نے سر ہلایا۔ "گویا تم نے معلول سے علت کو پہچانا۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہے۔"

"شاید!" رضا حسین چونکے "شاید کے لفظ میں تو شک کا عنصر جھلکتا ہے' بے یقینی کا رنگ نمایاں ہونے لگتا ہے۔"

"بے یقینی مجھے ان سب باتوں پر نہیں' اپنے فہم کی پختگی پر ہے۔" نادیہ نے سادگی سے کہا۔ "ہو سکتا ہے میری سمجھ ابھی ناپختہ ہو' ہو سکتا ہے میں ابھی پہچان کی اصل منزل سے بہت دور ہوں' لیکن اتنا یقین ضرور ہے کہ ایک راستہ ضرور میرے قدموں تلے آچکا ہے' اب پہلے کی سی وہ کیفیت نہیں ہے کہ رنگ برنگ راستوں پر اترنے چڑھنے کا عمل جاری ہو' اور ذہن الجھن کا شکار ہو کہ میرا راستہ کون سا ہے۔"

"بہت اچھے۔" رضا حسین کو جیسے اس کے جواب سے خوشی محسوس ہوئی تھی "لیکن یہ اسکارف؟" انہوں نے نادیہ کے سر کی طرف اشارہ کیا "ہم غالباً" اس کی وجہ جان رہے تھے۔"

"ہاں یہ..... یہ میں نے اس لیے پہنا ہے کہ مجھے ایک الگ شناخت کا احساس رہے' میرا خیال ہے کہ ایک راستے کو پکڑ لینے کی بنیادی شرط یقین اور ایمان تو ہے ہی لیکن ایک الگ شناخت ہر دم انسان کو یہ احساس دلاتی رہتی ہے کہ وہ اس ہجوم سے مختلف ہے جو اس کے اردگرد ہے۔"

"لیکن بغیر پوری طرح سمجھے شناخت بنانے کا کیا فائدہ۔" ڈاکٹر رضا حسین نے کہا۔ "ہو سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں کبھی تمہیں احساس ہو کہ جو تم نے سمجھا' اصل میں ویسا نہیں ہے یا پھر یہ کہ یہ وہ راستہ نہیں جس کی تمہیں تلاش تھی' پھر تم کیا کرو گی؟ شناخت بدلنے کے عمل سے گزرو گی' اس کو سر سے اتار پھینکو گی واپسی کا سفر شروع کرو گی اور اسی مقام پر پہنچ جاؤ گی جہاں سے چلی تھیں' ایک نئے سفر کے آغاز کے لیے؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" نادیہ کے لہجے میں یقین جھلک رہا تھا "آپ نے خود ہی تو قیاس کیا کہ میں معلول سے علت تک پہنچی ہوں۔" وہ ہلکا سا مسکرائی "دنیا کے سو عظیم انسانوں کی تاریخ' شخصیت اور زندگی کے حالات و واقعات پڑھنے کے بعد جو شخصیت میرے اپنے خیال میں مجھے عظیم ترین محسوس ہوئی اور جس کے بارے میں پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ جو کچھ سکھا رہی ہے اسے جھٹلانا ناممکن ہے' اور اگر وہ شخصیت یہ کہتی ہے کہ ایک خدا ہے تو مجھے بغیر استدلال کے مان لینا چاہیے کہ وہ عظیم انسان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پھر اس کے بعد' میرا خیال نہیں کہ کبھی مجھے واپسی کا راستہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"مجھے اچھا لگا نادیہ! بہت اچھا لگا۔" ڈاکٹر رضا حسین نے بے ساختہ کہا۔ وہ نادیہ کی یہ بات سن کر اتنا پرجوش اور خوش ہو گئے تھے کہ ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

"مجھے سب سے اچھی بات یہ لگی کہ تم نے کسی وعظ' کسی نصیحت' کسی سبق کو سن کر اپنی راہ متعین کرنے کے بجائے اپنے فہم اور استدلال کو استعمال کرنے کی کوشش کی اور اپنی شناخت حاصل کی' میں ایسا ہی چاہتا تھا۔ اسی لیے درس و تدریس اور وعظ و نصیحت سے کنارہ کرتا رہا۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اجتناب پر کئی بار تمہارا دل میری طرف سے برا ہوا' لیکن یقین جانو میں ایسا ہی چاہتا تھا۔" انہوں نے نادیہ کو یقین دلانے کے انداز میں کہا۔

"میں جانتی ہوں' لیکن جو کتب آپ نے مجھے پڑھنے کے لیے دیں' کیا ان کے انتخاب میں ایک ارادہ' ایک کوشش شامل نہیں تھی۔" اس نے نظریں اٹھا کر ڈاکٹر حسین کی طرف دیکھا۔

"ہاں یقینا" اور وہ اس لیے تھی کہ مجھے اندازہ تھا کہ لاشعوری طور پر تم اس طرف جھکاؤ رکھتی ہو' میں نے وہ کتب تمہیں اس لیے دیں تاکہ تمہیں کوئی ابہام نہ رہے' شعوری یا لاشعوری رجحان کی وجہ سے تم وقتی طور پر ایک طرف نہ جھک جاؤ' ایسا جھکاؤ جس پر بعد میں تمہیں پچھتاوا ہو۔"

"میرے لیے دعا کیجیے گا ڈاکٹر صاحب!" نادیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "کائنات جیسی وسعت رکھنے والے اس موضوع پر کچھ حاصل کر سکوں' کیونکہ ایک قدم آگے بڑھانے پر مجھے روشنی کی تیز کرنیں اپنی جانب آتی

محسوس ہوتی ہیں' ایسی کرنیں جو نئی حقیقتوں کو منور کرتی ہیں اور میں اب تک کی اپنی کوتاہ بینی پر نئے پچھتاووں کا شکار ہو جاتی ہوں۔"

"پچھتاووں کا شکار ہونے کے بجائے منور ہوتی حقیقتوں کا نظارہ کرنے اور انہیں سمجھنے کی کوشش کیا کرو' تمہارے قدم تیزی سے آگے بڑھنے لگیں گے۔" ڈاکٹر رضا نے مسکراتے ہوئے کہا "جتنے برسوں سے میں یہاں رہ رہا ہوں' اتنے برسوں میں میرے پاس آنے والے لوگوں میں تم پانچویں ایسی انسان ہو' جس نے اپنے فہم اور استدلال کے بل پر کسی حقیقت کو پایا ہے۔ میرے نزدیک ایسے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں۔"

"جب انسان فیصلہ کر کے چلتا ہے کہ اسے زندگی کا کوئی راستہ حاصل کرنا ہے تو اللہ وہ راستہ اسے ضرور عطا کرتا ہے' کیونکہ اسے اپنے بندے کا ارادہ اور لگن اچھی لگتی ہے۔"

"چاہے انسان اپنے لیے کوئی بھی راستہ حاصل کرنا چاہے۔" نادیہ نے رک کر سوال کیا۔

"انسان کی فہم اور استدلال کا کیا ہے' وہ تو کوئی بھی راستہ منتخب کر سکتی ہے' میں انسان کے ارادے اور لگن کی بات کر رہا ہوں' جو اللہ کو پسند آ جائے تو کامیابی مقدر بن جاتی ہے۔" ڈاکٹر رضا نے نرمی سے کہا۔

"شاید آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" نادیہ نے کچھ دیر ان کی بات پر غور کرنے کے بعد سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اس شاید سے یقینا" تک پہنچنے کے لیے تمہیں کافی فاصلہ طے کرنا ہوگا۔" ڈاکٹر رضا نے نادیہ کے شاید پر بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا "میں تمہارے لیے دعا گو ہوں کہ یہ فاصلہ طے کرتے ہوئے نہ تمہارا سانس پھولے نہ تمہیں تھکن محسوس ہو۔"

نادیہ نے ایک بار پھر سر ہلایا اور ڈاکٹر رضا کو خدا حافظ کہہ کر ان کے کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس عمارت سے جہاں ڈاکٹر رضا کا کلینک تھا' باہر دن روشن تھا' دوپہر کی ہلکی دھوپ نے ہر طرف اپنی روشنی بکھیر رکھی تھی۔ لندن کے باسیوں کے لیے وہ ایک خوشگوار دن تھا جب ہی اس کے سامنے پھیلے راستے پر آنے جانے والے اکثر لوگوں کے چہرے پر سکون اور مزاج خوشگوار محسوس ہو رہے تھے۔

"یہاں سے دور' ہیلسنکی کے چند روزہ موسم بہار میں اپنی نوکری اور پڑھائی کے اوقات کار میں توازن پیدا کرتا شہکھر اس وقت کیا کر رہا ہوگا۔" اس کے ذہن میں اچانک خیال آیا۔

"یقینا" وہ آنے والے ویک اینڈ کو اپنی مہینے بھر کی ذرا سی بچت کے ذریعے بھرپور طریقے سے منانے کے خوابوں میں گم ہوگا۔ اس کے چہرے پر بے اختیار مسکراہٹ بکھری۔

"کسی بھی انسانی فکر سے آزاد وہ زندگی کیسی ہے' جو شہکھر گزار رہا ہے' کیا میں کبھی اسے بتا پاؤں گی کہ بے سمت چلنے والے مسافر کی زندگی زیادہ بہتر ہے یا کسی منزل کو ذہن میں رکھ کر ایک متعین راستے پر چلنے والے مسافر کی۔ میں اسے بتا تو پاؤں لیکن سمجھا کبھی نہ پاؤں شاید۔"

اس نے ایک گہرا سانس لیتے ہوئے سوچا اور اپنے شولڈر بیگ کا اسٹریپ ہاتھ میں مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھ گئی۔



"ہیلو' کیا یہ فاطمہ ذوالفقار کا نمبر ہے؟"

"آپ کون؟"

"میں جو بھی ہوں' پلیز آپ صرف اتنا بتا دیں کہ کیا یہ فاطمہ ذوالفقار کا نمبر ہے۔"

"نہیں' میں معذرت خواہ ہوں' یہ فاطمہ کا نمبر نہیں ہے۔"

"اوہ۔ پھر یہ کس کا نمبر ہے اور میری ڈائری میں فاطمہ کے نام سے کیوں لکھا ہے' شاید میں بہت لاپرواہ ہوں یا شاید میں بہت بھلکڑ ہوں۔"

"شاید آپ یہ دونوں ہوں' لاپرواہ بھی اور بھلکڑ بھی۔"

"اگر میں ایسی ہوں تو پرواہ کیوں کر رہی ہوں' بھول کیوں نہیں جاتی۔"

"یہ سوال تو آپ خود اپنے آپ سے کریں محترمہ! مجھے البتہ یہ ضرور بتا دیں کہ آپ فاطمہ سے کس سلسلے میں بات کرنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں رہنے دیں' جب یہ اس کا نمبر ہے ہی نہیں تو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔" دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا۔ خدیجہ نے چونک کر فون کان سے الگ کر کے نظروں کے سامنے کیا اور پھر آخری کال کا نمبر دوبارہ سے دیکھنے لگیں۔

"نامعلوم نمبر ہے۔" انہوں نے چشمہ آنکھوں سے اتارا "اگر محترمہ دو منٹ صبر کرتیں تو میں ان کو بتاتی کہ یہ فاطمہ کا تو نہیں خدیجہ کا نمبر ہے' خدیجہ جو فاطمہ کی بہن ہے۔ اور شاید میں واپس کال کر کے ان کو خود بھی بتا دیتی لیکن اس وقت تو میرے فون میں پیسے بھی ختم ہو چکے ہیں اور بجلی بھی۔

انہوں نے سر ہلاتے ہوئے یاد کیا اور فون واپس بیگ میں رکھ دیا۔ وہ اس وقت بجلی کا بل ادا کرنے اور پنشن لینے کے لیے بینک میں بیٹھی تھیں۔ بینک منیجر سے ان کی پرانی علیک سلیک تھی' اس کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو کر انہیں وقت گزرنے کا اندازہ نہیں ہوا۔ بینک سے نکل کر انہیں گوشت' سبزی اور پھل خریدنے تھے اور اس خریداری میں دکانداروں سے مول تول کرنا ان کی پرانی عادت تھی۔ ان کاموں سے فارغ ہوتے اور راستے بھر کے ٹریفک مسائل سے نبرد آزما ہوتے ہوئے گھر پہنچنے تک ان کے ذہن سے اس نامعلوم نمبر سے آئی کال والی بات بالکل نکل چکی تھی۔ اسی لیے وہ اس کا تذکرہ فاطمہ سے کرنا بھول گئی تھیں۔ خدیجہ ذوالفقار بڑھتی عمر کے ساتھ نسیان کا شکار ہو رہی تھیں۔



"آپ اب آئی ہیں بی بی صاحب! جبکہ فقیر کو بڑے دن پہلے سے پتا تھا کہ آپ کو آنا ہے۔" اپنے سامنے بیٹھے اختر کے منہ سے یہ بات سن کر ماہ نور نے چونک کر اسے دیکھا۔

"یہ ان لوگوں کے شعبدے ہوتے ہیں' ایسی ہی باتیں کر کے یہ خلقت کو پھنساتے ہیں' ان پر دھیان مت دینا۔" اس کے قریب بیٹھے ابراہیم نے بزبان انگریزی اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"مانا آپ نے فرونیلز سے سینئر کیمبرج کر رکھا ہے باؤ صاحب! مگر ہو سکتا ہے کہ فقیر کو آپ کی دونوں زبانوں سے زیادہ زبانوں پر عبور حاصل ہو۔" اختر ہنس کر بولا۔ "فقیر خلقت کو پھنسانے والا ہوتا تو فقیر کے تذکرے آپ اخباروں میں پڑھتے' فقیر کو ٹیلی ویژن کی اسکرین پر یہی چولا پہنے مفکرانہ گفتگو کرتے دیکھتے' فقیر کے بارے میں سنا کرتے کہ وہ اقتدار کے ایوانوں میں بسنے والوں کا پرسنل پیر ہے' اس کی ایک گالی' ایک ڈنڈے کی قیمت لاکھوں کے نذرانے کے برابر ہے' کیوں بی بی صاحب! کیا خلقت کو پھنسانے والے فقیروں کا کلٹ (Cult) ہی یہ نہیں ہے آج کل۔"

اس نے ماہ نور کی طرف دیکھا۔ ابراہیم اس کی یہ بات سن کر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ماہ نور نے سرزنش بھری نظروں سے ابراہیم کی طرف دیکھا اور پھر اختر کی طرف متوجہ ہوئی۔

"پچھلی بار جب آپ یہاں آئی تھیں تو یاد ہوگا آپ کو' میں نے آپ کو اس آنے والے وقت کے بارے میں

کچھ بتانے کی جسارت کی تھی۔"

ماہ نور نے سر جھکا لیا۔ ابراہیم سوالیہ نظروں سے ماہ نور کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور میری ان باتوں کے مکمل ہونے سے پہلے ہی باؤ صاحب آپ کو لے کر یہاں سے بھاگ لیے تھے۔" اختر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"باتوں سے بھاگ لینے کا کیا فائدہ ہوتا ہے' وقت تو پھر بھی نہیں ٹلتا۔" وہ رکا اور گڑگڑی کی چھوٹی سی نال منہ میں دبا کر کش لینے لگا۔

"میں نے کہا تھا نا' یہاں سے کوئی سراغ نہیں ملے گا۔" ابراہیم نے ایک بار پھر انگریزی زبان میں ماہ نور کو مخاطب کیا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ کا من بڑا صاف ہے' اس لیے بڑا شانت بھی ہے۔"

اختر اس بار ابراہیم کی بات نظر انداز کرتے ہوئے ماہ نور سے مخاطب رہا۔ "آپ کے دل میں نہ حسد تھا نہ رشک تھا' آپ کی زندگی میں کوئی بغض نہیں تھا' اسی لیے آپ کی زندگی بڑی پرسکون تھی۔"

"تھی؟" ماہ نور نے تیزی سے کہا۔

"ہاں تھی۔" اختر نے سر ہلایا۔ "وہ زندگی ماضی کا حصہ نہ بن چکی ہوتی بی بی صاحب تو آپ آج فقیر کی کٹیا کا رخ کاہے کو کرتیں۔"

ماہ نور نے ایک بار پھر سر جھکا لیا۔

"اس بات کے صرف چند دن کے اندر آپ کا من بھی اٹکا اور دماغ بھی قابو میں نہ رہا۔" اب وہ ایک کڑوا سچ سنانے لگا تھا۔ "پھر زندگی میں حسد بھی آیا اور رشک بھی دخیل ہو گیا' رشک اور حسد نے بغض کو بھی کہیں نہ کہیں جنم دے دیا' اسی لیے تو اب راستے میں دشواریاں بھی ہیں اور کٹھنائیاں بھی۔"

ماہ نور نے دم سادھ کر اختر کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکا' اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں' وہ اس کے اندر کی دنیا کو کھینچ کر باہر لے آیا تھا اور اس کی ذہنی کیفیت کو الفاظ میں بیان کر رہا تھا۔

ماہ نور نے اختر کے چہرے سے نظریں ہٹا کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا' اس میں اختر کا سچ سننے کی تاب نہیں تھی یا پھر وہ اپنے محسوسات پر قابو پانا چاہتی تھی۔

"باؤ صاحب ایک بار مجھ سے کہنے لگے سائیں جی! آپ نے اس لڑکی سے وہ باتیں کیوں کی تھیں میرا دل ڈر گیا ہے۔

میں نے کہا پتا ہے نا آپ کو کہ بی بی صاحب پر کڑا وقت کس کی وجہ سے آنا ہے۔ آگے سے کچھ نہ بولے بس سر جھکا کر بیٹھ گئے" وہ رک کر ذرا سا ہنسا۔

"میں نے کہا سر نہ جھکاؤ باؤ صاحب' بس من اور ذہن میں توازن پیدا کر لو تاکہ وہ اس مشکل سے بچ جائیں۔" اس نے اپنی سرخ سرخ آنکھیں ماہ نور پر گاڑتے ہوئے کہا۔

"او گاڈ!" ابراہیم جھلا کر بولا "نجانے کیا پہیلیاں بجھوائی جا رہی ہیں یہاں۔ اگر تمہیں مزید سننا ہے تو تم بیٹھو ماہ نور! میں ذرا باہر نکل کر سانس لے لوں' یہاں تو دم گھٹتا جاتا ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ضرور صاحب بہادر! آپ باہر جا کر سانس لے لو' باہر آپ کی تواضع کے لیے لنگر بھی تیار ہے۔" اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ابراہیم ناگوار سی شکل بنائے باہر چلا گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا مجھے کیا بات کرنا چاہیے۔" ابراہیم کے جانے کے بعد وہ بے بسی سے بولی۔ "مگر میں آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ شاید آپ سے پتا چلے' وہ کدھر چلا گیا ہے' اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے' آپ نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ فکر نہ کرے۔"

"میں آپ کو یہ ہی بتانے لگا تھا بی بی صاحب!" اختر نے گڑگڑی میں بجھتے انگاروں کو پھونک مار کر روشن کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے باؤ صاحب سے کہا تھا' فکر نہ کریں' وہ من بھی پالیں گے اور ذہن بھی پالیں گے' اور انہوں نے پا بھی لیا تھا' لیکن بندے کی صفت ہوتی ہے بے صبری اور عجلت پسندی' یہ بے صبری اور عجلت پسندی بندے کی آنکھوں پر گمان کی پٹی باندھ دیتی ہے۔ گمان کی بھی اور بدگمانی کی بھی' باؤ صاحب ساکن پانی پر تیرتے تیرتے' موجوں کے تلاطم سے ہڑبڑا گئے اور پٹی بندھ گئی آنکھوں پر۔ اس پٹی کو تو بس اشارے کی ضرورت ہوتی ہے بی بی صاحب۔"

"کیسی بدگمانی' کس سے بدگمانی؟" ماہ نور نے تیزی سے سوال کیا۔

"ہر کسی سے۔ اس سے بھی جس سے کوئی براہ راست واسطہ بھی نہیں۔" اختر نے آنکھوں میں آتے پانی کو انگلی سے صاف کیا' الاؤ کا دھواں اب جھونپڑی کے اندر گھسنے لگا تھا۔

"اس سے پہلے ہونے والی گفتگو میں ہی فقیر سمجھ چکا تھا باؤ صاحب اس تشکیک کا شکار ہو چکے تھے جس کے بارے میں انہیں وارننگ دی جا چکی تھی کہ اس سے نہ بچا پائے تو قدم رک جائیں گے اور زندگی ایک کوہ گراں بن کر رہ جائے گی' اپنے اپنے کوہ گراں انسان کو خود اٹھانے پڑتے ہیں بی بی صاحب! کسی دوسرے کو کیا پڑی ہے اس کے حصے کا بوجھ اٹھاتا پھرے' یہ تو آپ ہو جن کا من اٹکا اور دماغ بھی قابو میں نہ رہا۔ آپ بھی آزمائش کی زد میں آگئیں' یہ ہی تو سمجھاتا تھا باؤ صاحب کو' اپنے ساتھ بی بی صاحب کو بھی مشکل میں ڈالو گے۔ گمان سے بچ جاؤ' مگر وہ نہ سمجھے' جب ہی تو آج وہ غائب' آپ حاضر ہو' اپنے اپنے حصے کی کٹھنائیاں کاٹنے کے لیے۔"

"وہ جانے سے پہلے آپ سے ملا تھا؟" ماہ نور نے بے چینی سے کہا۔

"ہاں!" اختر نے سر ہلایا۔ "وہ ایسے ملے کہ دماغ میں بے شمار سوال تھے اور دل میں ان گنت شکوک میں نے بڑی جان ماری۔ سوال نہ پوچھو' شک میں نہ پڑو' باؤ صاحب نے کیا یہ کہ سوال پوچھے نہیں مگر دل دماغ میں سوال اور شکوک کا بنڈل سنبھالے خود منظر سے غائب ہو گئے وہ کہتے تھے۔ میں خود اس محبت کا کیا کروں گا جو خود غرض ہے۔ مگر انہوں نے شک کے بیج کی جو آبیاری شروع کر دی تھی' وہ اس سے خود کو باز رکھنے پر تیار نہیں تھے' پھر میں پیچھے ہٹ گیا۔"

"آپ نے اسے وارن نہیں کیا کہ وہ غلط کر رہا ہے۔"

"یہی تو بتا رہا ہوں بی بی صاحب! کہ وہ کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھے' جو نظر اور عقل کے سامنے شک کا پردہ حائل نہ ہو گیا ہوتا تو مجھ تک آنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہتی' نور فاطمہ کی جھونپڑی ہی کافی تھی' مگر باؤ صاحب وہاں بھی شک کا شکار ہوتے رہے۔ یہاں آئے تو شربت کے پیالے کو ہونٹوں سے لگا کر دیر تک سوچ میں گم رہے کہ پئیں کہ نہ پئیں' او بی بی صاحب۔" اختر نے کچھ سوچنے کے بعد رک کر ماہ نور کی طرف دیکھا "جب بندے پر یہ اسٹیج آجائے تو پھر اسے اس کے حال پر چھوڑنا بہتر ہوتا ہے۔ باؤ صاحب کم عقل نہیں نہ ہی ان کی نظر کوتاہ ہے' لیکن جو کچھ بھی ان کے لیے غیر متوقع تھا اس کی گہرائی میں جانے کے بجائے اس سے گھبرا گئے آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے بجائے نظریں چرا گئے' جس شخص کے لیے میں ان سے شروع سے کہتا چلا آ رہا تھا کہ اس پر شک نہ کیجیے گا۔ اسی کے بارے میں مشکوک ہو گئے' بس پھر فقیر کو پیچھے ہٹنا ہی کوئی چارہ نہ تھا۔"

"میں بہت عقل مند نہیں ہوں سائیں صاحب" ماہ نور نے سر جھکاتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں آپ کے علم

اور مصروفیت کی باتیں شاید نہ آرہی ہوں، عقل اور نظر کے پردے، انسان کی تجربہ گاہیں، نور فاطمہ کی جھونپڑی، شربت کے پیالے، ہوسکتا ہے یہ کوئی ایسے کوڈورڈز ہوں جنہیں ڈی کوڈ کرنا میرے لیے ممکن نہ ہو، لیکن میرے پیش نظر سب سے اہم بات صرف ایک ہے، میں ہر حال میں سعد کے لیے سلامتی چاہتی ہوں، میں بھی نہیں چاہوں گی کہ مجھے پتا چلے، وہ کسی مشکل میں پھنس گیا ہے، جبکہ آپ کی باتوں کو سن کر جو مطلب میری سمجھ میں آیا ہے، وہ یہی ہے کہ وہ یا تو کسی بہت بڑی مشکل کا شکار ہوچکا ہے یا ہونے والا ہے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"میں نہیں جانتی، وہ کس سے بدگمان ہوا، میں نہیں جانتی کہ وہ کس سے بھاگ رہا ہے، میں بس اتنا جانتی ہوں کہ وہ کسی بھی جگہ ہے۔ کسی بھی حال میں ہے، میرے دل کی ہر دھڑکن اس کا نام لے کر دھڑکتی ہے اور میں اپنی اس کیفیت کے ہاتھوں مجبور ہوں۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"فقیر سب جانتا ہے بی بی صاحب! آپ اس کے سامنے اپنا دل کھولو چاہے نہ کھولو، فقیر سب جانتا ہے۔ آپ کی اس کیفیت کی تشریح تو اسی لیے میں نے شروع میں ہی کردی تھی۔" اختر نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"تو بس پھر، میں آپ کی منت کرتی ہوں۔" ماہ نور نے اختر کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اپنے علم، اپنی کرامات، اپنی روحانیت کے کرشموں، اپنی معرفت یا جو کچھ بھی آپ کے پاس ہے، اس کے ذریعے کوئی ایسا عمل کردیجیے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہے۔ سلامت رہے اور ساتھ سلامتی کے واپس لوٹ آئے۔ اس کے ذہن کی ساری الجھنیں دور ہوجائیں۔"

"بی بی صاحب!" اختر ہنس کر بولا۔ "آپ کو پتا ہے کہ وہ علم، وہ کرامات وہ کرشمہ اور وہ منتر جو اس کو واپس لاسکتا ہے، وہ میرے پاس نہیں صرف آپ کے پاس ہے۔"

"نہیں سائیں جی! میں جانتی ہوں کہ اس دنیا میں، میری زندگی میں اس کا کوئی کردار ہے نہ ہوگا کیونکہ وہ جس کو اپنے مقدر کا ستارا سمجھتا ہے، وہ اونچائیوں میں چمکتا ہے میری طرح زمین کی گرد کے ذروں میں نہیں رلتا، لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں، جو ہر حال میں صرف اس کا نام لیتا اور اس کا نام لے کر جیتا ہے۔" ماہ نور کو لگا اختر جیسے شخص کے سامنے اپنی دل کی کیفیت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"آپ کے اس بے غرض جذبے نے ہی تو ڈھال بننا ہے بی بی صاحب" اختر نے کہا۔ "لیکن باؤ صاحب کی تشکیک نے ان کے راستے کے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو اکٹھا کرکے جو کوہ گراں ان کے سامنے کھڑا کردیا ہے، اس کے سامنے ان کی پیش قدمی رک جائے گی وہ رک گئے تو انہیں محسوس ہوگا کہ وہ خود بھی ایک کوہ گراں بن چکے ہیں، اس کیفیت سے اس وقت تک چھٹکارا ناممکن ہے جب تک اپنے ذہن کی گتھیوں کو نہ سلجھائیں گے۔ آپ اپنے بے غرض جذبے کی مالا جپتی رہیے، بہت ممکن ہے آپ کی یہ تسبیح ہی باؤ صاحب کو دوبارہ اپنے راستے پر واپس لے آئے۔"

ماہ نور نے بے یقینی سے اختر کی طرف دیکھا، وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا، پھر اس نے آنکھیں بند کرکے گڑگڑی کی نے منہ میں دبالی۔

☼ ☼ ☼

اصطبل کے قریب رکھے سنگی بینچوں میں سے ایک بینچ پر وہ کب سے اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کا دوست، اس کا غم گسار محمد رضوان الحق اسی صبح اس سے رخصت ہوکر واپس گیا تھا اور اس کے جانے کے بعد اس پر تنہائی اور اداسی کی، ایک نہ ختم ہونے والی کیفیت طاری تھی۔ اس کی نظروں کے سامنے پھیلے زمین کے ایک وسیع قطعے میں

سفیدے کے اونچے لمبے درخت قطار در قطار سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان درختوں سے بغیر ڈنٹھل کے چھوٹے چھوٹے جھنبھیری نما پھول ہوا کے سنگ ہلتے اپنی جگہ چھوڑتے نیچے آن گرتے تھے۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایسے ان گنت پھول نیچے گرے اور یہاں وہاں اپنی مخصوص خوشبو بکھیرتے بکھر گئے۔

"بندے کا دارو بندہ ہی ہوتا ہے۔" اس نے ایک لمبے وقفے کے بعد پہلو بدلتے ہوئے سوچا "پھل پھول، جانور، پرندے تو بس دیکھنے کے اور مصروف رہنے کے بہانے ہیں، بندہ، جنوروں سے اور پھل بوٹوں سے گلاں (باتیں) نہیں کرسکدا سکتا۔"

سوچتے سوچتے اسے لطیف مالی یاد آگیا جو پودوں کی کٹائی کرتے ہوئے، بیلوں کو دیواروں پر چڑھانے کے لیے ان کے سروں کو باندھتے ہوئے ان سے باتیں کیا کرتا تھا۔

"اللہ بخشے، چاچا لطیف، بڑیاں باتاں کرتا تھا" کہتا تھا یہ پودے، یہ درخت یہ پتے اور پھول میرے بچے ہیں، میں ان سے اپنے دل کی باتاں کرتا ہوں بڑا قسمت والا تھا۔ ان سے ہی گلاں باتاں کرکے ویلا (فارغ) ہوجاتا تھا، میرے جیسے بندہ تو اپنے ورگا (جیسا) بندہ ہی ڈھونڈتا رہ جاتا ہے، دل کی ہواڑ (دکھ) نکالنے کے لیے۔" اس نے اپنی حالت پر افسوس کرتے ہوئے سر ہلایا۔

"پھر یہ بھی بڑی عجیب گل (بات) ہے کہ سارا فارم ہاؤس اللہ خیری صلا آباد ہے، بندوں کی تو کوئی کمی نہیں ہے ادھر، پر وہ ایک بندا نہیں ملتا جس کے آگے میں اپنے دل کی ہواڑ (دکھ) پھول سکوں۔ واہ بھائی رضوان الحق! آگیا تھا جو چار دن اور نکال جاتے، میرا دل لگا رہتا، ورنہ باقی کی حیاتی اب میں نے تو بندہ ہی ڈھونڈتے پھرنا ہے دل کی بات کرنے کے لیے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔

"پر تم بھی کیا کرتے، بندے کے ساتھ پیٹ جو لگا ہوا ہے، اس ظالم پیٹ کے پیچھے بندے کو سنگی ساتھی، خوشی غمی سب چھوڑ کر اسے بھرنے کا سامان کرنے، رزق کمانے نکلنا پڑتا ہے، اچھا کیا جو تم میرے روکنے پر نہیں رکے۔ کہیں جو نوکری سے جواب ہوجاتا تو تم کیا کرتے۔" وہ اپنے ذہن کو کسی ایسی سوچ سے بچانے کے لیے جو اسے مزید غم زدہ کرنے کا باعث بن سکتی تھی، اوٹ پٹانگ باتیں سوچتا چلا جا رہا تھا۔

اسی دم اسے محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے املتاس کے جھنڈ سے جھڑے خشک پتوں پر چلتا کوئی دم بدم اس کے قریب آرہا تھا۔

"چلو جی، آگیا ماسٹر کمال۔" اس نے ان قدموں کی آہٹ سن کر دل میں سوچا "ابھی کہے گا کھاری پتر! چل جاکر ڈیری کی خبر لے، ساری نسلی بھینسیں دودھ دینا چھوڑ گئی ہیں، کریکشن (کلیکشن) والے شکایت کرتے ہیں۔ تو چل تھوڑا پیار پوچا کر، تیرا ہاتھ سیانتی (پہچانتی) ہیں، آپے سیدھی ہوجائیں گی۔" اس نے ایک بار پھر سر جھٹکا "جیسے کھاری نہ ہو وڈا پیر ہوگیا جس کا ہتھ پھر گیا تو مجیں آپ سے آپ سیدھی ہوجائیں گی۔"

اس کے کان قریب آتے قدموں کی آہٹ پر لگے تھے اور وہ ماسٹر کمال کی بلغمی آواز کا منتظر تھا۔ مگر چند لمحوں بعد اسے احساس ہوا کہ جو کوئی بھی عقب سے قریب آرہا تھا، وہ اس کے بالکل ساتھ اسی بینچ پر آکر بیٹھ گیا تھا۔

"لے اب ماسٹر گلاں کر کر کے گجی مار مارے گا۔ ویلا (فارغ) بیٹھ رہتا ہے کھاری نکما ہوگیا ہے۔" اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"کیا بات ہے تم ادھر کیوں بیٹھے ہو، وہ بھی اکیلے۔ میں ہر جگہ تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔" ماسٹر کمال کی بیٹھی ہوئی بلغمی آواز کے بجائے ایک مانوس نسوانی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"سعدیہ باؤ!" اس نے چونک کر دیکھا اور بدک کر قدرے دور ہٹ گیا۔

"اور تم نے یہ اپنا حلیہ کیا بنایا ہوا ہے کھاری! اتنے میلے کپڑے اور یہ ٹوٹی ہوئی چپل، لوگ کیا کہیں گے، کھاری

کو اپنے کپڑوں کا بھی ہوش نہیں' چلو اٹھو' اپنے کوارٹر میں چلتے ہیں۔ میں تمہیں کپڑے نکال کر دیتی ہوں' نہا دھو کر کپڑے بدلو' صاف ستھری ٹوپی پہنو۔ اباجی کہہ رہے تھے' کھاری سے کہنا۔ آج جمعہ پڑھنے ضرور آئے۔ پتا ہے آج اباجی کے جمعہ کے خطبے کے لیے میں نے اور اماں نے خود انہیں تیاری کرائی ہے۔ چلو اب اٹھ جاؤ' دیر نہ ہو جائے پھر اباجی ناراض ہوتے رہیں گے' میں نے تمہیں ان کا پیغام نہیں دیا۔"

وہ جیسے کہیں گئی ہی نہیں تھی۔

وہ ایسے تھی جیسے اس کے اور کھاری کے درمیان کوئی فاصلہ ہی نہیں تھا۔

کھاری نے بے یقینی سے ایک بار سعدیہ کو دیکھا اور ایک بار خود اپنے حلیے پر نظر ڈالی۔

"چلو نا' اب اٹھ جاؤ' جماعت کھڑی ہو جائے گی تو پہنچو گے' اباجی نے بڑا سخت ناراض ہو جانا ہے۔" سعدیہ نے اس کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ کر اٹھانا چاہا۔

"یا قسمت یا نصیب۔" محمد رضوان الحق نے کھاری سے رخصت ہوتے ہوئے کہا تھا۔

"قسمت بھی کھل گئی بھائی رضوان الحق! نصیب بھی کھل گیا۔" کھاری نے اچھلتے دل کے ساتھ رضوان الحق کو تصور میں مخاطب کیا۔ اس کے ارد گرد چھائی تنہائی' مایوسی' سناٹا اور اداسی یکدم چھٹ گئی تھی۔ اس کا دل خوشی کی ایک انوکھی لہر سے سرشار ہونے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخی پھیلی اور مسکراہٹ بھی۔

"آپ نے سعدیہ باؤ! آنے سے پہلے مینوں بتایا ہی نہیں۔" اس نے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کا دل پھر بھی بلیوں اچھل رہا تھا۔

"کیسے بتاتی!" وہ اس سے ایک قدم آگے چلتی ہوئی بولی "نہ تمہارے پاس کوئی فون تھا نہ میرے پاس۔"

"اوہو جی! میں نے تو اپنا فون آپ نوں دے دیا تھا' اس سے کر لیتیں ماسی سکینہ کے فون پر۔" کھاری چلتے چلتے رک گیا۔

"میں نے وہ فون پھینک دیا تھا۔" وہ مڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تم سادہ فون خریدنا' جس پر کوئی گانا وانا نہ سنا جا سکے۔"

"اچھا جی!" کھاری بھونچکا گیا "ٹھیک اے جی!" اس نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔ سعدیہ رخ بدل کے ایک مرتبہ پھر اس سے آگے چلنے لگی۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے سفید کاٹن کی سادہ شلوار پر آسمانی پھول دار کاٹن کی قمیص اور سوتی ڈوپٹے میں ملبوس اپنی غیر متوقع طور پر واپس آئی زوجہ کو دیکھ رہا تھا جس کے ظاہر میں اسے شادی کے بعد والا کوئی پرانا رنگ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"اج لگدا اے کہ یہ بھین جی دی بیٹی ہے۔" اس نے سوچا۔ "بدلی بدلی لگدی ہے پر جتنا بھی بدل جائے ______ یہ کدھروں (کہیں سے بھی) مولی جی کی بیٹی نہیں لگ سکتی' بے چارے بھین جی دا بڑا حوصلہ ہے کتھے (کہاں) سعد باؤ دے اباجی' کتھے مولی جی' بڑا جگرا پایا ہے بھین جی نے۔ توبہ توبہ!" وہ اپنی دھن میں سوچتا آگے بڑھ رہا تھا۔



"میں نے کہا تھا نا' یہ شخص کچھ نہیں جانتا۔ محض شعبدے باز ہے۔" ماہ نور کے اختر کی جھونپڑی سے باہر آنے پر ابراہیم نے تیزی سے اس کی طرف آتے ہوئے کہا۔ اس بار بھی وہ انگریزی زبان میں بات کر رہا تھا۔

ماہ نور نے بابے کے الاؤ سے لے کر دور تک جاتی انسانی قطار کو دیکھا جو اپنے سامنے سلور کی پلیٹیں اور کٹورے رکھے انہماک سے کھانا کھانے میں مشغول تھی۔

"آج اس نے یخنی کے انداز کا ثابت مرغ بنا رکھا ہے' کٹی سرخ مرچ اور کھٹائی والا اور میں نے اس سے لذیذ لنگر پہلے کبھی کہیں نہیں کھایا۔" ابراہیم نے سوتی رومال سے گیلے ہاتھ خشک کرتے ہوئے اسے بتایا۔ غالباً" وہ لنگر کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھونے کے بعد ادھر آیا تھا" یہ ایک نایاب کک ہے میں نے اسے اپنے ریسٹورنٹ کے کچن میں جاب کی آفر بھی کر دی ہے۔ لیکن یہ نہیں مانا' اسے اسلام آباد کی ایلیٹ کلاس کے لیے کھانا بنانے سے زیادہ یہاں اس اجاڑ بیابان میں لنگر پکانے میں دلچسپی ہے۔"

"اور تم نے اس سے کہا تھا کہ کیا یہ آوارہ کتوں' بھیڑیوں اور ہوا میں اڑتی اندھی چمگادڑوں کے لیے لنگر پکا رہا ہے تم اس کا مذاق اڑا رہے تھے ابراہیم کچھ ہی دیر پہلے۔" ماہ نور کا لہجہ درشت ہوا۔ وہ کچھ نہ بولا۔

"اب چلیں ابراہیم' دیر ہو رہی ہے!" ماہ نور نے دھوپ کا چشمہ آنکھوں پر لگایا اور گاڑی کی طرف چلنے لگی۔

"اگر آپ برا نہ مانیں بی بی! تو فقیر کا لنگر چکھ ضرور لیں' یہاں نہیں کھانا چاہتیں تو ساتھ لے جائیے۔" الاؤ پر سے توا اتار کر اسے بجھانے میں مشغول بالکا ماہ نور کو یونہی جاتا دیکھ کر اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکا۔ ماہ نور نے رک کر اس کی طرف دیکھا' وہ تیزی سے لپک کر چنگیر پر جھکا' تھوڑی دیر بعد اس نے اخبار کے کاغذ میں لپٹی آدھی روٹی میں ثابت مرغ کا نصف حصہ لپیٹ کر ماہ نور کی طرف بڑھایا۔

"باؤ صاحب شک کا شکار ہوتے رہے' یہاں آئے تو شربت کے پیالے کو دیر تک ہونٹوں سے لگائے سوچتے رہے کہ پئیں کہ نہ پئیں۔"

ماہ نور کو اختر کی بات یاد آئی' اس نے ممنون ہونے کے سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے اسے پکڑ لیا۔



اے ٹی ایم کارڈ مشین کی درز میں رکھ کر یسمی نے اپنی مطلوبہ رقم کے نمبر دبائے اور ایسا کرتے ہوئے نجانے کیوں اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا' اس ـــــ عمل پر مشین نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا "اوہ' وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا" یسمی کا دماغ گھومنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کسی نے یکایک اسے ایک گھر کی چار دیواری اور ایک چھت تلے کے نرم گرم ماحول سے نکال کر کھلے آسمان تلے بیچ سڑک پہ کھڑا کر دیا ہو۔

"رہائش' تحفظ' روٹی' اس کی نظروں کے سامنے تین لفظ گھوم گھوم کے ناچنے لگے۔ ان لفظوں کے اندر سے دن میں بھی تارے نکلتے نظر آ رہے تھے' اس نے گھبرا کر اپنی آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر اس کے شیشے اپنے اسکارف سے صاف کیے اور چشمہ دوبارہ لگا کر اس بے جان مشین کی طرف دیکھا جو اپنے پیٹ میں کڑکڑاتی نقدی لیے ایستادہ تھی۔ اسے مشین کے بٹنوں کے اوپر سرخ رنگ الفاظ چلتے نظر آئے۔

"اپنا پاس ورڈ داخل کریں۔" مشین اس سے مطالبہ کر رہی تھی۔

"اوہ میں گھبراہٹ میں پاس ورڈ ڈالنا بھول گئی شاید۔" یسمی کا اپنے حافظے پر ماتم کرنے کو دل چاہا۔ ایک بار پھر کارڈ درز میں رکھ کر اس نے وہ پاس ورڈ داخل کیا جو سارہ نے اسے ایک چھوٹی پرچی پر لکھ کر دیا تھا' اس سے مطلوبہ رقم داخل کرنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ مطلوبہ رقم کے بٹن دبانے کے ساتھ ہی مشین نے اپنے پیٹ میں ذخیرہ کڑکڑاتے نوٹوں میں سے یسمی کے مطلوبہ نوٹ اگلے۔ یسمی نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ نوٹ پکڑے۔ اس کا رواں رواں شکر گزاری میں مشغول تھا۔ کارڈ اور مشین سے نکلی رسید نکال کر اس نے رسید آنکھوں سے قریب کرتے ہوئے روشنی کی طرف رخ کیا۔ اس کی نکالی رقم کے منہا ہو جانے کے بعد بھی اکاؤنٹ میں ایک خطیر رقم موجود تھی۔

"ہاں۔ وہ دل والا ہے' اس کے پاس دل ہے اور بہت بڑا دل ہے" یسمی فٹ سے سارہ کی ہم نوا ہو گئی' اس نے

ہاتھ میں پکڑے نوٹ کارڈ اور رسید سمیت اپنے پرس میں منتقل کر لیے۔ اگلے دو ماہ تک وہ دونوں اس رقم سے بہت اچھا وقت بغیر کسی پریشانی کے گزار سکتی تھیں۔ اس نے کسی لینڈ لیڈی کے انداز میں اے ٹی ایم روم کا دروازہ کھولا اور تمکنت کے ساتھ چلتی بینک کی حدود سے باہر سڑک پر آ گئی۔ پریشانی کے بھوت اور دن میں ناچتے تارے آنکھوں کے سامنے سے ہٹ چکے تھے۔ یمی گھر کی چار دیواری اور ایک چھت تلے کے نرم گرم ماحول میں واپس آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں تو سب نوں کہنا آں سعدیہ باؤ میری عقل چھوٹی ہے' اس کو چھوٹی چھوٹی باتاں تے سمجھ آ سکتی ہیں لیکن وڈیاں باتاں (بڑی باتیں) ایہہ بے چاری نہیں سمجھ سکتی" جمعے کی نماز سے فارغ ہو کر واپس فارم ہاؤس میں آنے کے بعد کھاری نے سعدیہ کے سامنے بیٹھتے ہوئے سچائی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"تمہاری عقل چھوٹی نہیں ہے کھاری! تم جان بوجھ کر ظاہر کرتے ہو کہ تمہاری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" سعدیہ نے نیچی آواز میں کہا۔

"نہیں سعدیہ باؤ! مجھے سچی بات ہے وڈیاں وڈیاں باتاں سمجھ نہیں آتیں' پر پھر بھی میں سمجھدا (سمجھتا) ہوں کہ آپ نے واپس آنا تھا تو مجھے سنیہا (پیغام) بھجوانا چاہیے تھا۔ میں آپ نوں خود جا کر لے آتا۔ اس میں تہاڈی بھی عزت تھی' مولی صاحب کی بھی۔ تے بھین جی کی بھی۔" کھاری نے نرمی سے کہا۔

"اور تمہاری؟" سعدیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "کیا اس میں تمہاری عزت بھی تھی؟"

"میری۔" وہ ہولے سے ہنس دیا "میری کاہے دی عزت اور کاہے دی بے عزتی' میرے سارے ٹیم (ٹائم) اکو جے (ایک جیسے) ہیں۔ میرے جیسوں کو کیا فرق پڑتا ہے عزت بے عزتی سے۔"

"تمہارے بقول تمہاری عقل چھوٹی ہے کھاری! اور میرے بقول میری عمر چھوٹی ہے۔" سعدیہ نے اپنے ہاتھ کے ناخنوں پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا "حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ میں عمر میں چھوٹی ہوں نہ تم عقل میں چھوٹے ہو۔ میں نے نویں جماعت کا امتحان دیا' اس کا مطلب یہ تو نہیں نا کہ ضروری میں نویں جماعت کی عمر کی لڑکی ہوں۔ اماں نے جو حساب کتاب مجھے بتایا ہے۔ اس کے مطابق مجھے اس وقت ایف ایس سی کر چکے ہونا چاہیے تھا یا شاید اگر میں سیدھے سیدھے عمر کے مطابق پڑھ رہی ہوتی اور میرے ماں باپ کے پاس توفیق ہوتی تو میں ڈاکٹری کے پہلے سال میں ہوتی لیکن اماں' ابا جی کی خواریوں اور مجبوریوں کی وجہ سے میں آج لوگوں کے خیال میں دسویں جماعت کی عمر کی لڑکی ہوں۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"اسی طرح تم ہو۔" اس نے سر اٹھا کر کھاری کی طرف دیکھا "تمہیں بھی اندازہ نہیں کہ تم کتنے عقل مند اور سمجھ دار ہو' تم کتنے ذہین ہو۔ اس لیے کہ تمہیں یہ بات بتانے والا کوئی نہیں۔ جتنے تم ذہین ہو' اگر حالات تمہارے حق میں ہوتے تو آج تم کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی میدان میں بڑا نام کما رہے ہوتے۔ تمہاری ذہانت اس فارم ہاؤس کی چار دیواری کے اندر پل بڑھ کر جوان ہوئی۔ بھینسیں' چارا' دودھ' سبزیاں' پھل' پھول' ٹرک لوڈ کراتے اور ان لوڈ کراتے کراتے وقت گزر گیا' پھر بھی تم نے یہ نکتہ سمجھ لیا کہ خیریت اسی میں ہے کہ جتنی باتیں تمہاری سمجھ میں آتی ہیں' انہیں ظاہر نہ ہونے دیا جائے اور ایک کم عقل' جاہل کا سا انداز بنائے رکھا جائے' یہ بھی تو تمہاری ذہانت کی اعلا مثال ہے نا۔" سعدیہ افسردگی سے مسکرائی اور اس نے تائید طلب نظروں سے کھاری کی طرف دیکھا۔

"او نہیں سعدیہ باؤ!" میں اتنی عقل والا ہوتا تو پکا پکا یہ کیوں سمجھ لیتا کہ آپ اب کبھی ادھر واپس نہیں آؤ گے' میں نے تہاڈے ساتھ نکاح چوہدری صاحب کی زور زبردستی میں آ کر کیا تھا۔ اور بھین جی کے جوڑے ہتھ کھولنے کے لیے بھی" اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔

"جے یہ دونوں میرے ساتھ انج نہ کرتے تو آپ لکھ ترلے ڈال کر دیکھ لیتیں میں نے کدی نہیں ماننا تھا۔" اس نے سعدیہ کی اس خوش فہمی کو ہوا میں اڑایا جس کے مطابق کھاری سعدیہ کی ڈرامائی اپیلوں کی وجہ سے نکاح سے انکار نہیں کر سکا تھا۔

"میرے تے چوہدری صاحب تے بھین جی کا بڑا احسان ہے سعدیہ باؤ! ایک نے مینوں زندگی دی' الف ب پڑھائی تے دوسرے نے کتاب دا علم دتا۔ میں ان دونوں کی گل نہیں موڑ سکتا تھا۔ پر جب نکاح ہو گیا تے مولی جی کے نکاح دے خطبے دی سمجھ آپ کے جانے کے بعد آئی۔ نکاح دے دو بول دو بندوں کے دل جوڑ دیتے ہیں۔ بھانویں وہ اس سے پہلے ساری عمر کبھی ملے بھی نہ ہوں۔ آپ بھین جی دے پاس چلے گئے' مینوں پتا تھا' بھین جی آپ نوں وہ ساریاں باتاں بتائیں گے جو انہوں نے مجھے بتائی تھیں' مجھے پکا یقین ہو گیا تھا۔ آپ وہ باتاں سننے کے بعد مڑ کر واپس نہیں آؤ گے۔ آپ شناخت لینے نکاح کرانے پر تیار ہو گئے تھے' شناخت آپ کو بھین جی کی باتوں میں مل جانی تھی' شناختی کارڈ تو آپ کا ادھر ہی اڑا پھرتا تھا' آپ کو پتا نہیں تھا۔ میں نے پکا سوچ لیا تھا جب آپ کو پتا چل جائے گا کہ آپ کون ہو تو پھر ماڑے غریب افتخار احمد ولد نامعلوم کی زوجہ بن کر کس نے حیاتی ضائع کرنی ہے اپنی!" کھاری کی آواز رندھنے لگی۔

"جب یہ سوچ لیا تو پھر نکاح کے خطبے کی سمجھ آئی' نکاح کے دو بولوں نے آپ سے جو میرا تعلق جوڑا تھا' اس سے ہی مجھے پتا چلا تھا کہ کوئی اپنا ہو تو کیسا محسوس ہوتا ہے' آپ کے ساتھ میرا رشتہ بن گیا تھا۔ آپ گانے سننے' فیشن کرنے دے شوقین بن گئے تے میرا بھی دل کہتا میں شوق پورے کرنے دے قابل ہو جاؤں پر ابھی آنکھوں میں سپنے اترنے ہی لگے تھے کہ آپ نے بھین جی دا درس سن لیا۔ آپ بھین جی توں بد ظن ہو گئے تھے' فیر میرا دل نہ کہتا کہ میں اپنے سپنے سنبھالتا پھروں' آپ نوں بھین جی کے پاس بھیج دیا' مجھے پکا یقین تھا' آپ نے اس کے بعد مڑ کر واپس نہیں آنا پھر بھی بھیج دیا۔ آپ کے جانے کے بعد سارا فارم ہاؤس ویلا (خالی) ہو گیا' سارے جی (لوگ) ادھر ہی رہتے کام کرتے پھرتے تھے پر مینوں لگتا کوئی نہیں ہے' اک کلی میری جان ہے جو ادھر ویرانے میں رہتی ہے۔ میں ہوکے بھردا (آہیں بھرتا) اپنی قسمت کو روتا' کوئی کام نہ کرتا وقت گزار رہا تھا۔ مجھے اپنے اگلے وقت میں کچھ نظر نہیں آتا تھا' گھپ اندھیرا میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ میں ازلی بدنصیب' نہ ماں نہ پیو' نہ کوئی بھین نہ بھائی' نہ کوئی آگا نہ پیچھا' واحد جان اپنی۔ آہا!"

اس نے سر ہلاتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔ اس کی باتیں سنتے ہوئے سعدیہ کا دل بھرنے لگا۔

"اتنے دکھ سے بھرے دل کے دکھ کا مداوا کیونکر ہو پائے گا۔" اس نے گھبرا کر سوچا۔

"جے میں اتنی عقل رکھتا ہوتا سعدیہ باؤ! جتنی وڈی آپ میری بتاتے ہو تو آس تو نہ چھوڑتا' ہوکے تو نہ بھرتا' بھائی رضوان الحق کو ایکسپریس فون کر کے یہاں بلا کر اپنے رونے تو نہ سناتا' وچارہ (بیچارہ) سارے کم کاج چھڈ کر کے میرے پیچھے بھاگا چلا آیا۔" کھاری نے افسردگی سے سر ہلایا۔

"بس ثابت ہو گیا نا کہ میں کم عقلا' تے انا (اندھا) ہوں۔" اس نے سعدیہ کی طرف دیکھا۔

"تمہارے لیے یہ صورت حال ہی ایسی تھی کھاری! کہ تم اس کے علاوہ اور کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔" سعدیہ نے اسے تسلی دینے کی ایک کمزور سی کوشش کی "میں دیکھو کتنی بے وقوف ہوں' اماں مجھ سے کہتی رہیں۔ کھاری کو پیغام بھیجو' آ کر مل جائے' میں نے فون پیچھے کھیتوں میں پھینک دیا۔ تمہیں پیغام کیسے دیتی مگر نہیں۔" اس نے

نفی میں سرہلایا۔ ”دے دیتی تو تم اس مشقت سے بچ جاتے۔“

”چلو جو وی گل بات ہے۔“ کھاری نے اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں کچھ دیر چھپا لینے کے بعد ہاتھ چہرے پر پھیرتے ہوئے کہا ”سچی گل تو ابھی بھی یہ ہے سعدیہ باؤ! میں کسی طرح وی (بھی) آپ دے قابل نہیں میں بے حیثیتا‘ بے شناختا بندہ تے کسی دے بھی قابل نہیں‘ آپ تو سعدیہ باؤ ہو‘ بھین جی دی بیٹی‘ آپ دے تو میں کسی طرح بھی قابل نہیں۔“

”ہاں اب لگ رہا ہے جیسے واقعی تم نے عقل گھاس چرنے کے لیے بھیج دی ہے۔“ سعدیہ مسکرائی‘ کھاری نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”خود کہتے ہو‘ نکاح کے دو بولوں میں واقعی بڑی تاثیر ہوتی ہے اور خود ہی اس کو جھٹلانے پر اتر آتے ہو۔ میاں بیوی کے رشتے میں حیثیت اور شناخت کا کیا دخل ہے پاگل‘ نکاح کے دو بول‘ میاں بیوی کی ازدواجی حیثیت ایک برابر کر دیتے ہیں۔“

سعدیہ‘ آپا رابعہ کی زبان بولنے لگی تھی‘ اتنے دن ان کے ساتھ ماضی کی کتاب کے اوراق الٹتے گزرے تھے‘ زبان پر اثر کیسے نہ ہوتا۔

”اور پھر تم کیسے بے عقل ہو‘ میراثیوں کے سرپنچ کی نواسی کو اپنے سے بڑھ کر حیثیت دار سمجھتے ہو۔“ وہ ہنسی۔

”آپ نوں اندازہ ہے سعدیہ باؤ! بھین جی اور مولی صاحب آپ کی جان سنبھال کے کدھر کدھر کھجل خوار (خوار) ہوتے رہے۔“ کھاری نے کہا۔ ”میرے تو جو اپنے تھے اگر کوئی تھے وہ مجھے بس اسٹاپ پر پھینک گئے چاہے ادھر مینوں بلیاں کھاتیں کہ کتے پھاڑتے‘ ان کی جان تے چھٹ گئی نال میرے سے‘ بس یہ ہی فرق ہے حیثیت کا سعدیہ باؤ بھین جی اور مولی صاحب آپ کو جان سے لگائے خون دی وگدی نہر پار کر آئے اور مینوں کتے بلیوں دے اگے ڈال دیا گیا۔ باقی کس دی جد (آباؤ اجداد کی ذات صفات) کیا ہے تے نسل کون سی ہے‘ اس نال کوئی فرق نہیں پڑتا‘ فرق بس ایسی حیثیت نال پڑتا ہے کہ بندہ کسی کے واسطے کتنا لازمی (اہم) ہے۔“

”تم نے ماں کی کہانی غور سے سنی ہوتی تو یہ گلہ بھی دل میں نہ پالتے۔“ سعدیہ نے کہا ”کتنے حیثیت والے ہوں گے وہ سعد صاحب! میں نے تو خیر نہ دیکھا ہے نہ جانتی ہوں بس سنا ہی ہے‘ تم نے تو دیکھا بھی ہے‘ سنا ہے سب کچھ کے مالک ہونے کے باوجود کوئی سکون نہیں انہیں‘ دربدر بھٹکتے پھرتے ہیں اسے پانے کے لیے جو ایک چیز انہیں نہیں ملی۔ اللہ سے خیر مانگو کھاری اللہ اپنی جانب سے اور کچھ دے نہ دے دل کا سکون ضرور عطا کرے۔“

”او آہو‘ میں تے بڑا چنگا ہوتا تھا۔“ سعدیہ کے لہجے اور انداز کی سادگی نے کھاری کو پرانی جون میں واپس لا کھڑا کیا ”بڑے سکون دی نیند سوتا تھا‘ بڑے آرام سکون امن امان کے نال دن گزارتا تھا‘ نہ کوئی فکر نہ فاقہ پر یہ جو بیچ میں وڈے وڈے کنڑفیوژن آ گئے تو میں بوتر (بوکھلا) گیا‘ لو دسو بھلا کھاری غریب کی اتنی اوقات ہے کہ کنڑفیوژن بھی آئیں اور وہ سلامت بھی رہے۔“

”اچھا تو پھر اب بتاؤ‘ اب کیا حال ہے‘ کنفیوژن ختم ہوا کہ ابھی بھی ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”پہلے آپ بتاؤ‘ آپ سچی مچی واپس آ گئے ہو؟“ کھاری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“

”ہن مڑ کر تے نہ چلے جاؤ گے؟“

”نہیں۔ کبھی بھی نہیں۔“

”کوئی اندیشہ‘ کوئی گال الاہما (شکوہ شکایت) کوئی پچھتاوے تو نہیں؟“

”نہیں‘ کیونکہ نکاح کے دو بولوں میں بڑی طاقت ہے‘ جو میاں بیوی کو ایک جیسی ازدواجی حیثیت میں لا کھڑا کرتی ہے۔“

”بڑا چنگا کیا سعدیہ باؤ! صاف صاف بتا دیا‘ نہیں تو کنڑفیوژن اور دودھ (بڑھ) جاتا تھا پہلی بار کھاری کے دانت نکلے ”ہن کوئی کنڑفیوژن نہیں‘ قسمے ہن کوئی کنڑفیوژن نہیں۔“

اس نے خوش ہوتے ہوئے سعدیہ کے دونوں ہاتھ گرمجوشی سے پکڑ لیے۔

”اب ہم دونوں مل کر فارم ہاؤس کی چاکری کریں گے‘ مجھے سبزیاں اور پھل توڑنے کا بڑا شوق ہے۔“ سعدیہ نے کہا۔

”او نہ جی نہ‘ میں نے نہیں سبزیاں پھل تڑانے آپ سے۔“ کھاری نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اور بھی مضبوطی سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا ”ہتھ لہو لہو ہو جاندے ہیں کانٹوں نال لگ کے نہ۔“ اس نے سرہلایا ”چاکری میں کراں گا‘ تسی بس پڑھائی کرو‘ جتنا دل کرتا ہے پڑھو۔“ وہ لگاوٹ سے بولا۔

سعدیہ مسکرا دی۔



”تم ابھی تک کنوارے کیوں ہو‘ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟“ وودن زادے نے اپنے نئے دوست کے اس سوال پر گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

”اگر یہ ہی سوال میں تم سے کروں تو؟“ اس نے اپنی مسکراہٹ ہونٹوں تلے دباتے ہوئے کہا۔

”پہلے سوال کرنے والے کو جواب پہلے۔“ اس کے دوست نے آنکھیں میچتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں بھی تمہارے سوال کا جواب ضرور دوں گا‘ تم فکر مت کرو‘ لیکن پہلے تم بتاؤ۔“

وہ دونوں برک اے بریک ہالیڈے کاٹیج کے عقبی لان میں بیٹھے تھے۔ سکی ڈائیونگ کے لیے ڈریم میں گزارنے والے وقت کے لیے اس کاٹیج کا انتخاب سعد سلطان نے یہاں آنے سے پہلے کیا تھا اور وودن زادے سے سٹین ہوپ کے ایک کیفے میں ملاقات کے دوران اس نے اس کا ذکر وودن زادے سے کیا تھا۔ وودن زادے کو سعد سلطان کا یہ انتخاب پسند آیا تھا اور اب وہ بھی اس کے ساتھ اس کاٹیج میں ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ کاٹیج دو سو سال پرانے سٹین ہوپ محل کی شکارگاہ کے لاؤنج میں بنایا گیا تھا۔ وودن زادے کو اس کاٹیج کے انتخاب میں سعد سلطان کے مزاج کی جھلک نظر آئی تھی۔

”یہ شخص قدامت پسند ہے اور اسے فنون لطیفہ میں دلچسپی ہے۔“ اس نے برک اے بریک ہالیڈے کاٹیج کا نام سننے کے بعد سوچا تھا اور یہاں آ کر اس سنگی کاٹیج کے اندرونی طرز تعمیر‘ اس کی لکڑی کی چھتوں‘ انگل نک آتش دانوں‘ سجاوٹی نوادرات اور قدیم طرز کی کھڑکیوں اور دروازوں کو دیکھ کر اس کے سعد کے مزاج کے بارے میں قیافہ کو مزید تقویت ملی تھی۔ وہ پچھلے دو دن سے اکٹھے یہاں رہ رہے تھے۔ وودن زادے کو پاکستان کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ سعد نے اسے انٹرنیٹ کے ذریعے نہ صرف پاکستان بلکہ ایران کی بھی سیر کرا دی تھی۔ وودن زادے کو اپنی زندگی میں ملنے والا یہ پہلا پاکستانی خاصا اچھا لگا تھا۔

”ہاں‘ تمہیں زندگی کے بہت سے موضوعات پر عبور حاصل ہے۔ تم سے ملنے کے بعد مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں اب تک کنویں کے مینڈک کی سی زندگی گزار رہا ہوں۔“

”ہمارے ساتھ رہو گے تو یوں ہی عیش کرو گے۔“ جواب میں کسر نفسی سے کام لینے کے بجائے اس نے وودن زادے کو آنکھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

”ویسے مجھے کیوں ایسا لگ رہا ہے کہ سکی انگ کا صرف بہانا ہے‘ دراصل تم صرف اس برک اے بریک کاٹیج

میں رہنے کے لیے ویرڈیل آئے ہو۔" وودن زادے نے وودن اس کے سکی انگ ریزارٹ جانے کے بجائے اس گاؤں میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہنے پر مذاق سے کہا تھا۔

"پینالٹنز کے مشرقی حصے میں واقع "ویرڈیل" میں آکر قیام کرنے کا اصل مقصد اس موسم میں کیا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے سوائے ویرڈیل سکی انگ کلب کے سیزن کا مزا لوٹنے کے۔" جواب میں وہ مسکرا کر بولا تھا۔ یہ وودن تو میں نے صرف اپنے ہاتھ اور بازو کھولنے میں گزارنے ہیں۔

"لیکن تم نے میرے سوال کا جواب گول کر دیا، بتاؤ، تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

"عورت کی وجہ سے۔" وودن زادے نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ "امریکن عورت ناقابل اعتبار ہے اور ایرانی عورت۔" اس نے اپنے سامنے کھڑے سعد سلطان کی طرف دیکھا "وہ امریکن عورت کی طرح ہی ناقابل اعتبار ہے۔" اس نے اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"تم امریکن عورت کو چاہے جو مرضی کہو لیکن ایرانی عورت پر لعنت مت بھیجو کیونکہ وہ تو پھولوں کے دیس کی باسی ہے جس کے وجود سے پھولوں کی خوشبو آتی ہے، پراسرار مشرق کے پراسرار پھولوں کی خوشبو۔" جواب میں وہ یکدم بلند آواز میں بولا تھا۔

"مجھے علم نہیں۔" وودن زادے نے سرہلاتے ہوئے کہا "میں ایرانی عورت سے صرف اپنی ماں، بہنوں، نانی، دادی اور ایک پھوپھی کی حد تک واقف ہوں، یہ چھ عورتیں خالص ایرانی تھیں، ان کی اگلی نسلیں مخلوط ہو چکی ہیں اور یہ چھ کی چھ خالص عورتیں بھی امریکی عورتوں کی طرح ہی تھیں، ناقابل اعتبار، بے وفا، ناقابل بھروسا۔"

"پھر مجھے کہنا چاہیے کہ تمہارا تجربہ اور مشاہدہ بہت محدود ہے، نہ ہونے کے برابر۔" جواب میں وہ شانے اچکا کر بولا۔

"ہاں، وہ تو ہے، تم سے مل کر مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔" وودن زادے نے سچائی کے ساتھ اعتراف کیا۔

"اسی لیے میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا کہ تم ایرانی عورتوں پر لعنت بھیجو۔" وہ قطعیت سے بولا۔

"چلو، ٹھیک ہے میں انہیں کچھ نہیں کہتا۔" وودن زادے صلح جو انداز میں بولا۔

"ویسے یہ ہے کہ میں آج کل کے حالات میں ایرانی قوم کے بے لچک رویے پر خوش بھی ہوتا ہوں، چاہے کوئی اسے اس ملک کی ضد کہے، ہٹ دھرمی کہے مگر یہ ایک قوم کی خودداری ہے خواہ وہ ضد ہو یا ہٹ دھرمی۔"

"اسی لیے تو میں تمہیں ان کے بارے میں کچھ کہنے کی اجازت نہیں دوں گا، اس زمانے میں جب دنیا بھر کے ملک علامتی طور پر ہی سہی ایک عالمی طاقت کے سامنے جھک جاتے ہیں، اس ملک کے بے لچک رویے میں اس سے متاثر ہونے کا خاطر خواہ مواد موجود ہے۔" وہ اپنے ڈی ایس ایل آر کیمرے کے لینس کو صاف کرتے ہوئے بولا۔

"چلو خیر، یہ تو ایک ایسا موضوع ہے جس پر میں زیادہ بات نہیں کر سکتا کیونکہ اس پر میرا علم بہت کم ہے، لیکن عورت ہاں عورت۔" اس نے سعد کی طرف دیکھا "عورت امریکی ہو یا ایرانی، فرانسیسی ہو یا جاپانی، بے اعتبار ہوتی ہے ناقابل بھروسا۔"

"دیکھو تم پھر مشرق کی عورت پر الزام لگا رہے ہو۔" سعد نے انگلی اٹھا کر اس کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھئی، میرا اپنا تجربہ ہے۔" اس بار وودن زادے نے پروا نہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں امریکی شہری ہوں اور عورت کے سارے روپ دیکھ چکا ہوں، اس معاملے میں شاید میرا تجربہ تم سے زیادہ ہے، تم جو ایک جدید پاکستانی دکھتے ہو مگر شراب نہیں پیتے ٹی ٹوٹلر ہو۔"

"ایک دو یا دس عورتوں کے تجربے کو تم سب پر لیبل نہیں کر سکتے۔" سعد نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"جو بھی ہے۔" وودن زادے نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنے تجربوں کی روشنی میں، میں ایسا ہی ہوں اور ایسا ہی رہنا چاہتا ہوں، عورت سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے، وہ کون سا گھر بناتی اور بچے سنبھالتی ہے، ہر چھ ماہ کے بعد دسیوں گھر ٹوٹتے اور بکھر جاتے ہیں۔"

اپنی بات کے جواب میں خاموشی پر وودن زادے نے کن انکھیوں سے سعد کی طرف دیکھا، اس کا خیال تھا کہ جواب میں وہ مزید بھڑکے گا لیکن وہ خاموشی سے سر جھکائے کیمرے کا لینس صاف کرنے میں مصروف تھا۔

اب تم بتاؤ، تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" وودن زادے نے خاموشی توڑنے کی خاطر کہا۔

"میں نے" سعد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا "میں نے اس لیے شادی نہیں کی۔" سر دوبارہ جھکا کر اپنے کام میں مشغول ہوتے ہوئے اس نے کہا "کہ میری ابھی شادی والی عمر نہیں ہے، میں ابھی چھوٹا ہوں۔"

ہنسی بے اختیار وودن زادے کے منہ سے پھوٹی تھی، اس کا نیا دوست بھی فنون لطیفہ میں دلچسپی رکھنے کے ساتھ ساتھ فن ظرافت میں بھی دلچسپی رکھتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کھاری جمعہ پڑھنے آیا تھا، میں نے جمعہ کے بعد دوپہر کے کھانے کے لیے اسے بہت روکا مگر نہیں رکا۔ پتا نہیں اسے کس لیے اتنی جلدی تھی۔" مولوی سراج سرفراز نے آپا رابعہ کو بتایا۔

"اس کا گھر دوبارہ سے بسنے جا رہا تھا۔ خدا جانے وہ جمعہ پڑھنے کیسے آگیا۔" آپا رابعہ سوچ رہی تھیں "شکر ہے، جو آ گیا نہ آتا تو مجھے ایک اور غم نے آگھیرنا تھا کہ سعدیہ نے اسے آنے کو کہا نہیں یا وہ نہیں آیا۔"

"بہتر نہ ہوتا اگر کھاری خود آتا اور سعدیہ کو لے جاتا، سعدیہ اکیلی کیوں گئی۔" مولوی صاحب نے آپا رابعہ کی طرف دیکھا۔

"اس کا خیال تھا کہ اسے خود سے چلے جانا چاہیے، کھاری تو گھبراتا شاید کبھی نہ آئے۔"

"کھاری کیوں گھبراتا رہا، اسے کیا مسئلہ تھا؟" مولوی سراج نے پوچھا۔

"خود اعتمادی کی کمی کا شکار ہو گیا تھا بس۔" آپا رابعہ کو مولوی سراج کا یوں سوال کرنا کھل رہا تھا۔

"ٹھیک ہے پھر میں اب عصر پڑھانے جا رہا ہوں۔" مولوی سراج کو شاید آپا رابعہ کا جز بز ہونا سمجھ میں آگیا تھا وہ سر پر رومال باندھتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مولوی سراج کو کیا بتاؤں کہ سعدیہ نے عقل کو ہاتھ ڈال لیا، اسے سمجھ آگئی کہ زندگی حیثیت اور بے حیثیتی کا نام نہیں، زندگی اس چیز کا نام ہے کہ انسان کب کہاں اور کیسے سمجھ داری کا ثبوت دیتا ہے۔ اپنے نفع نقصان کو سمجھ جاتا ہے۔ میں مولوی سراج کو کیا سمجھاؤں کہ ساری عمر پیچھے مجھے بھی اب سمجھ میں آیا ہے کہ سعدیہ عمر میں مجھ سے کہیں چھوٹی مگر عقل میں مجھ سے کہیں آگے ہے۔ جو باتیں وہ چند دنوں میں سمجھ گئی وہ باتیں اگر میں نے اتنے سالوں میں تھوڑی تھوڑی کر کے سمجھائی ہوتیں تو آج وہ عقل، شعور اور فہم میں ہم سے اور بھی کہیں آگے ہوتی۔ بس!" سر کو تاسف سے ہلاتے ہوئے انہوں نے سوچا "آج خود پر نظر ڈالوں تو لگتا ہے سارا قصور ہی میرا ہے۔ میرا تو وہ حال ہے، جو سارے سیانے مرجائیں تو کملا بھی سیانا بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ جو چند سال میں نے اس سمجھ دار، باشعور، سلیقے سبھاؤ والی بی بی کے ساتھ گزار لیے تو میں نے سمجھا کہ میں ازلی کملی بھی عقل کل بن گئی ہوں۔ اس کے بعد زندگی کے معاملات کی ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ گویا نظام سقے کی حکومت دائمی ہو گئی۔ مولوی سراج سرفراز بے چارے کی زندگی بھی اپنے انگوٹھے تلے کرلی اور سعدیہ بیچاری کو بھی اپنی فہم کے ہنٹر مار مار کر سدھاتی رہی۔"

"آہ ہا۔" انہوں نے ایک سرد آہ بھری "اب جو اپنے اصل پر نظر پڑتی ہے تو شرم سے گھٹ جاتی ہوں۔ کانے کوے والا حساب لگتا ہے اپنا' جو سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ عمر بھر اپنے تھیلے میں جو بلیاں چھپائے سعدیہ کی نظروں سے بچاتی رہی جب وہ ہی بلیاں اس کے سامنے نکالنی پڑیں تو وہ بولی "کاش اماں! آپ نے مجھے بہت پہلے بتا دیا ہوتا۔ میں اپنے خوابوں کی دیوار کے کنگرے اتنے اونچے بناتی نہ ان پر بیل بوٹے کھینچتی۔" سعدیہ کا یہ جملہ تھا کہ ایک طمانچہ۔ سالوں زن سے میرے رخسار پر آن پڑا۔ جو اس کی جگہ میں ہوتی اور اس عمر میں ہوتی جس میں وہ ہے تو چیخ چیخ کر بین ڈال ڈال کر ہف تھک جاتی لیکن وہ بولی "اماں! پیچھے جا کر ایک دفعہ تو دیکھنا تھا جو آپ دیکھ کر بھاگی تھیں' اس کے بعد کیا ہوا تھا۔" آج کی بچی ہم سے کہیں زیادہ بہادر نکلی' زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے والی' جب ہی تو اس نے سوچ لیا کہ کھاری کے ساتھ زندگی گزارنے میں آسانی رہے گی اور چلی گئی۔ وہ بات' جو میں عمر بھر سراج سرفراز کے بارے میں نہ سوچ سکی۔ بس ثابت ہوا کہ میں ہی احمق تھی' میرے سارے عمل الٹے اور ناپختہ تھے جب ہی آج بھی دل کو کوئی سکون نہیں ہے' جب ہی آزمائش آتی ہے اور آکر ٹھہر ہی جاتی ہے۔ پہلے لگتا تھا سعدیہ آزمائش ہے' اب لگتا ہے وہ آزمائش بن گیا ہے۔ جو دو گھڑی غائب سے نظروں کے سامنے حاضر ہوا اور پھر نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا' دل کا بچا کھچا قرار لوٹ کر۔ آنکھوں کی رہی سہی نیند چھین کے۔ وہ نجانے اب کس پردے کے پیچھے پھر سے غائب ہو گیا اور میں دریا کے سامنے کھڑی پیاسی کی پیاسی رہ گئی نہ کسی پل چین ہے نہ کسی پل قرار ہے۔" وہ اٹھ کر بے چینی سے ٹہلنے لگیں۔

"کیا کروں اور کہاں جا کر ڈھونڈوں' ماہ نور نے کہا تھا' وہ مجھے جلد واپس آکر بتائے گی مگر اب تو اس کی بھی کوئی خیر خبر نہیں۔ کھاری ملے تو اس سے کہوں' ماہ نور کا تو پتا لے۔ کہاں رہ گئی۔"

انہوں نے اپنی تھکی ہوئی آنکھوں سے دیوار کے اس کونے کو دیکھا جس پر لگے جالے کی مکڑی اپنے تار تیزی سے بنتی اوپر اوپر اور اوپر چلی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں کہتی تھی تم سے نہ کوسا کرو سراج سرفراز کو' نہ کہا کرو اسے کم بخت اور منحوس' دیکھ لو' اس روز وہ نہ ہوتا تو یہاں چار قتل ضرور ہوئے ہوتے' ایسے چار قتل جن کا نہ کوئی پرچا کٹتا' نہ کوئی مدعی ہوتا نہ گواہ اور قاتل حسب معمول چھریاں لہراتا اسی محلے میں دندناتا پھر رہا ہوتا۔"

"اب چپ کیوں ہو' بولتی نہیں' کہیں وہ تمہاری زبان کاٹ دینے میں کامیاب تو نہیں ہو گیا' وہ جو چھریاں لہراتا آیا تھا مگر اسی سانڈ نما سراج سرفراز نے اسے بھگا دیا تھا۔"

"اچھا ہی تھا زبان کاٹ جاتا' کم بخت غلط موقع پر غلط بات کر جاتی ہے۔"

"کاٹ ہی جاتا جو تمہاری زبان اس کی چھریوں سے تیز نہ ہوتی' مگر یہ آج موقع اور بات کی غلطی کا احساس کیسے ہونے لگا تمہیں۔۔۔؟"

"بس ہو گیا اور سچ جانو' مجھے تو یہاں رہتے اب ڈر لگتا ہے۔ وہ کہیں گیا نہیں' یہیں ہے اور پھر آئے گا' یہ بے چارہ سراج سرفراز کب تک اسے بھگائے گا' اب کے وہ آیا تو سب سے پہلے اسی کی گردن اتارے گا۔"

"ہاں! اس بے چارے کے لیے تو میں بھی پریشان ہوں' ابھی تو وہ اسے کچھ نہیں کہے گا۔ تازہ تازہ بات ہے لیکن جیسے ہی ذرا ٹھنڈی پڑی سب سے پہلے اسی کا قصہ ختم کرے گا۔"

"وہ خود چپ ہو کر بیٹھا ہے' مگر محلے والوں کی زبانیں اپنی سان پر تیز کر رہا ہے۔ جو اٹھتا ہے' یہ ہی کہتا ہے' یہ محرم سراج سرفراز ادھر آکر کیوں بیٹھ رہا ہے دو جوان عورتوں کے گھر میں۔"

"ہاں ہر طرف سے گھیرے میں آ گئے' اوپر سے ان کو بھی کاروباری مسائل نے یکدم ہی آن گھیرا' ورنہ وہ تو بچے کی پیدائش کے فوراً" بعد یہاں سے ہمیں نکال لے جانا چاہتے تھے۔"

"طیفا لاٹر جان کا دشمن' سراج سرفراز نامحرم' منے کے ابا کا کاروبار مندے میں' تمہارا اگانا بجانا ختم۔ ہر طرف سے گلی بند۔ جائیں تو جائیں کہاں۔"

"ماں ہوں' ممتا منہ پکڑ لیتی ہے لیکن کوئی دوسرا نے تو کہے یہ بچہ ہی منحوس ثابت ہوا۔"

"ہائے تمہارے منہ میں خاک' بچہ کیوں منحوس ثابت ہونے لگا' ہمارا منا تو مبارک ہے' خوش قسمت ہے' اس کا آنا سعد ثابت ہو گا۔ دیکھ لینا' اس کے ماتھے پر قسمت کی لکیر چمکتی ہے' اس کی آنکھوں کے صدقے جاؤں جن میں سے روشنی کی کرنیں نکلتی ہیں' مولا خوش رکھے اسے' سدا سلامتی دے اس کے شملے اونچے رہیں' خبردار جو اس کو منحوس بولا کوئی۔"

"کبھی کبھی تو مجھے ایسا لگتا ہے میں نہیں' تم ہی اس کی ماں ہو۔"

"ہاں تو مانتا کون ہے کہ میں اس کی ماں نہیں' تم ماں ہو بھی نہیں سکتیں' جو اپنے بچے کو منحوس کہے وہ ماں نہیں ہوتی۔"

"اس کا باپ بھی تمہاری باتوں کا گرویدہ اور یہ بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر روتا تمہاری گود میں جا کر چپ ہو جاتا ہے۔ میں تو درمیان میں سے نفی ہوتی چلی جا رہی ہوں۔"

"کوئی نفی وفی نہیں ہو رہی' بس حالات اور کام دھندے کی مار سے سٹپٹا گئی ہو' سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہوتے ہوتے ہو گا! اب اس سراج سرفراز کا کیا کریں' جو آج صبح کہہ رہا تھا۔ بی بی جی! محلے میں نکلتا ہوں تو لوگوں کی باتیں کہیں کھڑا نہیں ہونے دیتیں' آپ کو اکیلے چھوڑ دینے کو جی نہیں مانتا مگر یہاں رہ بھی نہیں پاؤں گا' ہو سکے تو مجھے اجازت دیں۔ میں کہیں اور ٹھکانا کر لوں۔"

"ہائے میرے ربا' یہ کم۔ میرا مطلب ہے' یہ اللہ کا بندہ بھی چلا گیا تو کون روکے گا طیفے لاٹر کو۔"

"اب کیوں گھگھی بندھ رہی ہے' اور کہو اسے کم بخت اور منحوس۔"

"نہیں بولتی۔ اب تو کہتے کہتے رک جاتی ہوں۔ سر پیٹ کر اپنی عقل کا ماتم بھی کر لیتی ہوں جو منہ سے غلطی سے اس کے لیے کوئی برا لفظ نکل بھی جائے تو' پر اس کو نہ جانے دینا۔ اللہ کا واسطہ ہے اسے روک لو۔ یہ چلا گیا تو ہم کیا کریں گے۔"

"تم تو کہتی تھیں' پڑا چارپائی توڑتا رہتا ہے اناج کا دشمن۔"

"توبہ میری توبہ' جواب کہوں تو میری زبان واقعی کاٹ دینا مگر اسے تو روکو کس طرح۔"

"ہوں' سوچتی ہوں' کڑاتی ہوں کوئی ترکیب اس کو روکنے کی۔"

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

ناولٹ

صدف آصف

دل کے اس پار

"ارے خالہ اب سبزی کاٹ بھی دیں، مجھے ابھی تیار بھی ہونا ہے، غضب خدا کا، دو گھنٹے سے چار آلو لے کر بیٹھی ہیں، ایمان سے آپ سے کچھ کام نہیں ہوتا اور بیٹے صاحب فرماتے ہیں کہ بھلا میری اماں جیسا ذائقہ کس کے ہاتھ میں ہے؟"

رونق نے بہت سارے چکن کٹلٹس تیزی سے فرائی کرتے ہوئے شور مچایا۔ کچن کا برا حال تھا۔ کیچپ کی بوتل کھلی پڑی تھی، مایونیز ساشے سے بہہ رہا تھا، سلاد پتے کی قیات پورے کاؤنٹر پر بکھری ہوئی تھیں۔ رابعہ کو بعد میں یہاں کی صفائی بھی کرنا تھی، رونق کو تو بس میکے جانے کی جلدی تھی سو تکان اس کے اعصاب پر سوار ہونا شروع ہو گئی تھی۔

"ہونہہ چار آلو؟... خدا جھوٹ نہ بلوائے تو پانچ کلو سے کم نہیں ہوں گے۔ بہو بیگم نے بیچ بیچ میں دس دفعہ تو اوپر کے کاموں کے لیے اٹھایا ہے۔"

رابعہ خاتون نے رونق کی مبالغہ آرائی پر خون کے گھونٹ پیے۔ اس وقت اپنی صفائی پیش کرنے کا مطلب ایک نئی جنگ کا آغاز تھا، اس لیے انہوں نے ساری باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا۔ ویسے بھی اب تو زندگی میں سکون کے چند لمحے وہ ہی ہوتے تھے جب بہو میکے جانے کا قصد کرتی تھی۔ آج ایسے خوشگوار موقع پر جب بہو دو دن کے لیے امی کے گھر سدھار رہی تھی وہ پاگل تھوڑی تھیں کہ اپنے اندر جاگنے والے آزادی کے خوش کن احساس کو اپنے ہاتھوں سے مٹا دیتیں، اسی لیے کان بند کیے رونق کے چلتے ہوئے منہ کو مزید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ برداشت کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔

رونق کی چالاک بھابھیوں نے ایک نیا وتیرہ اپنا لیا تھا وہ جب بھی میکے جانے کا ارادہ باندھتی، اس کی بھابھیاں ایک ون ڈش پارٹی کا انعقاد کر لیتیں یوں اتنی مہنگائی اور گرمی میں وہ اتنے بڑے ٹبر کا کم از کم ایک وقت کا کھانا پکانے سے بچ جاتیں۔ رونق جیسی نخنی خوری واہ واہ سمیٹنے کے چکر میں گھر کے بجٹ کی پروا کیے بغیر تندہی سے اچھے سے اچھے پکوان پکانے میں جت



جاتی۔ آج بھی فریج فرائز بنانے کے لیے آلو چھلوائے اور کٹوائے جا رہے تھے۔ وہ ست الوجود۔۔۔ میکے کی ایسی تقریبات میں پورے گھر کو الرٹ رکھتی تھی۔ صبح سے کچن میں مصروف تھی۔ ساتھ میں ساس کو بھی لگالیا، بھابھیوں سے مقابلہ بازی میں بھلے اپنے گھر کا بجٹ چوپٹ ہو جائے، مگر اس کی ”میں“ کی تسکین کے آگے سب کچھ ہیچ تھا۔ گھر کے ہر معاملے میں دہرے معیار کی قائل بہو رانی، یہاں آکر بڑی انصاف پسند بن جاتی تھی، اپنے اوپر اس طرح کی ٹینشن کبھی اکیلے سوار نہیں کرتی، تھوڑا تھوڑا حصہ شوہر اور ساس دونوں پر لازمی تھوپا جاتا، اسی لیے کل زبردستی میاں جی کو پکڑ کر بازار نکل گئیں، تھیلے بھر بھر کے دعوت کا سامان لایا گیا اور آج بے چاری رابعہ خاتون کی شامت آئی ہوئی تھی۔

خدا خدا کرکے چکن برگر تیار ہوئے تو ہاٹ پاٹ اور ناشتے دان گاڑی میں رکھ کر وہ سمیرا اور سمیر سمیت میکے روانہ ہوئی۔ مومن میاں نے جاتے جاتے ماں کے کان میں دھیرے سے دال چاول اور اسٹو کی فرمائش کی، تو ان کے صبح سے بند گوبھی، کھیرا، ٹماٹر، پیاز اور پھر پانچ کلو آلو کاٹنے والے شل ہاتھوں میں توانائی کی لہر دوڑ گئی۔ رابعہ نے مٹن کا پیکٹ فریزر سے نکال کر بھگویا۔ پیاز کاٹنے کے لیے ٹوکری میں رکھی۔ اور پہلے اپنے لیے ایک کپ گرما گرم چائے پکنے کو رکھ دی۔ تکان کے باوجود بیٹے کو منع نہ کر سکیں۔ جانتی تھیں کہ اگر یہ ہی فرمائش بہو کے سامنے کی جاتی تو اسے ایک دم مہنگائی اور مہینے کے آخری دنوں کا احساس جاگ اٹھتا۔

”اف۔۔۔ کتنا سکون چھا گیا، ورنہ تو رونق نے صبح سے وہ رونق لگا رکھی تھی کہ اللہ کی پناہ۔“ انہوں نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور پاس پڑی کرسی پر بیٹھ کر پانی پینے لگیں۔

”تمہیں۔۔۔ تو ایسی ہی شور اور ہنگامہ مچانے والی بہو کی ضرورت تھی۔ اب کیا ہو گیا؟“ ان کا ضمیر آئینہ ہاتھ میں لیے ان کے مقابل آگیا۔ ریشمی لہجے والی کی یاد دل میں کلبلائی۔

”اے میرے اللہ کہیں یہ کوئی مکافات عمل تو نہیں ہے؟“ آنکھیں جل تھل ہو گئیں، جانے یہ پیاز کی تیزی تھی یا دکھی دل کی فریاد جو احتجاجاً آنکھوں سے دھار کی صورت میں بہہ نکلی۔

☼ ☼ ☼

”ملی۔۔۔ بیٹا۔۔۔ ملی۔۔۔“ خورشیدہ وہیل چیئر چلاتی ہوئی بیٹی کو آوازیں دینے لگیں۔

”جی امی۔۔۔ کیا ہوا؟ آرہی ہوں۔“ ملی نے دور سے پکارا۔ وہ شاید ڈرائنگ روم میں ڈسٹنگ کر رہی تھی۔ اسے صفائی کا خبط تھا۔

”بس بیٹا۔۔۔ رونق بہو کی لن ترانیوں نے دل دکھا دیا، خدا دشمن کو بھی ایسے دن نہ دکھائے، بے چارے شریف ماں بیٹا۔ کیسی خود پسند، زبان دراز اور پھوہڑ لڑکی ان کے پلے پڑ گئی ہے۔“ خورشیدہ غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے بولیں۔ فلیٹ میں رہنے کا ایک نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ کا کوئی بھی معاملہ ذاتی نہیں رہتا، دیوار سے دیوار یوں جڑی ہوتی ہے کہ پاس پڑوس کے مسئلے زبان سے بیان کیے بغیر ہوا کے دوش پر ایک گھر سے دوسرے گھر تک پہنچ جاتے ہیں، گھومنے پھرنے کی عادی خورشیدہ بیگم جب سے تنہائی کا شکار ہوئی تھیں ملی کی تنبیہہ کے باوجود ان کو سن گن لینے کی عادت ہو چلی تھی۔ یہاں تو دل کا معاملہ تھا اسی لیے ایسے موقع پر کان خود بخود ادھر لگ جاتے۔ رونق کی زبان کے جوہر ان سے بھلا کب تک چھپے رہتے۔ سب کچھ کچن کی کھڑکی سے کھڑے ہو کر سننے کے بعد اب اظہار افسوس کے لیے ملی کا سامع کے طور پر سامنے ہونا ضروری تھا۔

”چھوڑیں امی! یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے ہم کیوں برا بھلا بول کر گناہگار بنیں۔“ ملی نے نظریں چرائیں، دھلے ہوئے کپڑے ٹی وی لاؤنج میں بچھے تخت پر پھیلائے اور تہہ کرتے ہوئے گویا ہوئی، وہ ویسے بھی دوسروں کے معاملات سے چار فٹ دور بھاگتی تھی مومن میاں کے بارے میں تو اسے اب ایک لفظ بھی

سننا گوارا نہیں تھا۔

”تو بھلا ذاتی معاملے سے تمہارا کیا مطلب؟ بھئی پڑوسیوں کے بہت حقوق ہوتے ہیں، ہمارا تو ویسے بھی اتنے برسوں کا بہناپا رہا ہے۔ تم کچھ بھی کہو۔ میں تو شام کو رابعہ بہن کی طرف چکر لگاؤں گی، ویسے بھی ان کی چنڈال بہو بچوں سمیت اپنی بھابھیوں پر ظلم توڑنے میکے جا چکی ہے۔“ آخری جملہ انہوں نے ملی کے نزدیک آکر چٹخارے لیتے ہوئے کہا تو وہ مسکرا دی۔ ماں بیٹی کے درمیان چند باتوں پر ہزار اختلاف سہی مگر رونق کا واحد معاملہ تھا، جہاں دونوں کا ایک ہی موقف تھا۔

”پتا نہیں مومن کیوں ان پر سختی نہیں کرتے؟“ ملیحہ کی آنکھوں کے سامنے رابعہ کا مشفقانہ بھیگا سا چہرہ آگیا، کچھ بھی تھا اس نے سالوں ان کی محبت سمیٹی تھی، اسی لیے عادت کے برخلاف شکوہ کر بیٹھی، اسے ایسے مردوں سے نفرت تھی جو جورو کے غلام بنے رہتے ہیں، جس مومن کو وہ جانتی تھی وہ ایسا تو نہیں تھا، پھر اب ایسا کیوں۔۔۔؟

”بس بیٹی کبھی کبھی کسی انسان کی حد سے بڑھی ہوئی اچھائیاں، اس کی برائی بن جاتی ہیں۔“ خورشیدہ نے ٹھنڈی آہ بھر کر تجزیہ کیا۔

”کیا مطلب امی؟۔۔۔ میں سمجھی نہیں۔“ اس نے تخت پر سفید براق چادر بچھاتے ہوئے شکنیں درست کیں، مگر زندگی کی شکنیں۔۔۔ ان کا کیا؟ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”صاف بات یہ ہے کہ زندگی کی گاڑی توازن کے فارمولے کے تحت چلتی ہے، جہاں مرد کا حد سے زیادہ غصہ ور ہونا، اس کی شادی شدہ زندگی کو تکلیفوں سے بھر دیتا ہے، وہیں بے جا نرم خوئی بھی معاملات کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے۔ مومن میاں کے ساتھ بھی یہ ہی معاملہ رہا، اگر وہ اپنے فیصلے کرنے جوگے ہوتے تو آج دونوں گھروں کے حالات مختلف ہوتے۔“ خورشیدہ نے سرخ ہوتی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھا، شفاف چاندنی سا نکھرا نکھرا حسن گہنانے لگا تھا۔ رونق کی چمکتی، دمکتی سورج کی شعاعوں سی خوبصورتی نے جیسے ان سب کی زندگیوں کو جلا کر بھسم کر دیا تھا۔

”چھوڑیں امی! جو گزر گیا۔۔۔ سو گزر گیا کم از کم اب تو مومن کو حالات پر قابو پانے کی کوشش کرنا چاہیے۔“ اذیت ملی کی آنکھوں سے عیاں تھی، مگر وہ ہی اپنے دکھ چھپانے کی پرانی عادت، ”فوراً“ چہرے کو مسکراہٹ کا نقاب پہنا دیا۔

وہ شروع سے ایسی ہی تھی۔ اپنے موتی جیسے جذبوں کو سینت سینت کر رکھنے والی تب ہی تو ہار اس کا مقدر ٹھہری اور وہ جیت گئے جن کے دلوں میں چاہت کے پھول کھلے ہوں یا نہیں مگر شور مچا کر جیتنا جانتے تھے۔

”رونق نے شروع دن سے یہ بات سمجھ لی تھی کہ مومن میاں کی شرافت فوراً ہی دباؤ کا شکار ہو جاتی ہے بس اب وہ چیخ چلا کر اپنی ہر بات منوا لیتی ہے۔“ خورشیدہ نے اپنے زندگی بھر کے تجربے کی پوٹلی سے ایک کترن نکال کر ملی کے ہاتھ میں تھما دی، وہ رابعہ کے لیے افسردہ ہو رہی تھی۔ ماں اور بیٹی اس وقت ایک ہی طرح کے احساس میں کھوئے ہوئے تھے۔

”ویسے یہ بات ہے کہ نور جہاں نے اپنی بیٹی کا نام رونق رکھنے کا فیصلہ بالکل ٹھیک کیا تھا، اب دیکھو نا جب سے کمبخت ماری میکے گئی ہے، پورے فلور پر خاموشی سی چھا گئی ہے، مجھے تو سوچ سوچ کر وحشت سی ہو رہی ہے کہ دو دن کیسے بوریت میں گزریں گے؟“

خورشیدہ نے ماحول کی اداسی دور کرتے ہوئے شرارت سے ملی کو دیکھ کر سوکھے منہ سے کہا۔ ضبط کے باوجود اس کی ہنسی نکل گئی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے ارسلان کے کانوں میں جیسے ریشم کی ملائمت سی گھل گئی۔ اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔

☼ ☼ ☼

رابعہ نے بھرپور نیند کا مزہ لے کر اٹھتے ہی چائے کا پانی چولہے پر رکھا اور پورے گھر میں گھوم پھر کے آزادی کے احساس سے حظ اٹھایا، یہ وہ ہی گھر تھا جہاں

انہوں نے زندگی کے خوشگوار پل گزارنے کے خواب دیکھے تھے، بیٹے کی زندگی کی بے ترتیبی نے جیسے سپنے دیکھنے والی آنکھوں میں دکھوں کے رت جگے بھر دیے تھے۔

جب سے کیبل لگا تھا، رونق کی آنکھ صبح دس بجے سے قبل شاذ و نادر ہی کھلتی تھی، وہ رات گئے تک پڑوسی ملک کے ٹی وی ڈرامے دیکھنے کی لت میں مبتلا تھی۔ آہستہ آہستہ پوتی کو اسکول بھیجنے اور بیٹے کا ناشتا بنانے کی ذمہ داری ان کے بوڑھے کاندھوں پر آپڑی تھی، مومن میاں نے لاکھ سر پٹخا مگر اس بندی نے کبھی سدھر کے نہ دیا۔ سمیرا کی کب تک چھٹی کرائی جاتی؟! انہیں بھی ناشتے کے انتظار میں دفتر سے روزانہ دیر ہو جاتی تھی آخر ماں کے سمجھانے پر اس معاملے میں "مصلحتاً" خاموشی اختیار کرنی پڑی۔ گھر کے حالات کو سنوارنے کے لیے ان کی خود ساختہ خاموشی نے ان کے بچوں کے مستقبل پر کئی سوال اٹھا دیے۔ سمیر بھی ماں سے چیک کر دیر تک سونے کا عادی ہو چلا تھا، مومن میاں کو ان سب باتوں سے بڑی ذہنی اذیت ہوتی مگر "ونی کرنی، کس کے آگے جا کر روتے" سو خاموشی سے وقت گزار رہے تھے۔

وہ گھر جو ہمیشہ چمکتا دمکتا رہتا تھا، گندا سندا بجھا سا رہتا۔ بچوں کے کھلونے ہر طرف پھیلے رہتے، رابعہ حتی الامکان سمیٹنے کی کوشش کرتیں مگر اب ان کی بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم خم کہاں تھا، اوپر کے کاموں کے لیے ایک دو دفعہ ماسی بھی لگوائی گئی مگر وہ رونق کی زبان درازی سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ویسے بھی کام کرنے والی مائیوں کے بہت نخرے ہو گئے تھے، گھر کی بیبیوں نے جب سے ہر کام سے ہاتھ اٹھا لیے تھے تو ان کو کام کی کمی نہیں رہی تھی۔ اب بات جھاڑو، برتن اور کپڑے سے بہت آگے نکل آئی تھی، گھر کی ڈسٹنگ، آٹا گوندھنا، سبزی کاٹنا، کپڑے استری کرنا یا روٹی پکانا وہ چھوٹے چھوٹے کام تھے جن کے ماسیوں کو منہ مانگے دام ملتے تھے، تو ان کو کیا ضرورت تھی کہ وہ بیگموں کے نخرے اٹھاتی پھریں، اب الٹی ریت تھی کہ بیگمات ان ماسیوں کے نخرے اٹھاتی تھیں کہ کہیں کام چھوڑ گئیں تو ان کے آرام میں خلل واقع ہو گا۔

یہاں تو صرف جھاڑو، برتن کرنے والی ماسی آتی تھی، جو رونق کے سو کر اٹھنے سے قبل ہی اپنے کام نپٹا کر بھاگ جاتی تھی، رابعہ کی نرم طبیعت کا گزارا ہر ایک کے ساتھ ہو جاتا تھا۔ اسی لیے وہ بھی ابھی تک یہاں ٹکی ہوئی تھی۔

کل رات مزے سے اسٹو اڑانے کے بعد مومن میاں نے ماں کو صبح ناشتا بنانے سے منع کر دیا تھا۔ رابعہ کے اصرار پر اس نے پیٹ بھاری ہونے کی توجیہہ پیش کی مگر وہ جانتی تھیں کہ بیٹا فقط ماں کو آرام دینا چاہتا ہے۔ بعض اوقات الفاظ ختم ہو جاتے ہیں مگر جذبے بولتے ہیں، ان ماں بیٹے کے درمیان بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بالکنی میں بیٹھ کر باہر کے نظاروں سے لطف لینے لگیں۔ یہ بڑا سا کھلا ہوادار فلیٹ جو ان کے شوہر نے شادی کی سالگرہ پر ان کو "تحفتاً" دیا تھا، اب جانے کیوں دن بہ دن گھٹن زدہ سا لگنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

رابعہ کی شادی شدہ زندگی کا وہ نقرئی دور جب شوہر کی محبت دھنک رنگوں میں لپٹی ہوئی سی لگتی ہے، مشقتوں کی نذر ہو گیا۔ رابعہ کے والدین نے خوشی خوشی اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی بیٹی کا ہاتھ مامون کے ہاتھ میں دے دیا۔ مامون احمد مناسب شکل و صورت کے تھے، نوکری بھی بہترین تھی، امراء کے علاقے میں باپ کا عالیشان بنگلہ، دروازے پر کھڑی شاندار گاڑی، انکار کا کوئی جواز ہی نہیں تھا، مگر وہ جو کہتے ہیں ناکہ "بیٹیوں سے نہیں، ان کے نصیب سے ڈر لگتا ہے۔" رابعہ کے والدین نے بھی راج دلاری کے لیے خوب چھان پھٹک کر سسرال ڈھونڈا تھا۔ مگر شادی کے دو مہینے بعد ہی وہ سب متوسط علاقے میں کرائے کے چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

مامون گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ والد کے انتقال کے بعد جب قرض خواہ منہ کھول کر کھڑے ہوئے تو پتا چلا کہ ساری شان و شوکت دکھاوے کی تھی، کئی سالوں سے احمد صاحب کا کاروبار ٹھپ جا رہا تھا، مگر امیروں والے چونچلے نہ گئے تھے۔ یہ ان کی نوابی فطرت اور خود پسندی تھی جو گھر والوں سے سب کچھ چھپائے، وہ قرض پر قرض لے کر کاروبار میں پیسہ لگاتے رہے، مگر جب قسمت خراب تو سونا بھی مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایک کے بعد ایک نقصان نے ان کا ہاتھ خالی کر دیا ان کے دیوالیہ ہونے کی خبر سنتے ہی قرض خواہوں نے اپنے پیسوں کی وصولیابی کے لیے تھانے کچہری کی دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ مارے شرمندگی کے ایک دن ایسا سوئے کہ پھر کبھی نہ اٹھ پائے۔

گھر والوں پر ایسی افتاد آپڑی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، ایک طرف میت پڑی، دوسری طرف قرض مانگنے والوں کا دبی دبی زبان میں تقاضا۔ مامون احمد سے خاندان کی یہ بے وقعتی برداشت نہ ہوئی۔ سب سے ایک مہینے کا وقت مانگا اور پندرہ دن میں ہی سب کچھ بیچ باچ کے باپ کی عزت پر لگنے والا داغ دھو دیا، قرضہ چکانے کے لیے ماں اور نئی نویلی دلہن کے گہنے بھی "مجبوراً" بیچنے پڑے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ قرضہ سسرال والوں سے لیا۔ ایسا وقت آپڑا کہ مرد ہوتے ہوئے بھی ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے مگر رابعہ کی استقامت کو شاباش تھی، جو مسکراتے ہوئے شوہر کے وقار کی بحالی پر اپنا سب کچھ خوشی خوشی وار بیٹھیں۔

چلبلی، شرارتی ضدی رابعہ کے اندر سے ایک صابر و شاکر، سلیقہ مند، کم گو بیوی اور بہو نے کب جنم لیا، کسی کو خبر ہی نہیں ہوئی، مگر زبیدہ تو اس کی ماں تھیں، پہلے بیٹی کے الہڑپن کو دیکھتے ہوئے ہولتی رہتیں کہ "یہ تو دوسرے دن ہی شوہر سے لڑ کے میکے آبیٹھے گی" اب اس کی سمجھ داری پر "ہائے میری بچی" کہہ کر منہ چھپا کر روتیں۔

"ہاں! تم بھی عجیب ہو، پہلے ٹوکتی تھیں کہ سسرال

میں ایک دن بھی گزارا نہ کرپاؤں گی' اب روتی ہو کہ میری بچی کیسے ان حالات میں گزارا کررہی ہے؟" رابعہ جب بھی میکے آتیں ماں کے بلکنے پر ان سے لپٹ کر شرارتی لہجے میں ماں کو بہلاتیں تو وہ صبر کی مورت پر قربان ہوجاتیں۔

حالات کی مار نے مامون احمد کی زندگی کا دھارا بدل کررکھ دیا۔ ان جھلملاتے دنوں سے منہ موڑے 'نئی نویلی دلہن کو ساتھ لگائے وہ کمر کس کر' ماں کے علاج اور بہن بھائیوں کے آنسو پونچھنے میں مصروف ہوگئے۔ جلد ہی ماں بھی باپ کے پیچھے دنیا چھوڑ گئی۔ ایک اور غم کا پہاڑ تھا جو ان سب پر ٹوٹ پڑا۔ جانے والا چلا جاتا ہے' مگر زندگی نہیں رکتی' چلتی رہتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ مہنگائی نے کمر توڑ کے رکھ دی' اتنے لوگوں کا خرچا اور مامون کی ایک تنخواہ۔ جب گزارا مشکل ہونے لگا تو مجبوراً" رابعہ نے اپنی بی اے کی ڈگری جھاڑ پونچھ کے الماری سے نکالی اور ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری حاصل کرلی' ایک ہی بیٹا تھا مومن جسے دونوں نندیں مل جل کر سنبھال لیتیں' مامون رابعہ کی خوبیوں کے دل سے معترف ہوگئے۔

وہ جانتے تھے کہ جب رابعہ کرائے کی مد میں مہینے کی دس تاریخ کو تنخواہ کا منہ بند لفافہ خاموشی سے لاکر ان کو تھماتیں' تو کتنی ہی حسرتیں ان کی آنکھوں میں مچل رہی ہوتیں۔ وہ اپنے آپ میں مجرم سے بن جاتے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ ان پر رابعہ کے لیے ایک گھر بنانے کی دھن سوار ہوگئی' ہارون بھی نوکری پر لگ گیا تھا' مگر انہوں نے رابعہ کی نوکری نہ چھڑائی۔ قرضے اتارنے اور بھائی بہنوں کے فرائض نبٹانے کے ساتھ ساتھ وہ اس قابل ہوگئے کہ بیوی کو ایک مکان سے اٹھا کر گھر میں لے آئے۔ ہارون جو دبئی چلا گیا تھا' بھائی کا گھر سجانے کے لیے خطیر رقم بھیج دی۔

شفٹنگ کے دوسرے دن ہی مامون اپنے ہاتھوں سے استعفیٰ لکھ کر ان کے اسکول میں دے آئے' تو وہ شوہر کا ہاتھ تھام کر بے ساختہ رو دیں۔ شریک حیات اگر شریک غم بن جائے تو زندگی کتنی آسان ہوجاتی ہے۔

اللہ کی کیا مرضی تھی کہ رابعہ مومن میاں کے بعد وہ دوبارہ ماں نہ بن سکیں' بیٹا انجینئر بن رہا تھا' اب دونوں میاں بیوی خوش تھے' زندگی سے سارے گلے شکوے خود بخود ختم ہوگئے تھے۔ عمر بڑھ گئی تھی مگر جذبے جوان تھے۔ مامون نے رابعہ کے ساتھ بیٹھ کر سپنے بُن ڈالے' رابعہ کی پرکشش آنکھوں میں دوبارہ روشنی بھر گئی تھی' مامون نے ایک مہینے کی چھٹیاں لے لیں تو مومن نے ان دونوں کو پاکستان ٹور پہ بھیجنے کا پروگرام بنالیا' جہد مسلسل کے بعد زندگی میں در آئی فراغت نے رابعہ اور مامون کے جذبوں میں ایک نئی توانائی بھردی تھی مگر بعض لوگوں کو خوشیوں کا موسم کم ہی راس آتا ہے۔

مومن میاں ڈائیوو کی بکنگ کروانے گئے ہوئے تھے' رابعہ گنگناتی ہوئی لنچ کے لیے کچن میں کھٹی چٹپٹی کباب بنارہی تھیں اور مامون بالکنی میں فراغت سے بیٹھے اخبار کا مطالعہ کررہے تھے۔

"زندگی کتنی مکمل لگنے لگی ہے۔" رابعہ نے بہت سرشار ہوکر سوچا۔ جلدی جلدی پلاؤ کو دم دیتے ہوئے' دوسرے چولہے پر چائے کا پانی رکھا۔ مامون بالکنی سے جھانک کر باہر کے نظاروں کا لطف لینے لگے۔ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ مامون نے اخبار منہ پر رکھا اور آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"انہوں نے شاید پکارا ہے' بڑی دیر سے کچن میں لگی ہوں نا۔ لگتا ہے ناراض ہوگئے ہیں۔" اچانک دل کو اندیشوں نے آگھیرا' ایسا لگا مامون آوازیں دے رہے ہوں' وہ فوراً" بھاپ اڑاتی چائے لے کر بالکنی کی طرف بڑھیں۔

"ایک کپ چائے ان کا موڈ خوشگوار کردے گی۔" رابعہ نے عجیب طور پر گھبرانے والے دل سے باتیں شروع کردیں۔ حالات کی مجبوری نے ان دونوں کے درمیان جو فاصلے پیدا کردیے تھے' اس کی تلافی کے طور پر اب مامون رابعہ کو لمحوں کے لیے بھی خود سے جدا نہ کرتے۔ جب سے چھٹیوں پر تھے' رابعہ کا سایہ بنے رہتے' کبھی کبھی تو رابعہ جوان بیٹے کی موجودگی میں میاں جی کے چونچلوں پر چڑ جاتیں' تو دونوں باپ بیٹا مل کر ان کا ریکارڈ لگاتے۔ "مگر آج اتنی دیر کی خاموشی۔۔۔"

"لیجیے جناب۔۔۔ چائے حاضر ہے۔" رابعہ نے اخبار مامون کے چہرے سے ہٹایا تو ان کے چہرے پر چھایا ابدی سکون رابعہ کو عمر بھر کے لیے بے سکون کر گیا۔ چائے کی پیالی رابعہ کے ہاتھوں سے گر گئی' گرم چائے پیروں کو جلا گئی مگر ان کو ہوش ہی کہاں تھا' وہ چیخ چیخ کر رو رہی تھیں۔ ان کی چیخ وپکار پر خورشیدہ پڑوس سے ہانپتی کانپتی ان کے پاس جا پہنچیں کہ "نئے پڑوسیوں کے یہاں کیا افتاد آن پڑی؟" اور پھر رابعہ کی آہ وزاری' مومن کے آنسو بھی جانے والے کو واپس نہ لاسکے' ملیحہ اور خورشیدہ نے بڑھ کر سارے انتظامات سنبھال لیے۔

"ہائے ہمارا باپ چلا گیا۔" ہارون دبئی سے اور بہنیں دوسرے شہروں سے روتی دھوتی چلی آئیں' انہیں لگا کہ وہ لوگ آج واقعی یتیم ہوگئے تھے۔



"ارے دونوں کہاں رہ گئیں؟ میری بچیاں کب سے آئی بیٹھی ہیں' کسی سے اتنا نہیں ہوا کہ چائے' پانی کا ہی پوچھ لے۔"

نور جہاں کی پاٹ دار آواز گھر کے کونے کونے میں گونج رہی تھی' رونق کی لمبی چوڑی مردمار سی اماں جی صرف نام کی ہی نور جہاں تھیں' ورنہ جس جگہ پہنچ جاتیں' اندھیرے چھا جاتے۔ نادیہ' مہرین آرام سے اپنی اپنی تیاریاں مکمل کرکے کمرے سے نکلیں' اسکول کی چھٹیاں شروع ہوچکی تھیں۔ وہ جانتی تھیں دونوں نندیں بچوں سمیت رہنے کو پہنچ گئی ہیں' ابھی انہیں دو دن بھگتنا تھا' زیادہ خوش اخلاقی دکھانے کا مطلب تیسرے دن بھی ٹھہرنے کا حوصلہ دینا اور ایسی غلطی کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"ارے بھئی ہمیں آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہوا اور تم دونوں کا کچھ پتا نہیں' کیا پار لر چلی گئی تھیں۔" رونق نے بھابھیوں کے نئے نکور لان کے سوٹوں اور چمکتے دمکتے چہروں کو دیکھ کر سلام دعا کے بعد جل کر کہا۔ اس کی پر تجسس طبیعت سوال پر سوال کرنے پر مجبور کرتی تھی خاص طور پر جب معاملہ بھابھیوں کا ہوتو۔۔۔

اوہو۔۔۔ کل دن بھر جو دیورانی' جٹھانی نے فیشل کے نام پر ایک دوسرے کے چہرے کی رگڑائی اور منجھائی کی تھی تو آج وہ محنت سود سمیت وصول ہوگئی۔ دونوں نے ایک ہی بات سوچی اور مسکرا دیں۔

"ارے کہاں باجی؟۔۔۔ امی کو ہمارا پارلر جانا پسند ہی نہیں تو۔۔۔" مہرین نے آنکھیں گھماتے ہوئے کہا اور پھیکا سا شربت گلاسوں میں انڈیل کر سب کو پیش کیا۔ جانتی تھی کہ نندوں کے بدتمیز بچے یہ بھی نہیں چھوڑیں گے۔

"ارے بہن۔۔۔ ہماری سیدھی سادی ماں پر ایسے الزام تو نہ دھرو' وہ بے چاری تو نہ تین میں نہ تیرہ میں' گھر کی کرتا دھرتا تم لوگ' وہ تو خاموشی سے ایک کونے میں پڑی رہتی ہیں۔" روشنی چھوٹی ہونے کی وجہ سے لاڈلی تھی' غصہ بھی جلدی آجاتا تھا تڑخ کر بولی۔ ویسے بھی آج پروٹوکول میں کمی دیکھ کر چڑی ہوئی تھی' فوراً" ہی بھابھیوں کو سنایا۔ ماں نے خوش ہوکر بیٹی کو سراہتی نظروں سے دیکھا۔

"ویسے رونق باجی! ہر کوئی آپ کی طرح خوش قسمت تھوڑی ہوتا ہے۔ کچی مومن بھائی کتنے اچھے ہیں نا کہ آنکھ بند کرکے آپ کو شاپنگ کرواتے رہیں' یہاں تو ایک ایک پیسے کا حساب کتاب ہوتا ہے' ماشاء اللہ آپ کا نیا سوٹ تین ہزار سے کم کا نہیں لگ رہا۔" نادیہ نے فوراً" ہی حساب بے باق کیا' وہ روشنی کے منہ کم ہی لگتی تھی' وہ تو ذرا ذرا سی بات پر گھنٹوں رونا پیٹنا مچاتی کہ سنبھالنا مشکل ہوجاتا' گھر کا ماحول الگ خراب ہوکر رہ جاتا۔ اسی لیے رونق کو مخاطب کرکے بولی۔

"ہونہہ یہ تو ہے' میرا میاں۔۔۔ میری کوئی بات ٹالتا

نہیں ہے، پچھلے ہفتے طارق روڈ سے شاپنگ کروائی تو میں نے یہ سوٹ چار ہزار کا خرید اتھا۔" نادیہ نے رونق کو چنے کے جھاڑ پر چڑھایا اور وہ ہمیشہ کی طرح چڑھتی چلی گئی۔ ماں ہاتھ دباتی، آنکھیں دکھاتی رہ گئیں اور وہ بیچ میں سوٹ کی دگنی قیمت بتا کر شربت پینے لگی، گرمی اتنی تھی کہ پھیکا شربت بھی پیاس بجھا گیا۔

ساسوجی اشارے بھی ایسے کرتی تھیں کہ جس کو سجھائی نہ دے وہ بھی جان لے، پھر بہوؤں کو تو اللہ جی نے بڑی بڑی روشن آنکھوں سے نوازا تھا، دونوں بہوؤں نے مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا، کام ہو گیا تھا رونق کو ڈانٹ کھانے کے لیے کمرے میں چھوڑا اور باہر نکل گئیں۔

"ہائے ہائے کب عقل آئے گی تجھے، اب یہ دونوں حرفوں کی بنی میرے بیٹوں کے پیچھے لگ جائیں گی کہ جب تمہاری بہن اتنا مہنگا سوٹ پہن سکتی ہیں، تو ہمارے لیے کاہے کی منادی ہے، میں پورے ہفتے تمہارے بھائیوں کے سامنے تم بہنوں کی مظلومیت اور سسرال میں ہونے والی زیادتیوں کے قصے گھڑتی ہوں، مگر تمہاری شیخیاں... میرے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہیں۔" بہوؤں کے باہر جاتے ہی وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے پر جلال لہجے میں برس پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"اوہ سوری... لگی تو نہیں...؟" مومن میاں آفس کے لیے تیزی سے نکلے تو سامنے سے آتی ہوئی ملیحہ سے ٹکرا گئے۔

وہ بھی اپنے کالج جا رہی تھی، جہاں وہ لیکچرار تھی۔ بے بی پنک بلیک کڑھائی والا کرتا اور بلیک ٹراؤزر اس کے متناسب جسم پر جچ رہے تھے، گھنے سلکی بالوں کی لمبی چوٹی ایک سائیڈ پر ڈالے، وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی دکھائی دے رہی تھی۔ مومن میاں اسے ستائشی نظروں سے دیکھتے رہے مگر ملی نے تکلفاً بھی ان کو نہ دیکھا۔

"اگر میں نے زندگی میں ایک صحیح فیصلہ کیا ہوتا تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے؟"

وہ دھیرے دھیرے اس کے پیچھے چلتے ہوئے لفٹ تک آئے۔ اب دونوں لفٹ کے اندر پاس پاس کھڑے تھے۔ ملیحہ کے پاس سے اٹھنے والی بھینی بھینی خوشبو مومن کو مدہوش کیے دے رہی تھی۔ انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے وہ خوشبو اپنے اندر اتاری۔ انہیں یاد آیا کہ ملیحہ تو شروع سے ہی اتنی نفیس تھی۔ اس کے پاس ایک سے بڑھ کر ایک خوشبو موجود ہوتی تھی، اس کی پسند کے کچھ پرفیوم تو مومن میاں نے سالگرہ پر اسے تحفتاً دیے تھے۔ وہ ایک دم ملیحہ کا موازنہ بیوی سے کرنے لگے شادی کے چار سالوں میں اس کی پتلی کمر ایک بڑے کمرے بلکہ ہال میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سبک ناک نقشہ جس پر وہ فدا ہو گئے تھے، اب ایک پھولے غبارے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد جو اس کے بال جھڑنا شروع ہوئے، تو اب پودینے کی گڈی جتنے رہ گئے تھے، اس پر اس کی کاہلی، چھوٹا والا جگہ جگہ گندگی پھیلاتا پھرتا، مگر اسے کام کی عادت جو نہیں تھی، اسی لیے ہر وقت بیڈ روم سے اور اکثر اس کے پاس سے بدبو کے بھبکے اٹھتے تھے۔ لفٹ گراؤنڈ فلور پر رکی تو وہ اپنی سوچ سے باہر آئے۔ صبح صبح موڈ آف ہو گیا۔

انہوں نے اپنی زندگی کی بے رونقی پر ٹھنڈی آہ بھری۔ وہ حالات سے بے زار رہنے لگے تھے، مگر رونق کو کوئی پروا نہیں تھی۔ ہاں اسے پروا تھی تو صرف اپنے میکے کی وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟ بھابھیاں کیا کر رہی ہوں گی؟ یا اپنی اماں جی اور ان کے خود ساختہ مسائل کی۔ جو لڑکیاں شادی کے بعد میکے میں اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتی ہیں، انہیں کبھی بھی اپنے سسرال اور اس گھر کے مسائل سے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی اور رونق کا شمار ایسی لڑکیوں میں ہی ہوتا تھا۔

مومن میاں کمپاؤنڈ میں کھڑے حسرت سے دور جاتی ہوئی شیراڈ کو دیکھ رہے تھے جس کی ڈرائیونگ سیٹ پر طمطراق سے بیٹھی ملیحہ جچ رہی تھی، یہ اور بات ہے کہ آنکھوں کی نمی چھپانے کے لیے ملی نے بلیک

اسٹائلش گاگلز لگا لیے تھے۔

☼ ☼ ☼

مومن میاں کے سسرال میں بھی معاشرے کے عمومی گھرانوں کی طرح دہرا معیار رائج تھا۔ شادی کے شروع دنوں میں نادیہ اور مہرین سسرال میں دبی دبی رہیں مگر وہ بھی اسی دنیا کی باسی تھیں، فرشتہ نہیں۔ جب یہاں کے نرالے رنگ ڈھنگ دیکھے تو انہوں نے بھی کل پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ انہیں بھی اچھا لگتا اگر انہیں اکبری کی جگہ اصغری کا خطاب ملتا مگر یہاں تو یہ حال تھا کہ وہ نندیں جو بھائیوں کے سامنے پیار لٹاتی تھیں، آپس میں بھابھیوں کے ایسے بخیے ادھیڑتیں کہ کچھ کہنے کی بات نہیں، ایسی باتیں کبھی چھپتی نہیں ہیں، جب بھابھیوں کے کانوں تک پہنچتی تو ان کا رویہ بھی نندوں کے ساتھ برا ہو جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کے درمیان بات بے بات وہ بحث چھڑتی کہ مرد کان دبا کر باہر نکل جاتے۔

مومن میاں بھی اس تو تو میں میں والے ماحول سے بھرپائے تھے، ورنہ ایک وقت تھا کہ جب یہی گھرانا ان کا اور ان کی امی کا آئیڈیل ہوا کرتا تھا، رونق کا بڑا بھائی حامد، مومن کا پرانا دوست تھا، مگر دونوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا بہت کم ہوا تھا۔ ایک دن مومن میاں رابعہ بیگم کو لے کر بازار گئے ہوئے تھے کہ اچانک شہر کے حالات خراب ہو گئے، ساری دکانیں بند کرائی جانے لگی۔ وہ اکیلے ہوتے تو کاہے کی فکر، مگر یہاں تو ماں ساتھ تھی، سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو حامد کے گھر چلے گئے، جو بازار سے نزدیک تر واقع تھا۔

وہاں سے واپسی پر تو جیسے رابعہ کا دل باغ باغ ہو گیا، کیسا بھرا پرا خاندان تھا۔ نور جہاں نے تو انہیں فوراً ہی بہن کے عہدے پر فائز کر دیا، خاطر داری میں کوئی کمی نہ چھوڑی، اس وقت نادیہ کی شادی ہو چکی تھی، وہ بھی سر پر دوپٹا اوڑھے کاموں میں لگی ہوئی تھی پھر بلبل کی طرح چہچہاتی گوری چٹی رونق، جو ان سے چپک کر بیٹھی تو انہیں گھنٹوں اٹھنے نہیں دیا، واپسی پر نور جہاں نے بہت سارے کباب ایک ڈبے میں پیک کر کے ان کو پکڑا دیے کہ "میری رونق نے بنائے ہیں، مومن میاں شوق سے کھا رہے تھے۔"

رشتوں کو ترسے ہوئے وہ ماں بیٹے اتنی اہمیت پر جیسے کھل اٹھے، رابعہ کے سسرالی بھی دور رہتے تھے اور میکے میں بھی بھائی بہن اپنی زندگیوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ کبھی ہفتہ پندرہ دن میں ملاقات ہو جاتی تو ہو جاتی، یہاں تو نور جہاں نے جیسے ان کا گھر ہی دیکھ لیا۔ آئے دن یا تو خود مزیدار پکوان لیے چلی آتیں یا ان لوگوں کو اپنے گھر آنے بہانے سے بلوا لیتیں، رونق بھی اماں کے ساتھ لگ کے چلی آتی اور مومن میاں کے آگے پیچھے ہوتی، اس کی آئی لائنر مسکارا لگی آنکھوں میں وہ نشہ تھا کہ مومن میاں ملی کی سادہ، کاجل والی آنکھوں کی خوب صورتی بھولتے جا رہے تھے۔ نور جہاں کی تو دلی مراد پوری ہو رہی تھی، وہ سیدھی سادی رابعہ کو اپنے ساتھ الجھائے رکھتیں بھلا وہ رونق کے لیے اتنا اچھا گھرانا خود سے ڈھونڈ سکتی تھیں؟ ہاتھ آئی نعمت کو کون چھوڑتا ہے۔

"خالہ جان! آپ تو مجھے اتنی پیاری لگتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ ہمیشہ یہیں رہ جاؤں۔" وقت رخصت جب رونق نے گرمجوشی سے رابعہ سے لپٹ کر چٹاچٹ پیار کیا تو کئی سالوں بعد رابعہ کے اندر اپنے زندہ ہونے کا احساس جاگا بھلا "ملی" میں کیا ایسے گن ہیں، اس کے بہو بن کے آنے کے بعد بھی یہاں خاموشیوں کا راج ہوگا۔ انہوں نے اپنے ضمیر کو تاویلیں دے کر سلانا چاہا۔

نور جہاں انہیں اتنا مصروف رکھتیں کہ ان کے پاس خورشیدہ اور ملیحہ کے لیے بھی وقت نہ ہوتا تھا یا وہ خود بھی ان دونوں سے نگاہیں ملانے سے گھبرا رہی تھیں، یہ ہی حال مومن میاں کا تھا۔

ملی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی مگر منہ سے کیا کہتی کہ "رابعہ خالہ! آپ نے جو اشارے کنائے میں مجھے اپنی بہو بنانے کی بات کی تھی، وہ بات کیوں بھول گئیں؟" دونوں ماں بیٹیاں سامنے والے

فلیٹ میں ہونے والا تماشا خاموشی سے دیکھتی رہتیں۔

ملیحہ تو اتنی آن بان والی تھی کہ مومن میاں کا گریبان پکڑ کر یہ بھی نہیں پوچھ سکی کہ "تم نے جب ساتھ نبھانا نہیں تھا تو آس کیوں دلائی تھی' عہد و پیماں کر کے یوں بھی کوئی مکرتا ہے بھلا۔" وہ پہلے بھی کم بولتی تھی۔ اب مزید خاموش رہنے لگی تھی۔

پھر ایک دن مومن میاں کی شادی کا کارڈ آ گیا' مگر وہ خورشیدہ کی بیماری میں یوں الجھی کہ اس کے پاس غم منانے کا بھی وقت نہیں رہا۔ بس تھوڑی دیر کے لیے مومن کی شادی کی تقریب میں شریک ضرور ہوئی' تاکہ دنیا والوں کو باتیں بنانے کا موقع نہ ملے' خورشیدہ کی تو ایسی حالت ہی نہیں تھی کہ وہ شادی میں شریک ہو پاتیں' بس بیٹی کے ہاتھ شگن کا لفافہ بھجوا دیا۔

ملیحہ نے بڑی مشکلوں سے رونق کو مومن کے برابر میں دلہن بنا بیٹھا دیکھ کر مسکرا کر مبارک باد دی۔ دونوں نظر لگ جانے کی حد تک پیارے لگ رہے تھے۔ ملی کے حوصلے پر مومن نظریں چرا گئے۔ رابعہ البتہ شرمندہ شرمندہ سی گلے لگ گئیں۔

ملیحہ پوری تقریب میں مسکراتی رہی۔ یہ اور بات ہے کہ رات بھر اس کا تکیہ بھیگتا رہا۔ دوسرے دن اس نے اپنے ہاتھوں وہ سارے کارڈ جلا دیے۔ جو عید بقر عید یا سالگرہ پر مومن میاں بڑی محبت سے ملیحہ کو دیتے رہے تھے۔ اس نے زندگی کی کتاب سے مومن نام کا صفحہ ہی پھاڑ ڈالا۔ خورشیدہ بھی بیٹی کے غم میں ساری رات کروٹیں بدلتی رہی تھیں' تو وہ بھی ملیحہ کی ہی ماں تھیں' بھولے سے بھی رابعہ بیگم کو نہیں جتایا کہ "کیسے بہن بن کر ان کے ارمانوں کا خون کر گئیں؟"

اور رابعہ بیگم کے پاس ویسے بھی یہ سب باتیں سوچنے کا وقت ہی کہاں تھا؟ وہ تو پریشان تھیں کہ ٹرک بھر کر ملنے والے جہیز کو کہاں کہاں سجائیں۔ نور جہاں نے ان کو بھی چھوٹا سا سونے کا لاکٹ سیٹ دیا تھا۔ سامان اتنا تھا کہ کھلا کھلا سا فلیٹ بھی تنگ پڑ گیا تھا۔ دوستوں میں سسرال والوں کی امارت کی خوب واہ واہ ہوئی تو مومن میاں کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ رابعہ یوں تو چیزوں کی بھوکی نہیں تھیں۔ مگر مکھن ملائی سی بہو کے ساتھ ملنے والا اسباب ان کے لیے بھی بونس ثابت ہوا۔

☼ ☼ ☼

"چچی جان۔۔۔ آپ فکر نہیں کریں' میں نے آپ کی ساری رپورٹ ڈاکٹر ڈیوڈ کو میل کر دی ہیں۔ مجھے بس ان کے جواب کا ہی انتظار ہے۔ پھر دیکھیے گا آپ کو زبردستی برطانیہ لے جاؤں گا۔" ارسلان نے مسکراتے ہوئے خورشیدہ کو دیکھا۔

"ارے۔۔۔ بیٹا میں تو یہاں کے ڈاکٹروں کو دکھا دکھا کر تھک گئی ہوں' ملی نے مجھ پر اتنا پیسہ بھی خرچ کیا' مگر ریڑھ کی ہڈی میں پیدا ہونے والی خرابی دور نہ ہوئی۔ اس لیے میں چلنے سے قاصر ہوں۔ اب تو لگتا ہے اسی وہیل چیئر پر زندگی تمام ہو جائے گی۔" وہ بہت مایوس نظر آ رہی تھیں۔ پاس ہی ملیحہ بیٹھی خربوزے چھیل رہی تھی۔ ماں کی حالت پر افسردہ ہو گئی۔ پیار سے اٹھ کر پانی پلایا۔

"ارسلان بھائی۔۔۔ مجھے اپنی اماں کو چلتے دیکھنے کی شدید آرزو ہے۔ مجھے سات سمندر پار بھی جانا پڑے تو جاؤں گی۔"

ملیحہ نے ڈش میں فروٹ چاٹ رکھ کر سلیقے سے پیش کرتے ہوئے ایک عزم سے کہا تو ارسلان نے اپنی اس چچا زاد بہن کو مسکرا کر دیکھا۔ چچا ابا کے انتقال کے بعد یہ دونوں ماں' بیٹی یہاں اکیلی رہ گئی تھیں جبکہ ارسلان کئی سال قبل والد کے انتقال کے بعد اپنی اماں اور دو بھائیوں کے ساتھ ہمیشہ کے لیے لندن شفٹ ہو گئے تھے۔ جب بھی پاکستان کا چکر لگتا تو چچی جان سے ملنے ضرور آتے۔ اس بار تو ویسے بھی کچھ خاص ارادے لے کر یہاں آئے تھے۔

"بیٹا۔۔۔ میں اپنے لیے نہیں' مگر ملی کے لیے ٹھیک ہونا چاہتی ہوں۔ اب بھلا بتاؤ یہ بھی کوئی بات ہے کہ اس نے اپنی شادی کو میری صحت یابی سے مشروط کر دیا ہے۔ اسی بات پر ہم ماں بیٹی میں جھگڑا رہتا ہے۔" ملیحہ جیسے ہی کچن میں چائے بنانے گئی' خورشیدہ نے دھیرے دھیرے ارسلان کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔۔۔ پھر تو مجھے جلد از جلد آپ کا مکمل علاج کروانا ہی پڑے گا۔" کچن میں کام کرتی ملیحہ کو بغور دیکھتے ہوئے ارسلان شوخی سے بولے۔ ملیحہ پیازی اور سرمئی رنگ کے لباس میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ چولہے کی تپش سے اس کے گالوں پر لالی سی چھا گئی تھی۔ وہ ایک ٹک اسے ہی تک رہے تھے۔

"بیٹا۔۔۔ اب تم بھی شادی کر ہی لو' کب تک پردیس میں چھڑے چھانٹ پھرتے رہو گے۔" ارسلان کے آئے دن کے لگنے والے چکروں نے ان کے ہاتھوں میں امید کے جگنو تھما دیے تھے۔ انہوں نے موقع دیکھ کر سلیقے سے بات چھیڑی۔

"جی چچی جان! آپ صحیح فرما رہی ہیں۔ آپ تو جانتی ہیں نا۔۔۔ ابو کے انتقال کے بعد میں نے بھائیوں کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی تھی۔ اب اللہ کا کرم ہے کہ وہ دونوں اپنی زندگیوں میں سیٹل ہو چکے ہیں' تو مجھ پر امی کی طرف سے بھی شادی کے لیے پریشر ہے۔ اس لیے اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔" وہ مسکرائے۔

"میرے دل میں بھی برسوں سے ایک خیال پنپ رہا ہے۔ میں نے آپ کے اور ملیحہ کے وزٹ ویزے کے لیے اپلائی کیا ہوا ہے۔ بس جیسے ہی ویزا لگتا ہے' میں پہلی فرصت میں آپ کو اس لڑکی کے بارے میں بتاؤں گا۔ جس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" ارسلان نے ملیحہ کے ہاتھ سے چائے کا کپ لیتے ہوئے کہا۔

"ارے واہ۔۔۔ میں تو خود رشتہ لے کر آپ کے ہونے والے سسرال جاؤں گی۔ مگر یاد رکھیے گا کہ آپ کی دلہن پسند نہ آئی تو انکار کر دوں گی۔" ملیحہ نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"چلو۔۔۔ ٹھیک ہے' مگر مجھے یقین ہے تم۔۔۔ میری دلہن کو ناپسند کر ہی نہیں سکتیں۔" ارسلان نے دلچسپی سے اس کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھا۔

"اوہو۔۔۔ چلیں وعدہ' اگر پسند آئی۔۔۔ تو اس کی ساری شاپنگ میں خود ہی کروں گی۔" اس نے بشاشت سے کہا۔

"وعدہ۔۔۔؟ آپ کا جانا تو ویسے بھی بہت ضروری ہے۔" ارسلان کا لہجہ معنی خیز تھا۔

"ہائے دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے کتنا سج رہے ہیں۔" خورشیدہ نے دل ہی دل میں بلائیں لے ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

"بات سنیے۔۔۔ امی کی گلی میں ایک مکان بہت سستے میں بک رہا ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ ہم لوگ یہ فلیٹ بیچ کر وہ مکان خرید لیں؟" رونق جب بھی میکے سے واپس آتی ایک نیا شوشہ چھوڑتی' مگر آج تو اس نے حد ہی کر دی۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے یا گرمی کی وجہ سے اثر ہو گیا ہے۔" مومن میاں نے بیوی کو گھورا۔

"آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں' جس طرح آپ کو اپنی امی پیاری ہیں۔ اسی طرح ہمیں بھی اپنی ماں سے پیار ہے نا؟" وہ ٹھنک کر بولی ویسے بھی آج لان کے نئے جوڑے میں نہائی دھوئی کافی معقول لگ رہی تھی' مومن میاں اس کی نرالی منطق پر مسکرا کے رہ گئے۔

"تو ان کی محبت کا ثبوت دینے کے لیے جو تم ہر ہفتے دوڑی چلی جاتی ہو کیا وہ کافی نہیں؟" وہ بھی روز روز کے ڈراموں سے تھک چکے تھے۔ اسی لیے خاموشی اختیار کرنے کے بجائے جرح پر اتر آئے۔

"تو کیا ہوا۔۔۔ ساری لڑکیاں ہی میکے جاتی ہیں۔ وہاں جانا ہمارا حق ہے۔ آخر وہ ہماری ماں کا گھر ہے۔" اس نے مومن کی بات کو چنداں اہمیت نہ دی اور سمیر کو زور' زور سے تھپک کر سلانے لگی' جو نیند میں تھا' مگر اس کی تیز آواز سے کچی نیند سے اٹھ رہا تھا۔

"ہاں' ہاں بالکل جاتی ہیں' مگر تم بہنوں کی طرح نہیں' جنہیں اپنے گھر سے زیادہ میکے کی پڑی رہتی ہے۔ اگر تمہاری بھابھیاں ایک سے دو دفعہ اپنے میکے یا کہیں گھومنے پھرنے چلی جائیں تو تم اپنی امی کی فکر میں یہاں سے دس فون کر دیتی ہو کہ وہ دونوں ساس کو

اکیلا چھوڑ کر ایسے کیسے نکل گئیں؟ ایسا اس وقت کیوں نہیں سوچتی ہو' جب تم لوگ اپنی ساسوں کو اکیلا چھوڑ کر دو' دو دن رہنے چلی جاتی ہو' اور ویسے بھی میری حامد اور شاہد سے بات ہوئی تھی وہ بھی ہر وقت کی چخ چخ سے تنگ آگئے ہیں۔ امی کا گھر کہتے ہوئے تم لوگ یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ وہاں اور لوگ بھی رہتے ہیں اور ان کی بھی کوئی ذاتی زندگی ہے۔ انہیں بھی آرام و سکون کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں؟"

مومن میاں کے اندر برسوں سے جمع ہونے والا لاوا آج بہہ نکلا تھا۔

"میں آپ سے فضول بحث میں الجھنا نہیں چاہتی۔ میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ جب ہمیں ایک موقع مل رہا ہے کہ ہم وہاں ایک اچھا اور بڑا گھر سستے میں خرید سکیں تو اس ڈربے میں رہنے کا کیا جواز؟ ویسے بھی ہم بہنوں کو لگنے لگا ہے کہ ماں جی کو اب ہماری ضرورت ہے۔ اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ویسے بھی مجھے شروع سے ہی بڑے گھر کی عادت ہے۔ میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔" تیز لہجے میں کہتی چلی گئی۔

"اچھا' ورنہ ہماری شادی سے قبل تو تمہیں یہ فلیٹ اور اس کا پرسکون ماحول بہت بھاتا تھا اور جہاں تک خالہ کے اکیلے رہنے کی بات ہے تو کیا وہاں تمہارے بھائی اور ان کی فیملی نہیں رہتی' جہاں تک میرا خیال ہے وہ دونوں ماں کے فرماں بردار بھی ہیں' پھر وہ کیسے اکیلی ہوگئیں؟" وہ حیرت سے پوچھ بیٹھا۔

"دیکھیے بھائیوں کی بات اور ہے۔ مگر نادیہ اور مہرین ہماری بھابھیاں ہیں' وہ کچھ بھی کرلیں' میری امی ان کی ساس ہی رہیں گی' ماں نہیں بن سکتیں نا۔" رونق نے دانت کچکچا کر کہا تو' مومن میاں' بیوی کو دیکھ کر رہ گئے۔

"اصل میں کچھ سسرال والے خود اپنی بہوؤں کو بگاڑتے ہیں' خصوصاً" جہاں تم جیسی سوچ رکھنے والی بہنیں ہوں تو وہاں کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ یہاں تمہیں صحیح معنوں میں سسرال نہیں ملا تو تم اپنے میکے کو سسرال سمجھ کے بھابھیوں سے بدلے نکالتی ہو' جب وہ منہ کو آنے لگتی ہیں تو انہیں برا بھلا کہتی ہو۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ پہلے جب کبھی میں سسرال جاتا تھا مہرین اور نادیہ سر جھکائے کچن میں لگی ہوتی تھیں۔ تم سب بچوں سمیت بیٹھی ان کی پکائی ہوئی چیزوں میں کیڑے نکال رہی ہوتی تھیں۔ اس وقت اگر انصاف سے کام لیا جاتا اور بہوؤں کا بھی دل رکھا جاتا تو' حالات اتنے خراب نہ ہوتے۔" مومن میاں اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ شوہر کو یوں ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر رونق نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں۔

"ارے بھئی جب تک صرف نادیہ تھی' ہمارے گھر کا ماحول بہتر تھا۔ مگر جب سے یہ مہرین بیاہ کر ہمارے گھر میں آئی' تو اس نے ہمارے گھر میں تفرقے ڈال دیے۔ ماحول ہی خراب کرکے رکھ دیا۔ اب مسائل بڑھ گئے ہیں۔" رونق نے شوہر کو سمجھانا چاہا۔ مگر وہ بھی آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔

"کوئی کسی کو نہیں بگاڑتا' اگر وہ اتنی بری ہے تو تم لوگ اچھے بن جاتے' تاکہ اسے کچھ کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ویسے بھی تم آج اس بات کا اعتراف کررہی ہو نا' ورنہ مہرین کی شادی سے قبل تو میں نے تم لوگوں کے منہ سے ہمیشہ نادیہ کی برائیاں ہی سنی تھیں۔ پتا نہیں اب صحیح بول رہی ہو یا پہلے غلط تھیں' اس بارے میں سوچنا؟"

"آپ کو تو ہمیشہ سے ہم لوگ غلط لگتے ہیں' بس وہ ہی صحیح ہیں۔" وہ چڑ کر بولی۔

"اس حقیقت کو مان لو کہ اب وہ گھر تمہاری بھابھیوں کے دم سے چلے گا۔ ویسے بھی اپنے اوپر رکھ کر سوچو' تم یہاں شہزادیوں کی طرح رہتی ہو۔ جب چاہا اٹھیں' جب چاہا سوئیں' کوئی روک ٹوک نہیں' میری امی کا وجود تو نہ ہونے کے برابر ہے' لیکن اگر میری کوئی بہن ہوتی اور وہ آکر تم پر اپنی مرضی تھوپتی' تمہارے گھر میں دخل اندازی کرتی تو تم برداشت کرتیں؟ کبھی نہیں۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر کا راستہ دکھا دیتیں۔ اس لیے پلیز اپنے دماغ کے کیڑے جھاڑ لو' میں کبھی سسرال کے قریب جا کر نہیں پڑوں گا۔"

مومن میاں نے دوٹوک لہجے میں بات ختم کردی۔ شاید شادی شدہ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ان کا اتنا طویل مکالمہ ہوا' ورنہ تو ہمیشہ صرف رونق ہی بولتی تھی' اور وہ سر جھکا کر سنتے تھے۔

"جیو بیٹا۔ دل خوش کردیا۔" دروازے سے لگی کھڑی رابعہ کا دل باغ باغ ہوگیا۔ آخر وہ بھی ایک ساس تھیں۔ رونق آنسو بہاتی بیڈ پر گرگئی۔



مومن میاں آج بڑی ہمت کرکے ملیحہ سے ملنے کے لیے کالج جا پہنچے تھے۔ رونق کو روٹھ کر میکے گئے ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہوگیا تھا۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ امی کے محلے میں گھر لیتا ہے۔ مگر مومن میاں کی غیرت کا امتحان تھا اور وہ اتنے غیرت مند تو تھے۔ اس لیے اس بار ان کا جھکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اور جب سے رونق نے یہ مسئلہ اٹھایا تھا رابعہ بیگم کتنی مضطرب تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اس گھر سے ان کی کتنی سہانی یادیں وابستہ تھیں اور ان کے دل کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ویسے بھی وہ آج کل ایک نئی ڈگر پر چل نکلا تھا۔

وہ اب اتنا کماتے تھے کہ دو بیویوں کا خرچ اٹھانا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ملیحہ نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔ اگر وہ اپنی محبت میں ثابت قدم نہ رہے تو کیا ہوا؟ ملیحہ کی وفا نے تو ان کا سر جھکا دیا۔ دل و دماغ دوبارہ اس کے نام کی دہائی دینے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ شاید قدرت نے ان کا سنجوگ یوں ہی لکھا ہو' اسی لیے وہ آج اس سے صاف صاف دل کی بات کرنے یہاں آئے تھے۔

چپڑاسی نے انہیں انتظار گاہ میں بٹھا دیا۔ کالج کی چھٹی ہوچکی تھی۔ اس لیے یہاں کافی سکون تھا۔ ائرکنڈیشن کی ٹھنڈک نے ان کے حواس بحال کیے تو وہ آنکھیں موند کر بیٹھ گئے۔

"ارے۔ آپ یہاں۔ میں تو سمجھی تھی کہ وہ۔ ہوں گے۔" وہ مومن میاں کو وہاں بیٹھا دیکھ کر چونک گئی۔

"ہاں۔ وہ۔ مجھے۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔" بڑا حوصلہ کرکے وہ یہاں تک تو آپہنچے تھے مگر ملیحہ کو سامنے دیکھ کر ہکلانے لگے۔

"جی خیریت۔ کہیے کیا کسی کا داخلہ کروانا ہے؟" وہ مومن میاں کے سامنے والے صوفے پر تکلف سے بیٹھی' خاصے روکھے انداز میں گویا ہوئی۔ بار بار اپنی نازک کلائی پر بندھی گولڈن چین والی گھڑی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک وہ وقت تھا کہ جب وہ ان کو دیکھنے یا ان سے ملنے کے بہانے ڈھونڈا کرتی تھی اور آج ان کی موجودگی جیسے روح پر بھاری پڑ رہی تھی۔

"وہ۔ میں یہاں سے۔ گزر رہا تھا تو۔ سوچا تم سے مل لوں۔" ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو گھبرا کر بولے۔ ملیحہ ڈیپ ریڈ اور فان کلر کے جدید انداز میں سلے ہوئے کرتے اور چوڑی دار پائجامے میں غضب ڈھا رہی تھی۔ آج اس نے تھوڑا بہت میک اپ بھی کیا ہوا تھا اور شاید بالوں کی کٹنگ بھی جدید انداز میں کروائی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کی کشش میں بے حد اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ اسے یک ٹک دیکھے گئے۔

"کیا اس کے دل تک میرے جذبوں کی رسائی ہوگئی' جو یہ آج اتنا سجی سنوری ہے۔" دل خوش فہم نے امیدوں کو بڑھاوا دیا' تو وہ مسکرا دیے۔ "میرا کالج آپ کے راستے میں تو نہیں پڑتا' خیر وہ بات کیجیے جو کرنے آئے ہیں۔" وہ آج بھی ان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

"ملیحہ اگر تمہیں برا نہ لگے تو مجھے ایک بات کہنی ہے۔" وہ گھبرا کر گویا ہوئے۔

اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

"وہ۔ کیا۔ تم مجھ سے شادی کروگی؟" وہ بڑی مشکلوں سے نظریں جھکا کر دل کی بات زبان تک لے ہی آئے۔

"کھڑے ہوجائیے آپ۔ اتنی ہمت کہ بیوی کے ہوتے ہوئے مجھ سے ایسا بے ہودہ مذاق کریں۔ میں تو

آپ کو صرف بزدل سمجھتی تھی، مگر آپ اتنے بے حمیت ہوں گے، ایسا میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔" وہ غصے میں لال بھبھوکا ہوگئی۔

"ملی ایسے۔۔۔ نہ کہو، کبھی ہم نے ایک دوسرے سے پیار کیا تھا۔" وہ گھبرا کر درد بھری آواز میں گویا ہوئے۔

"پیار۔۔۔ وہ میری جوانی کی بڑی سنگین بھول تھی اور وہ تو اسی دن ختم ہوگیا تھا جب میری امی آپ کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور ہو کر وہیل چیئر پر آگئیں۔" اس نے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں کو ہتھیلی کی پشت سے پونچھا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔

"تم جانتی ہو اس رات کی بات؟" مومن میاں یک دم خوف زدہ ہوگئے۔ ان کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ ملیحہ اس راز سے واقف ہوگی۔

خالہ نے تو فون پر اس سے وعدہ لیا تھا کہ ملی کو کبھی اس بات کا پتا نہ چلے۔ وہ تو اپنے ضمیر کو یہ کہہ کر سلا چکے تھے کہ اندھیری رات کے ساتھ ہی وہ بات ختم ہوگئی۔

"جی ہاں، میں سب جانتی تھی، مگر شاید اس وقت میں بھی آپ کے پیار میں اندھی ہوگئی تھی اور آپ سے امیدیں لگائے بیٹھی تھی۔ مگر آپ جیسا خود غرض انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ میری بھولی بھالی امی آپ کی منگنی کے لڈو کھا کر بھی آپ کی ذات سے ناامید نہیں ہوئیں۔ آپ کو بیٹا جو کہتی تھیں۔ مگر رابعہ خالہ کے سامنے اپنا اور بیٹی کا بھرم قائم رکھنا تھا۔ اسی لیے رات کے دو بجے آپ کے موبائل پر فون کر کے باہر سیڑھیوں پر ملنے کے لیے بلوایا، وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں سو رہی ہوں اور میں چادر میں گھسی سب کچھ سن رہی تھی۔ میری آن بان والی ماں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ کے میری خوشیوں کی بھیک مانگنا چاہتی تھی۔ وہ یہ بات نہیں جانتی تھی کہ میرے دل میں پنپنے والے محبت کے پودے کی آبیاری آپ کے اپنے ہاتھوں ہوئی تھی۔ وہ تو صرف میرا حال دل آپ سے کہنے آئی تھیں۔ ان کو میری انا اتنی عزیز تھی۔ اسی لیے لوگوں اور مجھ سے چھپانے کے لیے انہوں نے رات میں بات کرنے کا رسک لیا۔ اتنے سالوں کے تعلقات میں ان کا آپ پر اتنا تو حق بنتا تھا نا مگر آپ نے کیا، کیا؟ آس کے جگنو ان کے ہاتھوں میں تھما کر انہیں بات کرنے کے لیے باہر بلوا لیا اور خود نہ آئے، میری ماں ایک گھنٹے باہر کھڑی رہی اور میں اندر چادر میں منہ چھپا کر تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔ کیا ایسی قربانی کوئی ماں دے گی؟ جانے کیسے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گئی۔ شور سے محلے والے جاگ اٹھے، مگر آپ باہر نہ آئے، امی کو اسپتال لے جایا گیا، وہ ایک ایک کے پوچھنے پہ یہ ہی صفائی دیتی رہیں کہ وہ کچرے کی بالٹی رکھنے باہر آئی تھیں کہ پیر پھسل گیا۔ اکثر نے انہیں گھور کر دیکھا کہ اتنی رات کو کچرا رکھنے والی یہ عورت پاگل تو نہیں، مگر۔۔۔" وہ سرخ چہرے کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"پلیز مجھے۔۔۔ معاف کر دو ملی۔۔۔" مومن میاں کا "کاٹو تو بدن میں لہو نہیں" والا حال تھا۔

"امی مطمئن ہیں کہ مجھے آج تک کچھ نہیں پتا، مگر وہ کیا جانیں، جب وہ باہر کھڑی انتظار کر رہی تھیں، تو میں مسلسل آپ کا نمبر ملا رہی تھی کہ آپ باہر آکر بھلے انکار کر دیں، مگر ان کی آس تو توڑ دیں، تاکہ وہ واپس گھر آجائیں۔ مگر آپ ایسے سنگ دل کہ اپنا موبائل فون بند کر کے مزے سے سو گئے۔" اس کی آنکھوں میں تنفر تھا۔

"اس پوری رات سویا تو میں بھی نہیں تھا۔ خالہ سے ملنے آنا بھی چاہ رہا تھا۔ مگر پھر ڈر گیا کہ اگر خالہ نے میرا گریبان پکڑ کر پوچھ لیا کہ میں نے ان کی بیٹی سے دھوکا کیوں کیا؟ تو میرے پاس کیا جواب ہوگا؟ اسی ڈر سے موبائل بھی آف کر دیا تھا۔"

وہ سر جھکا کر بولے، بیوی کو احتساب کے کٹہرے تک لانے والے کا آج اپنا یوم حساب تھا۔ ملیحہ نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے جگ میں سے گلاس میں پانی انڈیل کر پیا، مومن میاں نے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے تر کیا۔ کمرے میں ایک ناگوار سی خاموشی چھائی۔

شاید دونوں کے پاس کہنے کے لیے اب کچھ نہیں بچا تھا۔ ملی کے موبائل نے زور، زور سے بج کر سکوت کو توڑا، وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں کے دائرے سے باہر نکل آئے۔

"جی۔۔۔ آپ آگئے ہیں۔ اوکے پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔" ملیحہ نے اپنی آواز پر قابو پا کر موبائل پر مختصر بات کی۔ مومن میاں کو ایک منٹ وہیں بیٹھنے کا کہہ کر وہ پرنسپل سے جانے کی اجازت لینے اندر کی طرف چل دی۔



وہ سر جھکائے ملیحہ کے پیچھے پیچھے کالج کے گیٹ سے باہر نکلے۔ ملی سر اٹھائے بلیک اکارڈ کی جانب بڑھ گئی۔ جو کالج کے گیٹ کے سامنے کھڑی تھی۔ وہ آج ان کے دل سے ساری خوش فہمیوں کا خاتمہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے رونق کی راہ بھی صاف کرنی تھی جو بہرحال مومن کے دو بچوں کی ماں تھی۔

"ارسلان! ان سے ملیے، یہ ہیں مومن، رابعہ خالہ کے بیٹے، ہماری بلڈنگ میں ہی ان کا فلیٹ ہے۔" مومن میاں نے اپنا ہاتھ مصافحہ کے لیے ارسلان کی طرف بڑھایا۔ وہ لمحوں میں اس کی شان دار شخصیت سے مرعوب ہوگئے تھے۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ملی میرے خیال میں فی الحال ان سے معذرت کر لو کیونکہ ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔ امید ہے کہ اب ان شاء اللہ ان سے ہماری ملاقات تقریب والے دن ہوگی۔" ارسلان بہت جلدی میں لگ رہے تھے۔ انہوں نے سرسری سی نظر مومن پر ڈالی اور استحقاق سے ملیحہ کے برابر میں جا کھڑے ہوئے، مومن کے دل کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا۔

"میں سمجھا نہیں، کیسی تقریب؟" وہ اپنے شبہ کی تصدیق چاہتے تھے۔ اس لیے بے ساختہ پوچھ بیٹھے۔

"اصل میں۔۔۔ اگلے مہینے ہماری شادی ہو رہی ہے۔ آج تو ہم برائیڈل ڈریس اور جیولری کی شاپنگ کے لیے طارق روڈ جا رہے ہیں۔ کارڈ چھپ کے آجائیں تو امی، رابعہ خالہ کو دینے آئیں گی۔"

ملیحہ نے ارسلان کے بازو کو تھام کر مضبوط لہجے میں تفصیل سے بتایا۔ مومن میاں کا چہرہ فق ہوگیا۔

"اتنا اچانک۔۔۔ سب کچھ کیسے؟" وہ حیران پریشان تھے۔

"بس۔۔۔ صاحب میں تو کئی سالوں سے اپنی اس کامنی سی کزن کا دیوانہ تھا۔ تاہم دل کی بات کہتے ہوئے ڈرتا تھا۔ پھر میرے اپنے گھریلو مسائل شادی کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اب یہ بات تو آپ بھی مانیں گے ناکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ یہ محترمہ تو ابھی بھی شادی کے لیے رضامند نہ تھیں۔ وہ ہی پرانی شرط کہ پہلے چچی جان پیروں پر کھڑی ہو جائیں، میں نے بہت سمجھایا کہ تم نے ان کی معذوری کو اپنے اوپر ایسے سوار کر لیا ہے جیسے اس کی ذمہ دار تم ہی ہو، خیر کئی مہینوں سے میری کوششیں جاری تھیں۔ ڈاکٹر ڈیوڈ نے آخر ان کے علاج کا عندیہ دے دیا۔ وہ میرا بہت اچھا دوست بھی ہے۔ اس نے چچی جان کی رپورٹ دیکھ کر مجھے حوصلہ دیا کہ ان کا کیس قابل علاج ہے اور چھوٹے سے آپریشن اور چند مہینوں کی فزیو تھراپی کے بعد وہ اسٹک پکڑ کر چلنے کے قابل ہو جائیں گی، اسی لیے اگلے مہینے نکاح کے فوراً بعد ہم تینوں لندن روانہ ہو جائیں گے۔ جہاں میری مما اپنی پیاری بہو کا شدت سے انتظار کر رہی ہیں۔ ہمارا ولیمہ بھی وہیں ہوگا۔" ارسلان نے ساری تفصیلات بتانے کے بعد سرشاری سے آنکھیں موند لیں۔ ملیحہ نے جتاتی نگاہوں سے مومن میاں کو دیکھا جو بڑی مشکل سے اپنے قدموں پر کھڑے تھے۔

ارسلان نے مومن میاں سے الوداعی مصافحہ کیا اور شادی میں شرکت کی یاد دہانی کرا کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ ملیحہ بلیک گاگلز میں اپنی گلابی آنکھیں چھپائے فرنٹ سیٹ پر جا بیٹھی۔

"مومن میاں! آج ایک اور بھرم ٹوٹ گیا، دل نادان تو یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ ملیحہ ابھی تک میری محبت کو

دل سے لگائے بیٹھی ہے۔ جب ہی تو اس نے شادی نہیں کی۔ مگر وہ تو میری جفاؤں کا کفارہ ادا کر رہی تھی۔"
گاڑی کی سیٹ پر گرتے ہوئے انہوں نے سر تھام کر خود کلامی کی۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے اپنے دل کو جھڑکا، جس کی آہ و زاری جاری تھی۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اب ان پر ایک ان چاہی تکان سوار ہو رہی تھی۔ مگر سفر تو جاری رکھنا تھا، چاہے وہ گاڑی کا ہو یا زندگی کا۔

☆ ☆ ☆

"اماں، مہرین کی امی بہت بیمار رہنے لگی ہیں۔ اس لیے ہم لوگ چند دنوں کے لیے وہاں شفٹ ہو رہے ہیں۔" حامد ایک بڑا سا سوٹ کیس تھامے ماں کے کمرے میں داخل ہوئے۔ پیچھے نیلے رنگ کے لان کے سوٹ میں تیار مہرین اور ان کے دونوں بچے چلے آ رہے تھے۔

"کیا۔۔۔ مطلب ہے۔۔۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا، سسرال میں جا کر پڑو گے، تمہیں شرم نہیں آئے گی؟" وہ پاندان پھینک پھانک تخت سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"امی! اس میں شرمندگی کی کیا بات ہے؟ میری امی بیمار ہیں، ان کو میری ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا کہ ہم وہاں جا کر رہیں۔" مہرین نے مسکرا کر کہا۔ ان سب کی آوازیں سن کر روشنی اور رونق جو کمرے میں مزے سے لیٹی تھیں اٹھ کر باہر چلی آئیں۔

"یہ دیکھو ہمارے بھائی کو، کیسے بیوی کی سنتا ہے؟ سسرال جاتے ہوئے اسے شرم نہیں آئی۔" روشنی عادت کے مطابق تنک کے بولی۔ "پلیز تم تو خاموش ہی رہو، ارے کون اپنی بیوی کی نہیں سنتا، اگر انور بھائی تمہاری نہیں سنتے تو آج تم اپنی مرضی چلا پاتیں۔" مہرین نے چبا چبا کر کہا۔

"امی پلیز۔۔۔ آپ کو ویسے بھی بہوؤں کی کیا ضرورت۔۔۔ آپ کے کام کاج کے لیے آپ کی بیٹیاں آگئی ہیں، تو پھر اچھا ہے بھابھی کو جانے دیں۔" نادیہ جو ان کے دلوں کا ناسور بنی ہوئی تھی، فوراً جٹھانی کی مدد کو آئی۔

"نہیں۔۔۔ نہیں میں اپنے بچوں کو کہیں جانے نہیں دوں گی، ارے یہ چھوٹا جب تک میرے پلنگ پر نہیں سوتا مجھے نیند نہیں آتی۔" نور جہاں نے حامد کے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھا کر اس کا منہ چوم لیا۔

"دیکھیے امی۔۔۔ اگر بیٹیاں گھر میں رکھنے کی چیز ہوتیں تو راجہ، مہاراجہ بھی اپنی بیٹیوں کو نہ بیاہتے، مگر یہاں جب دنیا سے ہٹ کر کام کیے جائیں گے تو پھر گھر میں مسئلے مسائل تو جنم لیں گے۔ اس کے لیے صرف میری بیوی کو ذمہ دار ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے؟" شاہد نے ماں کا کندھا دبانا شروع کر دیا۔

"یہ دیکھو۔۔۔ ایک اور آیا بیوی کا حمایتی، ارے ان عورتوں کی لگائی بجھائی نے تو آج یہ دن دکھائے ہیں کہ ہمارے بھائی منہ کو چلے آ رہے ہیں۔" رونق نے ہاتھ نچا کر کہا۔

"کیوں بھئی کیا ہم لوگ انسان نہیں، جب ہمارا دل دکھتا ہے تو ہماری زبانیں بھی چلتی ہیں۔ ہم کوئی بات کسی سے بول دیں تو برائی بھلائی کرنے والی مشہور، اگر وہ ہی کام آپ لوگ کریں، تو ایک دوسرے سے دل کی بات شیئر کرنا کہا جاتا ہے۔" نادیہ نے سب کی طبیعت صاف کر دی۔

"ٹھیک ہے بیٹا، مگر گھر کے مسئلے آپس میں بیٹھ کر ہی حل کرنے چاہئیں۔" نور جہاں کا دم ختم ہونے لگا۔

"امی۔۔۔ ہم لوگ بھی دل کے برے نہیں ہیں، مگر جب تک دلوں کو صاف نہ کیا جائے تو کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نہیں، ویسے تو ایک دوسرے سے محبت کے ترانے گائے جاتے ہیں اور ادھر پیٹھ مڑی نہیں، ایک دوسرے کی برائیاں شروع بھلا کوئی کب تک برداشت کرے گا۔" مہرین اور نادیہ بھی ساس کے پاس آ بیٹھیں۔

"میری بیٹیوں نے میرے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں، مجھ پر ان کا بڑا احسان ہے۔" نور جہاں سے بیٹیوں کا اترا چہرہ نہ دیکھا گیا۔ فوراً ہی سو دفعہ کی دہرائی ہوئی بات ایک بار پھر دہرائی۔

"انہوں نے جو کچھ کیا، اپنی ماں کے لیے کیا نا؟ یہ اچھی بات ہے، اللہ ان کو اس کی جزا دے گا، ہم ان کی قربانیوں کو اور سراہتے جب وہ یہ سب اپنی ساس کے لیے کرتیں، جیسا کہ وہ ہم سے امید رکھتی ہیں۔" دونوں بھابھیاں یک زبان ہو کر بولیں۔

"اچھا اماں! ہم لوگ شام تک گھر جا رہے ہیں۔" وہ دونوں اداسی سے بولیں تو ماں نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ بھی تھا ان کی نسل اب بیٹوں سے ہی آگے چلنی تھی نا کہ بیٹیوں سے۔ آج بڑے نے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کل چھوٹا بھی اس کی دیکھا دیکھی گھر چھوڑ کر چلا جاتا تو ان کا کیا ہوتا۔

"دیکھو میری پیاری بہنو! آؤ، جاؤ، رہو، کھاؤ پیو، تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا، مگر یہ جو ایک بھابھی کو چڑھانا تو ایک کو اتارنا، وہ کیا پہنتی ہے؟ وہ کیا کھاتی ہے؟ کتنا گھومتی ہے؟ پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ یہ سب تمہارے مسئلے نہیں، ان سب باتوں سے سوائے دل برا ہونے کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ تو پلیز اس گھر کے ماحول کو ٹھیک رکھنے میں واقعی ہماری بہنیں بن کر اپنا مثبت کردار ادا کرو، کچھ ایسا ہی ہم نے اپنی اپنی بیویوں کو بھی سمجھایا ہے۔" حامد نے دونوں بہنوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ان سے لپٹ کر رو دیں۔

"ارے اس موئے کالے سوٹ کیس کو تو لے جا کر اندر رکھو، اسے دیکھ دیکھ کر میرا تو بی پی شوٹ کر رہا ہے۔" نور جہاں نے کینہ توز نظروں سے بہو کے پہلو میں رکھے سوٹ کیس کو گھورا۔

"ارے۔۔۔ یہ۔۔۔ نادیہ۔۔۔ مہرین پلیز کھولو نا اسے۔۔۔ اس میں میری دونوں بہنوں، بہنوئیوں اور ان کے بچوں کے لیے گرمیوں کے کپڑے اور دوسری سوغات وغیرہ ہیں۔ یہ تم دونوں کے ساتھ جائیں گے۔" حامد نے مسکرا کر کہا تو نور جہاں کھل اٹھیں۔

"چلو بھئی نادیہ! ذرا مزیدار سی بریانی اور وائٹ کڑھائی تو پکاؤ، میری تھوڑی دیر قبل مومن اور انور میاں سے بات ہوئی ہے۔ وہ اپنی اپنی فیملی کے بغیر اداس ہیں تو شام تک ان سب کو لینے آ رہے ہیں۔" شاہد نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

"تم لوگ چلو، ہم بھی کچن میں تم لوگوں کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔ اتنی گرمی میں اتنے سارے لوگوں کا کھانا پکانا آسان تو نہیں، سب مل کر کام کریں گے تو گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جائے گا۔" رونق اور روشنی کے دلوں سے بھی کدورتیں صاف ہو گئی تھیں، وہ مسکراتی ہوئی بھابھیوں کے پیچھے چل پڑیں، تو انہوں نے بھی نندوں کو گلے لگا لیا۔ ☆



سُنو سانول،

سُنو سانول!

ابھی پہلی محبت کے بہت سے قرض باقی ہیں

ابھی پہلی مسافت کی تھکن سے چُور ہیں پاؤں

ابھی پہلی رفاقت کا ہر اک گھاؤ سلامت ہے

ابھی مقتول خوابوں کو بھی دفنایا نہیں ہم نے

ابھی آنکھیں ہیں عدت میں

ابھی یہ سوگ کے دن ہیں

ابھی اس غم کی کیفیت سے باہر کس طرح آئیں

ابھی یہ زخم بھرنے دو

ابھی کچھ دن گزرنے دو

یہ غم کے نیلگوں دریا اُتر جائیں تو سوچیں گے

ابھی یہ زخم تازہ ہیں، یہ بھر جائیں تو سوچیں گے

میثم علی آغا

وہ محبت نہیں، نہ یاری ہے
جس کی بنیاد کاروباری ہے

ہو بپا حشر اپنی آنکھ کھُلے
خوابِ دُنیا تو ہم پہ بھاری ہے

نہ محبت پہ ناصح ٹوک ہمیں
کیا یہ مضمون اختیاری ہے؟

ایسی نازک مزاجی کیا کیجیے
ان کے لفظوں کی ضربِ کاری ہے

کم سخن ہوں اگر بُرائی کیا
وحشتِ دل کی پردہ داری ہے

تم سے ساحر بھرے کہاں یہ دل
حاصلِ وصل بے قراری ہے

فرقان اللہ ساحر

مسکراتی ہوئی اس کی تصویر کے زاویے تھے بہت
رنگ پھیکے پڑے تو، تحیّر لیے آئنے تھے بہت

عشق بے تاب کا اک سفر تھا کہ جس میں نہ ٹھہرے قدم
عقل کی بات کو ہم اگر مانتے سانحے تھے بہت

اک گماں تھا کہ ہم چل رہے ہیں مگر ساتھ رستہ چلا
اپنے قدموں کو دیکھا تو پلٹے ہوئے دائرے تھے بہت

دُھوپ کے اس سفر میں بس اک خوفِ تشنہ لبی ہی تو ہے
خستہ دیوار کے سائے سے اُٹھ گئے وسوسے تھے بہت

درمیاں شب میں اک تھرتھراتی ہوئی لو نے سرگوشی کی
ان ستارہ شناسوں کے ہاتھوں میں تو زائچے تھے بہت

اب جو رُوداد پوچھو ہو کیسے سفر ہم نے طے کر لیا
بچ کے آئے ہیں کیسے نہ پوچھو میاں، حادثے تھے بہت

تھے دلوں میں تو جذبے وہی موجزن سر اٹھائے رہے
عشق کے دو جزیروں کے بھی درمیاں فاصلے تھے بہت

نعیم صدیقی



چھُپائے دل میں غموں کا جہاں بیٹھے ہیں
تمہاری بزم میں ہم بے زباں بیٹھے ہیں

یہ اور بات کہ منزل پہ ہم پہنچ نہ سکے
مگر یہ کم ہے کہ راہوں کو چھان بیٹھے ہیں

فُغاں ہے، درد ہے، سوز و فراق و داغِ الم
ابھی تو گھر میں بہت مہرباں بیٹھے ہیں

اب اور گردشِ تقدیر کیا ستائے گی
لُٹا کے عشق میں نام و نشاں بیٹھے ہیں

وہ ایک لفظِ محبت ہی دل کا دشمن ہے
جسے شریعتِ احساس مان بیٹھے ہیں

ساغر صدیقی

شگفتہ نگاہ



رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت صخر بن وداعہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے اللہ! میری امت کے لیے صبح کا وقت بابرکت بنادے۔"
انہوں نے کہا: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی فوجی دستہ یا لشکر روانہ فرماتے تو صبح کے وقت روانہ فرماتے تھے۔"
حضرت عمارہ بن حدیدؓ نے کہا: "حضرت صخرؓ تاجر تھے۔ وہ اپنا تجارتی قافلہ صبح کے وقت روانہ فرماتے تھے۔ چنانچہ وہ خوشحال ہوگئے۔ اور ان کا مال زیادہ ہوگیا۔"
فوائد و مسائل:
1۔ صبح کا وقت بابرکت ہے، لہٰذا اسے مفید کاموں میں صرف کرنا چاہیے۔ غفلت اور نیند میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔
2۔ صبح جلدی دکان کھولنا تاجر کے لیے باعث برکت ہے۔

زلزلہ اور انصاف،

سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کا زمانہ تھا۔ زمین نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ مدینہ کے در و بام کانپ اٹھے۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فی الفور اپنا کوڑا اٹھایا اور ایک رسید کیا زمین پر۔
"کیوں، کیا عمر تیری پشت پر انصاف نہیں کر رہا ہے؟"
یہ سننا تھا کہ زمین کی لرزش فوراً تھم گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد سے مدینہ منورہ میں آج تک زلزلہ نہیں آیا۔

ضبط نفس،

سقراط کو اس کے چند شاگرد اس وقت کے مشہور قیافہ شناس کے پاس لے گئے۔ اس نے سقراط کو دیکھ کر کہا۔
"یہ شخص نفس پرست، مغلوب الغضب اور نہایت عیش پسند ہے۔"
شاگردوں نے قیافہ شناس سے کہا: "آج ہمیں تمہارے کمال قیافہ شناسی پر شبہ ہوگیا ہے۔ اور گزشتہ کی نسبت بھی یہ یقین ہوگیا ہے کہ تم اٹکل پچو بیان کرتے ہو جو اتفاقاً صحیح نکل آتا ہے۔"
سقراط نے کہا: "اس شخص کے کمال میں کوئی شبہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بیان کردہ عیب مجھ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ لیکن میں نے اپنے ضبط نفس اور حکمت و دانائی سے ان تمام عیوب پر غلبہ حاصل کرلیا ہے۔"

جینے کا بہانہ،

ہر انسان کے اندر ایک "تلاش"، ایک جستجو، ایک خواہش ہوتی ہے۔ جس کی جستجو ہوتی ہے، وہ مل جائے تو تلاش ختم ہو جاتی ہے مگر تلاش ختم ہو جائے تو زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ تلاش دراصل ایک تصور ہے۔ یہ آپ کے ذہن میں ہوتی ہے۔ ہر انسان کی اپنی اپنی تلاش ہوتی ہے۔ یہ جینے کا ایک بہانہ ہے۔
(مستنصر حسین تارڑ)

نمرہ، اقرا۔ کراچی

دلچسپ جواب،

ایک انٹرویو کے دوران مستنصر حسین تارڑ سے سوال کیا گیا۔
"شاہد آفریدی، کترینہ کیف یا انجلینا جولی میں سے کس کے ساتھ ڈنر پر جانا پسند کریں گے؟"
انہوں نے کہا: "کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ کترینہ اور انجلینا دونوں ہی کے ساتھ جاسکوں؟"
"تو پھر آپ کی بیگم بھی ساتھ ہوں گی؟" صحافی نے کہا تو تارڑ صاحب بے ساختہ بولے۔
"یہ آپ سے کس نے کہا۔ بھئی انسان فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھانے جاتا ہے تو اپنی دال روٹی ساتھ لے کر تو نہیں جاتا۔"

بینش مدثر۔ فیصل آباد

مضحکہ خیز،

انتہا پسند ہندو جماعت وی ایچ پی کے رہنما چندر موہن شرما نے بھارت کے معروف اخبار دی ہندو کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ بھارت کے مسلمانوں نے اپنی آبادی بڑھانے کے لیے ایک نیا طریقہ ایجاد کر لیا ہے اور یہ "جہاد"، "پیار سے پھنسانے کا کھیل ہے۔ اس جہاد کے تحت خوش شکل نوجوانوں کو مدارس میں لڑکیاں پھنسانے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے اور پچانوے فیصد لڑکیاں مسلمان لڑکوں کے ساتھ بھاگتی ہیں اور ان ہی کے ساتھ شادی کرتی ہیں۔
انتہا پسند رہنما اس نکتے پر غور کرنے کو تیار نہیں کہ مسلم معاشرے میں عورت کا مقام ہندو معاشرے سے کہیں زیادہ بلند ہے اور مسلمان اپنی عورتوں کی زیادہ عزت کرتے ہیں اور ان سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور ان کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔

مطالعہ،

مطالعے کی عادت ڈالنا ایک طرح سے تمام دنیاوی غم و فکر سے نجات کے لیے اپنے لیے ایک پناہ گاہ تعمیر کرنا ہے۔
(سمرسٹ ماہم)

لمحہ فکریہ،

کیا یہ شرم ناک بات نہیں کہ انسانوں پر خطیب حکومت کریں جو لمبی تقریروں سے اس طرح سے گونجتے رہتے ہیں جس طرح سے پیتل کے برتن جو ضرب لگنے کے بعد اس وقت تک گونجتے رہتے ہیں جب تک کوئی ان پر ہاتھ نہیں رکھ دیتا۔
(افلاطون)

جمہوریت،

نہ تو موجودہ حالات سے اور نہ ہی تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اکثریت حکومت کرتی ہے یا اکثریت نے کبھی حکومت کی ہے۔
(جیفرسن ڈیوس)

سنیاسی بابا،

ایک ادھیڑ عمر صاحب ایک کلینک کے ریسپشن پر پہنچے اور بولے۔
"میں آپ کے سو سالہ سنیاسی بابا سے ملنا چاہتا ہوں جو اسی سال تک پہاڑوں پر چلہ کاٹ کر آئے ہیں۔"
"آپ کس سلسلے میں بابا جی سے ملنا چاہتے ہیں؟" ریسپشنسٹ نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے پیشہ ورانہ روانی سے پوچھا۔
"میں اس کا باپ ہوں۔ گاؤں سے آیا ہوں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اس نے پچھلے چار مہینے سے خرچے کے لیے گھر پیسے نہیں بھیجے۔" ادھیڑ عمر آدمی نے کہا۔

ندا، فضہ۔ کراچی

کاروباری گر،

دو چھوٹی بچیاں ایک بدصورت سیٹھ کے پاس چاکلیٹ بیچنے گئیں۔ اور عام سیلز گرل کی طرح لمبی چوڑی باتیں بنانے کے بجائے انہوں نے سیٹھ سے درخواست کی کہ وہ ان سے چاکلیٹ کا ڈبہ خریدے۔
"مگر کیوں؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"کیونکہ آپ بہت خوبصورت ہیں اور اس چاکلیٹ کے استعمال سے آپ مزید خوبرو بن سکتے ہیں۔" ایک بچی نے جواب دیا۔

بدصورت سیٹھ نے فوراً چھ ڈبے خرید لیے۔

"کاروبار میں فضول باتیں کام نہیں آتیں۔" وہ قیمت دے کر بولا۔ "حقیقت، سچائی اور دیانت داری سے کام لیا جائے تو تمہاری طرح کوئی بھی اپنی چیز بیچنے میں ناکام نہ ہو۔"

زندگی،

☆ زندگی ایک ایسا نغمہ ہے جس کی فرمائش کی جائے تو دوبارہ نہیں چلتا۔

☆ زندگی کا ہم پر کتنا احسان ہے کہ صرف ایک بار ہی روٹھتی ہے۔

☆ زندگی کی مشکلات گھاس کی مانند ہوتی ہیں۔ ان پر توجہ نہ دی جائے تو یہ بڑھ جاتی ہیں۔

☆ زندگی اتنی تلخ تو نہیں کہ اس کے آگے بھاگا جائے اور اتنی شیریں بھی نہیں کہ اس کے پیچھے بھاگا جائے۔

☆ زندگی کے اخبار میں سب سے اچھا صفحہ بچوں کا ہوتا ہے۔

☆ زندگی میں سوال زیادہ اور جواب کم ہوتے ہیں۔

☆ زندگی ایک بینک کی مانند ہوتی ہے، جو کچھ اس میں جمع کرو گے وہی کچھ نکلوا سکو گے۔

(خلیل جبران)

نوال افضل گھمن۔ گجرات

حضرت علیؓ نے فرمایا،

عقل جیسی کوئی دولت نہیں۔ اور جہالت جیسی کوئی غربت نہیں۔ ادب و آداب جیسی کوئی میراث نہیں اور مشورے جیسا کوئی مددگار نہیں۔

صائمہ سندھو۔ گوجرہ

ڈراپ سین،

سی آئی اے کی پوسٹ کے لیے انٹرویو ہو رہے تھے۔ مقررہ وقت پر صرف تین ہی نوجوان آئے۔ پہلے کو اندر بلایا گیا۔ انٹرویو لینے والے چیئرمین نے اسے ایک رُخی تصویر دی اور پوچھا۔

"اس تصویر میں کیا انوکھی بات ہے؟"

لڑکے نے بہت غور کے بعد جواب دیا۔ "جن حضرت کی یہ تصویر ہے، وہ صرف ایک کان رکھتے ہیں۔"

اس پر چیئرمین حیران ہوا اور کہا۔

"محترم! یہ سائیڈ پوز ہے۔ ظاہر ہے ایک کان ہی نظر آئے گا۔ بہرحال آپ جاسکتے ہیں۔"

دوسرے نوجوان نے بھی یہی جواب دیا۔ "اس شخص کا ایک ہی کان ہے۔"

چیئرمین آگ بگولا ہو گیا اور اس قدر معمولی ذہانت رکھنے پر اسے بھی جانے کو کہہ دیا۔ تیسرے نوجوان سے بھی یہی سوال کیا گیا۔ اس نے تصویر کا بغور جائزہ لیا اور بہت دیر سوچنے کے بعد کہا۔

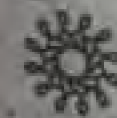
"وہ حضرت جن کی یہ تصویر ہے، انہوں نے کانٹیکٹ لینس لگائے ہوئے ہیں۔"

یہ سنتے ہی چیئرمین اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور اس نے کہا۔

"آپ کا جواب درست ہے مگر آپ یہ بتائیں کہ آپ نے یہ کیسے جانا؟"

اس نے کہا۔ "ان حضرت کی عمر چالیس سال سے اوپر لگتی ہے۔ اس عمر میں عموماً نظر کمزور ہو جاتی ہے انہوں نے عینک کے بجائے کانٹیکٹ لینس لگوائے کیونکہ عینک لگوانے کے لیے دو کان چاہئیں جو ان کے پاس نہیں ہیں۔ ارے بھئی ان کا ایک ہی کان ہے نا۔"

عائشہ۔ گوجرہ





میری بیاض سے

خالدہ جیلانی

نوال افضل گھمن ——— گجرات

رات بھی، نیند بھی، کہانی بھی
ہائے کیا چیز ہے جوانی بھی
ایک پیغام زندگانی بھی
عاشقی مرگِ ناگہانی بھی

ثمینہ کوثر عطاری ——— ڈوگہ گجرات

یہ جو عاشقی کا ہے سلسلہ، ہے اصل میں ہی کوئی معجزہ
کہ جو لفظ میرے گماں میں تھے، وہ تری زباں پہ آ گئے
مری عمر سے جو نہ سمٹ سکے، مرے دل میں اتنے سوال تھے
ترے پاس جتنے جواب تھے، تری اک نگاہ میں آ گئے

نواب زادی مولنگی ——— تحصیل مورو

کیا ڈھونڈتے ہیں، کیا کھو بیٹھے کس عجلت میں ہیں لوگ یہاں
سرِ راہ کچھ ایسے ملتے ہیں جیسے کوئی رسم نبھانی ہو
کچھ یادیں اور کتابیں ہوں، مرا عشق ہو اور یارانے ہوں
اسی آب و ہوا میں رہنا ہو اور ساری عمر بتانی ہو

انیقہ انا ——— چکوال

ماہ و جلال دام و درم اور کتنی دیر
رنگِ رواں یہ نقش اور کتنی دیر
شام آ رہی ہے، ڈوبتا سورج بتائے گا
تم اور کتنی دیر ہو، ہم اور کتنی دیر

سمیرا خان ——— ملکانی شریف

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ ایک شب جو تری یاد میں گزاری ہے
مجھے یہ زعم کہ میں حسن کا مصور ہوں
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

صدف عمران ——— کراچی

کچھ لوگ یوں ہی شہر میں ہم سے بھی خفا ہیں
ہر ایک سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

عرفانہ شیخ ——— پرانا سکھر

مجھے معلوم ہے وعدہ نبھانا سخت مشکل ہے
مری کم ہمتی انکار بھی کرنے نہیں دیتی

فوزیہ سلیم ——— چیچہ وطنی

کچھ دلوں کی یہ ملاقاتیں بہت اچھی لگیں
اس سے جو کچھ ہو سکیں، باتیں بہت اچھی لگیں
بعد مدت کے دعوت پر جو اس کے گھر گیا
پھر اسی گھر میں مداراتیں بہت اچھی لگیں

ثمرہ احمد بٹ ——— پتوکی

مقامِ عاشقی دنیا نے سمجھا ہی نہیں ورنہ
جہاں تک تیرا غم ہوتا، وہیں تک زندگی ہوتی

کوثر بانو ——— کراچی

سب ہی کو بھولے ہوئے کام یاد آنے لگے
ہمارے ساتھ کوئی دو قدم چلا بھی نہیں
سنے گا کون کہ سب اپنے آپ میں گم ہیں
سنائیں کیا کہ سنانے کو کچھ رہا بھی نہیں

شفق شان شاہ ——— گوجرہ

اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑی تو محسوس ہوا
یہی وہ جگہ ہے جہاں رستہ بدلنا ہے

فاطمہ ——— نامعلوم شہر

کرتے ہیں ایسے عزیزوں کی خامیوں کا تذکرہ
اپنے عمل میں لوگ فرشتہ ہوں جیسے

خواتین کی ڈائری

امت الصبور

سارہ چودھری کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر خورشید رضوی کی یہ غزل آپ سب قارئین بہنوں کی نذر۔

یہ جو ننگ تھے، یہ جو نام تھے، مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے، مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے، مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گئے
تو وہی جو میرے غلام تھے مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں مجھے راس تھیں
یہ جو زہرِ خندِ سلام تھے مجھے کھا گئے

حرا قریشی کی ڈائری سے

امجد اسلام امجد کی نظم "اتنے خواب کہاں رکھوں گا" سے آپ سب بہنوں کے لیے۔

گماں آباد ہستی میں وہی اک دھوپ پھیلی ہے
بہم دیگر الجھتے، پھیلتے، بکھرے سوالوں کی
نہ پہلے تھا۔ نہ اب اس کی
کوئی آہٹ
کسی بھی سمت سے آواز دیتی ہے

فیض احمد فیض کی شاعری کی تعریف کرنا تو سورج کو چراغ دکھانے والی بات ہے۔ ان کے چند اشعار قارئین کی نذر۔

سہل یوں راہ زندگی کی ہے
ہر قدم پہ ہم نے عاشقی کی ہے

ہم نے سجا دل میں لیے گلشن
جب بہاروں نے بے رخی کی ہے

زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

آسیہ قادر کی ڈائری سے

میری فیورٹ شاعرہ پروین شاکر کے الفاظ تو خود بخود اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔

یہ بارش خوبصورت ہے
اک عرصے بعد
میری روح میں
سیراب ہونے کی تمنا جاگ اٹھی ہے
مگر بادل کے رستے میں
بہت سے پیڑ آتے ہیں
میں پل بھر کے لیے شاداب ہوں
اور اپنی باقی عمر
پھر صحرا میں کاٹوں
میں اپنی پیاس پر راضی رہوں گی
مرے آنسو میرے دل کی کفالت
کے لیے کافی رہیں گے



خبریں وغیرہ

تبصرہ نشاط



نیک تمنائیں

شوبز کی دنیا کو اگر بھیڑ چال کی دنیا کہا جائے تو یہ ایسا کچھ غلط بھی نہ ہوگا کہ یہاں اگر ایک شخص کوئی کام کردے تو پھر ہر دوسرا شخص وہی کام کرتا نظر آتا ہے۔
شوبز کی دنیا میں آج کل شادی کرنے کا فیشن ہے۔ خاص طور پر اداکاراؤں میں یہ "فیشن" کچھ زیادہ ہی مقبول ہو رہا ہے۔
معروف اداکارہ صنم بلوچ بھی گزشتہ دنوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئیں۔ صنم کے شوہر عبداللہ فرحت شوبز سے وابستہ ہیں اور خاصے باصلاحیت ہیں۔ (باصلاحیت ہیں، جب ہی تو صنم کو لے اڑے۔)
عبداللہ اینکر پرسن اور اداکار ہونے کے ساتھ ساتھ پروڈیوسر اور ہدایت کار بھی ہیں۔
دونوں نے نکاح ہونے تک اپنی شادی کی خبر سب سے چھپائے رکھی۔ تاہم نکاح ہوتے ہی ان کی شادی کی خبر ایک نجی چینل کے ذریعے منظر عام پر آگئی۔ جہاں یہ دونوں کام کرتے ہیں۔ (بات تو ہمیشہ گھر ہی سے پھیلتی ہے ناں۔) صنم اور عبداللہ کی شادی خاصی دھوم دھام سے ہوئی ہے۔ نکاح کے بعد صنم نے شادی کی تمام تقریبات یعنی مایوں، مہندی، رخصتی، ولیمہ اور شادی کی تمام رسمیں نہایت دھوم دھام سے کیں اور خوب ہلا گلا کیا۔ (کیوں نہ کرتیں۔ آخر مارننگ شو کی میزبان ہیں بھئی۔ جو اب مارننگ شوز کے بجائے "ویڈنگ شوز" ہو گئے ہیں۔)
زندگی کے اس خوش گوار موڑ پر ہم سب کی نیک تمنائیں صنم اور عبداللہ کے ساتھ ہیں۔



دل کی بیماری

پرانے زمانے کا ایک قصہ ہے کہ کسی دیہاتی نے ایک چھوٹا سا پرندہ دیکھا۔ جو اپنی بولی میں کچھ کہے جا رہا تھا۔ دیہاتی کی سمجھ میں نہ آیا کہ پرندہ کیا کہہ رہا ہے۔ اس نے قریب موجود ایک پہلوان سے پوچھا تو پہلوان نے کہا کہ یہ کہہ رہا ہے۔ "کھا تیل، گھی، کر کسرت۔"
دیہاتی کو پہلوان کی بات عجیب سی لگی تو اس نے ایک مولوی صاحب سے یہی بات پوچھی۔ مولوی صاحب نے کہا کہ "یہ پرندہ کہہ رہا ہے سبحان تیری قدرت"
گویا ہر انسان کی گفتگو اس کے کام، ارد گرد کے ماحول اور اس کی تربیت سے مطابقت رکھتی ہے۔
شاید اسی لیے ڈاکٹروں کو ایک اچھا بھلا صحت مند شخص بھی بیمار ہی نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر چاہیں بھی تو اپنی اس عادت سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ کیونکہ ڈاکٹر بننے کے لیے انہوں نے پڑھائی میں اتنی محنت، اتنی جان ماری اور پتا اتنا پانی کیا ہوتا ہے کہ پھر ڈاکٹری ان کے مزاج میں رچ بس سی جاتی ہے۔
29 ستمبر کو "دل کی بیماریوں" کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اپنی شائستہ واحدی ایک مارننگ شو کی معروف اینکر پرسن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک "ڈاکٹر" بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی "رگ ڈاکٹری" پھڑک اٹھی۔ لہٰذا انہوں نے خاص طور پر اس حوالے سے پیر کو پروگرام کیا۔ پروگرام کی ابتدا میں شائستہ نے بتایا کہ وہ آج کا پروگرام دل کی بیماریوں کے حوالے سے کر رہی ہیں۔ اس کے بعد شائستہ نے دو مہمان جوڑوں کو مدعو کیا۔ جن میں سے ایک جوڑے کی "لو میرج" ہوئی تھی۔ جبکہ دوسرے جوڑے کی "لو اینگیجمنٹ" ہوئی تھی۔ کیونکہ شائستہ کے خیال میں "لو" سے زیادہ بڑی دل کی کوئی اور بیماری نہیں ہے۔ اس کے بعد پروگرام میں وہ ناچ گانا اور ہلا گلا ہوا ہے کہ الامان الحفیظ۔
(اف۔ ایسی حرکتیں تو دل کی بیماری کے بعد نہیں "دماغی بیماری" کے بعد کی جاتی ہیں۔ ویسے دل کی اس قسم کی بیماریوں سے باہر نہ آنے کا عارضہ تو اب تک ادیبوں اور شاعروں ہی میں دیکھنے میں آیا تھا۔ کسی ڈاکٹر میں پہلی مرتبہ دیکھنے میں آیا ہے۔ شائستہ جی! آپ نے واقعی ڈاکٹری پڑھی بھی ہے یا ڈگری کی محض شاپنگ ہی کی ہے؟)

حقیقت

ڈراما ہر زبان کے ادب کی مقبول صنف رہا ہے۔ ماضی میں مغرب میں بڑے بڑے ڈراما نگار گزرے ہیں

جن کے ڈرامے دیکھنے اور پڑھنے والوں کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ مگر اب لگتا ہے کہ مغرب والے اپنے سارے بہترین ڈراما نگار کھو چکے ہیں۔ اسی لیے ان کے لکھے ہر ڈرامے کے اسکرپٹ میں جھول پایا جاتا ہے۔

ملالہ یوسف زئی۔۔۔ مغرب کا ایک ایسا ڈراما جس کی کہانی میں ابتدا ہی سے خاصا تجسس موجود تھا۔ ملالہ ایک عرصے تک لوگوں کے لیے ایک معمانی رہی۔ کچھ لوگ اسے مظلوم سمجھتے رہے۔ تاہم چند زیرک نگاہ لوگ بھانپ گئے کہ ہو نہ ہو' ملالہ مغرب کا کوئی نیا ڈراما ہی معلوم ہوتی ہے۔

اور جناب! اب اس ڈرامے کے اختتام پر ان زیرک نگاہ لوگوں کی پیش گوئی ہی درست ثابت ہوئی۔ ارے۔۔۔ رے! ڈرامے کے اختتام سے آپ کچھ اور نہ سمجھ لیجیے گا۔ یہاں ڈرامے کا اختتام اس طرح ہوا ہے کہ مرکزی کردار کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے۔

مغرب سے مختلف اعزازات اور نوبل پرائز بٹورنے کے بعد حال ہی میں ملالہ کی ایک کتاب منظر عام پر آئی ہے۔۔۔ آئی ایم ملالہ۔۔۔ (اللہ نہ کرے۔ آپ بھی ناں! پتا نہیں کیا کیا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ کتاب کا نام ہے۔) اس کتاب میں ملالہ نے ہر اس شخص کی حمایت کی ہے۔ جسے اہلِ اسلام ناپسندیدگی' بلکہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ملعون مصنف سلمان رشدی کے لیے ملالہ کا خیال ہے کہ ہر شخص کو آزادیٔ اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ ہماری خفیہ ایجنسیوں کے ایک ملّا نے اس کتاب کے خلاف مضامین لکھے اور دیکھتے ہی پورے پاکستان میں ملّا باہر نکل آئے۔ (اہل مغرب کو چاہیے کہ "آزادیٔ اظہار رائے" کے نعرے کو بدل کے "آزادیٔ ہرزہ سرائی اسلام" کردیں۔) انسانوں کے بنائے اس نعرے کی حمایت کرنے والی ملالہ نے کئی اسلامی قوانین پر بھی شدید تنقید کی ہے۔ ملالہ کی یہ کتاب انگریزی میں ہے۔ جسے معروف برطانوی صحافی کرسٹینا لیمب نے تحریر کیا ہے۔ یہ وہی صحافی ہیں' جو دنیا بھر میں معروف اور پاکستان میں اپنی سرگرمیوں کی وجہ سے بدنام ہیں۔ گویا سارے اسلام مخالف لوگ اکٹھے ہوگئے ہیں۔ مغرب کی سرپرستی میں لکھی جانے والی اس کتاب کے ذریعے ملالہ کے کردار کی حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ در حقیقت وہ کون ہیں۔

(ملالہ جی! یہ کتاب لکھنے کا بے حد شکریہ۔۔۔ کہ وہ لوگ جو کل تک آپ کو بچی اور مظلوم سمجھتے تھے۔ وہ بھی اب جان گئے ہیں۔۔۔ میر جعفر۔۔۔ میر صادق۔۔۔ اور اب۔۔۔ ملالہ یوسف زئی۔)

یہ بیان کالمانہ

☆ یہ سندھ جو صدیوں کے سفر میں مسلسل سفر رہا ہے' وہ بھی پانی کا گیت ہے۔ جس کی آنکھوں میں پانی ہی پانی ہے۔ سیلاب کے موسم میں سندھ اسی پانی کا پیاسا گیت ہے۔

(اعجاز منگی۔۔۔ آواز حق)

دلِ مضطرب کی صلہ

باتیں صنم جنگ سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"صنم جنگ۔"
2 "پیار کا نام؟"
"بہن کہتی ہے صنو۔ ابو صنمی کہتے ہیں۔"
3 "تاریخ پیدائش / شہر؟"
"30 ستمبر / کراچی۔"
4 "قد / ستارہ؟"
"5 فٹ 4 انچ / لبرا۔"
5 "بہن بھائی / آپ کا نمبر؟"
"تین بہنیں ہیں۔ مجھے ملا کر ہم چار بہنیں ہیں / میرا نمبر پہلا ہے۔"
6 "تعلیمی قابلیت؟"
"ایم بی اے مارکیٹنگ۔"
7 "شادی؟"
"اگلے دو سال میں یقیناً" ہو جائے گی۔ امی ابو زیادہ انتظار نہیں کریں گے۔"
8 "شوبز میں کس نے متعارف کرایا؟"
"ایک دوست کے ذریعے آڈیشن دیا اور کامیابی اپنے

نیلنٹ یہ حاصل کی۔"

9 "آمد کب ہوئی شوبز میں؟"

"یہی کوئی چار ساڑھے چار سال پہلے۔ جب بی بی اے فرسٹ ایئر میں تھی تو اس فیلڈ میں آگئی تھی۔"

10 "پہلا پروگرام میوزک/ڈراما؟"

"میوزک میں "نیوز پلے" / اور سیریل "دل مضطر" ہے۔"

11 "پہلی کمائی؟/ خرچ؟"

"یہی کوئی پندرہ ہزار کے قریب اور مجھے شاپنگ کا بہت شوق ہے۔ تو شاپنگ ہی کی ہوگی۔"

12 "شوبز کی بڑی برائی؟"

"ہوگی کوئی۔ مجھے نہیں معلوم..... مجھے تو اچھے ہی لوگ ملے ہیں۔"

13 "آپ کی صبح کب ہوتی ہے؟"

"شوٹ کے دن نو بجے اور ورنہ دو بجے۔"

14 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"

"منہ دھونے کو دل چاہتا ہے۔"

15 "گھر والوں کی کون سی بات بری لگتی ہے؟"

"کوئی نہیں..... بڑے ہیں۔ جو مرضی کہہ لیں۔"

16 "اپنے ملک کا کون سا قانون برا لگتا ہے؟"

"کیا ہمارے ملک میں کوئی قانون ہے؟"

17 "اپنی ظاہری ساخت میں کیا کمی محسوس کرتی ہیں؟"

"کوئی نہیں۔ اللہ نے بہت اچھا بنایا ہے۔"

18 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"

"چیختی چلاتی نہیں ہوں۔ صابر و شاکر بچی ہوں۔ فریج سے نکال کر گرم کرکے کھا لیتی ہوں۔"

19 "کس دن کا شدت سے انتظار رہتا ہے؟"

"جس دن "چیک" ملنا ہو۔"

20 "شدید تھکن میں کہاں جانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی ہیں؟"

"اگر ابا کہیں جانے کو کہہ دیں۔ پھر چاہے میں نیند میں ہوں، بیمار ہوں یا جانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔ انکار نہیں کرتی۔"

21 "خوشی کا اظہار کس طرح کرتی ہو؟"

"گفٹ دے کر۔"

22 "گھر میں کس سے بہت پیار ہے؟"

"اپنے ابو سے بہت پیار ہے۔ انہیں گفٹ بھی دیتی رہتی ہوں۔"

23 "بیرون ملک کس بات سے متاثر ہوتی ہیں؟"

"کسی بھی بات سے نہیں۔ اپنا ملک اپنا ہے۔ ہمارا میڈیا اپنے ملک کو برا بناتا ہے۔ جبکہ ایسا ہے نہیں۔"

24 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"منحصر ہے بات پر کوئی۔ مجھے ڈومینیٹ (Dominate) کرے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

26 "غصے میں کیفیت؟"

"پہلے نظر انداز کرتی ہوں۔ پھر جب بات نہیں بنتی تو سنا دیتی ہوں۔"

27 "مردوں میں کیا خصوصیات اچھی لگتی ہیں؟"

"ہر مرد کی پرسنالٹی مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

28 "کوئی لڑکا اگر مسلسل گھورے تو؟"

"سنا دوں گی اور پوچھوں گی کہ "کیا بات ہے..... کوئی پرابلم ہے؟"

29 "پرائز بانڈ نکلنے کی منتظر رہتی ہیں؟"

"بہت زیادہ شوق ہے پرائز بانڈ کا اور نکلتے بھی ہیں ماشاء اللہ۔"

30 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"ابو کے۔"

31 "کوئی چیز جو وقت سے پہلے مل گئی ہو؟"

"یہ سب کامیابیاں، شہرت وغیرہ۔"

32 "جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے یا سنگل؟"

"جوائنٹ اکاؤنٹ ہونا چاہیے۔"

33 "جب شاپنگ کے لیے جاتی ہیں تو سب سے پہلے کیا خریدتی ہیں؟"

"جوتے، کپڑے۔"

34 "آپ کے دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"

"ہائے پتا نہیں..... کبھی کبھی خود بھی سوچتی ہوں کہ مجھے آگے کیا کرنا ہے۔"

35 "کبھی برا وقت آیا زندگی میں؟"

"الحمدللہ کبھی نہیں۔"

36 "بہترین تحفہ آپ کی نظر میں؟"

"پیار، محبت، پروا، عزت۔"

37 "کون سی بات موڈ پر اچھا اثر ڈالتی ہے؟"

"جب کوئی تعریف کرتا ہے اور حوصلہ افزائی کرتا ہے تو اچھا لگتا ہے۔"

38 "پسندیدہ پروفیشن؟"

"بینکر۔"

39 "مخلص کون ہوتا ہے اپنے یا پرائے؟"

"دونوں ہو سکتے ہیں۔"

40 "لوگ ملتے ہیں تو کیا کہتے ہیں؟"

"بہت معصوم ہو۔ بہت پیاری ہو۔ بہت اچھی لگتی ہو۔ بہت اچھی پرفارمر ہو۔"

41 "چھٹی کا دن کہاں گزارنا پسند کرتی ہیں؟"

"گھر میں اپنی فیملی کے ساتھ۔"

42 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"شلوار قمیص۔"

43 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"

"ہر کونے میں..... یا پھر جہاں میری بہن انعم نہ ہو۔ بہت روک ٹوک کرتی ہے۔"

44 "ایک آرٹسٹ جس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے؟"

"اس بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہیں ہے۔"

45 "کس کے ایس ایم ایس کا جواب فوراً دیتی ہیں؟"

"ابو کے۔"

46 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتی ہیں؟"

"دوستوں کے پاس چلی جاتی ہوں۔"

47 "ایک کردار جو آپ کرنا چاہتی ہیں؟"

"ابھی میں نئی نئی ہوں۔ زیادہ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ لیکن پھر بھی ایک دیوانی لڑکی کا رول کرنا چاہتی ہوں، جو عجیب و غریب حرکتیں کرتی ہو۔"

48 "ایک کردار جو ہٹ گیا؟"

"جی ابھی "صلہ" کا رول۔"

49 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائیں؟"

"ہاں ہوتا ہے ایسا۔ کیونکہ کوئی پیار سے مانگے تو آپ منع نہیں کر سکتے۔ بعد میں اس کی کیا نیت ہو۔ یہ معلوم نہیں ہوتا۔"

50 "مہمانوں کی آمد کیسی لگتی ہے؟"

"ٹھیک لگتی ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔"

51 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"

"تو روڈ پر بھیک مانگنے والے اور محنت کرنے والے بچوں کے لیے اسکول بناؤں گی۔ تعلیم کو عام کروں گی۔ چائلڈ لیبر قانون پر سختی سے عمل کروں گی۔"

52 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"

"فضول سی چیزیں۔ جیسے کپڑے، جوتے، بیگز وغیرہ۔"

53 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"

"ایک نصیحت ہوتی ہے، جو آپ کی اچھائی کے لیے ہوتی ہے اور ایک وہ جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں ہی سب کچھ ہوں۔ تو ان کی نصیحت بری لگتی ہے۔"

54 "وقت کی پابندی کرتی ہیں؟"

"تھوڑی سی لاپروا ہوں۔ مگر اکثر کرتی ہوں۔"

55 "کن لوگوں پر دل کھول کر خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنے آپ پر، اپنے گھر والوں پر جن میں بہنیں اور والدین شامل ہیں۔"

56 "اپنی کمائی سے اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"

"کچھ بھی نہیں۔ سوائے جوتے اور کپڑوں کے۔"

57 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ٹیبل یا چٹائی؟"

"چٹائی۔"

58 "اگر آپ کے علاوہ ساری دنیا سو جائے تو آپ کیا لینا پسند کریں گی؟"

"بہت مزے کا سوال ہے..... بہت ساری چیزیں لینا

چاہوں گی۔"
59 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے آپ کی دلچسپی؟"
"تھوڑی بہت ہے۔ بہت زیادہ نہیں ہے۔"
60 "ایک کھانا' جو بہت اچھا پکا لیتی ہیں؟"
"کچھ نہیں۔ کبھی اپنی امی کی مدد کرنے کچن میں چلی جاؤں تو امی باہر نکال دیتی ہیں کہ تمہیں کچھ نہیں آتا۔"
61 "عورت کا دل نرم ہوتا ہے یا مرد کا؟"
"عورت کا۔"
62 "کس ڈرامے میں سچ مچ مار کھائی؟"
"دل مضطر" میں عمران عباس سے تھپڑ کھایا۔"
64 "آپ کس کو اغوا کرنا چاہیں گی اور تاوان میں کیا وصول کریں گی؟"
"اپنی بہن کو اغوا کروں گی اور تاوان میں یہ وعدہ لوں گی کہ "بیٹا! اونچی آواز میں بات نہیں کروگی۔ صرف سنوگی اور کچھ نہیں کہوگی۔"
65 "کن کیڑوں سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں! مجھے کیڑوں سے ڈر نہیں لگتا۔ ہاں اگر شیر آگیا تو پھر میری خیر نہیں ہوگی۔"
66 "خودکشی کرنے والا بہادر ہوتا ہے یا بزدل؟"
"بزدل ہوتا ہے۔"
67 "شادی کی رسومات میں پسندیدہ رسم؟"
"جوتا چھپائی۔"
68 "کس قسم کے رویے دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"جب آپ کسی سے بہت اچھا کرو اور وہ کوئی رسپانس نہ دے یا پھر کوئی بدتمیزی کرے تب۔"
69 "ناشتا اور کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا پسند ہے؟"
"امی کھانا بہت اچھا پکاتی ہیں تو ان ہی کے ہاتھ کا پسند ہے۔"
70 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتیں؟"
"گاڑی کی چابی' پرس اور موبائل۔"
73 "آپ کی کوئی اچھی اور بری عادت؟"
"بری عادت یہ کہ بہت غصہ آتا ہے اور اچھی..... میرا خیال ہے سب ہی اچھی ہیں (قہقہہ)۔"
74 "ہاتھ میں پین آجائے تو کیا لکھتی ہیں؟"
"ڈراموں کی ڈیٹ' بجٹ اور کہانی۔"
75 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"بس ایک مرتبہ..... عموماً" نہیں چھوڑتی۔"
76 "مارننگ شو کے لیے آپ کے تاثرات؟"
"بس کردیں۔ بہت شادی بیاہ' ہلا گلا ہوگیا ہے۔ بہت ناچ گانا ہوگیا۔ کچھ اچھے پروگرام بھی کریں۔"
78 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہیں؟"
"موبائل اور چارجر اور کچھ نہیں۔"
79 "قدرت کی حسین تخلیق؟"
"ہم انسان' جانور' دنیا' پھول' پوری کائنات۔"
80 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"ابھی تک تو نہیں لگ رہی..... اللہ خیر کرے' کبھی بری نہ لگے۔"
81 "کون سے تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"عید۔"
82 "زندگی کب بدلی؟"
"ابھی تک تو نہیں بدلی۔ شاید شادی کے بعد بدلے گی۔"
83 "کوئی گہری نیند سے اٹھادے تو؟"
"تو کہتی ہوں۔ کیا ہے یار! کیوں اٹھادیا؟"
85 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتی ہیں؟"
"تھوڑی سی لاپروا ہوں۔ اسے ختم کرنا چاہتی ہوں۔"
86 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو ترو تازہ محسوس کرتی ہیں؟"
"صبح کے وقت۔"
93 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"کوئی مسئلہ نہیں۔ کیونکہ میرے گھر والوں نے مجھے کبھی سر پر نہیں چڑھایا کہ میں کوئی چیز ہوں اور نہ ہی میں نے اسے سر پر سوار کیا ہے۔"



آپ کا باورچی خانہ

حنا شہزادی

1 ۔ کھانا بناتے ہوئے میں سب کی پسند کا خیال رکھتی ہوں۔ کیونکہ میں اور میرے بہن' بھائی ذرا نخرے والے ہیں اور صحت بھی ضروری ہے تو غذائیت کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔

2 ۔ ہمارے ہاں مہمان ہمیشہ بتا کر ہی آتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کا اہتمام میں بڑے شوق سے کرتی ہوں اور جب ان سے تعریف سننے کو ملتی ہے تو ساری محنت وصول ہو جاتی ہے۔ ویسے بھی کھانا بنانے کا کام تو میں بڑے شوق سے کرتی ہوں تو جو کام شوق سے کیا جائے' وہ ہمیشہ اچھا ہی ہوتا ہے۔ ایک ڈش لکھ رہی ہوں' جو بڑے مزے کی بنتی ہے۔

مرغ مسالا

ضروری اجزا :

چکن	ایک کلو
دہی	ایک کلو
پیاز	چار عدد
لہسن	چار گٹھی
ٹماٹر	تین عدد
ہری مرچ	چھ عدد
ادرک (پسی ہوئی)	ایک کھانے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا	1/2 گڈی
تیل	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب :

تیل میں پیاز اور لہسن باریک کاٹ کر پکائیں۔ رنگ تبدیل ہونے لگے تو زیرہ ڈال کر پیاز اور لہسن براؤن ہونے تک پکائیں۔ تھوڑا سا پانی اور ہری مرچ' ٹماٹر' نمک' ہلدی' لال مرچ ڈال کر ٹماٹر گلنے تک پکائیں۔ پھر چکن ڈال کر اچھی طرح بھون لیں اور دہی شامل کر دیں۔ چکن گل جائے تو دو کپ پانی ڈال کر پانچ سے دس منٹ تک پکائیں پھر ہرا دھنیا' گرم مسالا ڈال کر اتار لیں۔ زیرہ والے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

3 ۔ کچن کا صاف رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کھانا صاف ماحول میں بنے گا۔ تب ہی تو گھر کے لوگ صحت مند رہیں گے نا۔ میں کھانا بنا کے کچن بھی صاف کر لیتی ہوں اور ہفتے بعد کچن کی تفصیلی صفائی بھی خود کرتی ہوں۔

4 ۔ ناشتا زیادہ تر چائے' پراٹھے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ سردیوں میں آلو کے پراٹھے یا گوبھی کے بچے ہوئے سالن کے پراٹھے بنتے ہیں۔ جو سب بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔

5 ۔ باہر کھانا کھانے کبھی نہیں گئے۔ گھر میں ہی ڈشز بنا کے انجوائے کرتے ہیں۔

6 ۔ کھانا موسم کے مطابق بنایا جائے تو کھانے کا مزا دوبالا ہو جاتا ہے۔ سردیوں میں سموسے' پکوڑے اور گرمیوں میں کولڈ ڈرنک' آئس کریم کا تو کیا مزا ہے۔

7 ۔ کھانا ہمیشہ ہلکی آنچ پر پکاتی ہوں اور چمچہ چلاتی رہتی ہوں اور دل لگا کے پکاتی ہوں۔

8 ۔ کھانا پکانے سے پہلے بسم اللہ اور درود شریف پڑھیں کھانا ذائقہ دار بنے گا اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا پیش کریں تو کھانے میں برکت ہوگی۔

☼



آج لنچ میں کیا ہے؟

صبا حر

غذائی ماہرین نے چوبیس گھنٹوں میں صرف ناشتے اور رات کے کھانے کو صحت کے لیے اہم قرار دیا ہے تاہم دونوں کھانوں کا درمیانی وقفہ زیادہ ہونے کے باعث لوگ دوپہر میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کھاتے ہیں اور اب چونکہ دوپہر میں کھانا معمول بن گیا ہے تو رات کی طرح دوپہر کے کھانے کا بھی باقاعدہ اہتمام کیا جانے لگا ہے۔ ہمارا کہنا صرف یہ ہے کہ اہتمام ضرور کریں مگر تنوع کے ساتھ ساتھ صحت کا بھی خیال رکھیں اور دوپہر میں ہلکا پھلکا کھانا کھائیں۔

"آج لنچ میں کیا ہے؟" اس کا فیصلہ اکثر اوقات بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ درج ذیل مینو خواتین کی اسی پریشانی کو پیش نظر رکھ کر ترتیب دیا گیا ہے۔ جس میں تنوع بھی ہے' غذائیت بھی اور سہولت بھی ہے' صحت بھی۔

اتوار کے دن اپنے لنچ میں چاول رکھیں۔ بریانی' پلاؤ' فرائیڈ رائس۔

پیر کے دن مختلف رائتے بنائیں۔

منگل کے دن کچھ چائنیز ڈشز ہو جائیں۔

بدھ کے دن سبزیوں سے فائدے اٹھائیں۔

جمعرات کے دن دستر خوان کو رنگ برنگے سلاد سے سجائیں۔

جمعہ کے دن پروٹین یعنی دال پکائیں۔

ہفتے کے دن چکن' مٹن' بیف کا اہتمام کریں۔

ہم امید رکھتے ہیں۔یہ سلسلہ آپ کے لیے کار آمد ثابت ہوگا۔

نوڈلز فرائیڈ رائس

ضروری اجزا :

نوڈلز	ایک پیکٹ
مٹر	ایک کپ
گاجر	چار عدد
بند گوبھی	ایک کپ
شملہ مرچ	تین عدد
ہری پیاز	ایک کپ
چاول	ایک کلو
پسی سفید مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
چلی ساس	آدھا کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

نوڈلز کو ایک چمچہ تیل اور نمک میں ابال کر نتھار لیں۔گرم تیل میں ساری سبزیاں ڈال کر فرائی کریں پھر نوڈلز بھی شامل کردیں۔الگ پتیلی میں تیل گرم کرکے ہری پیاز نرم کریں پھر ایک کھانے کا چمچہ سرکہ، چلی ساس، ٹماٹو ساس، سفید مرچ، اجینو موتو اور نمک ڈال کر تھوڑا سا بھونیں۔چار گلاس پانی ڈال کر جوش دیں پھر چاول ڈالیں۔پانی خشک ہونے لگے تو نوڈلز ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کرکے دم لگادیں۔

ذائقے کی تبدیلی کے لیے بیف میکرونی رائس بنائیں۔ایک کپ میکرونی اور ایک کپ چاول کو الگ الگ ابال لیں۔دو انچ کی گوشت کی بوٹیاں نمک کے ساتھ ابال لیں۔اب ایک پتیلی میں تیل گرم کرکے لہسن ادرک پیسٹ فرائی کریں۔پھر گوشت ڈال دیں۔نمک، کالی مرچ، سرکہ اور سویا ساس مکس کرنے کے بعد چاول اور میکرونی بھی ڈال کر دس منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

آلو کا رائتہ

ضروری اجزا :

دہی	ایک پاؤ
آلو	ایک عدد
ہری مرچ	تین عدد
ہرا دھنیا	چند پتے
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

آلو کو کیوبز میں کاٹ کر فرائی کرلیں۔دہی میں نمک ملا کر پھینٹیں۔تھوڑا سا پانی ڈال کر پتلا کرلیں۔ہری مرچیں اور تھوڑا سا دھنیا پیس کر دہی میں ملائیں اور فرائی آلو ڈال دیں۔ہری مرچ اور ہرا دھنیا باریک کتر کر بھی ڈال سکتی ہیں۔

اگر بینگن کا رائتہ بنانا چاہیں تو ایک بڑے بینگن کو نرم ہونے تک ابال لیں پھر ٹھنڈا کرکے چھیل لیں اور میش کرکے نمک اور سرخ مرچ کے ساتھ دہی میں ملا دیں۔دو چمچے تیل میں آدھا چمچہ ثابت دھنیا اور آدھا چمچہ زیرہ ڈالیں اور دہی میں بگھار دیں۔

اگر کھیرے کا رائتہ بنانا چاہیں تو دو چھوٹے کھیروں کو چھلکے سمیت چوپ کرکے دہی میں ملادیں۔ساتھ ہی دو ہری مرچ باریک پیس کر نمک اور پسی کالی مرچ بھی دہی میں شامل کردیں۔دو چمچے تیل میں ایک چٹکی رائی اور دو کڑی پتے کڑکڑا کر دہی میں بگھار دیں۔

میکرونی/اسپگیٹھی/پاستا

ضروری اجزا :

میکرونی	ایک پیکٹ
چکن بوٹی	آدھا پاؤ
شملہ مرچ	ایک عدد
ٹماٹر	دو عدد
ہری پیاز	دو عدد

ابلے آلو	دو عدد
دہی	آدھا کپ
چینی	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چوکور کٹے ہوئے ٹماٹر اور شملہ مرچ اور باریک کٹی ہوئی ہری پیاز دو چمچے تیل میں فرائی کریں۔نمک، سویا ساس، سرکہ، چینی اور پسی کالی مرچ ڈال کر چوکور کٹے ہوئے آلو ڈال کر ہلکا سا بھونیں اور کسی پلیٹ میں نکال لیں۔اسی فرائنگ پان میں تین چمچے تیل ڈال کر چکن فرائی کریں۔ساتھ ہی دہی بھی شامل کردیں۔فرائیڈ سبزیاں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں پھر پہلے سے ابلی ہوئی میکرونی میں ملالیں۔ڈش میں نکال کر چاٹ مسالا چھڑکیں اور مزے سے کھائیں۔

اگر آپ نے اس ہفتے اسپگیٹھی کھانے کا ارادہ کرلیا ہے تو اس کے لیے یوں کیجیے کہ ایک چوتھائی کپ سویا ساس میں چار کھانے کے چمچے چینی یکجان کرلیں۔ابلی ہوئی اسپگیٹھی بھی شامل کرلیں الگ پیالے میں چار کھانے کے چمچے سرکہ، ایک چائے کا چمچہ لہسن پیسٹ اور نمک ملا کر چکن کی بوٹیوں پہ لگائیں اور رکھ دیں۔آدھے گھنٹے بعد ہلکا سا فرائی کرکے اسپگیٹھی کے ساتھ مکس کرکے کھائیں۔

اگر آپ پاستا بنانا چاہیں تو شملہ مرچ، کھیرا اور ٹماٹر کے بیج نکال کر ہری پیاز اور گوبھی کے ساتھ چوکور کاٹ لیں۔ایک چوتھائی کپ تیل میں ایک پیاز سنہری کرکے چکن کی کیوبز میں کٹی بوٹیاں فرائی کریں۔دس منٹ بعد تمام سبزیاں بھی شامل کردیں۔سویا ساس، چلی ساس، سفید مرچ اور نمک ڈال کر ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔نمک ڈال کر پاستا ابال لیں پھر سبزیوں میں شامل کرکے ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔آخر میں ایک کھانے کا چمچہ زیتون کا تیل ڈال دیں۔

کڑاہی سبزیاں

ضروری اجزا :

گاجر	دو عدد
شملہ مرچ	دو عدد
پھول گوبھی	ڈیڑھ پیالی
مٹر	ایک کپ
ٹماٹر	دو عدد
پیاز	دو عدد
ثابت سرخ مرچ	پانچ عدد
ادرک لہسن پیسٹ	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ٹماٹر، گاجر اور شملہ مرچ کو چوکور کاٹ لیں۔گوبھی کے پھول الگ کرلیں۔گرم تیل میں پیاز سنہری کریں، پھر بھنا ہوا پسا ہوا زیرہ، ثابت دھنیا اور سرخ مرچ ڈالیں۔لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ تین چار ہری مرچیں بھی پیس کر شامل کریں۔مٹر گوبھی اور گاجر ڈال کر ہلکی آنچ پر بھاپ پر گلائیں پھر ٹماٹر اور شملہ مرچ کے ساتھ نمک، پسی سرخ مرچ اور آدھا چمچہ پسا دھنیا ڈالیں۔تھوڑا سا پانی شامل کرکے ہلکی آنچ پر دس منٹ پکائیں۔ڈش میں نکال کر ہرے دھنیے اور کتری ہوئی ادرک سے سجاوٹ کریں۔

سبزیوں میں کچھ مختلف ترکیب چاہیں تو بنائیں بینگن کی کڑھی۔اس کے لیے آپ ایک کپ دہی میں چار کھانے کے چمچے بیسن پھینٹ لیں۔ایک چوتھائی کپ املی کا گودا، نمک، پسی سرخ مرچ، ہلدی، لہسن پیسٹ اور چار گلاس پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر ایک گھنٹے تک پکائیں۔دو گول موٹے بینگن کے سلائس کاٹ کر نمک کے پانی میں بھگو دیں۔ایک کپ بیسن میں نمک اور سرخ مرچ ڈال کر گھول لیں۔بینگن کے سلائس بیسن میں ڈبو کر فرائی کریں اور کڑھی میں ڈالتے جائیں۔ثابت سرخ مرچ، زیرہ اور کڑی پتے کا بگھار لگا

دیں۔ ابلے ہوئے چاولوں یا چپاتی کے ساتھ دوپہر کا مزے دار کھانا تیار ہے۔

رشین سلاد

ضروری اجزا :

آلو	دو عدد
گاجر	دو عدد
سیب	دو عدد
کریم	چار کھانے کے چمچے
مایونیز	ایک چوتھائی کپ
پسی کالی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

گاجر اور آلو کو ابال کر چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ سیب کو بھی کیوبز میں کاٹ لیں۔ ایک بڑے پیالے میں مایونیز، کریم، نمک، پسی کالی مرچ اور چٹکی بھر چینی اچھی طرح یکجان کرکے کیوبز میں کٹی چیزیں ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں۔ بڑی پلیٹ میں سلاد پتے کے ساتھ سجاوٹ کریں۔ آدھا چمچہ لیموں کا رس بھی چھڑک دیں۔

کریمی فروٹ سلاد کے لیے تین چار پھل (انگور، خربوزہ، سیب، کیلا، آڑو، آم) کیوبز میں کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں آدھا کپ مایونیز، آدھا کپ کریم، ایک چائے کا چمچہ سفید پسی مرچ، تین چمچے چینی اور نمک شامل کرکے خوب پھینٹیں۔ پھر کٹے ہوئے پھل اور ڈیڑھ کپ ابلی ہوئی میکرونی ہلکے سے مکس کریں۔

دال اسپیشل

ضروری اجزا :

چنے کی دال	ایک چوتھائی کپ
لوبیا کی دال	ایک چوتھائی کپ
ارہر کی دال	ایک چوتھائی کپ
پیاز	ایک عدد
ٹماٹر	تین عدد
مکھن	تین کھانے کے چمچے
قصوری میتھی	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

تینوں دالوں کو چھ گھنٹے تک بھگو کر ابال لیں۔ تیل گرم کرکے پیاز براؤن کریں۔ ساتھ لہسن بھی کاٹ کر ڈال دیں۔ ٹماٹر، ہری مرچ، نمک، پسی مرچ اور زیرہ ڈال کر ٹماٹر نرم ہونے تک بھونیں پھر دال اور مکھن شامل کرکے ہلکی آنچ پر دس منٹ تک پکائیں۔ آخر میں قصوری میتھی چھڑک دیں۔

کسی دن آپ نمکین دلیہ بھی بنا سکتی ہیں۔ آدھا کپ دلیے کے ساتھ آدھا آدھا کپ دو مزید دالیں ملا کر آدھے گھنٹے تک بھگونے کے بعد زیادہ پانی میں ابالیں۔ ساتھ ہی لہسن ادرک پیسٹ، نمک، سرخ مرچ، ہلدی ڈال دیں۔ (چاہیں تو بیف بھی ڈال سکتی ہیں) گل جائے تو گھوٹ لیں۔ پھر پیاز اور زیرے کا بگھار دے کر لہسن مرچ کی چٹنی کے ساتھ گرم گرم کھائیں۔

پالک کا سوپ

ضروری اجزا :

پالک	آدھا کلو (پتے الگ کرلیں)
نمک	حسب ذائقہ
ڈبل روٹی کے سلائز	دو عدد
(چھوٹے چوکور ٹکڑے کرلیں)	
مرغی کی یخنی	دو پیالی
کالی مرچ (کٹی ہوئی)	چائے کا آدھا چمچہ
تازہ کریم	حسب پسند

پالک کے پتے اچھی طرح سے دھو کر ایک پیالی پانی ڈال کر ہلکی آنچ میں ابال لیں۔ دس منٹ بعد اتار کر ٹھنڈا کرلیں۔ جب ٹھنڈا ہو جائے تو بلینڈر میں پیس لیں۔ پتیلی میں یخنی کے ساتھ ڈال کر دوبارہ پانچ منٹ کے لیے پکالیں۔ جب ابال آجائے تو نمک ڈال دیں۔

روشن حرف وہ سارے

حفصہ شمین

شاعری، جذبات و احساسات کو بیان کرنے کا بہت ہی خوب صورت ذریعہ ہے۔ اگر بات کرنے کے لیے آپ لفظوں کے انتخاب میں مشکل محسوس کریں تو شاعری اسے آپ کے لیے کہیں آسان بنا دیتی ہے۔

1 ۔ اشعار تو بہت سے ہیں، جو لبوں پہ رہتے ہیں۔ ویسے ابھی ایک ہی شعر لکھ رہی ہوں۔ جب رشبہ (بھتیجی) کو ہماری کوئی بات بری لگے تو ہم اس کو یہ کہہ کر مناتے ہیں کہ مانو! (پیار کا نام) ہم تو پیار پیار سے کر رہے تھے تو ڈھائی سالہ بچی بڑی جلدی اپنا موڈ ٹھیک کرلیتی ہے تو بے اختیار یہ شعر ادا ہوتا ہے۔

جبر میں تو ساری بات انا پر آتی ہے
چاہت میں تو جو جی چاہے تو منواتا جا

2 ۔ لائبریری میں گھومتے گھومتے پروین شاکر کی "خوشبو" پر نظر پڑی۔ ان کی تصویر سے اتنی زیادہ متاثر ہوئی کہ فوراً کتاب اٹھالی۔ پھر جو پڑھی تو اس میں سے یہ غزل بے حد و حساب پسند آئی۔

کیا کیا نہ خواب ہجر کے موسم میں کھو گئے
ہم جاگتے رہے تھے مگر بخت سو گئے

اس نے پیغام بھیجے تو رستے میں رہ گئے
ہم نے جو خط لکھے وہ ہوا برد ہو گئے

کیا جانیے، افق کے ادھر کیا طلسم ہے
لوٹے نہیں زمین پہ، اک بار جو گئے

جیسے بدن سے قوس قزح پھوٹنے لگی
بارش کے ہاتھ پھول کے سب زخم دھو گئے

کیا دکھ تھے، کون جان سکے گا نگار شب
جو میرے اور تیرے دوپٹے بھگو گئے

3 ۔ جناب! ہم ٹھہرے ہر غم دبائے ہنسنے ہنسانے والے لوگ۔۔۔ تو ہماری اسی عادت پر لوگ اکثر کہتے ہیں کہ

ہر وقت کا ہنسنا تجھے برباد نہ کردے
تنہائی کے لمحوں میں کبھی رو بھی لیا کر

4 ۔ شاعر کا نام تو اب مجھے یاد نہیں۔ مگر مجھے بہت پسند ہے

میرے دل کی دنیا میں آکر تو دیکھو
تمہیں زندگی کی حقیقت ملے گی
ذرا اپنی آنکھوں اٹھا کر تو دیکھو
ان آنکھوں میں تم کو محبت ملے گی

غم زندگی کا زہر پی کے شاہد
وہ جس کے لیے آج ہم مر رہے
بڑا خوف تھا میری قربت میں جن کو
میری موت سے ان کو شہرت ملے گی

5 ۔ کلاسیکی شعراء میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا بے حد دشوار، پھر ان کے کلام میں سے کسی ایک نظم یا غزل کا انتخاب اس سے کہیں دشوار امر تھا۔ بالآخر حکیم مومن خان کی یہ خوب صورت غزل آپ سب بہنوں کی نذر۔

اظہار شوق، شکوہ اثر اس سے تھا عبث
یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر، کہا عبث
میں ایک سخت جان ہوں گردوں سے پوچھ لو
تم کو خیال ہے میرے آزار کا عبث
جس غم میں مر رہے تھے، وہ غم ہی نہیں رہا
افسوس مر کے سمجھے کہ جینا ہے کیا عبث
اے روز حشر، کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں
بدنام ہو جہان میں تیری بلا عبث
ہرگز نہ رام وہ صنم سنگ دل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

☼

میری خاموشی کو بیاں ملے

زرین گل

(1) میرا نام زرین گل ہے۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ اسلام آباد میں رہتی ہوں۔ تین بیٹے ہیں۔ پہلے پمز (Pims) میں تھی۔ لیکن تیسرے بیٹے کی وجہ سے 'جو ابھی سال بھر کا ہے 'جاب چھوڑ دی ہے۔ میاں صاحب بینک میں کام کرتے ہیں۔ رہتے تو ہم ایک ہی گھر میں ہیں۔ لیکن ملاقات کم کم ہی ہوتی ہے کیونکہ میرے میاں کا خیال ہے کہ جس عورت کے پاس پیسہ' گاڑی اور آزادی ہو۔ اس کو میاں کی کمپنی کی ضرورت نہیں رہتی۔ لہٰذا وہ اپنے دوستوں میں گم اور میں اپنے کاموں میں گم رہنے کی کوشش کرتی ہوں۔

میرا بچپن بہت اچھا گزرا۔ میرے ڈیڈ آرمی آفیسر تھے اور میں تین بھائیوں کا چوتھا بھائی۔ پڑھائی میں اچھی تھی۔ پر ڈاکٹر بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ صرف اپنے نانا کو خوش کرنے کے لیے ڈاکٹر بنی۔

جب تک جاب کرتی تھی 'سر کھجانے کی فرصت نہیں تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ شام کو جب میں گھر واپس جا رہی تھی تو گھر جا کر جو کام کرنے تھے 'وہ یاد آئے تو میں گھبرا کر ایک پارک میں چلی گئی اور آدھا گھنٹہ روتی رہی تھی۔ اور میں نے سوچا تھا کہ میں اپنی بیٹی کو اگر ہوئی' کبھی ڈاکٹر نہیں بنواؤں گی۔ عورت جب تک شوق سے نوکری کرے تو وہ خوش رہتی ہے۔ ورنہ مجبوری میں وہی نوکری رونے پر مجبور کر دیتی ہے۔ البتہ اب میں بہت آرام میں ہوں۔ جب شیر دل اسکول جائے گا۔ پھر دوبارہ جاب شروع کر دوں گی۔

(2) یہ سوال مجھے بہت پسند ہے۔ خوبی یہ ہے کہ میں ہر کسی کی مدد کرنے کو تیار رہتی ہوں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ میں دل میں بغض اور کینہ نہیں رکھتی اور تیسری خوبی۔ ہے کہ برداشت بہت زیادہ ہے۔ خامیوں کے لیے میاں صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے جو خامیاں بتائیں۔ وہ سن کر رات کو نیند نہ آئی۔ بہرحال انہی کو ذرا میٹھے انداز میں مزاحیہ طریقے سے لکھ دیتی ہوں۔

۱ ۔ انتہائی بدتمیز ہوں (میں نے پوچھا۔ کب بدتمیزی کی ہے تو بحث کا ذکر کیا جو میں کبھی کبھار کرتی ہوں)
۲ ۔ پیسے پیسے کا حساب رکھتی ہوں (نہ رکھوں؟)
۳ ۔ بہت تیز بولتی ہوں۔
۴ ۔ بہت سادہ اور بے وقوف ہوں۔
باقی لکھنے کے قابل نہیں۔

(3) جب میں ہاسٹل میں تھی۔ تب میں نے خواتین ڈائجسٹ دیکھا۔ تھوڑا بہت پڑھا تو پتا چلا کہ اچھا رسالہ ہے۔ لیکن مجھے زندگی میں کبھی اتنا وقت نہیں ملا کہ میں اس کو آرام سے پڑھوں۔ اب بھی کہانی شروع کر کے اگر پسند نہ آئے تو چھوڑ دیتی ہوں۔ اکثر رائٹرز یا ناولز کی لوگ بہت تعریف کرتے ہیں تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ پسند کیوں نہیں آئی۔ جیسے نمرہ احمد ان کا کوئی ناول مجھے پسند نہیں۔ بس درمیان درمیان سے پڑھ لیتی تھی کبھی کبھار۔ فرحت اشتیاق اچھا لکھتی ہیں۔ لیکن "جو بچے ہیں سنگ" مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ کچھ ناولز ایک دم بہت اٹریکٹ کرتے ہیں۔ مجھے ایسے ناولز اچھے لگتے ہیں' جو تیزی سے آگے بڑھتے ہوں۔

صدیق سالک میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔ یہ میرے ابو کے دوست بھی تھے۔ ان کی سب کتابیں میرے پاس ہیں۔ "ہمہ یاراں دوزخ" جو پاک فوج ___ کے بارے میں ہے۔ جب جب میں پڑھتی ہوں' دل بہت دکھی ہوتا ہے۔

(4) میری سالگرہ جنوری میں ہوتی ہے۔ شادی سے پہلے منائی جاتی تھی۔ پانچ تحفے پانچ پرچیوں پر خود سے لکھ کر قرعہ اندازی کراتی تھی۔ ایک ابو ایک امی اور باقی کی بھائی اٹھاتے تھے اور پرچی کے مطابق تحفے دیتے تھے۔

شادی کے بعد اب وہ لوگ اپنی مرضی سے دیتے ہیں۔ میری جٹھانی بھی بہت پیار سے تحفہ دیتی ہیں۔ میاں البتہ سالگرہ منانے کو وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں اور اب تو مجھے بھی کیک کاٹتے شرم آتی ہے۔

ایک دفعہ ہمارے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ میں انتظار میں تھی کہ یہ کب جائیں گے۔ تاکہ میں کیک کاٹوں۔ آخر میں نے تنگ آکر مہمانوں سے کہا کہ آپ کب جائیں گے۔ تاکہ میں کیک کاٹوں۔ مہمان ہنستے ہوئے چلے گئے۔ لیکن ابو نے مجھے بہت ڈانٹا تھا۔

(5) مجھے شاعری بالکل پسند نہیں ہے۔ لیکن علامہ اقبال بہت پسند ہیں۔ ان کے جو اشعار سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ ان کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال جیسا انسان کم کم ہی پیدا ہوتا ہے۔ مجھے شعر کبھی یاد نہیں ہوتے۔ کوشش کروں۔ تب بھی نہیں اس لیے میں کوئی شعر نہیں لکھ رہی۔

روبینہ صفدر۔ سرگودھا

(1) نام تو آپ لوگ جان چکے ہیں اور میرے نام کا مطلب ہے چہرہ شناس۔ شہرت رکھنے والے شاہینوں کے شہر سرگودھا سے تعلق ہے۔ تاریخ پیدائش 20 جولائی ہے۔ اس حساب سے میں کینسر ہوں اور اپنے اسٹار کی تمام خوبیاں اور خامیاں (اہم) مجھ میں موجود ہیں۔

تعلیمی قابلیت بہت زیادہ نہیں۔ ایم اے اکنامکس، ایم ایڈ اور اب ایم فل (اکنامکس) کی اسٹوڈنٹ ہوں اس کے ساتھ ایک پرائیویٹ ادارے میں بطور لیکچرار اور ایڈمنسٹریٹر کے فرائض سرانجام دے رہی ہوں۔

اسٹوڈنٹس کی لائف سب سے مزے کی گزرتی ہے۔ اب اپنے اسٹوڈنٹس کو دیکھتی ہوں تو اس لائف کو بہت مس کرتی ہوں تو یقین آتا ہے کہ واقعی گزرے دن واپس نہیں آتے۔

گھر میں سب سے چھوٹی تھی ہائے ری قسمت' بہت لاڈ اٹھوائے۔ مگر اب بہن اور بھائیوں کے بچوں نے یہ سیٹ مجھ سے چھین لی۔ جی جناب! مجھ سے بڑے تینوں بہن بھائی میرڈ ہیں اور ان کے بچے بھی ہیں۔

(2) خوبیاں تو جناب! دوسرے ہی بتا سکتے ہیں۔ مگر بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ میں کیئرنگ بہت ہوں اور ذمہ دار بھی بہت ہوں۔ کبھی کسی کو دھوکا نہیں دے سکتی اور نہ صرف رشتوں کے ساتھ۔ بلکہ اپنے کام کے ساتھ بھی مخلص ہوں۔ کسی بھی معاملے میں ڈنڈی نہیں مارتی اور ایک خوبی یہ ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی سے حسد نہیں کرتی۔ بلکہ جو میرا نصیب ہے 'وہ مجھے ضرور ملے گا۔ اس پر یقین رکھتی ہوں۔

خامی نہیں۔ بلکہ ہر انسان میں خامیاں ہوتی ہیں مجھ میں ایک خامی یہ ہے کہ اگر کوئی میری پیٹھ پیچھے برائی کرے اور میرے دل میں اس کے خلاف گرہ پڑ جائے تو وہ کھولنا مشکل ہے۔ مجھے بہت برا لگتا ہے کہ مجھے میری غیر موجودگی میں ڈسکس کیا جائے۔

(3) خواتین ڈائجسٹ سے تعلق بہت پرانا ہے۔ مجھے ہر قسم کی کتابیں پڑھنے میں دلچسپی ہے۔ چاہے وہ عمرو عیار اور ٹارزن کی کہانیاں ہی کیوں نہ ہوں۔ کتابیں کافی ہیں جن کو پڑھ کر اچھا لگا۔ ان میں "علی پور کا ایلی" بہت دلچسپ تحریر ہے۔ اس کے علاوہ مکمل ناول اور کچھ سلسلہ وار ناول بھی مزے کے تھے۔ جن میں زیادہ کا تعلق عمیرہ احمد سے ہے۔

(6) آخر میں ایک بات کہ خدا کے لیے پاکستان سے محبت کریں۔ حتیٰ کہ ہم تو اس کے بارے میں بعض اوقات اچھا سوچتے بھی نہیں۔ جی کبھی اتنا تو سوچیں ہم نے اسے کیا دیا۔ مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔

عکسان

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

تمام ماہرین علم اور ماہرین نفسیات محسوس کرنے لگے ہیں کہ نماز، مستحکم مذہبی عقیدہ پریشانی، ڈر، خوف اور اعصابی کشمکش دور کرنے میں مدد دیتا ہے، جو کہ ہماری نصف سے زیادہ بیماریوں کے ذمہ دار ہیں۔

"جو شخص صحیح معنوں میں مذہب کا پابند ہوتا ہے، کبھی اعصابی اور ذہنی امراض کا شکار نہیں ہوتا۔"

جہاں تک مسائل کا معاملہ ہے، ہمیں اپنے مسائل پر دھیان تو ضرور دینا چاہیے لیکن پریشان ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔

ذہنی پریشانیاں دور کرنے کا بہترین حل یہ ہے کہ سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ گہرا یقین رکھیں کہ اللہ جو کچھ کرے گا بہتر کرے گا اور جو کچھ آج تک ہوا ہے۔ اس میں اللہ کی کوئی بہتری ہو گی۔ یہ یقین آپ کی ساری پریشانیاں دور کر دے گا۔

انسان دعا سے زیادہ طاقت ور چیز کوئی نہیں پیدا کر سکتا۔

صبا خان۔ کراچی

س: میں اس وقت ساتویں میں تھی اور آپی فرسٹ ایئر میں، آپی کا بچپن سے چچا کے بیٹے سے رشتہ طے تھا چچا کا بیٹا بہت خوب صورت تھا۔ ہمارے ہمسایوں میں دو شادی شدہ بہنیں رہتی تھیں۔ ان کا بھائی اکثر ان کے گھر نظر آتا۔ اس نے آپی کو دیکھا اور خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اس لڑکے کے بارے میں بتاتی چلوں کہ یہ اچھے کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ لیکن بری صحبتوں کی وجہ سے انتہائی بگڑا ہوا آوارہ لڑکوں کے ساتھ پھرتا تھا۔ چونکہ پیسہ وافر تھا۔ اس لیے ہر نئے فیشن کا لباس وہ پہنتا۔ پتا نہیں آپی کس چیز سے مرعوب ہو گئیں..... میرے بھائی اور ابا جان بہت سیدھے سادے ہیں۔ لہٰذا کچھ اس وجہ سے آپی کو ڈھیل ملی۔ اس لڑکے نے رشتہ بھیجا لیکن ابو نے انکار کر دیا کہ آپی کا رشتہ بچپن سے اپنوں میں طے ہے۔ شاید ابو مجبور ہو کر مان بھی لیتے اگر وہ لڑکا شریف ہوتا اور برسر روزگار ہوتا۔ انکار کے کچھ عرصہ بعد اس نے بہانے سے آپی سے تصویریں لے لیں اور ایک دن کالج سے ملاقات کے لیے لے کر گیا اور پھر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اس نے ریوالور کے زور پر آپی کو شام تک بٹھائے رکھا۔ ابو نے سوچا کہ اب اگر..... کسی اور جگہ آپی کو بیاہ دیں تو وہ طعنوں سے ان کو مار دیں گے۔ لہٰذا جب دوبارہ اس کے والدین آپی کے لیے رشتہ لے کر آئے تو ہم نے یہ رشتہ اس شرط پہ طے کیا کہ لڑکے کو کاروبار کروا دو اور انہوں نے لاکھوں روپے لگا کر اس کو کاروبار شروع کروا دیا۔ سال چھ مہینے کے بعد بڑی دھوم دھام کے ساتھ اس شخص کے ساتھ آپی کی شادی ہو گئی۔

یہاں سے اب میں اپنی الجھن لکھ رہی ہوں۔ جب ہم لوگ لڑکے کے گھر والوں سے ملے تو وہ بہت اچھے لگے۔ اپنوں سے بھی بڑھ کر جس لڑکے کے ساتھ آپی کی شادی ہوئی اس کے اور بھی تین بھائی تھے۔ ایک تو..... شادی شدہ تھا دوسرا اس سے چھوٹا جس نے بی کام کیا ہوا تھا۔ تیسرا ابا ہر تھا۔

جب یہ لوگ آپی کا رشتہ طے کر چکے تو ان لوگوں نے کہا کہ "ہم آپ کی دوسری بیٹی کا رشتہ بھی لیں گے۔ ہمارے اور لڑکے بہت شریف اور پڑھے لکھے ہیں۔" میرا شروع ہی سے خالہ کے بیٹے کے ساتھ رشتہ طے ہو چکا تھا۔ لیکن سب رشتہ داروں نے ہم سے ملنا جلنا بند کر دیا تھا۔ وہ ایک مثل مشہور ہے کہ ایک مچھلی سارے جل کو گندا کرتی ہے۔ تو یہی حال تھا۔ لوگ یہ تو نہیں دیکھتے کہ ان کی باقی بیٹیاں شریف ہیں یا شاید اس آوارہ بہنوئی کے بھائی میں کچھ ایسی کشش تھی کہ میں اس کی طرف متوجہ ہوئی بلکہ اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جیسا کہ سنا ہے کہ محبت کی شادیاں اکثر ناکام ہو جاتی ہیں۔ شاید آپی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا یا پھر یہ ایک سازش تھی کہ میری بہن اور بہنوئی میں شادی کے بعد جھگڑے رہنے لگے۔ اس کے والدین اس روز روز کے لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ چکے تھے۔ لہٰذا انہوں نے بہن کے دیور کا رشتہ اپنے امیر و کبیر رشتہ داروں میں کر دیا اور اس نے خوشی خوشی دوسری جگہ شادی کر لی۔ میں بہت روئی اتنا کہ بیمار ہو گئی۔ اور مجھے السر ہو گیا۔ جب اس ذلیل انسان نے دوسری جگہ خوشی خوشی رشتہ طے کروا لیا تو میں نے اس کو خط بھی لکھے اپنا قصور پوچھا۔ اس نے یہ جواب دیا کہ میرے والدین کی مرضی۔ وہ ایک بیٹے کا گھر اجاڑ کر دوسرے بیٹے کا گھر کیسے بسا لیتے۔ میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ آپی کے ساتھ جو واقعہ ہوا اس کی وجہ سے میری کبھی اپنے بہنوئی سے نہ بنی بس ہم دونوں میں ایک انجانی سی نفرت کی دیوار تھی۔ بہنوئی نے آپی کو کچھ ایسی پٹی پڑھائی کہ اس نے اپنے ساس سسر سے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ لوگ میری بہن کو بیاہ لائے تو میں طلاق لے لوں گی یا کہیں چلی جاؤں گی۔

مجھے پھر بھی ان لوگوں سے کوئی شکوہ نہیں۔ شکوہ ہے تو صرف اس شخص سے، جو مجھے اپنی زندگی کہتا تھا بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے والدین نے اس سے بار بار پوچھا تھا اور پھر اس کی رضامندی سے رشتہ طے ہوا۔

مجھ پر اب ایک عجیب سا جنون سوار ہے کہ میں بھی اسے کسی نہ کسی طرح اذیت پہنچاؤں۔ اتنی کہ جتنی اس نے مجھے دی ہے۔ میں اس سے انتقام لینا چاہتی ہوں۔ بہت سوچ بچار کے بعد میرے ذہن میں جو منصوبہ آیا۔ اس کے لیے کسی لڑکے کی ضرورت تھی جو مشکل تھا لیکن ان دنوں میرا ایک بھائی بنا ہے اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے اور اس نے وعدہ بھی کیا ہے کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا اور خط کے ذریعے یا گمنام ٹیلی فون کے ذریعے وہ اس کا جینا حرام کر دے گا۔ مجبوری کی وجہ سے میں نے اس پر اعتماد کیا ہے لیکن اب مجھے خطرہ ہے کہ وہ کسی کو یہ سب کچھ بتا نہ دے۔ وہ ہے بھی ہمارے محلے کا۔

آپ سے التجا ہے کہ خدا کے لیے اس مشکل وقت میں میری مدد کریں۔ مجھے بتائیں کہ میں اس سے کیسے انتقام لوں؟ کیسے اپنے دل کی آگ کو ٹھنڈا کروں؟ اور کیا میں اپنے بنے ہوئے بھائی پر اعتماد کروں یا نہیں؟

ج: بہن ش خان! انتقام لینے اور دل کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ صبر کریں اور اسے معاف کر دیں۔ شاید اسی میں بہتری ہو گی اور یہ جو محلے کے لڑکے کو بھائی بنا کر انتقام کا سوچا ہے، اس کا خیال ذہن سے نکال دیں۔ یہ بنے ہوئے بھائی کسی دن آپ کو بلیک میل یا بدنام کر دیں گے اور اس وقت آپ کے پاس پچھتاووں کے علاوہ کچھ نہ ہو گا اور گیا ہوا وقت واپس نہ آئے گا۔ آپ فوری طور پر بنے ہوئے بھائی سے رابطہ، واسطہ ختم کر لیں اور نماز پڑھا کریں۔ اللہ نے آپ کے لیے پتا نہیں کیا بہتر سوچ رکھا ہو۔

الف۔ پاک پتن

اچھی بہن! آپ کے شوہر شریف النفس، خدا ترس اور باکردار انسان ہیں۔ ان کی اور آپ کی انڈر اسٹینڈنگ بھی بہت اچھی ہے آپ میں بھی کوئی کمی نہیں ہے۔ جو مسئلہ ہے وہ آپ کے شوہر کے ساتھ ہے۔ اصل "وجہ" ان سے بات کر کے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ بظاہر جو وجہ نظر آتی ہے۔ وہ مزاجوں کا فرق ہے۔ آپ ان سے بات کر سکتی ہیں لیکن بہت احتیاط کے ساتھ بات کریں کیونکہ اس صورت میں منفی نتائج بھی سامنے آ سکتے ہیں۔



امت الصبور

بیوٹی بکس

امبر حیات..... سرگودھا

س۔ میرا مسئلہ بہت سنجیدہ ہے اور میں بہت پریشان ہوں۔ میری جلد خشک ہے اور میری عمر 35 سال ہے۔ لیکن ایک سال سے میرے چہرے پر جھریاں نمودار ہو رہی ہیں اور ان میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ آپ مجھے اس کا حل بتائیں اور پلیز یہ بھی بتائیں کہ کس طرح کا ماسک لگانا چاہیے اور ماسک کیسے لگائیں۔ یعنی کہ کن حصوں میں نہیں لگانا چاہیے' کیونکہ میں نے کبھی ماسک نہیں لگایا۔

ج۔ اگر 35 سال کی عمر میں آپ کے چہرے پر جھریاں نمودار ہو رہی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ آپ صحیح غذا نہیں لے رہی ہیں اور آپ کی نیند بھی پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اپنی غذا میں دودھ' پھل' سبزیوں کا اضافہ کریں۔ رات سونے سے پہلے ایک گلاس گرم دودھ پئیں۔ اس سے پرسکون نیند آئے گی۔

جھریاں پڑنے کی ایک وجہ جلد کا خشک ہونا بھی ہے۔ جلد پر باقاعدگی سے موئسچرائزر لگائیں۔ رات سونے سے پہلے کولڈ کریم کا مساج کریں پھر ٹشو سے چہرہ صاف کرلیں۔ دن میں ایک بار کچے دودھ سے یا بالائی سے چہرے پر مساج کریں۔ جھریوں کے لیے یہ ماسک لگائیں۔

ایک چمچہ شہد میں آدھا چمچہ لیموں کا عرق ملا کر چہرے پر لگائیں۔ بیس منٹ بعد چہرہ صاف پانی سے دھوئیں۔

منہ دھونے کے لیے گلسرین سوپ استعمال کریں۔

حنا قیصرانی..... کوٹ قیصرانی

س۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری عمر 18 سال ہے' مگر میرا وزن تقریباً 50 کلو ہے۔ پلیز کوئی آسان سا طریقہ بتائیں یا وزن کم کرنے کے لیے کوئی ٹیبلٹ بتادیں۔ کوئی حل ضرور بتائیں۔ دوسرا مسئلہ میرا یہ ہے کہ میرے بریسٹ سائز میری عمر سے زیادہ ہے۔ جس سے مجھے شرمندگی ہوتی ہے' پلیز میرا مسئلہ ضرور شائع کیجیے گا۔

ج۔ حنا! آپ وزن کم کرلیں تو آپ کا یہ مسئلہ بھی کسی حد تک حل ہو جائے گا۔ بریسٹ کم کرنے کے لیے ورزش کی جاتی ہے۔ جو آپ ڈاکٹر سے معلوم کرسکتی ہیں۔ وزن کم کرنے کے لیے بھی بہترین طریقہ ورزش ہے۔ روزانہ ایک گھنٹہ پیدل چلیں۔ کھانے پینے میں احتیاط کریں۔ کھانے سے پہلے پانی پئیں اور ایک پلیٹ سلاد کھائیں اس طرح آپ کھانا کم کھائیں گی۔ کھانے میں کچی سبزیاں اور پھل زیادہ استعمال کریں۔ میٹھی چیزوں کا استعمال کم سے کم کریں۔ تلی ہوئی مرغن اور بیکری کی اشیا کم کھائیں۔

اگر پھر بھی وزن کم نہ ہو تو آپ کو باقاعدہ ڈائٹ پلان کی ضرورت ہوگی۔

